دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

یوم آزادی مبارک
میری پہچان پاکستان

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اگست 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

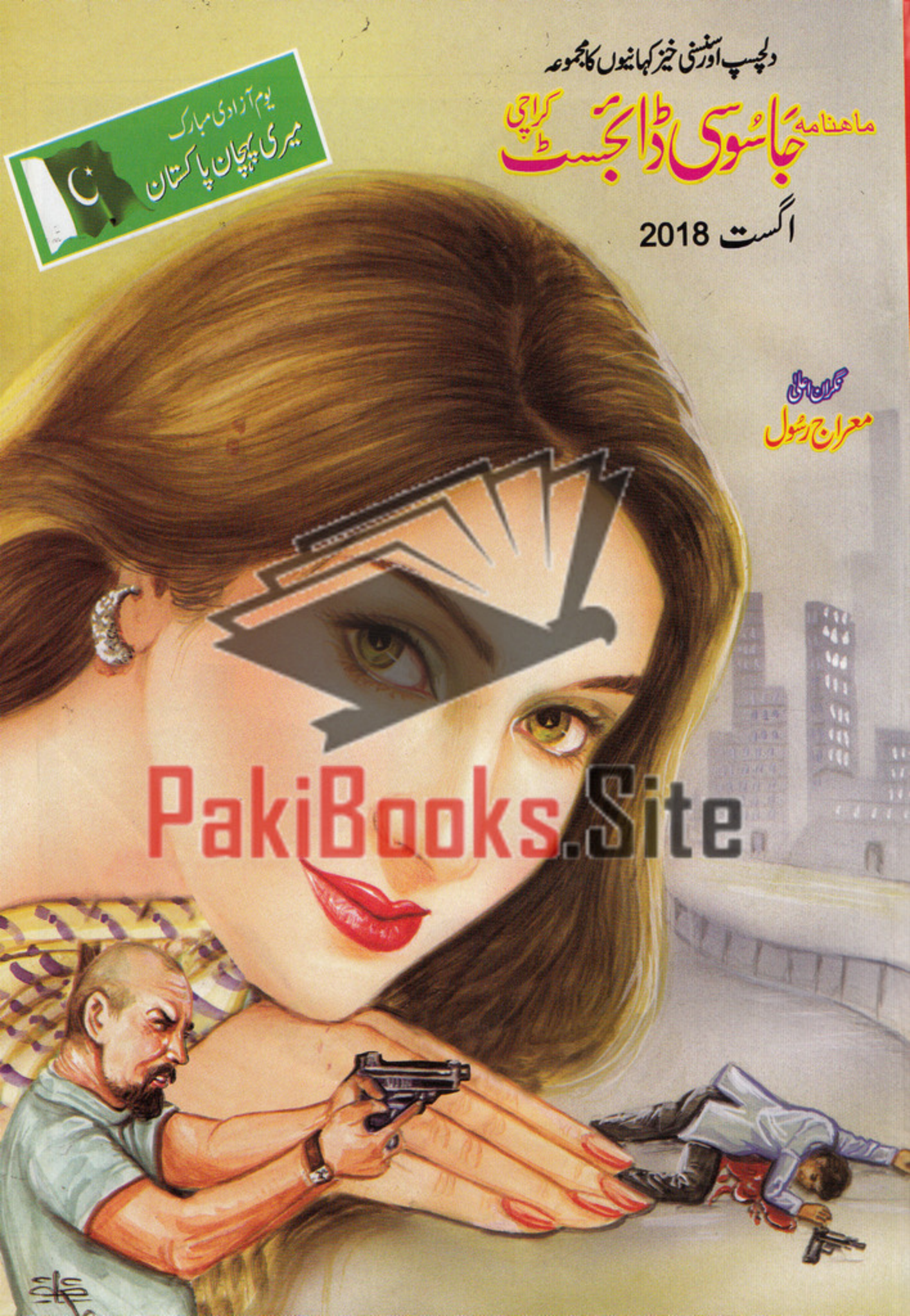

PakiBooks.Site

جاسوسی ڈائجسٹ

APNS CPNE

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07
چینی نکتہ چینی
مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

14
کمانڈو
ہمایوں بلگرامی
حق..... صداقت..... انصاف اور بدلے کی آگ
ایک کمانڈو کی فیصلہ کن جنگ کا سنسنی خیز احوال

67
بے رحم
شکر لطیف
سنسنی خیز کہانی
کے دلچسپ موڑ

79
میرا بازو
منظر امام
ماضی..... حال اور مستقبل سے
وابستہ شناس کہانی.....

83
اصلی مجرم
تنویر ریاض
کئی مجرموں کے درمیان اصلی
مجرم کی تلاش کا دلچسپ احوال

94
انگارے
طاہر جاوید مغل
سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

131
شاطر
اعتراز سلیم وصلی
اس فرشتہ صفت کی کہانی جسے
حالات و وقت نے مجرم بنا دیا

147
ہرجائی
مظہر سلیم ہاشمی
ہنگامۂ دل کا فسانہ اور کاتبِ
تقدیر کا انوکھا فیصلہ

154
آوارہ گرد
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

185
سیانا کوا
عمران قریشی
پرانی عداوت..... انتقام اور جرم کی
مثلث جسے وقت نے بکھیر دیا.....

197
پیادہ
امجد جاوید
ایکشن کی گہما گہمی..... سیاست و ریاست کے
پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھاتی یادگار تحریر

226
زمین خور
کبیر عباسی
زمین دوست اور زمین خور کا خونی
ٹکراؤ..... سرورق کا سنسنی خیز رنگ

جلد 48 • شمارہ 08 • اگست 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من......السلام علیکم!

اگست کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ آنے والا یوم آزادی آپ سب کو مبارک ہو اور ربّ العزت اس یوم سعید کو پاکستانی قوم کی یک جہتی......ترقی میں مددگار بنائے۔ ہمیں استعمار سے آزاد ہوئے سات عشروں سے زائد مدت گزر گئی لیکن ہم آج بھی قوموں کی صف میں خاصے پیچھے ہیں۔ ملائیشیا، تھائی لینڈ، فلپائن حتیٰ کہ بنگلا دیش جو معاشی استحکام اور ترقی کے اعتبار سے ہم سے بہت پیچھے تھے، آج بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ان کی کرنسیاں مستحکم ہیں جبکہ ہمارا روپیا بے چارہ آئے دن بحران سے گزرتا رہتا ہے۔ نوبت یہ آن پہنچی ہے کہ اب ڈالر مہنگے داموں بھی مشکل سے دستیاب ہے کیونکہ زر پرستوں نے بھاری منافع کی امید میں اپنی کافی پونجی اس بازار میں لگادی ہے۔ اس گرمیِ بازار کی مار ہم پر بھی مسلسل پڑ رہی ہے۔ اخبارات سے رسائل تک، سب کا انحصار درآمدی کاغذ پر ہے جس کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی جارہی ہے۔ یہ طوفان آنے والے دنوں میں زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو اپنے بھنور میں گھسیٹ لے گا۔ تنخواہ دار اور محدود آمدنی والے کیا کریں گے؟ چولھے کیسے روشن رکھیں گے؟ یہ نئی حکومت کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہوگا۔ ذرا مڑ کر دیکھیں کہ یورپ کا مردِ بیمار کہلانے والا برادر ملک، ترکی کہاں کھڑا ہے۔ وہاں کے رہنما نے عوامی قوت کے سہارے عزم و حوصلے کی ولولہ انگیز داستان رقم کی ہے۔ معاشی استحکام اور معاشرتی بہبود سے بڑھ کر قوم کو یہ حوصلہ دیا ہے کہ آج ترکی کسی سے مرعوب نظر نہیں آتا، بڑی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوٹوک بات کرتا ہے۔ کاش ہم رائے دہندگان اپنے وطن میں ایسی قیادت منتخب کرسکیں جو ہمیں اقوامِ عالم میں سربلند کرسکے۔ ان سوداگروں کے فریب میں نہ آئیں جو اقتدار کے ایوان میں پہنچنے کے لیے لاکھوں اور کروڑوں خرچ کرکے قومی خزانے سے اربوں لوٹنے کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ایک خوش امیدی ہی ہے جو مظلوم و محکوم اور پسے ہوئے پاکستانیوں کو جہدِ مسلسل پر اکسائے رہتی ہے۔ قوم کو اس صبر و استقامت کا انعام انشاء اللہ ضرور ملے گا۔

قبولہ شریف سے **فیصل مشتاق** کا اشتیاق نامہ ”اس بار جاسوسی کا بے صبری سے انتظار کیا ظاہر ہے دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میرا خط لگا یا نہیں جوں ہی جاسوسی ملا ورق پلٹتا گیا آخر میں صفحہ 13 پر خط لگا آخر میں ہی سہی کہیں تو جگہ ملی اس بات پر میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ ٹائٹل والی لڑکی کی شکل جون والے شمارے میں لگی لڑکی کی تصویر سے بہت مل رہی تھی کیا خبر دونوں جڑواں ہوں یا پھر ممکن ہے لڑکی ماڈل ہو اور اس کی تصاویر ہو خیر یہ تو ٹائٹل لگانے والے آرٹسٹ کو معلوم ہوگا۔ پیچھے کھڑا آدمی جانے کیوں اپنے ہی کان کے نزدیک بندوق لگائے کھڑا تھا ارے بھئی غلطی سے فائر ہو جاتا تو وہ بہرا بھی ہوسکتا تھا مگر ہوسکتا ہے وہ وارداتیاں ہو یا چور ہو جو چوری کی غرض سے آیا ہو پیچھے ایک اور آدمی جیب میں ہاتھ ڈالے جانے پیچھے کون سے کے تلاش کر رہا تھا۔ خیر ٹائٹل کی لڑکی کی آنکھیں تو بے حد پرکشش تھیں...... چینی نکتہ چینی میں قدم رکھا، اف کیسی بھیڑ تھی، دھکم پیل جاری تھی...... سب سے پہلے جناب طلعت مسعود تھے۔ ان کا لمبا چوڑا خط پسند آیا۔ اس کے علاوہ عبدالجبار رومی جی حاضر تھے جو سب کے تبصروں کی تعریفیں کر رہے تھے اور وہ اس لیے کہ ان کا تبصرہ بلاشبہ سراہنے کے قابل تھا، وہ خود بہت اچھے ہیں اس لیے ان کا تبصرہ بھی بہت عمدہ ہوتا ہے۔ ادریس احمد خاں شکوہ لبوں پر لیے حاضر تھے، میں نے دریافت کیا تو کہنے لگے یار جاسوسی سے اتنی محبت ہے اس کے صفحات میں اور معیار میں کمی برداشت نہیں پھر سب کو عید مبارک کہتے رخصت ہوگئے۔ محمد صفدر معاویہ بھائی شگفتہ انکشاف لیے حاضر تھے۔ سید ذیشان کاظمی بھائی کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ پاپا بن گئے ہیں واہ بھئی بہت مبارک ہو اب میرا جی للچا رہا ہے زیادہ تو نہیں کوئی چار رس گلے اور پانچ گلاب جامن اور پایا برفی محض میرے لیے کافی ہوں گے۔ ظاہر ہے بھئی مٹھائی تو بنتی ہے۔ مجھے یاد ہے ابھی پچھلے دنوں ہمارے کیمیا کے استاد کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو بس مت پوچھیے ہم نے کس طرح ان سے دعوتیں کھائیں اب وہ اس بات پر استفسار کر رہے تھے کہ ان کو کیمیا کا ٹیسٹ دیا جائے مگر ہم بھی ڈٹے رہے جب میٹھے میٹھے رس گلوں سے من لبریز ہوگا تب جا کر ٹیسٹ دیں گے۔ محمد اقبال صاحب کتنی گہرائی سے کہانی پڑھتے ہیں، بہت خوب۔ اس کے بعد ماہ رخ ارباب ایمانے زارا کا خط متاثر کن تھا۔ داؤدخیل والے محمد سجاول خان بھی میری طرح کوئی طالب علم محسوس ہوتے ہیں بے چارے ہم جیسے بھی کچھ طالب علم ہیں جن کو امتحانات ستاتے ہیں وقت ملے تو لکھتے ہیں ویسے آپ نے کون سی کلاس کے امتحان دیے ہیں؟ عاصم شہزاد کچھ کہانیوں پر ہی تبصرہ کرسکے مگر خوب۔ سیف خان اور شاہد ذوالفقار کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ اسما قادری کی خونی مسیحا نے کافی متاثر کیا۔ مجھے مغربی کہانیاں نہیں پسند، میں نے اوٹ بار بار پڑھنے کی کوشش بھی کی مگر پھر بھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ محمد سجاول خاں کی بیکار نے بہت ہی متاثر کیا چھوٹی سی تحریر میں بریڈلی نے گریک کا قتل کرکے ثابت کردیا وہ کسی قابل ہو یا نہ مگر اب وہ قاتل بن چکا تھا۔ ناصر ملک کی قصوروار۔ واہ کیا کہنے، بہت عمدہ اتنا ظالم شخص ہائے افسوس وہ اپنے سگے بیٹے کا بھی نہ ہوا تو بیوی کا کیا ہوتا آخر میں شکیل نے باپ کا قتل کرکے برائی کو ختم کردیا لیکن اگر شکیل نے اتنی ہمت کرلی تھی تو وہ پولیس کے پاس بھی جاسکتا تھا۔ جس تحریر سے مجھے بے انتہا محبت ہوئی، وہ تھی بازی اور کلاکار۔ بہت شاندار لگیں دونوں مزاح سے بھرپور تھیں۔ بازی میں مجھے سلیم کا کردار بہت پسند آیا، واقعی ہی قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہر سطر پڑھ کر مزہ آیا۔ تحسین رضا آپ نے تو کمال کردیا۔ آپ کی کہانی نے میرا دل موہ لیا، کلاکاری تو اچھی تھی، شاعری خریدنا بہت آسان ہے مگر اس کو لکھنا اور پورا سلسلہ چلانا بہت مشکل ہے۔ تحریر نے بہت متاثر کیا۔ طنز و مزاح سے بھرپور تھی۔ ایسی کہانیاں ہر ماہ کے جاسوسی کی زینت بنیں تو بہت اچھا تاثر پیدا ہوگا، شمارے کو چار چاند لگ جائیں گے۔

PakiBooks.Site

عید مبارک بھی اچھی تحریر تھی باقی جن کے بارے میں تبصرہ نہیں کیا ظاہر ہے بھئی مجھے وہ پسند نہیں آئیں۔ خیر امید ہے آپ لوگ مجھے مس کریں گے کوئی بات نہیں اگلے ماہ پھر سے آؤں گا انشاء اللہ۔''

فیصل آباد سمندری سے منحہ رمشہ کی درخواست ''امید ہے سب نے مجھے مس کیا ہوگا۔ میں جون اور جولائی جاسوسی ڈائجسٹ کے دونوں شماروں پر تبصرہ کروں گی۔ امتحان کے بعد جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنا اور بھی اچھا لگا۔ جون کے شمارے میں سرورق کی پہلی کہانی آئین وفا، کیا رومان پرور افسوں گر اور سحر انگیز کہانی تھی۔ کیلی اور جورڈن کا کردار بہت پاورفل تھا۔ آخر میں کیلی کو بھاگتے بھاگتے ایک گھر اور پوری فیملی مل ہی گئی۔ تمکین رضا کی دوڑ نے رلا دیا۔ آخر کب ہمارے ملک کا سسٹم بدلے گا اور ہمارے خواب پورے ہوں گے۔ سرور اکرام کی زندگی کے رنگ اچھی کہانی تھی۔ جمال دستی کا لباس کی چوری بھی اچھی کہانی تھی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی دوسری شرط کیا زبردست کہانی تھی۔ جولائی کے شمارے میں منظر امام کی عید مبارک اچھی پُرمزاح اور سبق آموز کہانی تھی۔ عکس فاطمہ کی بازی بھی اچھی پُرلطف کہانی تھی۔ محمد سجاول خان کی بیکار مجھے اچھی نہیں لگی۔ شاکر لطیف کی اوٹ کافی سسپنس والی کہانی تھی۔ سوچا نہیں تھا جو ہیرو تھا وہی قاتل ہوگا۔ سرورق کی پہلی کہانی روبینہ رشید کی قاتل و مقتول ایک نفسیاتی مریض مجرمانہ ذہن کے مالک مجرم کی تھی۔ شکیل ایک درندہ تھا جس طرح سے اس نے زارا کی جان لی وہ بہت دردناک تھا۔ شکر ہے اسحاق بچ گیا۔ ورنہ صائمہ کی وجہ سے وہ بھی مارا جاتا۔ جون کے شمارے میں۔ سرورق کی دوسری کہانی کبیر عباسی کی مسیحا تھی۔ مسیحا اصل میں درندہ بھی تھا جس طرح سے اس نے نیہا بے چاری کی جان لی، وہ بہت وحشت ناک تھا۔ ہاں لیکن توبہ کرنے سے کون سا گناہ معاف نہیں ہو سکتا اس خدائے برتر کی بارگاہ میں۔ اس دعا کے ساتھ اختتام کی طرف بڑھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ جاسوسی ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، میرا تبصرہ ضرور شائع کیجیے گا۔''

کوئٹہ سے سیف خان کے جذبات ''جولائی کی جھلساتی دھوپ میں نیڑھی میڑھی حسینہ جاسوسی نے درشن کرائے تو ناک اور کانوں سے بے اختیار دھواں نکلنے لگا۔ کھانستے کھانستے بمشکل تمام فہرست تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں البتہ ایچ اقبال، ناصر ملک، روبینہ رشید، اسما قادری اور منظر امام جیسے نابغہ روزگار نام نظر آئے تو طبیعت خوشگوار ہونے لگی۔ ناصر ملک صاحب کو طویل عرصہ بعد جاسوسی میں دیکھ کر ازحد مسرت ہوئی۔ خوش آمدید سر...... اداریے میں مدیر نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے سیاست دانوں کے کرتوت بیان کیے۔ جب تک ہم بحیثیت قوم اپنا قبلہ درست نہیں کرتے حالات جوں کے توں رہیں گے۔ محفلِ دوستاں میں طلعت میاں صدارت کی کرسی پر براجمان خود کو سنبھالنے کی کوششوں میں تھے۔ ونگ تبصرے کے لیے مبارکاں۔ ادارے کی آفیشل ویب سائٹ لازماً ہونی چاہیے۔ آنے والا دور آن لائن ریڈنگ کا دور ہے۔ اس ویب سائٹ پر جاسوسی کا نیا شمارہ فیحا دستیاب ہو تو غیر قانونی پی ڈی ایف لنکس، شمارے کی بروقت اور ہر جگہ دستیابی سمیت کتنے ہی مسائل چٹکیوں میں حل ہو جائیں گے۔ روحی بھائی ظفر صاحب ایک ہی خاتون کے مختلف پوز بنا رہے ہیں، سمجھا کریں۔ ادریس بھائی اور ذیشان بھائی...... ڈائجسٹ کی عوامی مقبولیت کا راز اس کا سستا ہونا ہی ہے۔ باقی بچے کھچے صفحات کا معیار برقرار رہنا چاہیے۔ ایمانے بچے، اس محفل کارساز پر صنف وجاہت کا ہی راج چلا آیا ہے۔ آنے میں نمک کا رونا ذرا سائڈ پر ہو کر رولیں پلیز راستہ بند نہ کریں۔ ماہ رخ ارباب کے تبصرے میں...... مجھے بھی سنن اور بوجھل پن جیسے الفاظ پڑھ کر جمائیاں آنے لگیں۔ کہانیوں میں آج کل سب سے پہلے انگارے ہی پڑھی جاتی ہے۔ مغل صاحب قاری کو اپنے ساتھ جوڑ رکھنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ اس قسط میں ایک طرف ہاناوائی کی تباہ کاریاں جاری رہیں تو دوسری طرف شاہ زیب زن مریدی کے بنائے اپنے ہی ریکارڈ رج کے توڑتے رہے۔ ایسٹرکنگ کو ڈائپرز چینج کرتے پڑھا تو ہی ہیج اور اک ہوا کہ عشق و شق کے رنگ کتنے نرالے ہوتے ہیں اور بندے کو کیا سے کیا بنا سکتے ہیں۔ تاہم خدا خدا کر کے مغل صاحب نے ہاناوائی کی صورت تاجور کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی بجا دی کہ اس کی ہٹ لسٹ میں محترمہ بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ آوارہ گرد میں اس بار ایکشن کی بے تحاشا بھرمار نے سائنسی اصولوں کے بھی بخیے ادھیڑ دیے۔ پوری قسط ہی جہاز میں دھما چوکڑی مچاتے گزار دی شہزی نے۔ اڑتے جہاز میں کمانڈو داخل کرانا بس بھٹی صاحب کا ہی کام ہے ورنہ دنیا میں آج تک کوئی مائی کا لال دورانِ پرواز طیارے کا دروازہ تک کھول نہ سکا۔ کہانی اب حقائق سے نکل کر ماورائی واقعات کی جانب بخوبی سفر طے کر رہی ہے۔ پوچھنا صرف یہ تھا کہ فضا میں فیول بھرنے کی ٹیکنیک جنگی جہازوں میں ہوتی تو سنی تھی، کمرشل فلائٹس ایسا کب سے کرنے لگی ہیں؟ قسط کا اختتام بڑے سنسنی خیز موڑ پر ہوا۔ دیکھتے ہیں کہ شہزی کا اونٹ...... ہم...... میرا مطلب جہاز نگرا کے کریش لینڈ کرتا ہے یا پھر وہ سپرمین کی طرح اسے بھی سنبھال لیتا ہے۔ سرورق کے دوسرے رنگ میں اسما قادری صاحبہ خونی مسیحاؤں کے ساتھ نبرد آزما نظر آئیں۔ کتنے دکھ اور افسوس کا مقام ہے کہ سادہ لوح دیہاتیوں کے وسائل و اسباب ایک طرف تو حکومتی مشینری دل کھول کے کھا رہی ہے دوسری طرف نام نہاد نجی اور رفری میڈیکل کیمپس کے نام پر ان کے بچوں کے اغوا، زیادتی، قابلِ اعتراض ویڈیوز ویب نیٹ پر اپلوڈ کرنے اور اعضا کی چوری جیسے گھناؤنے جرائم میں ملوث ہیں۔ اس کہانی کو پڑھنے کے دوران میڈیا پر گردش کرتے ایسے کتنے کیسز یاد آ گئے۔ پرل گروپ کی نوک جھونک کہانی کا حسن بڑھاتی رہی۔ اس سیریز کی کہانیاں مزید بھی آنی چاہئیں۔ پہلے رنگ میں میری فیورٹ روبینہ رشید صاحبہ نے سادہ سی کہانی کو کئی حیران کن موڑ دیے۔ آہستہ آہستہ کھلتی شکیل کی جنونیت اور دیوانگی کہانی کا ٹمپو بناتی بڑھاتی رہی۔ لیکن جس طرح نہتے ہو کر اس نے چار پولیس والوں کی موجودگی میں انسپکٹر پرویز کو قتل کر کے صائمہ کو اغوا کیا، وہ سین ذرا غیر حقیقی سا رہا۔ صائمہ کی انوالومنٹ نے آخر میں چونکا دیا۔ حسد و نفرت کی آگ میں سلگ کر دوسروں کا گھر خاکستر کرنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک منصف اوپر بھی موجود ہے جہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بہترین رنگ رہا۔ ناصر ملک صاحب نے قصوروار کی صورت جذبات اتھل پتھل کر دیے۔ خونی رشتوں میں نفرت در آئے تو انجام ایسا ہی خونی نکل آتا ہے۔ بہترین مگر افسردہ سی تحریر رہی۔ بھلا ہو تمکین رضا صاحبہ کا، کلاکار پڑھنے کے دوران ہنسی کے فوارے چھوٹتے رہے۔ سجاول خان اک بیکار قاتل کی فنکاری کا مختصر احوال سنا گئے۔ ویلڈن برادر...... مزید اچھی تحریروں کی توقع ہے آپ سے۔''

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کی تبصرہ نگاری ''جولائی کا شمارہ بہت خوب صورت رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ حسینہ کی نیلی بادامی آنکھیں اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اس کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک طرف جگمگاتا ہوا عید مبارک سرورق کی رونق بڑھا رہا تھا۔ نکتہ چینی میں چلتے ہیں۔ طلعت صاحب ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ پیارے پاکستان کے حالات بدلیں گے اور ہمیں جاسوسی بھی تین سو بیس صفحات کے ساتھ اپنا جلوہ دکھایا کرے گا۔ (انشاء اللہ) سینئر لکھاری ہمیشہ سے ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں اور رہیں گے لیکن وقت کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔ اس کا تو کام ہے بس گزرتے چلے جانا...... تو چلیں نئے لکھاریوں کو خوش آمدید کہیں تاکہ وہ بھی ہمارے لیے قابلِ فخر بن جائیں۔ روحی انصاری صاحب نے حسینہ کی ہم شکل کہیں خواب میں تو نہیں دیکھ لی؟ ماہ رخ، ادریس اور ذیشان صاحب غم صفحات میں بس رونے کے قریب تھے، ارے نہ بھئی حوصلہ کرو۔ سجاول صاحب کو بیکار کی اشاعت پر مبارکاں۔ عاصم شہزاد و پتا نہیں کیوں مجھے پولیس مین لگتے ہیں باتوں سے۔ سیف صاحب نے دل لگا کر تبصرہ کیا خصوصاً انگارے پر زیادہ دل لگایا، شاباش بیٹا۔ محبوب اور فیصل صاحب آپ کو محفل میں خوش آمدید۔ کہانیوں میں پہلا رنگ قاتل و مقتول میں جنونی قاتل نے دو محبت کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ بہت دکھ ہوا۔ صائمہ اگر اسحاق سے محبت کرتی تو اس کو یوں برباد نہ کرتی بلکہ اس کی خوشی میں خوش رہتی مگر نہیں...... اچھی تحریر تھی جی۔ خونی مسیحا میں لڑکیوں کا کردار پڑھ کر بے اختیار ہی اپنے لڑکی ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ کہانی نے بڑا پیارا سبق دیا کہ ہمیں نیکی کے کام میں بساط بھر حصہ ضرور ڈالنا چاہیے ویری نائس۔ قصوروار میں ناصر ملک نے اہم مسئلہ ہائی لائٹ کیا۔ یقیناً جن گھروں میں اعظم خان جیسا وحشی بستا ہوگا، اس گھر کا حال بھی کہانی سے مختلف نہیں ہوگا۔ پڑھ کر دل بہت غم زدہ ہوا۔ بیکار، محمد سجاول کی مختصر تحریر اچھی کوشش تھی۔ انگارے کی یہ قسط بس ٹھیک ہی تھی۔ مغل صاحب ایک کے بعد ایک کردار کو مارتے جا رہے ہیں۔ لگتا ہے آخر میں تاجور اور شاہی ہی رہ جائیں گے۔ شاہی پر تو بڑا غصہ آیا اس دفعہ جو وہ دراج کے ڈائپر بدل رہا تھا پھر بے سوچ کر معاف کر دیا کہ محبت میں انسان محبوب کی خاطر کسی بھی حد تک چلا جاتا ہے۔ بازی اور کلاکار پڑھ کر خوب قہقہے لگائے اور اپنے بھائیوں سے آپی مخصوم گئی کا خطاب بھی پایا۔ سفر کے بعد زبردست جی۔ شروع میں لگا کہ میچ اس کی ماں بھیج رہی ہوں گی لیکن وہ تو ڈاکٹر نکلی۔ عید مبارک میں آخر کار سب اکٹھے ہو گئے اور عید یادگار ہو گئی۔ کاش ہر گھر میں عید اسی طرح یادگار ہوا کرے۔ کیونکہ عید کا مزہ تو اکٹھے ہو کر مل بیٹھ کر ہی آتا ہے لیکن آج کل مل بیٹھنے کی روایت دم توڑ رہی ہے۔ نسرین منصوری کی تحریر قاتل بھی کامیاب رہی۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کے قلم سے کاغذی پیرہن پڑھتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ شروع میں سیاست کا پڑھ کر کچھ بوریت سی ہوئی لیکن دلچسپی بڑھتی گئی۔''

جدہ سے پرویز لاانگاہ کی پرانی شناسائی ''میں جاسوسی کی گولڈن ایج کا قاری ہوں اس لیے ٹائٹل آج کل دیکھنے کے قابل نہیں لگتے لیکن اس بار والا غنیمت معلوم ہوا کہ پچھلے تین ماہ سے ایک ہی شکل دیکھنے کے بعد کوئی ورائٹی تو نظر آئی۔ آنکھیں بہت پیاری تھیں۔ اپنے طلعت غنچے کو صدارتی کرسی پر دیکھ کر جہاں دل کے گارڈن میں گھنٹیاں بجیں وہیں پر تھوڑا رقابت کا بھی احساس ہوا۔ میرے تبصرے میں کیا ٹیڈو کی کمی ہوتی کہ کبھی وہ پروان چڑھ کر صدر نہیں بنا؟ اپنی بہو بیٹی ایمانے کی زبان درازیاں دیکھ کر حیران رہ گیا، پتا نہیں میرے معصوم پتر کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ سیف خان نے سب سے بچے لینے کی کوشش کی لیکن میں چونکہ اس سے ناراض ہوں تو میری طرف سے نو لفٹس۔ ماہ رخ اور ذیشان کاظمی کے تبصرے اچھے لگے۔ شاہد ذوالفقار کی باتیں پڑھ کر بڑی دیر تک قہقہے لگائے۔ معصومیت کی آڑ میں خوب شکار کیے۔ فیصل مشتاق اور محبوب سعیدی کے چٹے منے تبصرے بھی خوب رہے۔ بلیک لسٹ میں ہر بار ایک ہی نام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان بے چاروں کا قصور معاف کر دیں یا پھر ان کے نام ہی بدل لیں۔ (بدل دیتے ہیں) انگارے حسبِ معمول خوب دہک رہے تھے۔ مغل صاحب نے جہانی استاد کی رن مریدی کے ریکارڈ تڑوا دیے ہیں شاہ زیب سے۔ جو بھی لکھتے ہیں ہماری سوچیں کرا دیتے ہیں، میں تو حیران ہوتا ہوں، وہ اتنا اچھا لکھ کیسے لیتے ہیں۔ ڈائپر والی قسط نے ہاناوائی کی تباہ کاریوں کو پیچھے ڈال دیا ہے۔ ابھی سے انتظار ہے اگلی قسط کا۔ آوارہ گرد پر تبصرہ کرنے کی میری مجال نہیں ہے۔ میں سادہ بندہ اتنی اعلیٰ درجے کی سائنس سمجھنے سے قاصر ہی رہتا ہوں۔ سجاول خان کی بے کار بالکل بھی بے کار نہیں لگی (ہمیں بھی) اور ڈیڑھ صفحہ مزے کا لگا۔ ناصر ملک کو دیکھ کر مسافر کی یاد آ گئی اور اس کے ساتھ ہی طلعت ماڑا غنچہ بن کر تصور میں آ گیا۔ فوراً اپنے تصور کو دور کیا اور خواہش جاگی کہ کاش ناصر ملک ایک اور شاندار قسط وار لکھ ڈالیں۔ قصوروار بہت دردناک کہانی رہی اور میں رنجیدہ سا ہو گیا۔ یہ اداسی عید مبارک پڑھ کر دور کی۔ میرے جیسے پردیسیوں کے لیے ایسی تحریریں ٹانک کے کام دیتی ہیں۔ منظر امام نے ہلکے پھلکے انداز میں کہانی لکھ کر ساری تھکان اور کلفت دور کر دی۔ واہ، جاسوسی پڑھ پڑھ کر میں کتنی اچھی اردو بولنے لگا ہوں۔ (چلو جی کوئی تو مستفید ہوا) روبینہ رشید نے قاتل و مقتول لکھ کر رنگوں کا حق ادا کر دیا۔ ایماندار پولیس افسر بہت کم ہوتے ہیں۔ صائمہ کی مجرم دوستی انکشاف ہی لگی اور افسوس بھی ہوا۔ خونی مسیحا، اسما قادری کی۔ سسپنس بالکل ندارد تھا، بڑے سیدھے انداز میں کہانی چلتی پھرتی رہی پھر بھی بڑی پسند آئی۔ کاغذی پیرہن میں خوب سیاست بازی چلی اور ایکشن بھی کمال کا تھا۔ ایچ اقبال نے بڑے عرصے بعد اچھا لکھا۔ طالش کا کردار پسند آیا لیکن اس گریز کی سمجھ نہیں آئی کہ وہ اپنا مکھڑا بتائے بغیر بھی تو کوئی کور اسٹوری بنا سکتا تھا پھر خوامخواہ ڈرامے بازی کیوں کی؟ مجموعی طور پر جولائی کا شمارہ بہترین رہا۔''

ساہیوال سے ریحانہ عائشہ نادر کے خیالات ''جاسوسی ڈائجسٹ سے ماہ جولائی 18ء کے شمارے سے وابستگی ہوئی ہے۔ ڈائجسٹ میں کچھ قباحتیں تو ہیں مگر مجموعی طور پر اسے متوازن یا متوسط ڈائجسٹ کہا جا سکتا ہے۔ مجھے مطالعے کا زیادہ شوق نہیں ہے مگر دو تین چھوٹی کہانیاں پسند آئیں تو پھر پورا ڈائجسٹ ہی پڑھ ڈالا۔ انگارے کہانی بالخصوص پسند آئی ہے، آئندہ قسط کا انتظار رہے گا۔ اولاً صفحات پر کاغذی پیرہن پڑھی۔ اچھی کہانی ہے۔

PakiBooks.Site

مکالمے زبردست کہانی کی بنت اور روانی شاندار۔ جمال دستی کی کہانی سفر کے بعد نے خصوصاً متاثر کیا۔ اگر کہانی کے پلاٹ پر تھوڑی محنت کی جاتی تو مزید بہتری کا امکان تھا۔ عید مبارک کے عنوان سے منظر امام کی کہانی موجود تھی جو کوئی خاص تاثر نہ دے سکی۔ صدیوں پرانا موضوع جس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بازی کہانی میں سلیم سے کیے گئے سوالات اور سلیم کے ردعمل نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ یادگار کہانی ہے۔ قصوروار دو صفحات پڑھے تھے، پھر چھوڑ دی۔ ابتدا میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ بکواس کہانی ہے۔ انگریزی کہانی بیکار پسند آئی۔ عبدالرب بھٹی کی کہانی آوارہ گرد پڑھی۔ سارا سفر جہاز میں ہی کٹ گیا۔ تحسین رضا کی کلاکار پڑھ کر بھی بہت ہنسی آئی۔ اب میں خصوصی طور پر کہانی قاتل و مقتول پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ یہ ایک لاجواب کہانی ہوسکتی تھی۔ کہانی کے تسلسل نے متاثر کیا۔ اگر وہ توجہ دیتیں تو یہ کہانی یادگار ثابت ہوسکتی تھی۔ خواتین مردوں سے پیچھے نہیں ہیں مگر ادب کے میدان میں ہم خواتین میں وہ بات نہیں ہے جو مردوں میں ہے۔ میں نے جتنے بھی مرد لکھاریوں کو پڑھا ہے، ان کی تحریروں میں وسیع النظری اور عظیم معاشرتی رکھ رکھاؤ جھلکتا ہے۔ آج کل خواتین کے بہت سارے ڈائجسٹ چھپتے ہیں...... میں نے کچھ عرصے تک انہیں پڑھا ہے مگر مجھے مایوسی ہوئی خدا کی قسم! یہ ڈائجسٹ عورتوں کے حوالے سے معاشرتی بگاڑ کی اہم وجہ ثابت ہورہے ہیں۔ آخری کہانی خونی مسیحا کی پہلی لائن پڑھی تو اندازہ ہوگیا کہ یہ کہانی کتنے پانی ہے۔ اس کی رائٹر بھی فی میل ہیں۔ اسما قادری، نہ تمہید، نہ کچھ...... پہلے ہی جملے میں انگریزی کے چار پانچ الفاظ ہیں۔ اسما بہن اس کہانی کو انگریزی میں ہی تحریر کردیتیں تو بہتر تھا۔ لٹریچر صرف داستانوں، کہانیوں کا نام نہیں ہے۔ لٹریچر اسلوب کا نام ہے۔''

چشمہ بیراج سے ساگر تلوکر کی تیزیاں ''جیسے ہی اطلاع موصول ہوئی کہ جاسوسی مارکیٹ میں آگیا ہے۔ کامیاب چھاپا مار کے گرفتار کیا۔ دل و آنکھوں میں قید کیا۔ سرورق کی چھوکری خوشنما اور دلربا سی لگی تھوڑی۔ چٹی نکتہ چینی میں دیار غیر سے یادوں سے لپٹی طلعت کی شرکت بھلی لگی۔ سیف اچھا تبصرہ لکھتے ہیں نسوار سونگھ کے۔ میانوالی سے سجاول...... کی آمد چنگی لگی۔ میرا تبصرہ ایڈیٹر کی چھری تلے آگیا غازی رہا شکر ہے شہید نہیں ہوا۔ (شاباش بیٹا، ایسی یہ جواں مردی چاہیے) کاغذی پیرہن سیاست اور جرم کی آمیزش طالش اور صوفیہ کی محبت نے کہانی کو پانچ سورج لگادیے۔ سفر کے بعد باپ کی بیٹے سے والہانہ محبت اور ڈاکٹر قدسیہ کی فرض شناسی من کو بھاگئی۔ خدا ہمارے سروں پر والدین کا سایہ قائم رکھے امین۔ عید مبارک منظر امام شارٹ اسٹوری لکھنے کے امام ہیں۔ ہمیشہ چونکادینے والی اسٹوری لکھتے ہیں۔ انجم اور راحیلہ کی ترکیب نے روٹھے بھائیوں کو ملادیا۔ منظر امام کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ بازی ہلکی پھلکی سی کہانی اچھی لگی۔ سلیم کی استقامت نے متاثر کیا۔ کلاکار جھوٹی شہرت کے چکر میں پڑنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ انگارے ہاناوانی پوری قوت سے چھائی ہوئی ہے۔ شاہ زیب پارٹی کو حواس باختہ کردیا ہے۔ آفرین شاہ زیب پر ہے۔ دراج کے ڈائپر تبدیل کرکے بھی عاشقی کے مزے لوٹتا رہا۔ سیف کی فیملی کا ذکر غائب ہے۔ پہلوان کا کردار بھی سکڑتا جارہا ہے۔ آوارہ گرد دو اقساط جہاز گردی میں گزار دیے۔ اب اس کو لگام بھی لگادیں۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔ قصوروار ناصر ملک کی واپسی اچھی لگی ادارے کے لیے نیک شگون ہے۔ بیکار مختصر اور پُراثر ویلڈن سجاول۔ خونی مسیحا پرل گروپ کی واپسی ہوئی۔ ہم تو پرل کو بھول چکے تھے۔ ایکشن تجسس اور جاسوسی سے محظوظ کیا۔ شامی اور تیموری کی بھی حاضری لگوائی جائے۔ کبیر عباسی کاشف زبیر کے انداز میں لکھ لیتے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ لکھیں۔ قاتل و مقتول کی اٹھان اچھی تھی۔ بعد میں ہمیشہ کی طرح مصنفہ کی کہانی پر گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ شکیل اور پولیس کی آنکھ مچولی نے مزہ کیا۔ صائمہ کو زبردستی مجرم کی پارٹنر بنادیا گیا۔ انجام پسند نہیں آیا۔''

اسلام آباد سے ایمان زارا شاہ کی کھلکھلاہٹیں ''نکتہ چینی میں اس مرتبہ راج کررہے تھے طلعت، بہت مبارک باد۔ بس یہ بتادیں کیا فیس لیں گے، مجھے آپ سے کلاس لینی ہے۔ عبدالجبار رومی انگاروں پر میرا صرف پاؤں نہیں دل بھی پڑ گیا تھا، تکلیف تو بنتی تھی۔ ماہ رخ اب کراچی والوں کو بھی بارش نصیب ہوگی میں چلہ کاٹ رہی ہوں ویسے ابھی بھی اسلام آباد کا موسم خوشگوار ہے۔ سجاول...... یہ بتایئے یہ بنا پڑھے کیسے تبصرہ کرتے ہیں اور کون مہان لوگ کرتے ہیں؟ شاہد ذوالفقار آپ کے تبصرے سے آپ کی حد درجہ معصومیت ٹپک رہی ہے...... پڑھتے ہوئے ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے خاص کر آوارہ گرد سے۔ جیسے آپ کی مہارت بڑھ رہی ہے میں سوچ رہی ہوں، لگے ہاتھوں میں بھی شروع کردوں...... ! کیونکہ میری اردو بھی نہایت پکی ہے...... اور داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹرز کون سا خود معلومات جمع کرتے ہیں، اپنے کارندوں سے کرواتے ہیں اور کارندوں کی کوئی کمی تو نہیں ہوتی انہیں۔ سیف مجھے آپ کے متعلق یقین سا ہونے لگا ہے کہ آپ کے دل کی جگہ بھی گردہ فٹ ہوا ہے...... خیال رکھیے گا گردے اتنے گھونسے نہیں برداشت کرسکتے جلدی ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ سیف سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد انگاروں کو چھونے کی مطلب پڑھنے کی کوشش کی۔ انگاروں نے سازکر سوا کردیا ہے۔ کچھ تو خدا کا خوف کرلو تاجور بی بی...... اور کتنا گراؤ گی شاہ زیب کو۔ تھوڑی سی گریس اس کی چھوڑ دو ظالم...... مغل صاحب یہ بالکل اچھا نہیں کیا...... میں تو کہوں گی اس کا ٹینٹوا شاہ زیب کے ہاتھوں ہی دبا دیجیے گا...... مطلب دراج کا...... ہاناوانی کا طوفان تو رک نہیں رہا۔ ویسے میں ایکسپیکٹ کررہی ہوں سجاول ہی شاید اسے ختم کردے لیکن کہانی پھر جامی کی طرف رخ موڑ رہی ہے...... اب قسطنیا بھی انٹری کردے تو مزہ آئے گا۔ ایچ اقبال کی کاغذی پیرہن پڑھ کر محسوس ہوا کہ ان کو جہاز، طیارے وغیرہ بہت پسند ہیں۔ یہ تیسری کہانی ہے جس میں طیارے کا استعمال کیا گیا۔ اس سے قطع نظر کہانی سیاست اور اس کے داؤ پیچ پر گھوم رہی تھی جو کچھ کچھ حقیقت سے قریب تر تھی...... اور انجام بھی ابھار رہا۔ کچھ کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں سفر کے بعد بھی ایسی ہی جذباتی کہانی تھی۔ ایک باپ کی بیٹے سے محبت اور جانے کے بعد کی فکر...... دل کو چھو گئی۔ بازی اور عید مبارک لائٹ موڈ کی کہانیاں تھیں۔ گہرائی میں معاشرتی رویوں پر طنز کرنے کی کوشش کی گئی۔ ناصر ملک قصوروار اتنی دل فگار تھی افففف! ایک ایک سین پڑھتے ہوئے درد کا احساس ہورہا تھا...... بھلا ایسے بھی باپ ہوتے ہیں دنیا میں! اور انجام بھی دکھی کرگیا اگر قانون اس قاتل ہوتا تو بیٹا ہی کیوں باپ کی موت کا ذمے دار بنتا! اچھی کہانی لیکن بہت تکلیف دہ۔ سجاول خان کو جاسوسی میں ایز آ لکھاری انٹری کا آغاز کرنے پر مبارکباد۔ قتل تو کافی پرفیکٹ کیا گیا آپ کی کہانی میں...... اگلا کاروائے چنگیز کے نرالے شوق نے جو اس کے پاس

تھا، وہ بھی چھین لیا اس لیے تھوڑے پر راضی رہنا چاہیے۔ روبینہ رشید اور اسما قادری دونوں کے نام ایک ساتھ ایک شمارے میں وہ بھی رنگوں میں دیکھ کر واؤ نکلا...... ! پہلے روبینہ رشید کی قاتل و مقتول پڑھنا شروع کی۔ کہانی بالکل ناک کی طرح سیدھی تھی اس بار سسپنس کی کمی تھی۔ البتہ شکیل کو شکی القلب دیکھ کر ہر پل دھڑکا لگا رہا اب آگے یہ کس قسم کا قتل کرے گا...... مجرم اتنا سفاک اور پرفیکٹ پلانر تھا بیچ میں اس کے مجرمانہ ذہن کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی...... لیکن پھر بھی مجرم تو مجرم ہوتا ہے اور یہی بات صائمہ پر لاگو ہوئی۔ لیکن اتنے اچھے جبران جیسے پولیس آفیسرز کہاں ملتے ہیں جو ایک بچے کی فوٹوگرافس پر کیس حل کرلیں اور مدد کرنے والے پر آنچ بھی نہ آئے۔ اسما قادری کی کہانی زبردست رہی۔ سعدیہ کی کامیاب جاسوسی۔ عروج کی انٹری' روشنی کے پے در پے فائرز حیرت انگیز...... کافی بہادر نکلیں اگرچہ انہیں کوئی انعام نہیں ملا...... ! لیکن دل کو سکون مل جائے اس سے بڑا تمغا بھی بھلا ہوسکتا ہے؟''

دبئی سے طلعت مسعود کی سرخوشی ''کچھ مصروفیات کی وجہ سے اس مرتبہ سوچا تھا کہ محفل سے غیر حاضری کرلیں لیکن جب ہمیں یہ پتا چلا کہ کئی لوگ ہمارے تبصرے کا بڑا انتظار کرتے ہیں تو ہم نے سوچا انہیں مایوس نہ کیا جائے۔ کیونکہ بزرگ یہی کہتے ہیں کہ کسی کو مایوسی سے بچانا اچھی بات ہے تو اس لیے ایک بار پھر ہم جاسوسی کی اسمبلی میں حاضر ہیں۔ (خوش آمدید) ٹائٹل پر موجود خاتون کی شخصیت میں صرف بلوری آنکھیں اور بیک گراؤنڈ کی پُراسراری سرگرمی ٹائٹل کو بہتر بنارہی تھی اس کے علاوہ مزید تفصیلات ہم نے دوسروں کی توجہ کے لیے چھوڑ کر آگے کا رخ کیا تو فہرست اس دفعہ سینئر رائٹرز سے بھی نظر آئی۔ محفل شوگر پوائنٹ میں پہلے نمبر پر اپنا خط پاکر بہت خوشی ہوئی۔ بہت شکریہ اس عزت افزائی کا۔ ساتھ ہی عبدالجبار رومی انصاری پورے ڈائجسٹ پر بھرپور اظہار خیال کررہے تھے تو اویس احمد خان صاحب کی باتیں کافی سوچ و بچار والی تھیں۔ ایمان زارا شاہ شاید خواتین کو چینی پسند نہیں آرہی اس لیے نمک کے برابر ہیں۔ اب آپ ہی کوئی تحریک لانچ کریں۔ ماہ رخ صاحبہ گرمی کے موسم میں سرد آہیں بھر کر ٹمپریچر ڈاؤن کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ شاہد ذوالفقار صاحب چھٹیاں انجوائے کرنے کے ساتھ ایک بار پھر انگلش ناولز کے خلاف کمپین چلاتے نظر آئے۔ جس سے ہم بالکل متفق نہیں اس لیے اس معاملے میں آپ ہمیں اپوزیشن لیڈر سمجھ لیں۔ سیف بھائی کا ٹنڈو والہ یار سے ٹنڈو آدم تک پچھلے تبصرے میں تاجور کا ذکر اتنی دفعہ ہوا کہ امید ہے اب وہ چھینکیں مار کر ہی بن باس لے لے گی۔ تبصرہ دلچسپ رہا۔ اس کے علاوہ سید ذیشان حیدر، محمد اقبال کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ حسب معمول انگارے سے اسٹارٹ لیا جہاں شاہ زیب نے تمام پچھلے عاشقوں کا ریکارڈ توڑتے ہوئے نئی بلندیاں سر کیں کہ رقیب کے ڈائپر تک تبدیل کرنے پہنچ گیا اور یوں ایم اے کے ساتھ ایم جی اے، ماسٹر آف گورنس کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔ مغل صاحب پلیز اب مزید ایسی خدمت شاہ زیب سے نہ کروایئے گا۔ قاتل و مقتول کا تانا بانا بہت اچھے سے بُنا گیا تھا۔ شروع میں تو سیدھی کہانی ہی لگی کہ مجرم سامنے ہی تھا لیکن آخر میں شریک مجرم کی بے نقابی سرپرائز رہی۔ حسد و انتقام کا شکار ذہنی بیمار جنہوں نے سفاکیت کی انتہا کردی۔ بس کہانی پڑھتے ہوئے یہ خواہش ہوئی کہ کاش ہمارا پولیس ڈیپارٹمنٹ اسی طرح سائنسی بنیادوں اور جان فشانی سے تحقیقات کرے تو نہ صرف جرائم کا خاتمہ کرنے میں مدد ملے بلکہ بے گناہ لوگوں کو بھی انصاف ملے۔ اسما قادری کافی عرصے بعد پرل گروپ کے ساتھ آئیں اور مقدس پیشے کی آڑ میں گھناؤنے مجرموں کو بے نقاب کیا۔ اس کے ساتھ کہانی کی خاص بات یہ بھی رہی کہ مصنفہ نے بہت عمدہ انداز میں ہمارے معاشرے میں پھیلی بہت سی برائیوں کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ ان کا حل بھی پیش کرتی نظر آئیں۔ دونوں رنگ اس بار زبردست رہے۔ بے کار مختصر رہی لیکن محمد سجاول خان کا انداز تحریر اچھا رہا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی کی برداشت کو آخری حد تک نہیں آزمانا چاہیے۔ ناصر ملک صاحب معاشرے کے ان قصورواروں کو لے کر آئے جو کئی زندگیوں کی بربادی کے ذمے دار ہوتے ہیں گھریلو تشدد جیسے مسئلے پر بہت عمدہ تحریر۔ طویل عرصے بعد ملک صاحب کی واپسی پر خوشی ہوئی۔ اب ان کی کسی طویل سلسلہ وار کہانی کا انتظار رہے گا۔ امید ہے جلد ہی مسافر کی طرح ایک اور زبردست سلسلہ جلد لے کر آئیں گے۔ ابتدائی صفحات سیاست کے پُرپیچ میدان سے کاغذی پیراہنوں کی کہانی پیش کررہے تھے۔ سازشوں، محبتوں، نفرتوں کے گرد گھومتی خاصی تیز رفتار رہی اور اچھی رہی۔ کافی عرصے بعد آوارہ گرد کی قسط پڑھی لیکن مزہ بالکل نہیں آیا۔ زمین سے ہزاروں فٹ اوپر فضا میں ایک سے دوسرے طیارے کے درمیان آدمیوں کی نقل و حرکت کسی سائنس فکشن فلم کا منظر پیش کررہا تھا۔''

راجن پور سے آمنہ رانا کی پہلی کوشش ''پچھلے کچھ ماہ کی طرح اس مرتبہ بھی جاسوسی 30 جون کو ہی مل گیا۔ اس بار میں نے سوچا کہ میں بھی ہمت کرہی لوں تبصرہ لکھنے کی۔ پڑھ تو پچھلے 10 سال سے رہی ہوں۔ جن دنوں بڑے بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے جب ہمایوں سعید راج، تفسیر عباس بابر، طاہرہ گلزار، ماہا ایمان، شوکت شہریار، مرتضیٰ احتشام اور بہت سے تبصرہ نگار محفل جماتے رہتے...... بالآخر چھری کانٹوں سمیت ہم بھی میدان میں اتر آئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ انگارے پڑھنی شروع کی مگر جیسے جیسے پڑھتی گئی ویسے ہی دماغ کی بتیاں گل ہوتی گئیں۔ مغل انکل نے یہ کیا کیا؟...... بیچارے ہیرو کو کس پر لگادیا۔ رستم سیال کو جوتے میں پانی پلایا تو ہم چپ رہے پر اب مزید نہیں مغل انکل! آدھا جوش تو انگارے پڑھ کر ہی اڑ گیا تھا۔ پھر سے تازہ دم ہوکر آوارہ گرد کی طرف بڑھے۔ بے چارے شہزی کو اب پھر سے نئے چکر میں پھنسادیا۔ کوہار تو ہاتھ دھو کر ہی پیچھے پڑ گیا ہے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال براجمان تھے اپنے کاغذی پیراہن کے ساتھ۔ اچھی کاوش تھی۔ روبینہ رشید کی قاتل و مقتول بس ٹھیک ہی تھی۔ کچھ خاص نہیں لگی پر اچھی کوشش تھی۔ دوسرے رنگ پر اسما قادری کا نام پڑھا تو سوچا اچھا ہی ہوگا اور پڑھ کر اچھا ہی لگا۔ تنویر ریاض کا کارنامہ بہت خوب تھا۔ محمد سجاول خان کی بیکار پڑھ کر حیرت کے جھٹکے لگے، ڈیڑھ صفحات میں ہی کریا کرم کردیا۔ پہلی کوشش تھی اچھی رہی۔ قصوروار پڑھی...... ناصر ملک بہت خوب۔ آپ نے معاشرے کے اہم پہلو پر روشنی ڈالی اور باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ اوئے...... سرورق پر تو کمنٹس کرنا بھول ہی گئی۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب میں تبصرہ لکھنے بیٹھی تو سرورق موجود ہی نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں تو پڑھنے والے دس بارہ ہیں مگر پھاڑنے والے بھی پانچ چھ موجود ہیں۔ خیر پہلی کوشش کی ہے امید ہے اچھی لگے گی۔''

PakiBooks.site

جامشورو سے خالد شیخ طاہری کی بددلی بیزاری ”جاسوسی دنیا کے بادشاہ جاسوسی ڈائجسٹ جیسے ہی حیدرآباد میں تشریف لائے فوراً استقبال کیا۔ سرورق پر جب نظر ڈالی ہمیشہ کی طرح حسینہ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ چوہدری صاحب چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ سجائے پستول ہاتھ میں تھامے نظر آئے اور جاسوس ٹائپ شخص کو سڑک پر چوکس کھڑا پایا۔ مکمل جاسوسی کی ترجمانی کرنے والا سرورق شاندار تھا۔ فہرست میں تقریباً سبھی نام جانے پہچانے تھے۔ ناصر ملک صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بس اعتزاز سلیم وصلی کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کمی کو سجاول خان نے اپنی پہلی انٹری دے کر پوری کر دیا۔ محفل میں طلعت مسعود صاحب کا بہترین تبصرہ تھا۔ روبی انصاری کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ سید ذیشان، ماہ رخ ارباب، زارا شاہ، شاہد ذوالفقار، سیف خان، اور عاصم شہزاد کا تبصرہ شاندار رہا۔ یہ محفل کبھی ہماری ہوا کرتی تھی جواب بس ڈائجسٹ کی ہو کر رہ گئی ہے۔ (تو آپ کی شوخیاں شرارتیں کہاں گئیں؟) وہ شوخیاں اور لطافتیں نا جانے کہاں گئیں جو محفل کی رونق ہوا کرتی تھیں۔ کہانیوں میں اس دفعہ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ انگارے اس قسط میں تو مغل صاحب نے کمال ہی کر دیا بلکہ دھمال کر دیا۔ جس قاری نے یہ قسط پڑھی سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ عاشقوں نے منہ بنا کر سخت احتجاج کیا۔ اور قیس صاحب تو صحرا میں کسی ٹیلے کے اوٹ میں اپنی کم مائیگی پر زاروقطار رونے لگے اور سوچنے لگے بس یہ ہی ایک کمی رہ گئی تھی۔ یہ مغل صاحب کے قلم کا کمال ہے قاری بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیو مغل صاحب۔ آوارہ گرد نہ جانے اس ناول میں ایسا کیا ہے جو میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا چل رہا ہے پھر بھی نہ جانے کیا سوچ کر ان صفحات سے آگے نکل جاتا ہوں۔ کاغذی پیرہن جاسوسی کے اہم ترین صفحات کی کہانی۔ کہانی میں دلچسپی تو تھی مگر خالی دلچسپی تو پہلے صفحات کا دکھ کم نہیں کر سکتی، امید ہے ایچ اقبال صاحب اگلی بار دھماکا خیز کہانی پڑھائیں گے۔ جاسوسی کے گولڈن صفحات مطلب جاسوسی کے رنگ اس دفعہ وہ تاثر نہ چھوڑ سکے۔ جو جاسوسی کے رنگوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ روبینہ رشید صاحبہ کی قاتل و مقتول اچھی خاصی چلتے چلتے فلمی سی ہو گئی۔ مگر کہانی نے اپنی دلچسپی کم نہیں ہونے دی۔ آخر تک پڑھنے پر مجبور کیا۔ خونی مسیحا ایک بڑے نام کے ساتھ جاسوسی کی زینت بنی، اسما قادری صاحبہ نے جرائم کی دنیا کے ایک ایسے جرم کا پردہ چاک کیا جس سے ہمارے گاؤں دیہات کے لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اللہ کی رضا مان کر صبر کر لیتے ہیں۔ صنفِ نازک کی جرأت، ہمت اور بہادری نے کمال کر دکھایا، اسما قادری کی جاسوسی کے رنگ کو رنگنے کی بہترین کاوش۔ قصوروار، ناصر ملک کو بہت عرصے بعد پڑھا۔ سگے اور سوتیلے رشتوں کے درمیان کشمکش۔ جب قریبی رشتے گھناؤنے ہو جائیں اور نفرت انتہا کو پہنچ جائے تو ردعمل بھی انتہائی درجے کا ہوتا ہے۔ ایسے ہی عمل اور ردِعمل کی داستان جو متوقع انجام پر اختتام ہوئی۔ منظر امام کی عید مبارک ہر تیسرے چوتھے گھر کی کہانی۔ بزرگوں اور بچوں کے درمیان تعلقات کی جنگ ایک دلچسپ انداز لیے ہوئے تھی۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ سجاول بھائی کی بیکار دلچسپ رہی۔ سجاول بھائی پہلی انٹری بہت بہت مبارک۔ بازی اور کلاکار مزاح کا رنگ لیے ہوئے تھیں مگر کوئی خاص مزہ نہیں دیا۔ جمال دستی صاحب کی سفر کے بعد اچھی کہانی۔ تنویر ریاض کارنامہ میں کوئی کارنامہ نہ دیکھا سکے بس پڑھ لی۔ قاتل اور اوٹ کو صرف اس لیے پڑھا کہ جاسوسی میں شائع ہوئیں۔ اور جو جاسوسی میں آ گیا اسے تو ہم ضرور پڑھتے ہیں۔“

کہوٹہ سے عاصم شہزاد کی خواہش ”اس بار جاسوسی تین جولائی کو ہاتھ لگا۔ سرورق دیکھا۔ سادہ مگر بہترین۔ نیلی آنکھیں کی گہرائی میں کوئی انجانا سا غم ڈوبا نظر آیا حسینہ واقعی حسین تھی۔ سرورق کے بعد چٹکی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ ایک بار پھر سے اپنا تبصرہ دیکھ کر دل مسرتوں سے سرشار ہو گیا۔ چند دوستوں کے تبصروں میں اپنا ذکرِ خیر دیکھ کر بہت بھلا محسوس ہوا، حوصلہ افزائی کے لیے ان دوستوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ سیاسی داؤ پیچ طاقت و اختیار کے حصول کی سرد گرم جنگ ہیرو ہیروئین کی محبت و رفاقت کہانی کا پلاٹ خوبصورت اور بامقصد نکات پر تھا۔ کہانی آگے بڑھی، مصنف نے سسپنس برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اسرار متوقع ترین رہا۔ اپنے فائدے کے لیے دوسروں کی راہ میں گڑھا کھودنے والے یہ نہیں جانتے کہ کل یہی گڑھا ان کے لیے اندھا کنواں ثابت ہوگا۔ یہی کچھ سوچتے ہم آگے بڑھے جہاں ایک باپ دنیا فانی سے گزر کر بھی اپنے لختِ جگر کو حوصلہ دیتا نظر آیا۔ مایوسی امید محبت اور حوصلے کی سڑک پہ چلتی تحریر میں نہ تو ایکشن تھا نہ منظر نگاری مگر جذبات سے لبریز ہر سطر دل کو چھو جاتی۔ سسپنس ضرور تھا جو آخر تک برقرار رہا۔ ان پیغامات کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کو ہونا غیر متوقع تھا۔ عید مبارک۔ نفرتوں کدورتوں اور عداوتوں کو سمیٹتی ہوئی منظر امام کی ایک بار پھر معاشرتی پہلو پر نہایت دلکش تحریر۔ زندگی خوشی دینے کا نام ہے مگر نہ جانے ہم کیوں بلاوجہ کی نفرتوں اور حسد میں مبتلا ہو کر اسے اجیرن بنا لیتے ہیں۔ اسی سوچ کے ساتھ ہم آگے بڑھے جہاں ایک سزا یافتہ پولیس والا اپنی کھوئی ہوئی اہمیت واپس پانے میں کامیاب رہا بلاشبہ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ بیکار مختصر مگر نہایت روانی سے لکھی گئی بہترین کہانی لگی۔ سجاول خان بہت بہت مبارک ہو۔ قاتل، نے شروع شروع میں اکتا دیا مگر جوں جوں آگے بڑھی دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ خانقاہ کے انتظامات کو نہایت ہی خوبصورتی سے تحریر میں لایا گیا۔ راوی کا قاتل ہونا بالکل ہی غیر متوقع رہا۔ کبھی کبھی خواہشیں شدت اختیار کر جاتی ہیں۔ ہم انہی خیالات میں گم آگے بڑھے۔ حالات کے بھنور میں پھنسے انسان سے ملاقات ہوئی۔ مصنف نے اس ملاقات کو پُرمزاح اور پُرلطف بنانے کا مکمل سامان کیا۔ آخر راوی کو نوکری ملی اور ہم نے بھی چین کی سانس لی۔ مگر مغل صاحب نے وہ سارا چین ہی چھین لیا۔ انگارے کی یہ قسط بھرپور سے بھی کچھ اوپر رہی۔ بے پروائی نقصان دیتی ہے اور باقر کی بے پروائی نے اس کی جان ہی لے لی۔ سجاول اور خورشنہ کی موت بھی قریب نظر آتی ہے۔ گردشِ حالات نے اب ایسٹرن کنگ کو اس نہج پر لا کھڑا کیا کہ وہ اپنے ہی دشمن کی نہایت ہی ناگوار خدمت گزاری پر مامور ہو گیا۔ اور یہ سب اس تاجور کی وجہ سے مان گئے مغل صاحب کیا محبت ہے۔ عاشقی کا حق ادا کر دیا شاہ زیب نے۔ قصوروار دل دہلا دینے والی کہانی ثابت ہوئی آہ انسانیت نے درندگی کو شرما دیا۔ خود غرضی انا اور ضد کے ہاتھوں رشتے پامال ہوئے۔ نم آنکھوں کے ساتھ کہانی مکمل کی اور کافی دیر یہ سوچتے رہے جنت کا دروازہ جہنم کدہ کیسے بن گیا۔ اوٹ

قتل قتل قتل قتل اور پھر قتل مصنف نے تو اس بار تھوک کے حساب سے بندے مروا دیے۔ بہرحال کہانی سسپنس سے بھرپور رہی قانون تفتیش کی باریکیوں اور جزئیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بٹلر نے بہترین سے بھی آگے کی منصوبہ بندی کی۔ اور پھر ڈیوڈ کی لالچ نے اسے ہمیشہ کے لیے بچالیا۔ آوارہ گرد بھرپور رہی۔ ابتدائی صفحات کے ایکشن سین پڑھ کر گردشِ خون بے اختیار بڑھ گیا۔ اس کے بعد شہزی کے ساتھ ہمیں بھی اندیشوں نے گھیرا کہ آگے کیا ہوگا۔ کوہارا کا طیارہ ہائی جیک کرنا بالکل ہی غیر یقینی رہا۔ ری فیولنگ کے وقت انجینئر کے بھیس میں کمانڈو کا اندر آنا امید کے مطابق تھا۔ اس کے بعد تو ڈاکٹر صاحب حالات کو عروج پر لے گئے۔ اور ہم کسی معجزے کی امید لیے آگے بڑھ گئے جہاں ایک خود ساختہ شاعر سے ملاقات ہوگئی۔ کلاکار بالکل نئی اور منفرد کہانی محسوس ہوئی عجیب صورتِ حال میں گھرے راوی کی داستان پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور موصوف پر ترس بھی آیا۔ احساس ہوا کہ کبھی کبھی شیخی بگھارنا کتنا مہنگا ہو سکتا ہے۔ اسی جذبے کے ساتھ کہ ہمیشہ سچ کہیں گے ہم۔ سرورق پر آئے۔ جہاں ایک شاطر قاتل سے ملاقات ہوئی۔ محبت کی دوہری تکون کے گرد گھومتی کہانی واقعی جاسوسی کہانی تھی۔ ایک چالباز کی سفاک چال نے دو محبت کرنے والوں کو جدا کیا تو دل میں شدتِ غم سے ملول ہو گیا۔ شکیل کا جھوٹ مضبوط ترین تھا مگر پھر بھی سچ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ جزئیات اور منظر نگاری واقعی اس کہانی کی اہم ترین ضرورت تھی جسے بہت خوب صورتی سے پورا کیا گیا۔ اسما قادری بہت عرصے بعد اپنی کہانی کے ذریعے ملکی مسائل کو اجاگر کرتی نظر آئیں۔ چند صنفِ نازک کو دوسری کی مدد کا جذبہ لیے آگے بڑھی تو محسوس ہوا کہ انسانیت ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ مگر چند بے ضمیروں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میاں تھوڑا انتظار اور ہم کس مرض کی دعا ہیں مگر وہ کیا خوب کہا ہے۔ شاعر نے... کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔“

ہری پور سے شاہد ذوالفقار کی معذرت ”ٹائٹل پر لگتا ہے کرینہ کپور کی ایک تصویر کو کاپی کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آرٹسٹ کو اس میں بُری طرح ناکامی ہوئی، بہرحال ٹائٹل گرل کے علاوہ ٹائٹل بہتر تھا۔ انگارے کی یہ قسط بس ٹھیک ہی رہی، مغل انکل لکھتے تو بہت اچھا ہیں مگر انگارے میں اتفاقات کی بھرمار بھی کبھار سخت بور کر دیتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شاہ زیب تاجور کے گھر جانے کے لیے نکلا اور اتفاق سے اسے وہاں رہنے کا موقع مل گیا۔ آوارہ گرد میں شہزی پوری قسط میں جہاز میں ہی آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس بار قسط مزید مختصر کر دی آپ نے۔ ایچ اقبال کی پہلی کہانی کاغذی پیرہن یوں تو کافی بہتر رہی لیکن مکالمے بہت بورنگ تھے اور ایک چوہیشن بھی ہضم نہیں ہو سکی، ڈرائیور نے پیٹرول کی دھار لڑکے پر پھینکی، پھر جیب سے ماچس نکال کے تیلی جلا کے پھینکی، پھر خود کو بچانے کے لیے پیچھے ہٹا، پھر دھار گارڈ پر پھینکی، پھر تیلی اور تیلی سے ماچس جلا کر پھینکی مگر اس سارے عمل کے دوران گارڈ رائفل اس کی طرف موڑے دیکھتا ہی رہا۔ اس سین کو جتنا اچھا لکھا جا سکتا تھا اتنا ہی برے انداز میں لکھا گیا۔ اسما قادری نے خونی مسیحا لکھی اور بس ٹھیک ہی لکھی۔ لڑکیاں تھیں کہ ابتدائیاں پوری کہانی میں بس لیکچر ہی دے دے کے بور کرتی رہیں۔ دو تین صفحوں بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ آگے کیا ہوگا۔ روبینہ رشید کی قاتل و مقتول شمارے کی واحد تحریر رہی جو واقعی پسند آئی۔ بہت اچھا لکھتی ہیں وہ۔ مختصر تحریروں میں ناصر ملک نے قصوروار میں خوب رلایا۔ منظر امام کی عید مبارک روایتی سی تحریر تھی بہرحال ہلکے پھلکے جملوں کی وجہ سے بوریت نہیں ہوئی۔ سجاول بھائی کی بیکار بس ٹھیک ہی رہی۔ نیازی بھائی کی دو پوسٹوں کی وجہ سے چار مزید تحریریں پڑھ لیں۔ ایک تو انہوں نے کہا کہ شاکر لطیف کی تحریر ہمیشہ سنسنی سے بھرپور ہوتی ہے۔ شاکر لطیف کی کہانی میں ایک ہی بات کی بار بار تکرار نے سخت بور کیا۔ یہ کہانی بہتر ہوتی اگر 20 کے بجائے 5 صفحوں کی ہوتی باقی پندرہ صفحوں میں تو ایک ہی چیز بار بار دہرائی جاتی رہی۔ البتہ اینڈ اس کہانی کا اچھا تھا۔ تحسین رضا، جمال دستی اور عکس فاطمہ نے اچھا ہی لکھا۔ تبصروں میں اس بار چند مزید لوگ میری تجویز سے اتفاق کرتے پائے گئے کہ ابتدائی صفحات پر انگلش تحریر نہیں ہونی چاہیے۔ ان سب دوستوں کا شکریہ۔ باقی وقت کی کمی کے باعث میں سب کے تبصروں پر الگ الگ تبصرہ نہیں کر سکتا۔“

عطیہ داؤد کی ضلع اوکاڑہ سے دھمکی ”میں جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کی بہت بڑی فین ہوں ان کا مطالعہ میں پانچویں جماعت سے کر رہی ہوں۔ اب ماسٹرز کے امتحانات سے فارغ ہوئی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی ہوں۔ جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کی لت مجھے اپنی بڑی بہن سے لگی۔ ان کو ہمارے بڑے پھوپا اور ان کی بڑی بہن کے بچوں سے لگی۔ جوان سب سے ہوتے ہوئے مجھ تک پہنچی اور میں اس پر آج تک قائم ہوں۔ میرے فیورٹ رائٹر دی گریٹ کاشف زبیر ہیں لیکن انہوں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ شاید ان کو آرام کرنے کی بہت جلدی تھی۔ ان کے بغیر جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کا تصور کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا ان کے لیے مرحوم کا لفظ استعمال کرنا پڑے گا میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ لیکن کیا کریں اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ خط لکھنے کا میرا صرف اور صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ میں جاسوسی، اور سسپنس میں انگلش کہانیاں چاہتی ہوں۔ مجھے انگلش کلچر اور ماحول بے حد پسند ہے۔ جاسوسی اور سسپنس کے قیمتی اوراق پاکستانی مقامی اور دیسی کہانیوں میں ضائع مت کریں۔ اسے میری گزارش، التجا، درخواست یا دھمکی کچھ بھی سمجھ لیں۔ لیکن صرف انگلش کہانیاں جاسوسی اور سسپنس کی زینت بننی چاہئیں کیونکہ ان میں تھرل، سسپنس، ایکشن کے علاوہ معلومات بھی ہیں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی کی طلب گار ہوں۔ میں کبھی خط نہ لکھتی لیکن اس دفعہ جاسوسی اور سسپنس میں مقامی کہانیوں کی بھرمار ہے جو مجھے ہرگز پسند نہیں۔ اگر اس دفعہ خط شائع ہو گیا تو اگلی دفعہ بھی حاضر ہونے کی کوشش کروں گی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

ظہیر احمد، کراچی۔ شہباز اقبال حیدرآباد۔ ثاقب علی، میرپور خاص۔ شاہانہ فرید، سجاول۔ جاوید ملک، پشاور۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ فرحان شیخ، کراچی۔ امتیاز احمد، پھالیہ۔ طاہر مجاہد، میانوال رانجھا

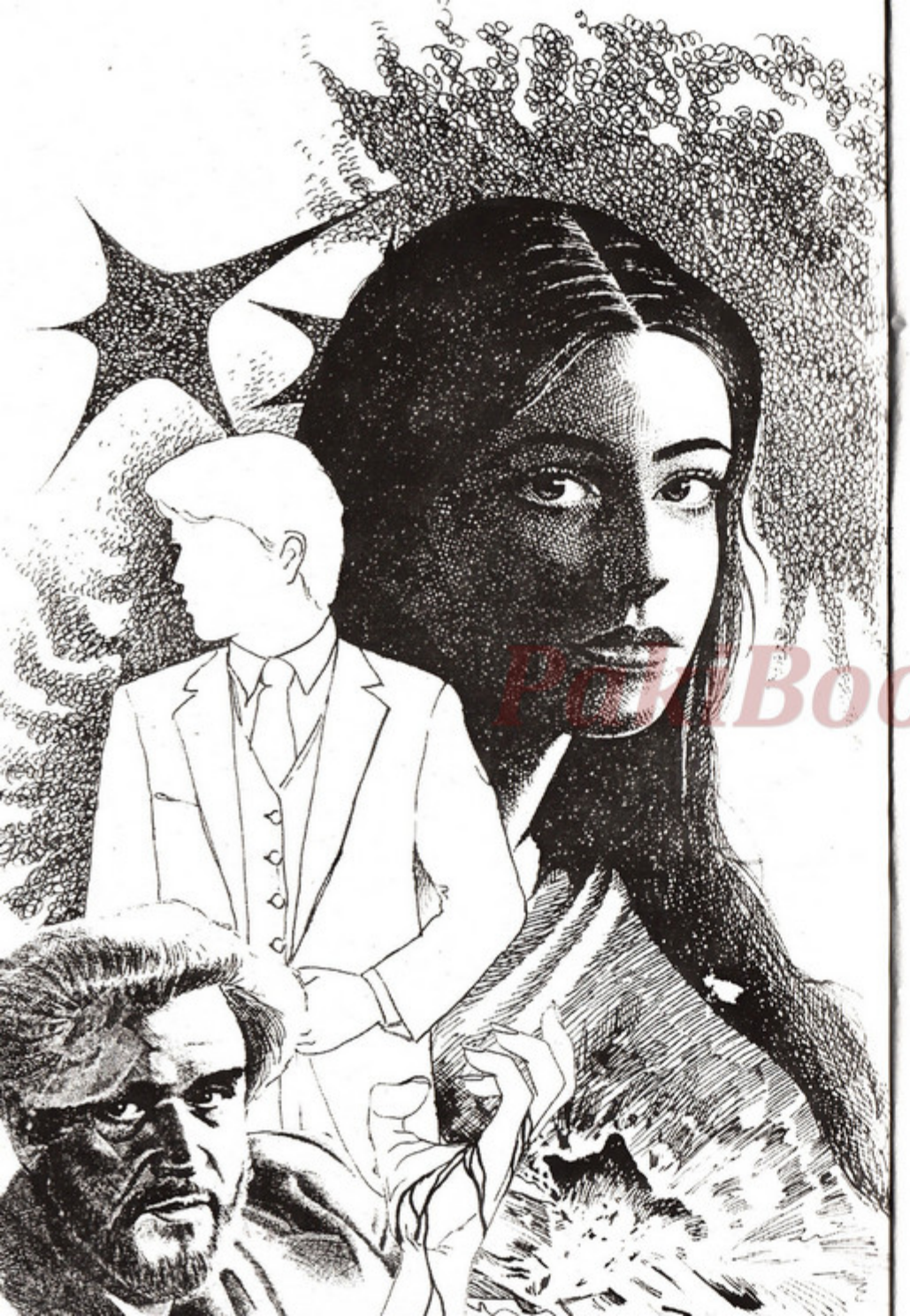

کمانڈو

ہمایوں بلگرامی

"حکمران اس کو بناؤ جو سب میں عاقل ہو" سرِ مجلس کسی بزرگ نے صلاح دی... اک اور مردِ خدا نے کہی ہوش کی بات کہ "جرّی جو سب سے زیادہ ہو... ہے وہی حکمران..." مسندِ شاہی نہیں آساں... حکومتِ اقلیم ہے مشکل... جی ہاں... بالکل درست ہے... ہزارہا مصیبتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔ صعوبتیں اٹھانا پڑتی ہیں... کتنے ہی سپاہی لڑتے ہوئے خاک و خوں ہو جاتے ہیں۔ چند ایسے بہادر بھی ہوتے ہیں جو بغاوت اور سچ کا ساتھ دینے کی جرأت رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ملک، شہر اور آس پاس کے ماحول کو کسی بھی جرم سے دور دیکھنا پسند کرتے ہیں... ایک ایسے ہی شہر کی کہانی... جس کے قرب و جوار میں چند شر پسندوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ طاقت و دولت نے انہیں اختیار دیے تھا کہ وہ قانون شکنی کریں... جسے چاہیں اٹھالیں... استعمال کریں اور آگے بڑھ جائیں۔ ان کے جرم کی فصیلیں بڑھتی جارہی تھیں... لیکن قانونِ قدرت ہے کہ ظالم کی دراز رسی کو کھینچنے والا بھی قریب ہوتا ہے... ان کا بھی کڑا وقت شروع ہو چکا تھا...

حق..... صداقت..... انصاف اور بدلے کی آگ.....

ایک کمانڈو کی فیصلہ کن جنگ کا سنسنی خیز احوال.....

کم آبادی اور چھوٹا سا شہر ہونے کے باوجود وہ ایک ترقی یافتہ شہر معلوم ہوتا تھا جس کا سب لوگ اس شہر کے میئر شیرازی کو سمجھتے تھے جو حکومت سے ملنے والے فنڈز کے علاوہ ذاتی اخراجات کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنے مرحوم باپ سے ورثے میں خاصی دولت ملی تھی۔ اس کی پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی تھی اس لیے وہ اپنی جائے پیدائش کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت بنانا چاہتا تھا لیکن کسی "اچھی ڈش میں کنکر" اس کی بیوی کا بھائی ہمدانی تھا جو شہر کے لوگوں کے لیے اکثر پریشانی کا سبب بن جاتا تھا۔ اس سے لوگ اس لیے بھی ڈرتے تھے کہ اس کا یارانہ وہاں کے ایک گینگسٹر اردشیر سے تھا۔

اردشیر نسلاً ایرانی تھا لیکن اس کے اجداد اسی شہر میں آبسے تھے۔ لوگ اس سے اتنا ڈرتے تھے کہ میئر شیرازی تک اس کے خلاف کوئی شکایت پہنچانے سے بھی گریز کرتے تھے۔

میئر شیرازی میں ایک خامی یہ تھی کہ وہ عوام سے رابطے میں نہیں رہتا تھا اور شراب کے نشے میں غرق سارا وقت اپنی خوب صورت بیوی کے ساتھ گزارتا تھا۔ شہر کی تمام ذمے داری اس نے نائب میئر ہمدانی کو سونپ

PakBooks.Site

رکھی تھی جو اس کی بیوی کا بھائی تھا۔

جوا اور خوب صورت لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں اور اس کے یہ دونوں شوق اردشیر ہی پورے کرتا تھا لیکن اس احسان کے باوجود اس نے اردشیر پر یہ پابندی بہرحال لگائی تھی کہ وہ اس شہر میں زیادہ پر پُرزے نکالنے سے حتی الامکان گریز کرے اور اپنی مرکزِ نگاہ آس پاس کے دوسرے شہروں کو بنائے۔ اس شہر میں بس اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے تھوڑے بہت پر پُرزے نکالے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ بہت زیادہ پر پُرزے نکالتا تو احتمال تھا کہ بات کسی نہ کسی طرح میئر شیرازی کے کانوں تک پہنچ ہی جاتی اور ہمدانی معتوب ٹھہرتا۔

داراب ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیوی اور نوجوان بیٹی کے ساتھ اس شہر میں اس لیے آبسا تھا کہ اس کی پچاس سالہ بڑی بہن اسی شہر میں رہتی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ اس آخری عمر میں چھوٹا بھائی ان کے قریب رہے۔ وہ اپنی بیٹی، داماد طارق اور دو نواسوں کے ساتھ جہاں رہتی تھیں، اس سے کچھ ہی فاصلے پر داراب کو مکان مل گیا تھا۔

طارق پہلی بار داراب سے ملا تھا اور اس کی شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا بھی کہ اس کے ماموں ریٹائرمنٹ کی عمر سے گزرنے کے باوجود نہایت صحت مند ہیں اور ان کی بیوی بھی زیادہ عمر کی نہیں معلوم ہوتیں۔

''ممی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ اُن کی دوسری شادی ہے۔ زویا آٹھ سال کی تھی جب اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ آنٹی اس کی سوتیلی والدہ ہیں مگر انہوں نے زویا کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی سوتیلی بیٹی ہے۔ زویا بھی انہیں سگی ماں کی طرح چاہتی ہے۔''

''آنٹی نسرین بھی اگر ماں بن جاتیں تو شاید زویا سے زیادہ محبت نہ کرتیں۔''

''ہوسکتا ہے۔''

''زویا بہت اٹھڑ ہے۔''

''آنٹی کی بات کرتے کرتے زویا کا خیال کیوں آگیا تمہیں؟'' بیوی نے اسے ذرا تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''کیا فضول بات کر بیٹھی ہو۔'' طارق نے کچھ بگڑ کر کہا۔

''ایسے ہی مذاق کر بیٹھی تھی میں۔'' بیوی نے ہنس کر کہا۔

''ایسا فضول مذاق آئندہ مت کرنا۔'' طارق نے یہ دستور بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

دوپہر کو طارق کھانا کھانے گھر آیا کرتا تھا اور پھر واپس اپنے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر چلا جاتا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں اسٹور بند نہیں ہوتا تھا۔ پانچ، چھ ملازم تھے اسٹور میں جن میں سے ایک پر اسے مکمل اعتماد تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ساس دھوپ سینک رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی زویا بھی بیٹھی تھی اور کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ کالج کی کتابیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔

داراب جن دنوں اس شہر میں آیا تھا، کالج کے داخلے جاری تھے۔ زویا کو آسانی سے فرسٹ ایئر میں داخلہ مل گیا تھا۔ یہاں وہ میٹرک کر کے ہی آئی تھی۔ طارق کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

''اچھا ہوا تم اس وقت گھر پر ہو۔'' ساس بولیں پھر زویا سے کہا۔ ''تم طارق کو بتا دو ساری بات۔ اپنے باپ سے تم نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تو بہت اچھا کیا۔ داراب بہت ٹھنڈے مزاج کا ہے لیکن جب کسی وجہ سے لڑنے بھڑنے کی نوبت آجائے تو جان پر کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔''

''کیا ہوگیا زویا؟'' طارق نے پوچھا۔

''ہاں زویا، طارق کو بتا دو۔'' ساس بولیں۔

''طارق بھائی!'' زویا نے پریشانی سے کہا۔ ''کل سے تین چار لڑکے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لوفر قسم کے ہیں۔ کل تو وہ کالج سے میرے پیچھے لگے تھے۔ سیٹیاں بجا رہے تھے میری طرف دیکھ کر۔ میں گھبرا کے قریب کھڑی ہوئی ایک بس میں بیٹھ گئی۔ بعد میں مجھے بس بدلنی بھی پڑی کیونکہ وہ ہمارے گھر کی طرف نہیں آتی تھی۔ پھر آج انہوں نے گھر سے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا۔''

''کار میں تھے؟'' طارق نے پوچھا۔

''جی نہیں، موٹر سائیکلیں ہیں تین۔ چوتھا ایک موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا تھا۔''

''کالج سے واپسی پر بھی تمہارے پیچھے لگے تھے؟''

''جی ہاں۔ مجھے اُن سے ڈر لگنے لگا ہے طارق بھائی! آج تو میں نے بس کے بجائے آٹو رکشا کر لی تھی۔''

''ان لڑکوں کی عمر؟''

''چاروں ہم عمر ہی لگتے ہیں۔ صحت مند جسم کے ہیں۔ ایک کا قد کاٹھ تو آپ ہی کی طرح ہے۔ لمبا تڑنگا۔''

''ہوں۔'' طارق کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''جب تم کالج گئی تھیں تو پرنسپل کو ان کے بارے میں بتایا تھا؟ شکایت کی تھی؟''

''شکایت تو کی تھی لیکن وہ تو جیسے ڈر گئی تھیں۔ کہنے لگیں اپنے گھر والوں کو بتاؤ۔ انہی کو کوئی مناسب بندوبست کرنا چاہیے۔ شاید وہ پولیس میں رپورٹ کریں یا کوئی اور قدم اٹھائیں۔''

''ڈر گئی تھیں۔'' طارق زیرِلب بڑبڑایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ سمجھ گئی تھیں۔''

''کیا سمجھ گئی تھیں طارق بھائی؟''

''اس شہر میں اتنی عمر کے چار لڑکوں کا صرف ایک ہی گروپ ہے جو اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام تو نہ جانے کیا ہے، اس کی شہرت شیراں کے نام سے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اردشیر کا بھائی ہے۔''

''یہ اردشیر کون ہے؟'' طارق کی ساس بول پڑیں۔

''ہے ایک آدمی۔'' طارق نے جواب دیا پھر زویا سے بولا۔ ''پولیس میں رپورٹ کرنا تو فضول ہوگا۔ تم کالج کس وقت جاتی ہو؟''

زویا نے وقت بتایا۔

طارق بولا۔ ''میں آدھے گھنٹے بعد اسٹور جاتا ہوں۔ کل سے ذرا جلدی نکل جایا کروں گا گھر سے۔ یہاں سے تمہارا گھر بمشکل دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ میں آجایا کروں گا تمہارے گھر۔ کار میں میرے ساتھ کالج جانا۔ دوپہر کو میں کھانا کھانے آتا ہوں۔ ذرا دیر سے نکلا کروں گا اسٹور سے بھی۔ تمہارے کالج کا وقت ختم ہونے پر پہنچ جایا کروں گا۔ تمہیں واپس گھر بھی پہنچا دیا کروں گا۔''

''یہ مصیبت آپ کب تک جھیلتیں گے؟''

''سوچوں گا کہ دوسری صورت کیا ہوسکتی ہے۔ ابھی تو تم چلو ورنہ مجھے اسٹور پہنچنے میں زیادہ دیر ہو جائے گی۔''

''چلیے۔''

اس وقت طارق کی بیوی ریحانہ بھی برآمدے میں نکل آئی تھی۔ اس نے ان باتوں کے آخری دو ایک جملے سن لیے تھے۔ وہ بولی۔ ''زویا کو کہاں لے جا رہے ہو؟ اور تم زویا! تم اس وقت یہاں کیسے؟''

''مجھے دیر ہو رہی ہے، ممی سے پوچھ لینا۔'' طارق نے ساس کی طرف اشارہ کیا۔ ''چلو زویا!''

زویا پہلے ہی کھڑی ہو چکی تھی۔ طارق اُسے لے کر گھر سے باہر نکلا۔ اس کی خوب صورت کار سامنے ہی کھڑی تھی۔

طارق نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ زویا اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ طارق نے پوچھا۔

''وہ لڑکے دکھائی دیے؟''

''رکشا کے تعاقب میں تو آئے تھے۔ کہیں قریب ہی ہوں گے۔ آپ کو دیکھ کر چھپ گئے ہوں گے۔''

طارق کچھ سوچتا ہوا کار چلاتا رہا۔

''موٹر سائیکلیں میرے تعاقب میں تو لگی ہوئی تھیں ہی۔'' زویا بولی۔ ''میں نے رکشا میں ان کی تصویر اس طرح کھینچ لی تھی کہ انہیں پتا نہ چلے۔''

''مجھے دکھاؤ۔'' طارق نے جلدی سے کہا۔

زویا نے اپنے موبائل میں محفوظ تصویر دکھائی۔

''ٹھیک ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جلدی میں کھینچی گئی یہ تصویر صاف تو نہیں ہے لیکن شیراں پہچانا جا رہا ہے۔ باقی لڑکے اس کے چاپلوس ہوں گے کیونکہ شیراں اردشیر کا بیٹا ہے۔''

''یہ اردشیر کون ہے طارق بھائی؟''

اردشیر کے بارے میں طارق جو کچھ جانتا تھا، وہ اس نے بتا دیا۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اردشیر امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک کمپنی کا مالک تھا لیکن بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ وہ اس کمپنی کی آڑ میں اسمگلنگ کرتا ہے۔

''تو اسے گرفتار کیوں نہیں کیا جاتا؟ کیا ثبوت نہیں ملتا؟''

''نہیں، بات کچھ اور ہے۔ تم ان سب باتوں میں اپنا دماغ مت اُلجھاؤ۔ دھیرے دھیرے شاید معلوم ہو ہی جائے گا۔''

زویا، طارق کا بہت ادب کرتی تھی اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

کار جب زویا کے گھر کے قریب جا کر رکی تو داراب نے بھی دیکھ لیا۔ وہ باغ بانی کر رہا تھا جو اس کا شوق تھا۔ گھر کے گرد چار دیواری نہیں تھی، کرانا کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ داخلی دروازہ بھی چوبی تھا۔

داراب نے کار دیکھ لی تھی۔ وہ تیزی سے قریب آیا جب زویا کار سے اتر رہی تھی۔

طارق نے داراب کو دیکھ کر دھیمی آواز میں زویا سے کہا۔ ''انکل کو نہ بتانا۔'' پھر ہنس کر بولا۔ ''مارنے دوڑ پڑیں گے ان لڑکوں کو اور بات خراب ہو جائے گی۔''

''تم طارق کے ساتھ کیسے زویا؟'' داراب قریب آکر بولا۔

PakiBooks.Site

زویا کے بجائے طارق نے جواب دیا۔ ''میں زویا کے کالج کے قریب سے گزر رہا تھا انکل! زویا بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں لے آیا۔ یہ بات مجھے آج اچھی نہیں لگی کہ گھر میں کار ہے اور زویا بسوں میں دھکے کھائے۔''

''میرے پاس کار نہیں ہے بیٹا! کار لے کر میں کروں گا بھی کیا۔ ہر وقت تو اپنے شوق میں لگا رہتا ہوں۔ بس ایک آدھ دوست ہے اس شہر میں۔ اس کے اصرار پر جاتا ہوں تو لیو کیب لے لیتا ہوں۔''

''ہمارا گھر کیا آپ کا گھر نہیں ہے انکل؟''

''وہ تو ہے لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں سنوں گا میں۔ کل سے میں ہی زویا کو کالج لے کر جایا کروں گا اور لے آیا کروں گا۔ اسٹور کی ٹائمنگ میں تھوڑی سی تبدیلی میں کوئی مسئلہ نہیں۔''

''اچھا۔'' کچھ رک کر داراب نے کہا۔ ''تم اتنی اپنائیت سے کہہ رہے ہو تو چلو ٹھیک ہے، آؤ چاہے تو پی لو۔''

''پھر کسی وقت انکل، آج تو ویسے ہی کچھ جلدی ہے پھر کسی وقت آؤں گا۔''

''اگر جلدی ہے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔''

''جی۔'' طارق نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ ''آنٹی سے میرا سلام کہیے گا۔'' اور پھر اس نے کار آگے بڑھا دی۔

چار دن گزر گئے۔ طارق زویا کو کالج لے جاتا اور لاتا رہا۔ اس نے سوچا تھا، اس میں حرج ہی کیا ہے جو اس مسئلے کا کوئی دوسرا حل سوچا جائے۔ دوسرا حل کچھ دشوار بھی تھا۔ اسے کسی طرح میسز شیرازی تک پہنچنے کی کوشش کرنی پڑتی۔ اس میں ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ شیراں اپنے باپ کو کچھ اور ہی کہانی سنا تا جس سے باقاعدہ دشمنی کو راہ مل جاتی۔

پانچویں دن طارق اس وقت چونکا جب اس نے شیراں کو اپنے اسٹور میں داخل ہوتے دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک ٹرانسمیٹر بھی تھا۔ وہ کسی ملازم کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے سیدھا اس کاؤنٹر پر آیا جہاں طارق بیٹھا ہوا تھا۔

''ذرا یہ دیکھیں۔'' اس نے ٹرانسمیٹر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بالکل ایسا ہی ایک ٹرانسمیٹر چاہیے۔ اتنا بڑا اسٹور ہے آپ کا۔ مجھے یقین ہے، آپ کے پاس ہوگا۔'' اس نے ٹرانسمیٹر کے دو ایک بٹن دبائے۔ ''ان میں کچھ خرابی ہو گئی ہے اور میں خرابی ٹھیک کروانے کے بجائے نئی چیز ہی خریدتا ہوں۔''

''یہ تو بہت اعلیٰ اور حساس ٹرانسمیٹر ہے۔'' طارق نے ٹرانسمیٹر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ نے کہیں باہر سے منگوایا ہوگا۔ یہاں تو یہ آپ کو شاید سارے ملک میں نہیں ملے گا۔''

''اور اگر کہیں مل گیا؟''

''تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی۔'' طارق نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اگر مل گیا تو آپ کو دکھانے لاؤں گا، آپ کا نام.....؟''

''طارق۔''

''شکریہ۔'' شیراں نے کہا۔ ''نام میں نے اس لیے پوچھا کہ اگر آپ اس وقت نہ ہوں تو آپ کے بارے میں کسی ملازم سے پوچھ لوں۔''

''ضرور۔''

شیراں سیٹی بجاتا ہوا مڑا اور اطمینان سے چلتا ہوا اسٹور سے نکل گیا۔

طارق کو ذرا دیر اُلجھن سی رہی، دماغ میں یہ خیال سرسرا تا رہا کہ شیراں کے آنے کا کوئی اور مقصد تو نہیں تھا؟ وہ زویا کو اس کے ساتھ کالج آتے جاتے دیکھ تو چکا تھا۔ کباب میں ہڈی تو محسوس کر لی تھی اس نے۔

طارق کو ایک فلم بھی یاد آئی۔ اس میں ایک شخص کسی کو قتل کروانے کے لیے کسی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کرتا ہے اور پھر اس شخص سے کسی بہانے ملاقات کرتا ہے جبکہ کچھ دور کھڑا ہوا قاتل اس کا چہرہ ذہن نشین کر لیتا ہے۔

طارق کو یہ خیال آیا ضرور لیکن پھر اسے خود پر ہنسی بھی آئی۔ اسے جس فلم کا خیال آیا تھا، وہ بہت پرانی تھی۔ اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ خفیہ طور پر کسی کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی تھی اور قاتل کو دکھائی جا سکتی تھی۔

ویسے بھی اس شہر میں قتل جیسی وارداتیں بہت کم ہوتی تھیں، ڈاکے بھی نہیں پڑتے تھے۔ صورتِ حال اتنی خراب ہوتی تو میسز شیرازی کو اس کا علم ہو ہی جاتا۔ وہ پولیس چیف کو آڑے ہاتھوں لے لیتا۔ امن و امان قائم رکھنے کے معاملے میں وہ بہت سخت تھا۔ پولیس چیف کے علاوہ ہمدانی کی بھی شامت آجاتی۔ شیرازی اس کی بھی پروا نہیں کرتا کہ ہمدانی اس کی بیوی کا بھائی تھا۔

لیکن احتیاط میں بھی کوئی حرج نہیں، طارق کے ذہن میں آیا اور دوسرے دن سے اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ریوالور ساتھ رکھنا شروع کر دیا جو لائسنس یافتہ تھا۔

اُس روز جب گھر سے روانگی کے وقت اس نے

الماری سے ریوالور نکالا تو اس کی بیوی ریحانہ چونک گئی تھی۔

''یہ کیوں لے جا رہے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''حفظِ ماتقدم کے طور پر۔''

''برسوں بعد یہ خیال کیوں آ گیا؟'' ریحانہ بولی۔ ''زویا کا مسئلہ تو ممی نے مجھے بتایا تھا۔ میں نے اس بارے میں بس ایک بار سرسری سی بات کی تھی لیکن آج.....'' اس کی نظریں ریوالور پر جم گئیں۔ ''کیا زویا ہی کی وجہ سے بات کچھ بڑھتی نظر آ رہی ہے؟''

''دراصل کل شیراں آیا تھا اسٹور میں۔'' طارق نے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اس نے اپنے اُس وقت کے خیالات کا اظہار بھی کر دیا، پھر کہا۔ ''لیکن میرے خیالات بہکا نا تھے، پھر بھی میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھ رہا ہوں کہ ریوالور ساتھ رکھا جائے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔''

ریحانہ کے چہرے سے پریشانی ختم نہیں ہوئی۔ ''اچھی خاصی مصیبت مول لے لی ہے تم نے۔''

''مصیبت؟'' طارق چونکا۔ ''کیا تم زویا کو مصیبت کہہ رہی ہو؟''

ریحانہ خاموش رہی۔

''حد کر دی تم نے۔'' طارق نے خفگی سے کہا۔ ''زویا تمہاری ماموں زاد بہن ہے اور میں اس گھر کا صرف داماد ہوں لیکن میں نے ممی کو اپنی ساس نہیں، ہمیشہ اپنی ماں سمجھا ہے۔''

''لیکن زویا تمہاری سالی ہے، اور وہ بھی سگی سالی نہیں۔'' ریحانہ نے دبے دبے سے لہجے میں کہا۔

اب طارق کو غصہ آ گیا، تاہم اس نے ضبط کرتے ہوئے صرف ایک لفظ کہا۔ ''افسوس!''

اور پھر وہ گھر سے روانہ ہو گیا۔ جب وہ زویا کو لینے اس کے گھر پہنچا تھا تو زویا بالکل تیار ہوتی تھی۔ کار کی آواز سنتے ہی باہر آ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ داراب بھی ہوتا تھا۔ زویا کے کار میں بیٹھنے تک وہ طارق سے دو ایک رسمی باتیں کر لیتا تھا۔

اُس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ داراب نے باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔ ''کیا بات ہے طارق! آج تمہارا موڈ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ صبح صبح ریحانہ سے کچھ کھٹ پٹ تو نہیں ہو گئی؟''

''ارے نہیں انکل۔'' طارق زبردستی ہنسا۔

لیکن حقیقت یہی تھی۔ زویا کو کالج لے جاتے ہوئے بھی ریحانہ کا ایک جملہ اس کے دماغ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ ''لیکن زویا تمہاری سالی ہے، وہ بھی سگی نہیں۔''

ریحانہ پینتیس سال کی ہو چکی ہے۔ وہ چالیس کا تھا۔

شادی کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد عورت کو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر پہلے جیسی نہیں رہی اس لیے کم عمر لڑکیوں کو شوہر کے ساتھ دیکھ کر وہ عورتیں احساسِ کمتری کا شکار ہو کر شکوک و شبہات میں پڑنے لگتی ہیں۔ کچھ ایسا معاملہ غالباً ریحانہ کے ساتھ بھی تھا۔

طارق نے پہلی بار کن انکھیوں سے زویا کی طرف دیکھا۔ اس نے ابھی سولہویں سال میں قدم رکھا ہی تھا لیکن وہ اٹھارہ سال کی بھرپور لڑکی نظر آنے لگی تھی جس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ داراب جیسے مضبوط اور تنومند شخص کی بیٹی تھی۔ خوب صورت اور تیکھے نقش و نگار اپنی ماں سے ملے تھے۔

طارق نے اسے کن انکھیوں سے دیکھنے کے بعد نظریں ہٹا لیں اور خود کو نفرین کرنے لگا۔ یہ درست تھا کہ شادی کے اتنے عرصے کے بعد ریحانہ سے قربت اس کے لیے اتنی باعثِ تسکین نہیں ہو سکتی تھی جتنی کسی کم عمر لڑکی کی قربت سے ہو سکتی تھی لیکن اس نے خود کو ایسی گھٹیا سوچ سے ہمیشہ دور رکھا تھا۔

اس وقت کہیں پڑھا ہوا یہ جملہ بھی اُس کے ذہن میں آیا۔ ''بعض اوقات پرہیزگار اور متقی لوگوں کے قدم بھی بہک جاتے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں ایسا نہیں ہوں۔''

''جی طارق بھائی؟'' برابر میں بیٹھی ہوئی زویا بول پڑی۔

طارق کو اس دوران میں خیال ہی نہیں رہا تھا کہ زویا اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں زویا!'' وہ ہنسا۔ ''بعض اوقات کاروبار کی کچھ مشکلات کا خیال زیادہ آ جاتا ہے تو میں بے خیالی میں بڑبڑانے لگتا ہوں۔''

''میری وجہ سے کوئی حرج تو نہیں ہو رہا ہے کاروبار میں؟'' زویا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ارے نہیں۔'' طارق پھر ہنسا۔ ''کچھ اور معاملات ہیں، اور اگر وہ حرج تمہاری وجہ سے ہوتا تو میں وہ بھی برداشت کر لیتا۔''

جواب دے کر طارق کا جسم سنسنا گیا۔ ''کیوں؟''

PakBooks.site

اس نے خود سے سوال کیا۔ ''زویا کی وجہ سے وہ کیوں برداشت کرلیتا؟''

یہ عام سا جملہ تھا لیکن اس وقت طارق کی سوچ ایک خاص راہ پر چل پڑی تھی، اس لیے اس نے سوچا کہ یہ جملہ مناسب نہیں تھا۔

زویا پھر کچھ نہیں بولی۔

اُسے کالج چھوڑ کر طارق اسٹور پر پہنچا اور ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے ریحانہ پر بھی غصہ آیا جس کے ایک ہی جملے نے اسے ذہنی انتشار میں مبتلا کردیا تھا۔

وہ رات کے کھانے سے پہلے دو پیگ پینے کا عادی تھا لیکن اس وقت اس نے ذہنی انتشار ختم کرنے کے لیے کچھ پی لینا ضروری سمجھا۔ کبھی کسی کاروباری اُلجھن کی وجہ سے بھی وہ ایک آدھ پیگ لے لیتا تھا اس لیے شراب اس کے اسٹور کے اس کیبن میں بھی ہوتی تھی جہاں وہ کبھی نہ کبھی کچھ دیر آرام کرلیا کرتا تھا۔

''آج میں کچھ تھکن محسوس کررہا ہوں۔'' اس نے اپنے معتمد ملازم سے کہا۔ ''کچھ دیر آرام کروں گا، تم اسٹور سنبھالو۔''

''کیا رات کو دیر تک جاگے تھے سر؟'' ملازم نے پوچھا۔

طارق سر ہلا کر ڈپارٹمنٹل اسٹور کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کا کیبن تھا۔

کیبن میں پہنچتے ہی اس نے بوتل نکالی اور پہلا پیگ پندرہ منٹ میں ختم کرلینے کے بعد دوسرا پیگ بنایا۔

ریحانہ کو تھوڑا سا ڈانٹ دینا چاہیے، اس نے دوسرا پیگ نصف پینے کے بعد سوچا، صرف اسی کی وجہ سے وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہوا تھا۔

دوسرا پیگ ختم کرنے کے بعد اس نے تیسرا پیگ بنایا۔ وہ پیگ اس نے آدھا ہی پیا تھا کہ اسے زویا کو کالج سے لینے کا خیال آیا۔ اس نے سوچا، اسے اتنی نہیں پینی چاہیے کہ زویا محسوس کرلے۔ اسی سوچ کی وجہ سے اس نے تیسرا پیگ آدھا چھوڑ دیا اور نرم و گداز کوچ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

کہیں نیند نہ آجائے، اسے خیال آیا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے موبائل نکال کر اس میں وہ ٹائم لگا دیا جس وقت وہ زویا کو لینے جایا کرتا تھا۔

ہوا وہی جو اس نے سوچا تھا۔ اس کی آنکھ لگ گئی لیکن الارم بجنے کی وجہ سے اٹھ بیٹھا۔ واش بیسن میں اس نے منہ پر پانی کے دو تین چھپکے مارے، کنگھا نکال کر بال درست کیے اور کیبن سے نکل آیا، وہ محسوس کررہا تھا کہ اسے اب بالکل نشہ نہیں ہے۔

''میری آنکھ لگ گئی تھی۔'' اس نے ملازم سے کہا۔ ''اور اب لنچ کے لیے گھر جانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

''آپ بے فکر ہوکر جائیں، یہ اچھا ہوا کہ آپ سو لیے۔ رات کی نیند پوری نہ ہو تو باقی دن بھی بوجھل گزرتا ہے۔''

طارق زویا کو لینے کے لیے اس کے کالج روانہ ہوگیا۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس وقت شراب پینا اس کے لیے سود مند رہا۔ اب وہ اس کیفیت سے نکل آیا تھا جو ریحانہ کے جملے سے پیدا ہوئی تھی۔

''اس وقت آپ ٹھیک نظر آرہے ہیں طارق بھائی۔'' واپسی پر زویا نے کہا۔

طارق مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے اپنی توجہ ڈرائیونگ ہی پر مرکوز رکھی، زویا کی طرف نہیں دیکھا۔

جب زویا گھر پہنچتی تھی، اس وقت بھی داراب گھر کے باہر بیٹی کے انتظار میں کھڑا نظر آتا تھا۔ طارق، زویا کو اتار کر دور ہی سے داراب کو سلام کرتا ہوا گاڑی نکال لے جاتا تھا لیکن اس روز اسے رکنا پڑا۔ داراب نے ہی اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ انجن بند کرکے کار سے اترا اور چوبی دروازے سے گزر کر داراب کے قریب پہنچا۔ اسے اپنے سلام کا جواب شفقت و محبت سے ملا۔

''میں نے تمہیں اس لیے روکا کہ آج تمہاری آنٹی نے بتھوے کا ساگ بنایا ہے۔ وہ لیتے جاؤ۔ باجی کو بہت پسند ہے۔ بس چند منٹ بیٹھو۔ تمہاری کار رکتے دیکھ کر میں نے آواز لگادی تھی۔ وہ ٹفن میں نکال رہی ہوں گی۔''

''جی...... آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہی رہتا ہوں۔'' داراب نے ہنس کر کہا۔ ''اگر بیماری کی کوئی شکل ہوتی ہے تو وہ میں نے برسوں سے نہیں دیکھی۔''

''شب و روز گھر میں رہتے ہوئے آپ کا دل نہیں گھبراتا؟''

''بہت عرصے دور رہا ہوں گھر سے۔ اب سوچا ہے کہ باقی وقت تمہاری آنٹی ہی کے لیے وقف کیے رکھوں۔''

''اتفاق ہے۔ نہ کبھی آپ سے پوچھا، نہ کبھی ممی سے۔ آپ کی ایسی کیا ذمے داریاں تھیں کہ گھر سے دور رہنا پڑا؟''

''فوج میں تھا میں۔'' داراب نے جواب دیا۔ ''ایس ایس جی...... میرا مطلب ہے اسپیشل سروسز گروپ سے بھی وابستہ رہا۔''

''یعنی کمانڈو رہے ہیں آپ؟'' طارق نے کچھ حیرت اور تجسس سے کہا۔

''ہوں۔'' داراب مسکرایا۔

''اسی لیے تو آپ آج بھی جوانوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اُس دور کی تو بڑی کہانیاں یاد ہوں گی آپ کو۔''

''بجلی جیسی زندگی ہوتی ہے۔ کبھی اِدھر چمکی تو کبھی اُدھر۔''

''ٹریننگ تو بہت سخت ہوتی ہوگی۔''

اس وقت زویا کی والدہ ٹفن لے کر آگئیں۔

''فوراً روانہ ہوجاؤ لے کر۔ یہ تو گرم گرم ہی اچھا لگتا ہے۔'' داراب نے کہا۔ ''اُس دور کی کہانیاں پھر کسی وقت سناؤں گا۔''

''جی بہتر۔'' طارق کھڑا ہوگیا۔

داراب نے اس کے ساتھ ساتھ کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بتایا تھا شاید! بس ایک ہی دوست ہے یہاں میرا۔ کبھی کبھی وہ بلا لیتا ہے۔ آج رات کھانے پر جاؤں گا۔ برج کی پارٹی جمے گی، تم کبھی کھیلے ہو؟''

''کبھی اتفاق نہیں ہوا انکل...... تو میں چھوڑ آؤں گا آپ لوگوں کو۔''

''ارے نہیں بھئی، ییلو کیب ہی ٹھیک رہے گی۔ پارٹی نہ جانے کب تک چلے! بور ہوجاؤ گے تم۔ ہاں اگر برج کھیل سکتے ہو تو دوسری بات تھی۔''

''زویا کھیل لیتی ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''کھیل تو لیتی ہے لیکن وہ جائے گی نہیں۔ اسے رات کے کھانے کے بعد اسٹڈی کرنے کی ایسی عادت ہے جیسے کسی کو نشے کی عادت پڑ جاتی ہے۔''

نشے کی بات سن کر طارق کا دل دھڑک گیا، کہیں انکل نے بُو تو نہیں محسوس کرلی؟

داراب نے بات جاری رکھی۔ ''کسی تقریب میں شرکت بہت ضروری ہو تو بس حاضری لگا کر لوٹ جاتی ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے رکتی ہے۔ اسٹڈی نہ کرے تو اس کا نشہ اکھڑنے لگتا ہے۔'' داراب ہنسا۔

''تو آج رات کو کھانا ہمارے گھر کھالے! میں لے جاؤں گا آکر، واپس بھی ظاہر ہے کہ چھوڑ دوں گا۔''

''کھانا تو اس کے لیے تیار کردیا ہوگا تمہاری آنٹی نے ابھی سے۔ وہ گرم کرکے کھالے گی۔'' بات اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھی کیونکہ وہ کار کے قریب پہنچ گئے تھے۔

''بس اب روانہ ہوجاؤ جلدی سے۔'' داراب نے کہا۔ ''بتھوے کا ساگ تو گرم گرم ہو تو مزہ دیتا ہے۔''

''اچھا انکل!'' طارق نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' طارق نے کار آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

سات بجے داراب اور اس کی بیوی نسرین گھر سے روانگی کے لیے تیار تھے۔ ییلو کیب باہر کھڑی تھی۔

''اچھا چندا!'' نسرین نے بیٹی کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ ''کھانا تیار ہے تمہارا۔ گرم کرکے کھالینا۔ چل کر دروازہ بند کرلو۔''

''آپ کی واپسی تو ڈیڑھ دو بجے تک ہوگی؟'' زویا نے کہا۔

''کھانے ہی میں نو بج جائیں گے۔'' داراب بول پڑا۔ ''پھر پارٹی جمے گی تو چند گھنٹے تو گزریں گے۔ اسٹڈی سے تھک کر تم سو جانا۔ تمہاری نیند بہت گہری تو ہوتی نہیں۔ کال بیل کی ایک ہی آواز پر اٹھ جاؤ گی۔''

زویا ان دونوں کو چھوڑنے کے لیے باہر تک گئی۔ جب ان کی ییلو کیب روانہ ہوگئی تو زویا لوٹی۔ گھر کا بیرونی دروازہ بند کرکے اپنے کمرے میں پہنچی۔ ایک کاپی اور دو کتابیں نکال کر سرہانے رکھ دیں جو اسے اس رات پڑھنی تھیں۔ ذرا دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد وہ کچن میں گئی۔ کھانا گرم کرکے کھایا، کافی بھی بنا کر پی، پھر اپنے کمرے میں آکر کتابیں اور کاپی لے کر بیٹھ گئی۔

گیارہ بجے تو اس نے تھکان محسوس کی لیکن وہ اس رات والدین کی واپسی تک اسٹڈی جاری رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کچن میں جاکر کافی بنائی، اس کی پیالی ہاتھ میں لیے وہ اپنے کمرے میں آگئی اور ٹی وی کھول لیا۔ اسی وقت ایک پروگرام شروع ہوا جس کا عنوان تھا ''رشتے''۔

زویا نے چینل تبدیل نہیں کیا کیونکہ پروگرام کا نام اچھا لگا تھا۔ پروگرام کرنے والے ایک ریٹائرڈ پروفیسر تھے۔ تقریر اپنے عنوان کے اعتبار سے رشتوں کی نزاکت پر تھی۔ زویا توجہ سے سنتی رہی۔ تقریر کے ایک موڑ پر پروفیسر صاحب نے کہا۔ ''مختلف مذاہب اور مختلف طبقات میں رشتوں کی نزاکت اور احترام مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے

Pak!Books.Site

معاشرے کے مختلف طبقات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ماڈرن طبقے میں یہ رشتے مشرقی تقاضوں سے دور ہوتے جارہے ہیں لیکن متوسط طبقے میں یہ دوری کچھ زیادہ نہیں۔ اسی فرق کی وجہ سے ماڈرن طبقے میں خرابیاں کچھ زیادہ ہیں جبکہ متوسط طبقے میں کچھ کم ہیں۔ مشرقی تمدن کو پیش نظر رکھا جائے تو لڑکیوں کے لیے محرم اور نامحرم کی نزاکت زیادہ ہوتی ہے۔ خونی رشتے نامحرم نہیں ہوتے۔ جو رشتے خونی نہ ہوں، وہ نامحرم ہوتے ہیں۔ کوایجوکیشن میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ قدرے کم ان گھرانوں میں ہوتی ہیں جہاں کوایجوکیشن کا رواج نہیں ہوتا لیکن بے تکلفانہ ماحول وہاں بھی کسی خرابی کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ بے تکلفانہ ماحول مشرقی تمدن کے لیے سم قاتل ہے۔ اس زہر سے بچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جہاں خونی رشتہ ہو، وہاں بھی تنہائی سے گریز کرنا چاہیے۔ اس قسم کی چند مثالیں سامنے آچکی ہیں لیکن جہاں خونی رشتہ نہ ہو، وہاں تنہائی اکثر خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔''

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔ یہ کوئی بہت غیر معمولی بات نہیں تھی اس لیے زویا کسی گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئی۔ لائٹ جانے کی وجہ سے ایمر جنسی لائٹ نے کام شروع کردیا تھا۔ کمرے میں بالکل تاریکی نہیں ہوئی تھی۔ زویا نے تارچ نکالی اور کافی کی خالی پیالی رکھنے کچن میں گئی۔ اسے بس تھوڑی سی کوفت ہوئی کہ وہ ٹی وی کا پروگرام پورا نہیں دیکھ سکی۔

مقرر کی باتیں اگرچہ کسی نہ کسی حد تک اشاروں کنایوں میں تھیں لیکن زویا اتنی چھوٹی بچی نہیں تھی کہ بات سمجھ نہ پاتی۔

کمرے میں واپس آکر اس نے ٹی وی بند ہی کردیا اور ایمر جنسی لائٹ قریب کرکے اسٹڈی شروع کردی۔ پھر دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ لائٹ بحال ہوگئی لیکن اب زویا کا موڈ نہیں رہا کہ وہ پورا پروگرام دیکھنے کے لیے ٹی وی کھولتی۔ اب اس کا دماغ پوری طرح اسٹڈی کی طرف تھا۔

مزید کچھ وقت گزرا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ زویا نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ چونکنے کا سبب یہ تھا کہ ابھی بارہ بھی نہیں بجے تھے، اس کے والدین کی واپسی میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے۔

آج کسی وجہ سے جلدی آگئے ہوں گے۔ وہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ بیل پھر بجی۔ زویا کے آگے بڑھتے ہوئے قدم یک لخت رک گئے۔ یہ اس کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ خود اس کے والدین کہا کرتے تھے کہ انہیں کبھی دوسری بیل بجانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

شاید کسی خاص وجہ سے جلدی میں ہوں۔

یہ سوچ کر زویا دوبارہ تیزی سے حرکت میں آئی اور دروازے پر پہنچ گئی لیکن اسی وقت اسے خیال آیا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے اس لیے احتیاط میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ وہ دروازہ کھولتے رکی اور قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

''کون؟''

''طارق۔'' باہر سے آواز آئی۔

زویا کو یہ بات اور عجیب لگی۔ اتنی رات کو طارق کا آنا بھی اس کے لیے ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس وقت اسے ٹی وی پروگرام کے یہ جملے بھی یاد آگئے کہ رشتہ اگر خونی نہ ہو تو تنہائی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے تذبذب کا شکار ہوگئی۔

پھر تیسرے گھنٹی بھی بج گئی۔

''کون؟'' زویا نے دوسری بار بے اختیار پوچھا۔

''طارق۔'' آواز آئی۔

زویا کو اس قسم کا جواب دینا کچھ مناسب نہیں لگا کہ وہ اکیلی ہے اس لیے طارق پھر کسی وقت آئے۔ وہ اس کی احسان مند بھی تھی کہ وہ اسے کالج لانے لے جانے لگا تھا۔ دوسری بات اس کے ذہن میں یہ آئی کہ طارق کا اتنی رات کو آنا بے وجہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا کوئی خاص سبب بھی ہوسکتا تھا۔ کوئی غیر معمولی بات بھی ہوسکتی تھی۔

اس نے دروازہ کھول دیا، دروازہ کیا کھلا کہ اس پر قیامت کا دروازہ کھل گیا۔ دروازے کو زور سے دھکا دیتا ہوا جو شخص اندر آیا، اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ اندر آتے ہی اس نے زویا کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور گھر کے اندر کی طرف لپکا۔

ڈاکو، زویا کے دماغ میں پہلا خیال یہ آیا۔ اس نے مچل کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر کامیاب نہیں ہوسکی۔ وہ کچھ خوف زدہ بھی ہوگئی تھی۔ اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود چیخ بھی نہیں سکی۔ خوف نے گنگ کردیا تھا۔

نقاب پوش نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوکر زویا کو ایک صوفے پر اس طرح ڈالا جیسے پٹخ دیا ہو۔ فوراً ہی وہ اس کے اوپر گر بھی گیا اور دایاں ہاتھ زویا کے گریبان میں ڈال

PakiBooks.Site

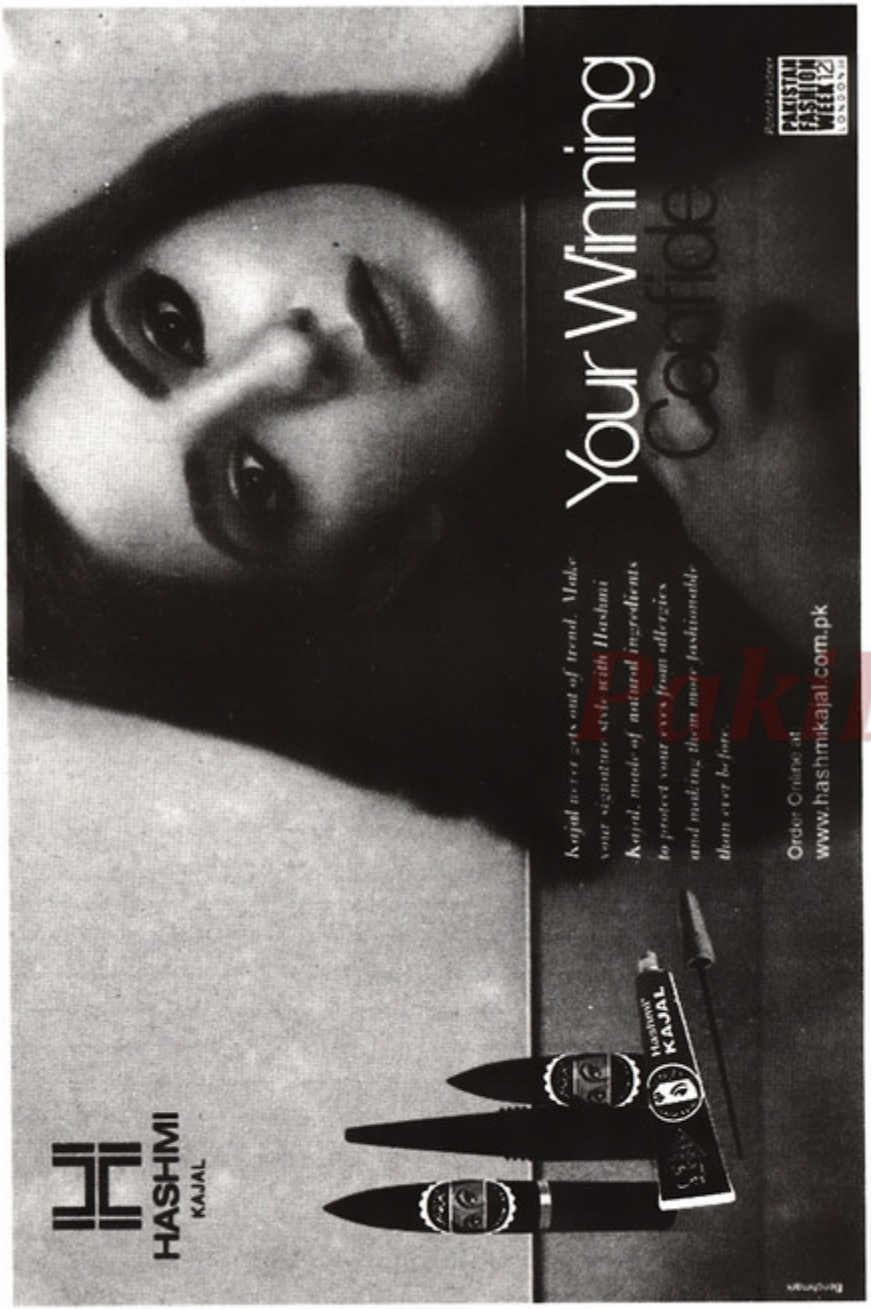

کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی قمیص جھرجھرا کر پھٹتی چلی گئی۔ اب زویا کی سمجھ میں آیا کہ وہ گھر لوٹنے آیا ہو یا نہ آیا ہو، اس کی عزت لوٹنے یقیناً آیا تھا۔

ایسی موقعوں پر عورت کے جسم کی طاقت خاصی بڑھ جاتی ہے۔ اس نے اپنی اسی طاقت سے نقاب پوش کو گرانے کی کوشش کی۔ وہ صوفے سے گر بھی گیا۔

''بچاؤ..... بچاؤ!'' اس وقت زویا صوفے سے اٹھ کر ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی بھاگی لیکن بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ نقاب پوش نے اس کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔ اس جھٹکے سے زویا منہ کے بل گری۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے لیکن وہ ہذیانی انداز میں چیختی رہی۔ ''بچاؤ..... بچاؤ۔''

اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ اس کی آواز گھر کے باہر نہیں جاسکتی۔

نقاب پوش نے اسے پھر دبوچ لیا اور اس مرتبہ ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کے منہ پر بھی رکھ دیا۔ وہ اس کی چیخ پکار بند کرنا چاہتا تھا جس میں اسے پوری طرح کامیابی نہیں ہوسکی۔ اس نے زویا کو اٹھا کر پھر صوفے پر پٹخ دیا اور اس پر سوار ہوگیا۔

زویا بہت مچلی، بہت ہاتھ پیر چلائے لیکن وہ اتنی طاقتور نہیں تھی کہ اس تنومند شخص کو اس کی من مانی سے روک سکتی۔

☆☆☆

داراب اپنی بیوی نسرین کے ساتھ دو بجے کے قریب گھر پہنچا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ چوبی دروازے سے گھر کے چھوٹے سے احاطے میں داخل ہوئے۔ داراب اور نسرین کافی خوش تھے کیونکہ اس رات انہوں نے برج میں بہت کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ اسی کے بارے میں بات کرتے ہوئے گھر کے مرکزی دروازے پر پہنچے اور چونک گئے۔ انہیں دروازہ کھلا ہوا نظر آیا تھا۔

''یہ کیا غیر ذمے داری برتی ہے زویا نے۔'' داراب بڑبڑایا۔ ''چوری چکاری کا بھی ڈر نہیں رہا اسے؟''

''زویا!'' نسرین پکارتی ہوئی تیزی سے گھر میں داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے داراب نے بھی گھر میں قدم رکھا۔

''زویا!'' نسرین نے دوبارہ پکارا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔

''اتنی گہری نیند تو نہیں سوتی وہ۔'' داراب پھر بڑبڑایا۔

وہ دونوں زویا کی خواب گاہ تک پہنچ گئے۔ اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا لیکن یہ کوئی زیادہ غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ چونکے تو اس وقت جب انہوں نے کمرے میں قدم رکھا۔

زویا اپنے بستر پر موجود تھی لیکن اس عالم میں کہ اس نے بستر ہی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ایک طرف تکے جارہی تھی۔

''کیا ہوا جانی؟'' نسرین اپنی بیٹی کی طرف لپکی۔

اب زویا کے سر نے آہستگی سے سر کو حرکت دی۔ باپ سے تو اس نے نظریں چرالی تھیں لیکن ماں کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس کے ہونٹ اس طرح پھڑ پھڑائے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن اس کی آواز نہ نکل رہی ہو۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔

''کچھ بولو زویا۔'' نسرین نے اس کے کندھے پکڑ کر ہلا ڈالے۔

اب زویا اس سے نہ صرف لپٹی بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

داراب دروازے پر ہی رک گیا تھا اور غور سے زویا کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اب ہچکیاں لینی شروع کردی تھیں۔ داراب کے دماغ میں ایک خیال طوفانی بھنور کی طرح چکرانے لگا تھا۔

''یہ کیا ہوگیا؟ کیسے ہوگیا؟'' وہ پھر زیر لب بڑبڑایا۔

زویا اب بھی ماں کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ بس ہچکیاں لیتے ہوئے روئے جارہی تھی۔

''پوچھو اس سے، پوچھو، کیا ہوا ہے؟'' داراب نے کہا اور مڑ کر کمرے سے نکل آیا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ ایک صوفے پر گر سا پڑا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال کا طوفانی بھنور اب بھی چکرا رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر سامنے کے ایک بڑے صوفے پر پڑی۔ وہاں اسے زویا کے ان کپڑوں کا ڈھیر دکھائی دیا جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھی جب میاں بیوی اس گھر سے گئے تھے۔ داراب تیزی سے اٹھ کر اس صوفے کے قریب گیا۔ اس نے زویا کی قمیص دیکھی جو سامنے سے اس طرح پھٹی تھی کہ ایک ڈیڑھ فٹ تک پھٹتی سی چلی گئی تھی۔ شلوار اور صوفے پر خون کے دھبے نظر آئے تھے۔

داراب کے دماغ میں چکراتا ہوا بھنور یک لخت

ساکت ہوگیا اور چہرہ غصے سے تمتما گیا۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر جو خیال اس کے ذہن میں آیا تھا، اس نے واضح شکل اختیار کرلی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا ہوا اور زخمی شیر کی طرح ڈرائنگ روم میں چکرانے لگا۔

''کون ہوسکتا ہے وہ شیطان؟'' اس سوال کی گونج اس کے دماغ میں بڑھتی ہی چلی گئی۔

غصہ اس کے رگ و پے میں تیرنے لگا تھا۔ اس کیفیت میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ اس وقت چونکا جب اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ اس کی بیوی نسرین تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ وہ آتے ہی ایک صوفے پر گر گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔

''کچھ بتایا زویا نے؟'' داراب کی آواز کانپ گئی۔

نسرین نے اثبات میں سر ہلایا۔

داراب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ نسرین نے اپنے آنسو خشک کیے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں وہ سب کچھ بتادیا جو وہ زویا سے بمشکل معلوم کرسکی تھی۔

''نقاب تھی چہرے پر؟'' داراب بڑبڑایا۔

اس کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا لیکن نسرین نے کہا۔ ''جی۔''

''وہ اس کی آواز سے بھی اسے نہیں پہچان سکی؟'' اس بار داراب نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ زویا اسے جانتی تھی اس لیے اس نے موقع ہی نہیں دیا کہ زویا اسے پہچان لے۔''

''ظاہر ہے کہ وہ شیراں ہی ہوگا۔'' داراب کی آواز پھر کانپ گئی۔ ''اور زویا نے ہم سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا کہ وہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ مجھے نہیں تو کم از کم تمہیں تو بتانا چاہیے تھا۔''

''اس نے صرف طارق کو بتایا تھا۔''

''اور طارق نے مجھے بے خبر رکھا۔ آخر کیوں؟''

''یہ سوال تو اسی سے کیا جاسکتا ہے۔'' نسرین نے کہا۔ پھر بولی۔ ''پولیس میں رپورٹ کرنا چاہیے یا نہیں؟''

''دماغ خراب ہے تمہارا؟'' داراب نے بگڑ کر کہا۔ ''زویا کو رسوا بھی کرنا ہے کیا؟''

''پھر کیا کرنا ہوگا؟''

داراب کچھ جواب دیے بغیر ٹہلنے لگا۔ نسرین اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''سب کچھ یہیں..... ڈرائنگ روم میں ہوا تھا۔''

داراب کچھ توقف سے بولا۔

''دیکھ چکی ہوں۔'' نسرین نے صوفے پر پڑے ہوئے زویا کے کپڑوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''خود زویا نے بھی بتایا تھا۔ یہاں وہ کچھ دیر بے سدھ پڑی روتی رہی تھی، پھر اپنے کمرے میں جاکر چادر لپیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ کپڑے تو اس قابل رہے نہیں تھے کہ وہی پہن لیتی۔ کمرے میں جاکر بھی اس نے دوسرے کپڑے نکال کر نہیں پہنے۔ ایسے میں اتنا ہوش کہاں رہتا ہے۔ ہم جب آئے تھے تو اس نے میری آواز سن لی تھی لیکن اس حالت میں وہ ہمارے سامنے کیسے آتی؟''

''کپڑے پہنا دیے اسے؟''

''جی.....'' نسرین نے جواب دیا۔ ''خواب آور دوا کھلا کے سلا بھی دیا ہے۔''

اب داراب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ زویا کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

''پانچ بجنے والے ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''چلو اب لیٹا جائے۔''

''اب کرنا کیا ہے آئندہ کے لیے؟'' نسرین نے اپنا سوال دہرایا۔

داراب نے اس بار بھی اس سوال کا جواب نہیں دیا اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ نسرین بھی کھڑی ہوگئی۔

''نیند تو کیا آئے گی۔'' خواب گاہ میں پہنچنے کے بعد داراب نے کہا۔ ''کچھ دیر آرام ہی کرلیا جائے۔''

نسرین کچھ کہے بغیر بستر پر لیٹ گئی۔ داراب اس کے برابر میں لیٹ گیا اور چھت کو تکنے لگا۔ کچھ یہی کیفیت نسرین کی بھی رہی۔

اس رات داراب ایک پل کو بھی نہیں سو سکا۔ نسرین دو ایک بار اونگھی، پھر چونک گئی۔ داراب اس کی کیفیت سے بے خبر بھی نہیں رہا۔

صبح دل نہ چاہتے ہوئے بھی نسرین نے ناشتا تیار کیا۔

داراب نے اس سے کہا۔ ''زویا کہاں ہے؟''

''ابھی دیکھ کر آئی ہوں اس کے کمرے میں۔'' نسرین نے جواب دیا۔ ''اس کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ وہ رات کو بالکل نہیں سوئی۔ میں نے اس بارے میں اس سے کچھ نہیں کہا۔''

''مناسب کیا۔''

PakBooks.Site

''بس یہ کہا تھا کہ چل کر ناشتا کرلو لیکن وہ مانی ہی نہیں۔ میں نے بہت سمجھایا تو وہ اس شرط پر تیار ہوئی کہ ناشتا اسی کے کمرے میں پہنچا دوں۔ میں کچھ یہ اندازہ لگا سکی ہوں کہ اس میں آپ کا سامنا کرنے کی سکت نہیں ہے۔''

داراب نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا، پھر کہا۔ ''تم ناشتا پہنچا دو گی تو بھی وہ نہیں کرے گی۔ شاید بس چائے کے دو ایک گھونٹ لے لے۔ تم اپنا ناشتا بھی اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ اس کے ساتھ ہی ناشتا کرو۔ میں ذرا طارق اور باجی سے مل کر آتا ہوں۔ یہ اچھا ہوا کہ آج اتوار ہے۔ طارق اتوار کو ذرا دیر سے ہی اسٹور جاتا ہے۔''

''اتنی جلدی وہاں کیوں؟ کیا انہیں بتائیں گے کہ.....''

''نہیں۔'' داراب نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس بارے میں تو کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا جاسکتا۔ انہیں بس یہ بتانے جارہا ہوں کہ ایک ایسا ضروری کام پڑ گیا ہے کہ ہم آج ہی یہ شہر چھوڑ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' نسرین چونکی۔

''زویا کو ذہنی دباؤ سے نکالنے کے لیے ایک قدم یہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہم یہ شہر چھوڑ دیں۔ جو کچھ ہوگیا، اس کا ازالہ تو ممکن نہیں۔''

''جائیں گے کہاں؟'' نسرین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''واپس۔'' داراب نے جواب دیا۔

وہ جس شہر سے آئے تھے، وہ بھی داراب ہی کا گھر تھا۔ وہاں سے تمام سامان بھی یہاں نہیں لایا گیا تھا۔ سب چیزیں یہیں خریدی گئی تھیں۔ وہ گھر جوں کا توں مقفل کر دیا گیا تھا۔ بس کپڑے اور ضروری سامان لایا گیا تھا۔

''اب بھی بس ضروری سامان پیک کرلو۔'' داراب نے وضاحت کرنے کے بعد کہا۔ ''باقی سامان پیک کرنے میں تو دو دن بھی لگ سکتے ہیں۔ وہاں ہمارا سب سامان موجود ہی ہے۔''

''یہ گھر بیچ دیں گے؟''

''نہیں، یہ بھی بس مقفل کر دیں گے۔ زویا کی شادی کہیں ہوجائے گی تو ہم بھی شاید پھر یہیں آجائیں۔ اچھا تم جا کر اس کے ساتھ ناشتا تو کرو۔ میں جلدی واپس آؤں گا۔''

''ناشتا تو ابھی آپ نے بھی نہیں کیا ہے۔''

''دے دو، اور تم زویا کے پاس جاؤ۔''

پندرہ منٹ بعد داراب ٹیکسی کر کے طارق کے گھر روانہ ہوگیا۔

اتنی صبح اسے دیکھ کر بڑی بہن کو بھی حیرت ہوئی۔

داراب نے کہا۔

''میں آج ہی اس شہر سے جارہا ہوں۔ ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔''

''واپسی کب تک ہوگی؟''

''اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ گھر مقفل کر کے جاؤں گا۔''

''تو زویا اور نسرین بھی؟''

''جی ہاں، وہ دونوں میرے بغیر کہیں نہیں رہ سکتیں۔'' داراب نے جواب دیا، پھر پوچھا۔ ''طارق کہاں ہے؟ اسے بھی بتا دوں، یا آپ بتا دیجیے گا۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔''

بڑی بہن نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''طارق گھر پر ہے بھی نہیں۔''

''کیوں؟ اتوار کو تو وہ کچھ دیر سے اسٹور جاتا ہے؟''

''وہ رات سے ہی نہیں ہے۔'' بہن نے افسردگی سے کہا۔ ''میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ تمہیں فون کروں۔ تم ہی طارق کو سمجھا کر فون کرے۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟''

''آدھی رات کے وقت کسی کا فون آیا تھا۔ وہ فوراً جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا دوست کسی پریشانی میں پڑ گیا ہے اس لیے اس کا جانا ضروری ہے۔ دو ایک گھنٹے میں واپس آجائے گا۔ ریحانہ نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ نہیں مانا۔ اس پر دونوں میاں بیوی میں کچھ تلخ باتیں بھی ہوگئیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ تلخی کیوں بڑھی تھی۔ اسی وقت کا گیا ہوا طارق ابھی تک نہیں لوٹا۔ تھوڑی دیر پہلے اسے فون کر چکی ہوں۔ وہ اپنے کسی دوست کے گھر پر ہے۔ مجھ سے اس نے کہا کہ ریحانہ کچھ آپے سے باہر ہونے لگی ہے اس لیے وہ اسے اتنی سزا تو دے گا کہ دو چار روز گھر ہی نہ آئے۔''

''ایسی کیا تلخی ہوگئی ان دونوں میں؟''

''ریحانہ نے مجھے بس اتنا بتایا ہے کہ آدھی رات کے وقت طارق کا جانا اسے بُرا لگا تھا۔ اس نے طارق کو روکنے کی کوشش کی تھی جس پر طارق ناراض ہو کر چلا گیا۔ تفصیل مجھے ریحانہ نے بھی نہیں بتائی۔ میں بُلاتی ہوں اسے، تم پوچھ لو اس سے۔''

''نہیں، میں طارق ہی کو فون کرتا ہوں۔'' داراب نے کہا اور پھر اپنے موبائل پر طارق سے رابطہ کرنا چاہا لیکن دوسری طرف گھنٹی تو بجی، ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔

داراب نے ٹھنڈی سانس لے کر موبائل بند کر دیا اور بولا۔ ''میری کال وہ ریسیو نہیں کر رہا ہے۔ سمجھ گیا ہوگا وہ میرے فون کرنے کا مقصد! میری بات ٹالنے کی سکت نہیں ہوگی اس میں..... خیر! ..... دیکھ لیجیے دو ایک دن۔ میرا فوراً جانا ضروری ہے ورنہ رکتا۔ ابھی جا کر سامان کی پیکنگ میں نسرین کی مدد کروں گا۔ پھر جو فلائٹ بھی جلد از جلد مل سکی، اس سے روانہ ہوجاؤں گا۔ اگر بیچ میں مہلت ملی تو اس کے اسٹور چلا جاؤں گا۔ وہاں تو وہ جائے گا ہی۔ اگر میں اسٹور نہ جا سکا تو ایک آدھ بار پھر اسے فون کر کے سمجھاؤں گا کہ گھر میں تھوڑی بہت کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے۔ اس پر اتنا شدید ردِعمل نہیں ہونا چاہیے۔''

''اچھا۔'' بہن نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی ضروری کام آپڑا ہوگا ورنہ اس موقع پر تم رک جاتے۔''

''میں کل بھی کسی وقت طارق کو فون کروں گا۔ اس سے پہلے آپ کو فون کر کے صورتِ حال معلوم کرلوں گا۔''

''میں انتظار کروں گی تمہارے فون کا۔''

مزید دو ایک رخصتی جملے کہہ کر داراب وہاں سے روانہ ہوا۔ راستے ہی میں اس نے موبائل پر اپنی بیوی سے رابطہ کیا۔

''پیکنگ میں تمہیں میری ضرورت پڑے گی نسرین؟''

''مجھے تو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ اپنی کیا چیز لے جانا ضروری سمجھیں گے۔''

''وہ میں آکر دیکھ لوں گا۔ مجھے تو پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ میں اب جلد از جلد ملنے والی کسی فلائٹ میں ریزرویشن کروا کے ہی آؤں گا۔ زویا نے ناشتا کرلیا؟''

''وہ کیا کرتی، میں نے ہی زبردستی کرایا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' داراب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

فلائٹ دو گھنٹے بعد ہی کی مل گئی۔ اسی فلائٹ سے وہ تینوں روانہ ہوگئے۔ داراب نے دانستہ طارق کو دوبارہ فون نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ طارق کا غصہ ایک آدھ دن میں خود ہی ٹھنڈا ہوجائے گا۔

ایک گھنٹا دس منٹ کی فلائٹ سے وہ تینوں اپنے پرانے شہر پہنچ گئے۔ پرانے گھر کا سامان دھول سے اَٹا ہوا تھا۔ نسرین صفائی میں لگ گئی۔ سب سے پہلے اس نے زویا کی اور اپنی خواب گاہ درست کی، پھر باقی جھاڑ پونچھ میں لگ گئی۔ داراب بستر پر لیٹ کر خیالات میں کھو گیا۔ اس کے چہرے پر بس سنجیدگی تھی، کسی قسم کا اشتعال ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ کسی کی بیٹی کے ساتھ اتنا بڑا سانحہ ہوجائے اور وہ ہر اعتبار سے پُرسکون رہے۔

چند دن گزر گئے۔ داراب گھر سے کہیں نہیں گیا۔ دونوں میاں بیوی کے تاثرات وہی رہے جو گھر میں ہو جانے والے کسی سانحے کے بعد ہوتے ہیں۔ زویا تو اپنے کمرے سے باہر قدم ہی نہیں رکھتی تھی کہ کہیں باپ سے سامنا نہ ہوجائے۔

ایک صبح داراب اخبار پڑھ رہا تھا کہ نسرین اس کے قریب آبیٹھی۔ داراب نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں زویا کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔'' نسرین نے کہا۔ ''اس کا ایک تعلیمی سال تو ضائع ہوگیا ہے۔ اگر اسے کسی طرح کہیں داخلہ مل جائے تو اس کا ذہن کچھ بٹ سکتا ہے۔ ابھی تو وہ زندہ لاش بنی ہوئی ہے۔''

''وقت بہت گزر چکا ہے۔ داخلہ تو نہیں مل سکتا اب یہاں ہمارے شناسا تو بہت ہیں۔ انہیں کھانے پر بُلانا شروع کردو۔ زویا کی سالگرہ آئے تو اس کا فنکشن کر دینا۔ یہی سب کچھ کیا جاسکتا ہے اس کا ذہن بٹانے کے لیے۔''

''آپ کی حالت دیکھ کر بھی دل کڑھتا ہے۔''

''تم بھی نارمل نہیں رہیں، البتہ میں نے اپنا ذہن بٹانے کے لیے ابھی ابھی کچھ سوچا ہے۔''

نسرین نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

داراب نے کہا۔ ''ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ سوچ رہا ہوں کہ اس طرح کچھ مصروف ہو جاؤں تو ذہن کچھ بٹے۔ یہ خیال ابھی یہ اشتہار دیکھ کر ذہن میں آیا۔'' داراب نے اخبار نسرین کو دیتے ہوئے انگلی ایک اشتہار پر رکھ دی۔

''ٹریولنگ ایجنٹ۔'' نسرین اشتہار پڑھتے ہوئے بڑبڑائی۔

PakiBooks.Site

"ہاں۔" داراب نے کہا۔ "اور یہ بہت بڑی کمپنی ہے۔ تنخواہ بھی بہت اچھی ملے گی۔"

"لیکن آپ کو اس کا کوئی تجربہ تو نہیں ہے۔"

"پھر بھی یہ ملازمت مجھے مل جائے گی اگر آج ہی جا کر ملوں۔ جب میں آرمی میں ایس ایس جی میں تھا، اس وقت ڈائریکٹر جنرل آف ملٹری آپریشن میرے بڑے بھائی کے بہت اچھے دوست تھے۔ اس حوالے سے وہ مجھے جانتے تھے اور پسند اس لیے کرتے تھے کہ میں گروپ کا سب سے بہتر کمانڈو سمجھا جاتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہی نے یہ کمپنی کھولی تھی۔ میں ان سے ملوں گا تو وہ مجھے نظر انداز نہیں کریں گے۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتا ہیں تو مل لیجیے۔ یہ ملازمت ملنے سے آپ کا ذہنی دباؤ تو ختم ہو۔ بس میں اور زویا بہت کمی محسوس کریں گے آپ کی۔ ٹریولنگ ایجنٹ کی حیثیت سے آپ سفر میں ہی رہا کریں گے۔"

"مستقل تو نہیں رہوں گا۔ ہفتے دس دن کے لیے جاؤں گا تو واپس بھی آؤں گا۔ رپورٹ تو دینی ہوگی۔"

"لیکن دو چار دن بعد پھر نہیں جانا پڑے گا۔"

"ہاں یہ تو ہوگا لیکن کچھ دن بعد میں کوشش کروں گا کہ مجھے کمپنی میں کوئی ایسی جگہ مل جائے کہ مجھے کہیں جانا نہ پڑے۔ اگر ایک کپ چائے پلا دو تو میں چلوں۔"

نسرین چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

چائے پی کر داراب گھر سے روانہ ہوا۔ اسے اس کا افسوس تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے جھوٹ بولا تھا، ایک گھڑی ہوئی کہانی سنادی تھی۔

وہ سارا دن اس نے اپنے شناساؤں یا دوستوں سے ملاقاتیں کرتے ہوئے گزارا اور شام کو گھر لوٹ کر نسرین کو خبر سنائی کہ اسے نوکری مل گئی ہے۔

"کل دفتر جاؤں گا۔" اس نے بتایا۔ "یہ کل ہی طے ہوگا کہ مجھے کتنے دن کے لیے کہاں بھیجا جائے گا۔"

نسرین نے سر ہلا دیا۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اس سے خوش نہیں کہ داراب دس دس بارہ بارہ دن کے لیے گھر سے دور رہے۔

دوسرے دن داراب پھر گھر سے نکلا۔ اس روز اس نے بینک اور انشورنس کے کچھ ایسے کام کیے کہ اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو اس کے بعد اس کی بیوی اور بیٹی کے لیے زندگی دشوار نہ ہو۔ وہ ایک ایسی مہم پر روانہ ہونے جا رہا تھا جس میں اسے اپنی کامیابی کا یقین تو تھا لیکن وہ یہ امکان نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس مہم میں خود اس کی زندگی بھی کام آجائے۔ اس سلسلے میں بعض نکات کے سلسلے میں اسے ایک اچھے وکیل سے بھی ملنا پڑا تھا۔ کچھ وقت اس نے دو ایک دوستوں سے ملنے میں بھی گزارا اور شام کو دفتری اوقات کے خاتمے پر گھر پہنچ گیا۔ مختلف بہانوں سے اس نے دو ایک کاغذات پر نسرین کے دستخط بھی لے لیے۔ بینک کی چیک بک بھی اس کے حوالے کی جس پر اس نے دو ایک سادہ... چیک پر دستخط کر دیے تھے۔

"میں چاہتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں جتنے پیسوں کی ضرورت بھی پڑے، تم نکلوا سکو۔" اس نے نسرین سے کہا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کا بینک بیلنس کتنا ہے۔ مزید یہ بھی کہا۔ "مجھے کل ہی روانہ ہونا ہے اس لیے میں نے یہ بندوبست ضروری سمجھا۔"

"تو کیا کل ہی جا رہے ہیں؟" نسرین نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ خفیف سا جبراً مسکرایا۔ "شاید اسی کو کہتے ہیں، سر منڈاتے ہی اولے پڑنا۔ بہر حال موبائل پر تم سے رابطہ تو رہے گا۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟"

داراب نے دور دراز کے ایک شہر کا نام بتا دیا۔

نسرین یہ سن کر کچھ اُداس ہو گئی۔

اس سے اگلے دن بھی وہ گھر سے نکلا۔ ایک بجے کی فلائٹ میں اپنے لیے سیٹ بک کرائی۔ ایک آدھ دوست سے ملاقات کی، پھر گیارہ بجے ہی گھر آ گیا۔ زویا کو نسرین نے اس کی روانگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ خود آ کر باپ کے سینے سے لگی اور رونے لگی۔ اپنے پرانے گھر میں آ کر اس نے پہلی مرتبہ باپ کا سامنا کیا تھا۔

"میں زندگی بھر کے لیے تو نہیں جا رہا ہوں چندا!" اس نے زویا کو سمجھایا۔ "بس آٹھ دس دن میں واپس آ جاؤں گا۔ تم اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ کالج نہ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی پڑھنا ہی چھوڑ دے۔ گھر میں بھی اسٹڈی جاری رکھی جا سکتی ہے، اور ہاں، نسرین....." نسرین قریب ہی موجود تھی۔

"آج کھانا جلد ہی کھا لیتے ہیں۔" داراب نے مزید کہا۔ "میں سوا بارہ بجے تک روانہ ہو جاؤں گا۔"

اس دن زویا نے ماں باپ کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔

سوا بارہ بجے تھے جب زویا اور نسرین نے اسے گھر سے رخصت کیا۔

ٹیکسی میں ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے داراب کے دماغ میں کئی خیالات امنڈتے ڈوبتے رہے۔

ان دنوں میں وہ موبائل پر اپنی بہن سے دو بار باتیں کر چکا تھا۔ وہاں کی صورتِ حال اس اعتبار سے اطمینان بخش تھی کہ طارق دوسرے ہی دن گھر آ گیا تھا۔ پہلے دن تو اس کا منہ پھولا رہا تھا لیکن وہ بتدریج نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی بیوی سے اس کی بات چیت بھی شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

گھر کا دروازہ بڑی بہن ہی نے کھولا اور حیرت سے داراب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کم از کم اپنے آنے کی اطلاع تو دے دیتے۔"

"میں نے سوچا تھا کہ اچانک مجھے اپنے سامنے پا کر بہت خوش ہوں گی۔" داراب نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ دروازہ کھولنے کیوں آئیں۔" طارق تو خیر اپنے اسٹور پر ہوگا لیکن ریحانہ....."

"اسے آج بخار ہو گیا ہے۔" بڑی بہن نے بتایا۔ "رات سے ہی اس کی طبیعت ڈل تھی۔ سو نہیں سکی۔ صبح طارق کو ناشتا کروا کے گھر سے اس کے جانے کے بعد ہی سوئی ہے۔" بہن نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں آج تو دونوں میاں بیوی نارمل ہیں۔ تم اچانک کیسے آ گئے۔ زویا اور نسرین....."

"میں اکیلا ہی آیا ہوں۔" داراب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہاں میں ایک کام ادھورا چھوڑ گیا تھا۔ اسے مکمل کرنے آیا ہوں۔ آٹھ دس دن تو رکوں گا۔"

"سامان کہاں ہے؟"

"وہ میں اپنے گھر میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

"جب اکیلے آئے ہو تو یہیں رہتے آٹھ دس دن۔"

"میری آمد و رفت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوگا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ لوگوں کو تکلیف میں ڈالوں۔ ابھی تو بس آپ کو سلام کرنے چلا آیا۔ فوراً ہی جاؤں گا۔ پھر کسی وقت اطمینان سے آ کر بیٹھوں گا۔"

"کچھ کھا پی کر تو جاؤ۔"

"بس ایک کپ چائے پلا دیں۔" داراب نے کہا۔ "اور ہاں..... شام کو میں گھر پر ہی ہوں گا۔ طارق کو بھیج دیجیے گا میرے پاس۔ اپنے کام کے سلسلے میں مجھے اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔"

"میں بھیج دوں گی۔"

داراب وہاں بیس منٹ سے زیادہ نہیں رکا اور اپنے گھر آ گیا۔ اسے بہت کچھ سوچنا تھا جس کے لیے یکسوئی ضروری تھی۔

زویا کے بیان کے مطابق اس نے "طارق" کی آواز سن کر گھر کا دروازہ کھولا تھا لیکن یہ بات داراب کی عقل نہیں مان رہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق طارق ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ طارق ہی ہوتا تو اپنا نام بتا کر نقاب میں کارروائی نہیں کرتا۔ نقاب کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ شخص اپنا چہرہ چھپانا چاہتا تھا۔ نام بتا کر چہرہ چھپانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس معاملے میں داراب کی سوچ یہ تھی کہ کسی نے طارق کی آواز میں اس کی نقل اتاری تھی، اور اتنی کامیاب نقل کہ زویا دھوکا کھا گئی تھی۔ داراب اسی سلسلے میں طارق سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اسے بستر پر لیٹے لیٹے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ طارق کی کال آ گئی۔ اس نے سلام کر کے کہا۔ "ابھی گھر سے فون آیا تھا کہ آپ اچانک آ گئے ہیں، اچھا نہیں لگا کہ آپ نے اطلاع بھی نہیں دی۔"

"کوئی سبب تھا اس کا۔ ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

"امی نے کہا تھا کہ میں شام کو آپ سے ملنے آؤں لیکن میں اتنا بے چین ہو گیا ہوں کہ فوراً آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کہاں ہیں اس وقت؟"

"تمہارے گھر سے نکل کر ایک چھوٹا سا کام کیا تھا۔ اس کے بعد گھر آ گیا ہوں۔ بس ابھی ابھی داخل ہوا ہوں گھر میں۔"

"آپ ڈسٹرب نہ ہوں تو ابھی آ جاؤں؟"

"تمہارا اسٹور؟"

"وہ سنبھالنے کے لیے ایک آدمی موجود ہے۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں آ جاؤں گا۔"

"تو آ جاؤ۔ میں خود تم سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ باجی کو تو میں نے بتا دیا تھا کہ وہ میری یہاں موجودگی کے بارے میں نسرین کو کچھ نہ بتائیں۔ تم بھی اس کا خیال رکھنا۔"

"ابھی تو میں آپ ہی کے پاس آ رہا ہوں۔"

"آ جاؤ۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

طارق کو آنے میں اتنی ہی دیر لگی جتنا وقت ڈرائیو میں لگ سکتا تھا۔ وہ آتے ہی بڑی محبت سے داراب کے گلے

PakBooks.Site

لگ گیا۔

''سچ جانیے، آپ کے اس طرح آجانے سے بہت خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔ ''اور اس کے لیے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ دراصل سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ آپ کو کیا جواب دوں گا۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف کردیں گے۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔ جو ہوا سو ہوا۔ خوشی ہوئی اس بات سے کہ تم میاں بیوی میں صلح ہوگئی ہے۔ میں تم سے ایک دوسرے اہم موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔''

داراب نے اسے ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔ وہ داراب کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ داراب نے کہا۔

''تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ ہم لوگ یہاں سے اچانک کیوں چلے گئے تھے۔''

''آپ نے کسی ضروری کام کی بات کی تھی شاید۔''

''وہ بہانہ تھا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ زویا کو خطرے سے دور نکال لے جاؤں۔''

''اچانک زویا کو کیا خطرہ ہوگیا تھا انکل؟''

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی ایسا مشہور شخص ہے جو لوگوں کی آواز کی نقل اتارتا ہو۔''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہاں ایسا کوئی شخص رہتا ہو۔ ٹی وی چینلز پر ہی دو ایک نقالوں کو سنا ہے۔ غالباً آپ نے بھی.....''

''ہاں میں بھی دیکھ چکا ہوں۔'' داراب نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان میں سے کوئی، یا ان کے علاوہ بھی کوئی یہاں رہتا ہے؟''

''اگر کوئی رہتا ہوگا تو مجھے اس کا علم نہیں لیکن آخر بات کیا ہے؟''

داراب چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''تمہیں علم ہے کہ ہم لوگ جس دن یہاں سے گئے ہیں، اس سے پچھلی رات کو میں نسرین کے ساتھ اپنے ایک دوست کے پاس گیا تھا۔ رات کو زویا گھر میں اکیلی تھی۔''

''جی ہاں، آپ نے بتایا تھا۔''

''اس رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت زویا نے کال بیل کی آواز سنی تو دروازے پر گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم لوگ اتنی جلدی واپس آسکتے ہیں اس لیے اس نے پوچھا، کون ہے؟ پوچھنا چاہیے تھا نا؟''

''جی ہاں، یقیناً۔''

''جواب میں زویا نے جواب سنا..... طارق!''

''میرا نام؟'' طارق چونکا۔

''ہاں، کال بیل بجانے والے نے تمہارا ہی نام لیا تھا۔ لہجہ بھی تمہارا ہی جیسا تھا۔ اس کے باوجود زویا کو شبہ ہوا۔ اس نے سوچا، اتنی رات کو تم کیسے آسکتے ہو۔ اسی لیے اس نے دوبارہ پوچھا کہ کون ہے اور جواب میں پھر تمہارا ہی نام لیا گیا۔ کیا تم اس رات میرے گھر آئے تھے؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا انکل!..... اس رات کو تو ریحانہ سے میرا کچھ جھگڑا ہوگیا تھا اور میں ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔'' طارق نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''اتنی رات کو میں آپ کے گھر کیسے آتا جبکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ اور آنٹی گھر پر نہیں ہوں گے۔'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''پھر زویا نے کیا کیا؟''

''زویا نے دروازہ نہیں کھولا۔ جواب دے دیا کہ کل دن میں آیئے گا۔ اس نے تمہارے لہجے اور آواز پر تو یقین کرلیا تھا لیکن اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ تم ہوگے۔ جواب دے کر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو کال بیل پھر بجائی گئی۔ زویا نے سوچا کہ اگر وہ تم ہی ہو تو اس کے کھردرے جواب پر نہ جانے کیا سوچو۔ اسی لیے وہ پھر دروازے پر گئی اور اس نے پوچھا۔ اس وقت آپ کو کیا کام ہے طارق بھائی۔ لیکن اس سوال کے جواب میں کچھ نہیں کہا گیا۔ زویا نے پھر سوال دہرایا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ زویا پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں لوٹ گئی لیکن اس واقعے نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔''

''یہ تو قدرتی بات ہے۔ زویا کی جگہ کوئی بھی ہوتا، وہ خوف زدہ ہوجاتا۔''

داراب نے یہ کہانی اس لیے گھڑی تھی کہ وہ طارق کو زویا کے بے آبرو ہوجانے کی بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''بس اسی بات سے میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔ کسی نے زویا کو دھوکا دے کر گھر میں داخل ہونا چاہا تھا۔ آئندہ بھی ایسی کوئی بات ہوسکتی تھی اس لیے میں نے فوری طور پر یہ گھر چھوڑنے یا یوں کہہ لو کہ یہ شہر ہی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ شیراں کے بارے میں زویا نے اپنی ماں کو بتا ہی دیا تھا۔ انہی سے مجھے معلوم ہوا تو میرا دھیان شیراں ہی کی طرف گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے زیادہ پریشانی بھی ہوئی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے صرف تمہارا نام اور لہجے کی مشق کی ہوگی۔ اسی لیے وہ زویا کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکا کہ اس وقت کیا کام ہے۔ مختصر کرتا ہوں بات۔ اب میں یہاں آیا ہی اس لیے ہوں کہ اس شخص کا پتا

چلایا جائے جس نے زویا کو دھوکا دے کر گھر میں داخل ہونا چاہا تھا۔'' پھر داراب صرف ''اوہ!'' کہہ کر کچھ سوچنے لگا۔

''کیا خیال آگیا آپ کو انکل؟'' طارق نے پوچھا۔

''طارق۔'' داراب نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ تم نے کسی سے اپنا تعارف کرانے کے لیے اپنا نام بتایا ہو اور اس شخص نے تمہاری آواز ریکارڈ کرلی ہو؟''

طارق کے چہرے سے صاف ظاہر ہوا کہ وہ نہ صرف چونکا تھا بلکہ کسی سوچ میں بھی پڑ گیا تھا۔

داراب نے پوچھا۔ ''کوئی ایسی ہی بات یاد آرہی ہے کیا؟''

''تعارف کی بات نہیں ہے انکل..... اب میں سمجھ گیا ہوں۔ یہ حرکت شیراں ہی کی ہوسکتی ہے۔'' طارق کے لہجے میں اب غصے کی لہر تھی۔

''تم بڑے یقین سے کہہ رہے ہو یہ بات۔'' داراب نے کہا۔

''یقین کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ وہ زویا کو راہ چلتے پریشان کرنے لگا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ ایک دن میرے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹیپ ریکارڈر بھی تھا۔''

طارق نے وہ سارا واقعہ دہرا دیا۔

''ہوں۔'' داراب نے سر ہلایا۔ ''اس طرح اس نے دو مرتبہ تمہارا نام ریکارڈ کرلیا۔''

''جی ہاں، جو ٹیپ ریکارڈر اس کے ہاتھ میں تھا، وہ خراب نہیں ہوگا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور اسے یہ یقین بھی ہوگا کہ اسی قسم کا ٹیپ ریکارڈر سارے شہر کی دکانوں پر نہیں ہوگا۔ وہ یقیناً اسمگل کیا ہوا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ یہاں وہ ٹیپ ریکارڈر کوئی بھی نہیں منگواتا۔''

''تمہاری بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' داراب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا قوی امکان ہے کہ میرے گھر میں داخل ہونے کی وہ کوشش شیراں ہی نے کی ہوگی۔ اسے کسی طرح معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس رات ہم میاں بیوی گھر پر نہیں تھے اور زویا گھر میں اکیلی تھی لیکن اس کی مکمل تصدیق کرنی پڑے گی کہ اسی نے وہ ٹیپ ریکارڈر استعمال کیا تھا۔''

''اس کی تصدیق کیسے ہوسکتی ہے انکل؟''

''اب یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''اگر یہ ثابت بھی ہوجائے کہ یہ حرکت کرنے والا وہی تھا تو بھی آپ کیا کریں گے؟''

''یہ بھی تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''انکل!'' طارق کے لہجے میں تشویش آگئی۔ ''آپ کچھ اور کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟ یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اس کا باپ اردشیر اس شہر کا بے حد خطرناک آدمی ہے۔''

''میں کمانڈو تھا فوج میں طارق!..... ہمیں کسی سے ڈرنا نہیں سکھایا جاتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے انکل لیکن آپ کے دل میں کیا ہے؟''

''زویا کے دماغ پر اس واقعے کا بہت اثر پڑا ہے۔ اب اگر یہ حرکت شیراں کی ثابت ہوتی ہے تو میں اسے چھوٹا موٹا سبق تو دوں گا۔''

''آپ بڑے ہیں انکل! میں آپ کو سمجھانے کی جسارت کیسے کروں؟ زویا کے دماغ پر اس کا جو بھی اثر پڑا ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زائل بھی ہوجائے گا۔ اگر آپ نے شیراں کو کوئی چھوٹا موٹا سبق دینے کی کوشش کی تو کوئی بڑا قضیہ نہ کھڑا ہوجائے۔''

''میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ اب تبدیل نہیں ہوسکتا۔ اپنے اس ارادے سے میں نے نسرین کو بھی بے خبر رکھا ہے اور باجی کو بھی..... تم بھی ان سے ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔ پریشان ہوں گی وہ بھی۔''

''بہتر ہے۔'' طارق نے طویل سانس لی۔ ''لیکن اگر اس معاملے میں آپ..... کسی وقت میری ضرورت محسوس کریں تو میں حاضر ہوں۔''

''خیال رکھوں گا، اب تم جاؤ، اپنا اسٹور دیکھو۔''

طارق جب وہاں سے رخصت ہوا تو خاصا متفکر دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

طارق جب تک داراب کے سامنے رہا، صرف متفکر دکھائی دیتا رہا تھا لیکن گھر سے نکلنے کے بعد اس کے چہرے سے اشتعال ظاہر ہونے لگا۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ زویا کو ہراساں کرنے والا شیراں کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا لیکن اس کے خیال کے مطابق داراب کی نظر میں وہ مشکوک ہوسکتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ گھر میں زویا کی تنہائی کا علم صرف اسی کو تھا۔ شیراں کو اگر علم ہوتا تو وہ داراب کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش فوری طور پر کرتا جبکہ واقعہ خاصی دیر بعد پیش آیا تھا۔

طارق نے داراب کو شیراں کے ٹیپ ریکارڈر کا واقعہ سنا دیا تھا لیکن اس کے خیال کے مطابق ضروری نہیں تھا کہ

PakBooks.com

داراب نے اس پر یقین کرلیا ہو لیکن اس نے شیراں کے سلسلے میں بھی غصے کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس بارے میں مکمل تحقیق کرنا چاہتا تھا۔

اس کے خیال کے مطابق ضروری نہیں تھا کہ داراب نے اس کے بیان پر بھی مکمل یقین کرلیا ہو۔

انہی سب وسوسوں کے باعث طارق اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے اب اسے شیراں کی تلاش تھی۔

لیکن شیراں کی تلاش کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانا تو تھا نہیں، اور وہ اپنے باپ کے ساتھ بھی نہیں رہتا تھا۔

وہ دوپہر کو کھانا کھانے گھر گیا۔ اس سے پوچھا بھی گیا کہ داراب نے اسے کیوں بلایا تھا لیکن وہ رسمی جواب دے کر بات ٹال گیا۔ کھانا کھا کے اسٹور آگیا۔ اپنے معتمد ملازم کو سمجھا دیا کہ آج شاید وہ اسٹور نہ آسکے۔ اس کے بعد وہ پھر شیراں کی تلاش میں نکل گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں پوچھتا پھرا۔ بعض لوگوں نے اس کے سوال پر اسے شبہے کی نظروں سے بھی دیکھا لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ اس پر تو جنون سوار تھا کہ کسی طرح شیراں تک پہنچے۔ آخر رات کے آٹھ بجے کے قریب اس نے شیراں کو پا ہی لیا۔

اگرچہ شراب خانہ کھولنا قانوناً ممنوع تھا لیکن اس شہر میں کسی حد تک چوری چھپے کئی شراب خانے قائم تھے۔ شیراں ایک ایسے ہی شراب خانے میں ملا۔ غالباً وہ کچھ ہی دیر پہلے شراب خانے میں آیا تھا کیونکہ نشے میں نہیں تھا۔ اس نے ابھی پینی شروع کی ہی تھی۔ اس کے ساتھ دو لفنگے اور بھی تھے۔

طارق اس کی میز کے قریب جا کر رکا تو شیراں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے تمہاری تلاش تھی۔'' طارق نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مسکراتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''میں بے خبروں میں سے نہیں ہوں۔'' شیراں نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''معلوم ہو گیا تھا مجھے کہ تم مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔''

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟'' طارق نے اپنا لہجہ خوشگوار رکھا۔

شیراں نے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کے دونوں ساتھی بڑے غور سے طارق کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دراصل بزنس کی بات ہے۔'' طارق نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے پہچان تو گئے ہو گے؟''

''تمہیں کون نہیں پہچانے گا۔'' شیراں کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''شہر کے سب سے بڑے اسٹور کے مالک ہو۔ میں آیا بھی تھا ایک بار تمہارے اسٹور پر۔''

''میں اسی وجہ سے آیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تم ایک ٹیپ ریکارڈر لائے تھے نا، تم نے بتایا تھا کہ وہ خراب ہو گیا ہے اور تم بالکل ویسا ہی ایک ٹیپ ریکارڈر چاہتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ.....''

''مجھے سب یاد ہے۔'' شیراں نے منہ بنا کر بات کاٹی۔ ''آگے کی بات کرو۔''

''ویسا ٹیپ ریکارڈر مل گیا تمہیں؟''

''شہر میں نہیں ہے۔''

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ تو ویسا ہی پڑا ہو گا تمہارے پاس؟''

''ہاں، کیوں؟''

''میں وہ ٹیپ ریکارڈر خریدنا چاہتا ہوں۔''

''خراب ٹیپ ریکارڈر خریدو گے؟'' شیراں ہنسا۔

''ہاں۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''دراصل میرے ایک پرانے گاہک ہیں۔ ان کی فرمائش ہے کہ میں انہیں ویسا ہی ٹیپ ریکارڈر منگوا کے دوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اسی شہر میں کسی کے پاس ایک ایسا ٹیپ ریکارڈر ہے لیکن خراب ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ خراب ٹیپ ریکارڈر بھی خرید لیں گے۔''

''خراب ٹیپ ریکارڈر خریدنے والے بھی ہیں دنیا میں؟''

''دراصل وہ خود بھی اس فیلڈ کے ماسٹر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ٹیپ ریکارڈر ٹھیک کرلیں گے۔ وہ میرے بہت معزز گاہک ہیں۔ میں ان کی بات ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے آج تمہیں تلاش کرتا پھرا۔ مجھے امید تھی کہ تم نے ٹیپ ریکارڈر گھر میں کہیں ڈال دیا ہو گا۔''

''لیکن میں اسے بیچنا نہیں چاہتا۔''

''خراب ٹیپ ریکارڈر کا کیا کرو گے؟''

''نادر چیز ہے، پڑی رہے گی۔''

''میں اس کے اتنے ہی دام دے دوں گا جتنے کا تم نے خریدا ہو گا۔''

''لیکن میں بیچنا ہی نہیں چاہتا۔'' شیراں نے اپنی بات دہرائی۔

بات اس موڑ تک نہیں پہنچ رہی تھی جہاں طارق پہنچانا چاہتا تھا۔ اب اسے زیادہ صاف بات کرنی پڑی۔

''جب تم وہ ٹیپ ریکارڈر میرے پاس لائے تھے، اس میں کیسٹ تو لگا ہوا ہو گا؟''

''مطلب؟'' شیراں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''اور ٹیپ ریکارڈر بھی خراب نہیں تھا۔'' طارق نے زور دے کر کہا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' شیراں غرایا۔ ''جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟''

''اچھی طرح جانتا ہوں اور بہت کچھ سمجھ چکا ہوں۔ مجھے وہ کیسٹ تو لازمی چاہیے۔ تم نے اس میں میری آواز بھی ریکارڈ کی تھی۔''

''اچھا!'' شیراں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اتنی خوب صورت آواز ہے تمہاری؟''

''بہت خراب آواز ہے میری، لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اس سے پھر کوئی غلط کام لینا چاہو، جیسا کہ ایک بار لے چکے ہو۔''

چند لمحوں کے لیے شیراں کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پالیا اور ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''جاؤ یار! دماغ خراب نہ کرو میرا۔''

''تم اگر وہ کیسٹ مجھے نہیں دو گے تو بات بہت آگے بڑھ جائے گی۔ تم سے یہ بات کرنے کے لیے بہت تگ و دو کی ہے۔ میئر صاحب تک رسائی حاصل کر لی ہے میں نے۔'' طارق نے جھوٹ بولا۔ ''اگر تم نے مجھے وہ کیسٹ نہیں دی تو میں اس بارے میں میئر صاحب کو بتاؤں گا۔''

شیراں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''مجھے ابھی تمہارا جواب چاہیے۔'' طارق نے کہا۔

''ورنہ میں ابھی سیدھا میئر صاحب ہی کے پاس جاؤں گا۔''

''جن لوگوں کے دلوں میں ایسی خواہش پیدا ہو، وہ زندہ نہیں رہتے۔'' شیراں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں سب لوگوں کے سامنے بھی گولی مار سکتا ہوں تمہیں۔ کوئی بھی میرے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔'' شیراں نے یہ سب کچھ نہ صرف کہا بلکہ جیب سے ریوالور بھی نکال لیا۔

اس کے دونوں ساتھی جو اب تک بالکل خاموش رہے تھے، ان میں سے ایک بول پڑا۔ ''تم سے اس طرح

کی باتیں کرنے والے کو تو سسک سسک کر مرنا چاہیے استاد! یہاں سے لے چلو اسے۔ اس طرح ماریں گے کہ تڑپ تڑپ کر مرے۔''

''تو باندھ لو اسے۔'' شیراں نے کہا۔

طارق تیزی سے اٹھا تاکہ اپنا بچاؤ کر سکے۔

یہ سب کچھ ہوتا دیکھ کر شراب خانے میں ہلچل مچ گئی لیکن کوئی اتنی ہمت نہیں کر سکا کہ آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتا۔

شیراں کے ساتھیوں نے جھپٹ کر طارق کو جکڑ لیا لیکن پھر فوراً ہی ان کو تارے نظر آنے لگے۔ اگر دن ہوتا تو بھی انہیں تارے نظر آجاتے کیونکہ حملہ آور نے ان پر گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔

حملہ کرنے والا داراب تھا۔ اسے دیکھ کر طارق حیران رہ گیا۔ حیرانی کی اس کیفیت میں بھی وہ شیراں کی طرف سے غافل نہیں تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا جسے وہ کسی وقت بھی استعمال کر سکتا تھا۔

داراب نے چند لمحوں میں ان دونوں کی ایسی درگت بنائی کہ ان میں سے ایک تو فرش پر گر کر پھر نہ اٹھ سکا۔ ان سے کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں، ایک کمانڈو نکرایا تھا۔

طارق نے دیکھا کہ شیراں نے داراب کی طرف ریوالور سیدھا کیا تھا۔

''انکل..... وہ فائر کرنے والا ہے۔'' طارق چیخا۔

لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گولی چل چکی تھی، لیکن وہ کارگر اس لیے نہیں ہو سکی کہ لفظ ''فائر'' سنتے ہی داراب نے تیزی سے خود کو فرش پر گرا دیا تھا۔ گولی اس کے اوپر سے نکل گئی۔

داراب کو یقیناً اندازہ ہو گا کہ گولی کس نے چلائی ہو گی۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی جست لگائی اور طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے داراب اڑتا ہوا شیراں پر جا گرا ہو۔

شیراں اس کے نیچے دب گیا۔ اس کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی پر داراب کی گرفت بھی سخت ہو گئی۔ داراب نے اس کی کلائی موڑ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور گرانا چاہا۔ شیراں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط رکھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ کلائی مڑنے کی وجہ سے ریوالور کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف ہو گیا اور نہ جانے کیسے گولی بھی چل گئی۔

گولی نے نشانہ بھی شیراں کے دل کو بنایا تھا کیونکہ وہ فوراً بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

PakiBooks.site

شیراں کے ساتھیوں میں سے ایک تو فرش پر گرنے کے بعد اٹھ ہی نہیں سکا تھا اور دوسرے نے اپنے ''استاد'' کو گولی لگنے کے بعد وہاں سے کھسک لینا ہی مناسب سمجھا۔

داراب جب شیراں کی لاش کو چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہوا تو اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے لگ چکے تھے۔

کئی سپاہی دوڑتے ہوئے شراب خانے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کہیں آس پاس ہی گشت پر ہوں گے اور فائر کی آواز پر ہی شراب خانے کی طرف دوڑ پڑے ہوں گے۔

جب شیراں لاش میں تبدیل ہوا تو وہ سپاہی شراب خانے میں داخل ہو چکے تھے اور تیزی سے شیراں کی لاش کی طرف بڑھے تھے۔ داراب بھی وہیں کھڑا تھا۔ شیراں کا ریوالور اس کے ہاتھ سے گر کر لاش کے قریب ہی پڑا تھا۔

''یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں انکل!'' طارق نے داراب سے بڑی تیزی سے کہا۔

''نہیں۔'' داراب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے جو یہاں سے بھاگوں۔ وہ اپنے ریوالور سے خود کو ہلاک کر بیٹھا ہے۔''

☆☆☆

شیراں کا جو ساتھی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا، وہ وہاں سے سیدھا اردشیر کے پاس پہنچا تھا اور اپنے بیٹے کی موت کی اطلاع سن کر اردشیر چیخ پڑا تھا۔ ''کیا بک رہے ہو؟''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ماسٹر!'' اطلاع دینے والے کی آواز کانپ گئی۔

اردشیر گروپ کے سبھی لوگ اسے ''ماسٹر'' کہتے تھے۔

اردشیر پھر دہارا۔ ''یہ ہوا کیسے؟''

اطلاع دینے والے نے سارا واقعہ دہراتے ہوئے کہا۔ ''وہ شخص شیراں پر کود پڑا تھا۔ دونوں ہی گر گئے تھے پھر میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ شیراں نے خود پر تو گولی نہیں چلائی ہوگی۔''

اردشیر کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور اس پر نائب میئر ہمدانی کا نمبر ملایا جو اس کا خریدا ہوا آدمی تھا۔

کال ریسیو کی گئی۔ ہمدانی کی آواز آئی۔ ''ہیلو!''

''اردشیر بول رہا ہوں۔'' اس کی آواز میں اب بھی گھن گرج تھی۔ ''کسی نے میرے بیٹے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

''مجھے فوراً اطلاع مل گئی تھی اردشیر صاحب۔'' ہمدانی نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ ''میں جائے واردات پر پہنچ چکا ہوں۔ جن لوگوں میں جھگڑا ہوا تھا، وہ اب پولیس کی حراست میں ہیں اور انہیں پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا جا رہا ہے۔ لاش ایمبولینس میں رکھ دی گئی ہے۔ تمہارا ایک آدمی بھی بے ہوش پڑا ملا ہے۔'' ہمدانی نے وضاحت سے جواب دیا۔

''میں اس شخص کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہوں گا۔ کیس ایسا بننا چاہیے کہ وہ بچ نہ سکے۔ اس نے جس شخص کی حمایت میں جھگڑا شروع کیا تھا، وہ بھی حراست میں لیا گیا ہے؟''

''جی ہاں، میں نے بتایا تھا نا کہ جھگڑا کرنے والوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔'' ہمدانی نے جواب دیا۔

''میرے آدمی کو فوراً چھوڑ دو۔''

''تھوڑی سی رسمی کارروائی تو کرنی پڑے گی۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اردشیر پھر زور سے بولا۔ ''بھول گئے ہو کیا کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟''

''صورتِ حال کچھ خراب ہے۔ میں آپ کو آدھے گھنٹے بعد فون کر کے بتاؤں گا۔''

''کیا صورتِ حال خراب ہو گئی ہے؟'' اردشیر غصے میں ہی بول رہا تھا۔

بیٹے کی موت پر باپ کے چہرے پر غم کا تاثر بھی ہونا چاہیے تھا لیکن اردشیر صرف غصے میں نظر آ رہا تھا۔

''میں نے ابھی کہا کہ میں آپ کو آدھے گھنٹے بعد فون کر کے صورتِ حال کے بارے میں بتاؤں گا۔'' ہمدانی کی آواز آئی۔

اردشیر غرایا۔ ''آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنا چاہیے۔'' اس نے کچھ اور سنے بغیر فون بند کر دیا۔ اسے ہمدانی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ جس نے فوراً اس کی بات ماننے کے بجائے کسی خراب صورتِ حال کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی بات فوراً ماننے سے گریز کیا تھا۔

اطلاع دینے والا ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔

''تم۔'' اردشیر نے اس پر غصیلی نظر ڈالی۔ ''میرے بیٹے کو گولی مار دی گئی اور تم بزدل وہاں سے بھاگ آئے۔ تم نے اس پر گولیاں نہیں برسائیں۔ تمہیں اس بزدلی کی کیا سزا ملنا چاہیے؟''

اطلاع دینے والے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ ''ماسٹر!'' اس کی آواز کانپ گئی۔ ''وہ شخص لڑائی بھڑائی کا بہت ماہر

ہے۔ آپ میرا چہرہ دیکھ رہے ہیں؟''

اس کے چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے، خراشیں بھی تھیں۔

اردشیر نے جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے اس منحوس چہرے کے ساتھ قبر میں چلے جاؤ۔''

''ماسٹر!'' اطلاع دینے والا گڑگڑاتا ہوا اردشیر کے قدموں میں گر گیا۔ اردشیر نے ریوالور کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔

''ماسٹر، رحم!'' اطلاع دینے والا پھر گڑگڑایا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

اردشیر نے اسے ٹھوکر ماری۔ ''دور ہو جا میری نظروں سے۔''

اطلاع دینے والا اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اردشیر کا غضب کے مارے برا حال تھا۔ بار بار اس کی نظر گھڑی کی طرف جاتی رہی۔ آدھا گھنٹا گزرتے ہی اس نے موبائل جیب سے نکال لیا، جیسے اس کے خیال کے مطابق ہمدانی کی کال آتی ہی ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''اُلّو کا.....'' اس نے دانت پیستے ہوئے ہمدانی کی شان میں ''قصیدہ'' پڑھا۔

پھر پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ ہمدانی کی کال نہیں آئی۔ اردشیر نے ارادہ کیا کہ خود اسے فون کرے لیکن پھر اس نے سر جھٹک کر موبائل جیب میں ڈالا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکلا۔ گھر سے نکلنے کے لیے اسے ایک ہال سے بھی گزرنا تھا۔ وہاں اس نے اپنے گروپ کے کئی افراد کو دیکھا جو اسے دیکھتے ہی ادب سے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہی میں شیراں کی موت کی اطلاع دینے والا بھی تھا جس نے اپنی مرہم پٹی کرا لی تھی۔

گھر سے نکل کر اردشیر اپنی کار میں بیٹھا۔ جلد ہی اس کی کار سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس کا رخ پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ بیس منٹ بعد اس کی کار پولیس ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں جا رکی پھر اس نے کار کا دروازہ کھولنا ہی چاہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا۔

کال ہمدانی کی تھی۔

''ایک گھنٹے بعد؟'' وہ ماؤتھ پیس میں غرایا۔

''صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔'' ہمدانی نے کہا۔ ''میں نے آپ کو فون اسی لیے کیا ہے کہ آپ پولیس ہیڈ کوارٹر آ جائیں۔''

''آ چکا ہوں۔'' اردشیر غرایا۔

''کہاں ہیں؟'' ہمدانی نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی کمپاؤنڈ میں کار روکی ہے۔''

''بہتر ہے۔ آپ سیکنڈ فلور پر آ جائیں۔''

اردشیر نے جواب دیے بغیر رابطہ منقطع کیا اور موبائل جیب میں ڈالتا ہوا کار سے اُتر آیا۔

وہ دوسری منزل پر پہنچا ہی تھا کہ ہمدانی نظر آ گیا جو تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اردشیر غرایا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ عرش پر پہنچا ہوا ہے؟''

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ صورتِ حال کچھ نازک ہو گئی ہے۔ میں جالب سے کچھ بہانہ کر کے کمرے سے نکلا ہوں تاکہ آپ کو حالات سے آگاہ کر دوں۔''

''جالب کون؟''

''میئر صاحب کا ایک قریبی عزیز ہے۔ اس وقت وہ بھی شراب خانے میں تھا جب شراب خانے میں جھگڑا ہوا۔ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا اس لیے میں داراب کے خلاف کوئی کیس نہیں بنا سکتا۔''

''داراب؟ یعنی جس نے میرے بیٹے کو گولی ماری؟''

''جی۔'' ہمدانی نے کہا۔ ''اس کا بیان ہے کہ شیراں کو داراب نے ہلاک نہیں کیا۔ اس نے بس شیراں کے ہاتھ سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تھی تو ریوالور کی نال کا رخ شیراں کی طرف ہو گیا تھا اور نہ جانے کیسے ٹریگر پر شیراں کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا اور گولی چل گئی تھی۔''

''کیا بکواس ہے۔'' اردشیر غرایا۔

''سمجھنے کی کوشش کیجیے۔'' ہمدانی نے التجا کرنے والے انداز میں کہا۔ ''شراب خانے میں اس وقت جو لوگ موجود تھے، وہ میرے کسی بھی اقدام کے خلاف بیان دینے کی جرأت نہیں کرتے لیکن اب اگر میں نے داراب کے خلاف کیس بنانے کی کوشش کی تو جالب کے ذریعے یہ بات میئر صاحب تک پہنچ جائے گی۔ حالات بہت خراب ہو جائیں گے۔''

''ہوں۔'' اردشیر کے ہونٹ بھنچ گئے۔

''آیئے۔'' ہمدانی واپسی کے لیے کھڑا ہوا۔ ''آپ کو میں نے ابھی اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ اپنے آدمی کو ضمانت پر ابھی رہا کروالیں۔''

PakBooks.Site

''اور داراب؟ اس کا ساتھی؟''

''ان کا بیان بھی لیا جا چکا ہے۔ ان دونوں کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ داراب نے اپنے کسی دوست کو فون کیا ہے۔ وہ آکر ان دونوں کی ضمانت کرالے گا۔''

''یعنی قاتل کو چھوڑ دیا جائے گا؟'' اردشیر نے دانت پیسے۔

''اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' ہمدانی نے کہا۔ ''جس پولیس آفیسر کے ہاتھ میں یہ کیس ہے، وہ تو میرے اشارۂ ابرو پر کام کرتا لیکن میں جالب کی وجہ سے داراب کے خلاف فوری طور پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا، البتہ بعد میں کوشش کی جاسکتی ہے کہ اس کیس میں کوئی بگاڑ پیدا کر کے داراب کو جکڑا جاسکے۔''

''بعد میں؟'' اردشیر کے لہجے میں غراہٹ پھر عود کر آئی۔ ''جبکہ میں اپنے بیٹے کے قاتل کو ایک دن کے لیے بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''اب ہم اس پر بعد میں بات کرلیں گے۔'' ہمدانی نے ایک دروازے پر رک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''جالب اسی کمرے میں ہے۔''

اردشیر کے ہونٹ پھر بھنچ گئے۔ ہمدانی نے دروازہ کھولا اور اردشیر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

اردشیر نے وہاں ایک پولیس آفیسر کو جس شخص سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا، اس کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ تھی۔

''یہ جالب صاحب ہیں۔'' ہمدانی نے جالب سے اردشیر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کل ہی امریکا سے آئے ہیں۔ میئر صاحب ہی کے گھر میں ٹھہرے ہیں۔ دراصل یہ میئر صاحب کی اہلیہ کے چچازاد بھائی ہیں۔'' پھر وہ جالب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''جالب صاحب! یہ مقتول کے والد ہیں۔ یہ اپنے بیٹے کے ساتھی کی ضمانت کرانے آئے ہیں۔''

''اردشیر نام بتایا تھا نا آپ نے ان کا؟'' جالب بولا۔

''جی ہاں۔''

جالب نے اردشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے بیٹے کے قتل پر افسوس کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔''

اردشیر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اچھا ہمدانی صاحب!'' جالب کھڑا ہوگیا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

کمرے سے اس کے رخصت ہوتے ہی اردشیر بولا۔ ''میرے آدمی کی ضمانت کے سلسلے میں جو کارروائی کرنی ہے، وہ کرو اور میرے بیٹے کی لاش میرے حوالے کرو۔''

''وہ تو آپ کو کل ہی مل سکے گی۔'' ہمدانی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' اردشیر پھر غرایا۔

''قانونی طور پر اس کا پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔''

''یعنی میرے بیٹے کے جسم کی چیر پھاڑ بھی ہوگی؟''

ہمدانی نے اسے جواب دینے کے بجائے پولیس آفیسر کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں اردشیر صاحب!'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور بات کھل گئی تو ہمدانی صاحب کے لیے بھی مسئلہ ہوجائے گا۔''

چند لمحے کے لیے اردشیر کے ہونٹ بھنچ گئے، پھر اس نے پوچھا۔ ''قاتل کی ضمانت کب ہوگی؟'' اس کے لہجے میں نکیلا پن تھا۔

''اس میں تو شاید ابھی ایک گھنٹا اور لگے۔'' پولیس آفیسر ہی نے جواب دیا۔ ''جو صاحب ضمانت کرانے آئیں گے، وہ کسی معاملے میں پھنسا ہونے کی وجہ سے فوراً نہیں آسکے۔ انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے بعد آنے کے لیے کہا تھا اور ابھی ایک گھنٹا باقی ہے۔''

''شیراں کا دوست کہاں ہے؟''

''فی الحال تو وہ تینوں ہی لاک اَپ میں ہیں۔''

''خیر۔'' اردشیر نے کہا۔ ''میرے بیٹے کے دوست کی ضمانت کے سلسلے میں جو کارروائی کرنی ہے، وہ جلدی سے کروالیں۔''

''میرے ساتھ آیئے۔'' پولیس آفیسر کھڑا ہوگیا۔

نصف گھنٹے بعد اردشیر اپنے ساتھی کو لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوگیا۔

''جھگڑا کیوں ہوا تھا؟'' اردشیر نے سوال کیا۔

''بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکی ماسٹر!..... کسی ٹیپ ریکارڈر اور اس میں لگے ہوئے کیسٹ کی بات تھی اور.....''

''یہ ساری کہانی میں جونی سے سُن چکا ہوں۔'' اردشیر نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قتل داراب نے کیا تھا یا.....''

''مجھے تو پتا نہیں ماسٹر! میں اس سے پہلے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔''

''جونی کا بیان ہے کہ جب شیراں اور داراب گتھم گتھا تھے تو اس نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ اسے یقین تو نہیں کہ گولی چلانے والا کون تھا لیکن مجھے یہ بات غلط معلوم ہورہی ہے کہ جب گولی چلی تو ریوالور شیراں کے ہاتھ میں تھا۔''

''یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آسکی کہ شیراں نے خود ہی اپنے آپ کو ہلاک کیا تھا۔''

''شیراں کی تربیت خود میں نے کی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ میں ریوالور ہو اور دھینگا مشتی کی صورت میں ریوالور کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف ہوجائے تو اسے ٹریگر سے انگلی ہٹا لینی چاہیے۔ خیر جو بھی ہوا ہوگا، پتا چل جائے گا۔''

پھر وہ دونوں گھر پہنچنے تک خاموش ہی رہے۔

گھر کے بڑے ہال میں اردشیر کے کچھ آدمی اب بھی موجود تھے۔ اردشیر نے ان میں سے چار آدمیوں کا گروپ بنایا۔ اس گروپ میں جونی بھی تھا جس نے اردشیر کو شیراں کی موت کی اطلاع دی تھی۔

''تم چاروں ابھی پولیس ہیڈ کوارٹر روانہ ہوجاؤ۔'' اس نے حکم صادر کیا۔ ''ڈیڑھ گھنٹے بعد داراب دوسرے آدمی کے ساتھ وہاں سے نکلے گا۔ یہ امکان بھی ہے کہ وہ دونوں جلدی وہاں سے نکلیں۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ فوراً روانہ ہوجاؤ۔ داراب پر نظر رکھو۔ جیسے ہی موقع ملے، اسے گولی مار دو۔''

''ٹھیک ہے ماسٹر۔'' ایک آدمی نے کہا۔ ''لیکن ہم داراب کو پہچانیں گے کیسے؟''

''بے وقوف! کیا جونی کو میں نے بلاوجہ تمہارے ساتھ کیا ہے؟ اور کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جونی نے اس آدمی کو دیکھا ہے؟ اے جونی! کیا تم نے بتایا نہیں اپنے ساتھیوں کو کہ تم داراب کو دیکھ چکے ہو؟''

''بتا دیا تھا ماسٹر!'' جونی نے آہستہ سے جواب دیا۔

اردشیر نے کھا جانے والی نظروں سے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''فوراً روانہ ہوجاؤ تم لوگ۔ آج رات داراب کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔''

وہ چاروں بڑی عجلت میں رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

داراب اور طارق کی ضمانت، داراب کے اسی دوست نے لی تھی جس کے گھر کبھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ جایا کرتا تھا اور ایسے ہی موقع پر زویا، شیراں کی زیادتی کا شکار ہوئی تھی۔

وہ تینوں پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکلے تو طارق بولا۔ ''میں نے پولیس والوں کے سامنے ایک سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ میں اس کے لیے بہت بے چین تھا۔''

''ایسی کیا بات ہے؟ اچھا چھوڑو، بعد میں بات کریں گے۔'' داراب نے جواب دیا، پھر اپنے دوست کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''تم نے اس وقت مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں اس کا شکریہ اس لیے ادا نہیں کروں گا کہ ہماری دوستی یہ رسم ادا کرنے کا تقاضا نہیں کرتی۔''

دوست ہنس پڑا، پھر اس نے کہا۔ ''خیر، اب ذرا چوکس رہنا۔ یہ شہر بہت زہریلا بن چکا ہے۔ بڑی احتیاط سے زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔''

''وہ تو اندازہ ہوچکا ہے مجھے۔'' داراب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہرحال اب تم جاؤ۔ بھابی پریشان ہوں گی۔ خاصی رات گزر چکی ہے۔''

''ہاں انہیں تو اب جانے دیں انکل۔'' طارق بولا۔

پولیس نے ضمانت کے بعد اس کی کار بھی واپس کردی تھی جسے طارق کی گرفتاری کے ساتھ ہی پولیس ہیڈ کوارٹر لے آیا گیا تھا۔

دو ایک رسمی باتوں کے بعد داراب کا دوست اپنی کار میں چلا گیا۔ داراب کے ساتھ طارق اپنی کار کی طرف بڑھا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ تم کیا پوچھنے کے لیے بے چین ہو۔'' داراب نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگے کہ میں شراب خانے میں اسی وقت کیسے پہنچ گیا جب شیراں سے تمہارا جھگڑا شروع ہوا تھا۔''

''جی ہاں۔'' طارق نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔''

''بتاتا ہوں۔'' داراب جواب دیتے ہوئے کار کے سامنے سے گھوم کر کار کے دوسرے دروازے کے قریب پہنچا۔

طارق ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ داراب دروازہ کھول کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''جی؟'' طارق سوالیہ انداز میں کہتے ہوئے کار حرکت میں لے آیا۔

PakBooks.site

''دراصل۔'' داراب نے کہا۔ ''جب تم میرے گھر سے روانہ ہوئے تھے، میں ایک ٹیکسی میں تمہارا تعاقب شروع کر چکا تھا لیکن اس سے یہ مطلب نہ لینا کہ مجھے تم پر شبہ تھا۔ مجھے خیال یہ آیا تھا کہ میں تو اس معاملے کی مکمل تحقیق کرنے کی بات کر چکا تھا لیکن میرے خیال میں امکان یہی تھا کہ تم بھی.....'' داراب نے بات ادھوری چھوڑ کر کہا۔

''تمہارے ذہن میں یہ بات تھی کہ مجھے تم پر بھی شبہ ہو سکتا ہے اس لیے تم بھی اس کی تحقیق میں لگ سکتے ہو۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اس سلسلے میں کیا قدم اٹھاؤ گے۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ تم شیراں سے مل کر بات کرو گے، کوئی منصوبہ ہو گا تمہارے ذہن میں۔ میرا یہ شک درست بھی ثابت ہوا۔ میں شراب خانے میں تمہاری میز کے قریب ہی کی ایک میز پر جا بیٹھا تھا۔ مجھے تم پر قطعاً شبہ نہیں تھا طارق! میں انسان کی صورت شکل سے ہی اس کے کردار کا اندازہ لگا لیتا ہوں، اور میں نے تمہیں ہرگز غلط نہیں سمجھا تھا۔''

کار اس وقت ایک ایسی سڑک پر تھی جہاں روشنی کم تھی اور رات زیادہ گزر جانے کے باعث ٹریفک بھی برائے نام تھا۔

''شکریہ انکل کہ آپ نے مجھے ایسا ویسا آدمی نہیں سمجھا۔'' طارق نے کہا۔

''اور پھر مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا کہ تم نے شیراں کے ٹیپ ریکارڈر کی کہانی غلط نہیں سنائی تھی۔''

''کیا آپ اتنے قریب تھے کہ شیراں سے میری باتیں سن سکتے تھے؟''

''میری سماعت اتنی تیز نہیں ہے لیکن.....'' داراب نے اپنے فاؤنٹین پن کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بہت حساس ریکارڈر ہے۔ جب میں پولیس سے اجازت لے کر ٹوائلٹ میں گیا تھا تو میں نے اس کی آواز کم کر کے ریکارڈنگ سن لی تھی۔''

''گڈ!'' طارق نے خوش ہو کر کہا۔ ''ابھی مقدمہ تو چلے گا۔ یہ ریکارڈنگ اس وقت کام آ سکتی ہے۔''

''ہو سکتا ہے لیکن شاید اس کی نوبت نہ آئے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''اس سوال کا میرے پاس کوئی مدلل جواب نہیں ہے۔''

''خیر! شیراں کو اپنے کیے کی سزا تو مل گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بہت زیادہ مل گئی ہے۔''

داراب نے اس کی بات ٹالنے کے لیے کہا۔

''تمہاری اتنی لمبی غیر حاضری سے باجی اور تمہاری بیوی تو بہت پریشان ہوں گی۔ انہوں نے تمہیں فون نہیں کیا؟''

''پریشان تو اس لیے ہوں گی کہ فون پر ان کا مجھ سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں جھوٹی سچی کہانی سناؤں۔''

''اب تو فون کھول لو۔''

''کیا فائدہ انکل..... اب میں گھر پہنچ ہی جاؤں گا۔ خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔ اب آپ کو اردشیر سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے بیٹے کا قاتل آپ کو ہی سمجھ رہا ہو گا۔''

''ایسے لوگوں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے۔''

''میں حیران رہ گیا تھا آپ کو لڑتے دیکھ کر۔ آپ بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ آج معلوم ہوا کہ کمانڈوز کیسے ہوتے ہیں۔''

داراب مسکرا کر رہ گیا۔

''مقدمہ چلنے تک اب آپ کو یہاں رکنا تو پڑے گا؟''

''ہاں، مجبوری ہے۔''

''زویا اور..... چچی؟''

''دیکھوں گا، کیا کہہ سکتا ہوں ان سے.....''

اسی قسم کی باتوں میں داراب کا گھر قریب آ گیا۔ اسی وقت ایک تیز آواز سنائی دی۔ طارق نے چونک کر عقب نما آئینے میں دیکھا۔ اسے کسی کار کی تیز ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ کار بہت تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

''انکل ایک کار بہت غیر معمولی تیزی سے آگے آ رہی ہے۔''

''کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔'' داراب کے لہجے میں تشویش تھی۔

گھر بالکل قریب آ گیا تھا۔ طارق کے کار روکتے روکتے داراب نے اپنی طرف کا دروازہ کھول لیا تھا۔

''میں اُتر رہا ہوں۔'' داراب نے تیزی سے کہا۔ ''تم بہت تیزی سے آگے بڑھ جانا۔ اگر وہ ہمارا کوئی دشمن ہے تو وہ تمہیں شاید کوئی نقصان نہ پہنچائے۔''

طارق نے کار روک دی تھی۔ ''آپ جائیے، جب آپ اندر چلے جائیں گے تو میں بھی چلا جاؤں گا۔''

داراب کی چھٹی حس اسے شدید خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے طارق کی بات اس طرح سنی جیسے سنی ہی نہ ہو۔ وہ کار سے اُتر کر دروازہ بند کرتے ہوئے تیزی سے

اپنے گھر کے چوبی دروازے کی طرف بڑھا۔

کار اب تقریباً قریب آ چکی تھی۔

داراب چوبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا جب عقب سے آنے والی کار سر پر آ گئی پھر اسی کار سے پے در پے دو فائر ہوئے۔ داراب کی چیخ سنائی دی اور وہ دروازے کے قریب ہی ایک کیاری میں گرتا دکھائی دیا۔

فائر کرنے والی کار تیزی سے آگے نکلتی چلی گئی۔ اس نے اپنی رفتار میں بھی اضافہ کیا تھا۔

طارق کا دل بہت شدت سے اُچھلا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ اس کار کا تعاقب کرتا لیکن اس نے دوسری صورت کو ترجیح دی۔ داراب کی خبر لینا ضروری تھا۔ وہ کار کی ہیڈ لائٹس بند کر کے انجن بند کیے بغیر گھر کے دروازے کی طرف لپکا۔

آس پاس جو گھر تھے، ان کے مکین اب گولیاں چلنے کی آوازیں سننے کے عادی ہو چکے تھے اور اب تو رات بھی بہت گزر چکی تھی۔ کسی نے کھڑکی کھول کر جھانکنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

طارق چوبی دروازے سے تیزی سے گزرا۔ نیم تاریکی میں اس نے داراب کو کیاری سے اٹھتے دیکھا۔

''انکل!'' طارق نے تیزی سے کہا۔ ''گولی کہاں لگی ہے؟''

داراب کو کھڑا ہوتے دیکھ کر اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ گولی نے داراب کو کوئی خطرناک نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

داراب کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ ''کوئی گولی نہیں لگی۔''

''تو..... تو وہ..... آپ کی چیخ.....؟''

''چیخا میں جان کر تھا۔'' داراب نے جواب دیا۔ ''فائر کرنے والے یا والوں کو یقین دلانا ضروری تھا کہ وہ کامیاب ہو گئے ہیں مجھے ختم کرنے میں۔''

''یہ اردشیر ہی کے آدمی ہوں گے۔'' طارق نے کہا۔

''آپ کے دوست نے پولیس ہیڈ کوارٹر سے چلتے وقت کہا بھی تھا کہ بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

''مجھے اتنی جلدی اس کی طرف سے کسی خطرناک اقدام کا خیال نہیں تھا۔ اچھا اب تم جاؤ۔ اپنے گھر والوں کو اور پریشان نہ کرو۔ وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ میں نے بعد میں گولیاں چلنے کی آوازیں نہیں سنیں۔ اگر وہ تمہیں بھی نقصان پہنچانا چاہتے تو کار پر بھی گولیاں برساتے۔''

''کار بھی اب بہت دور نکل چکی ہو گی۔''

''بس اب تم جاؤ۔'' داراب نے اپنی بات دہرائی۔

''آج نیند تو اڑ ہی جائے گی میری۔ یہی واقعہ ذہن میں گونجتا رہے گا۔''

''کل بات کریں گے اس بارے میں، اب جاؤ۔''

داراب کی تیسری تاکید کے بعد طارق واپسی کے لیے مڑ گیا۔

داراب اپنی جگہ پر اس وقت تک رکا جب تک اس نے کار کے جانے کی آواز نہیں سن لی۔ پھر وہ مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے لائٹ جلائی۔ اس وقت اگر طارق ہوتا تو روشنی میں یہ دیکھ کر گھبرا جاتا کہ داراب کی پیٹھ پر خون کا دھبا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔

گولی اس کی پیٹھ پر کسی جگہ لگی تھی۔ داراب کا اندازہ تھا کہ گولی نے اس کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ مونڈھے اور بغل کے نیچے کسی جگہ تھی۔ ہڈی کو نقصان پہنچنے کی صورت میں وہ شدید تکلیف محسوس کرتا۔

اس نے طارق کو جلد از جلد اس لیے رخصت کیا تھا کہ وہ خون دیکھ کر گھبرا جاتا اور فوراً کسی اسپتال کا رخ کرنے کی بات کرتا جبکہ داراب ایسا نہیں چاہتا تھا۔

وہ خواب گاہ میں پہنچا۔ لائٹ جلا کر اس نے الماری سے ایک بریف کیس جیسا باکس نکالا اور اسے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے باتھ روم میں داخل ہوا اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بریف کیس نما باکس اس نے اپنے سامنے رکھا اور قمیص اتارنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر تکلیف کا ہلکا سا تاثر ابھرا۔ قمیص کے بعد اس نے اپنی بنیان بھی اتاری جو خون میں بہت زیادہ بھیگ چکی تھی۔ وہ آئینے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہوا اور سر موڑ کر آئینے میں اپنی پشت دیکھی۔ خون کمر تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے باکس سے روئی نکالی اور ہاتھ پیچھے کر کے خون صاف کرنے لگا۔ خاصی روئی صرف کرنے کے بعد اس کی پیٹھ اس حد تک صاف ہو گئی کہ وہ سوراخ نظر آنے لگا جس سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔

اب داراب نے باکس میں سے جو اوزار نکالے، وہ آپریشن میں کام آتے ہیں۔ گولی جسم سے نکالنے میں اسے زیادہ تکلیف محسوس ہوئی اور وقت بھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ خاصی تکلیف برداشت کرنے کے بعد وہ آخر کار اپنی ڈریسنگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

PakiBookLite

باقی پیٹھ پھر خون سے رنگین ہو چکی تھی جو اس نے گیلی روئی اور پھر تولیے سے مکمل طور پر صاف کی۔ اس کے بعد الماری سے شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن کر اپنا مخصوص ''آپریشن باکس'' بند کیا۔ اپنا زیریں لباس نکال کر اس نے انہیں واش بیسن میں اس طرح نچوڑا کہ اس میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا۔ ہاتھ دھو کر اس نے وہ کپڑے ایک بڑے صاف کپڑے میں اس طرح باندھے کہ گٹھری سی بن گئی۔ وہ گٹھری اس نے باتھ روم ہی کے ایک گوشے میں ڈال دی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ گھنٹوں میں گٹھری خشک ہو جائے گی۔

منہ دھو کر اس نے اپنے بال درست کیے اور باکس اٹھا کر باتھ روم سے نکل آیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر اسے بھوک کا احساس ہوا۔ اس نے فریج سے نکال کر کچھ کھایا اور پھر لیٹ گیا۔ لیٹنا بھی اسے کروٹ کے بل پڑا۔ جس طرف گولی لگی تھی، اس کروٹ سے وہ لیٹ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ شدید تکلیف ہوتی۔

رات خاصی گزر چکی تھی، پھر بھی اسے مزید تاخیر سے نیند آئی۔ وہ صبح اٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے حرارت ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے اٹھا۔ نہانا اس نے مناسب نہیں سمجھا، بس منہ ہاتھ دھو کر، کئی کلیاں کر کے اس نے اپنے لیے ناشتا تیار کیا۔ ناشتا کرنے کے بعد اس نے کپڑے تبدیل کیے اور ایک خاصا موٹا سویٹر پہنا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی وہ جسم گرم رہنے سے حرارت ختم ہو سکتی تھی۔ دوسرے اس طرح اس کے شانے کا وہ ابھار بھی دیکھنے والے کو کچھ کم محسوس ہوتا۔

ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے وہ بستر پر لیٹ گیا۔ چند منٹ کام کرنے کے بعد اسے کچھ تیاریاں کرنی تھیں لیکن دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر بیرونی دروازے پر پہنچا۔

''کون ہے؟'' اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں انکل، طارق۔'' باہر سے آواز آئی۔

''سامان لے آئے؟''

''کیسا سامان؟'' آواز میں حیرت تھی۔

داراب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ سامنے طارق کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔

''آؤ۔'' داراب نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول دیا۔

طارق اندر آ گیا۔ داراب نے دروازہ بند کیا۔

''میں معافی چاہتا ہوں انکل۔'' طارق بولا۔ ''مجھے بالکل یاد نہیں۔ آپ نے کیا سامان منگوایا تھا؟''

''کچھ نہیں۔'' داراب کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ یوں ہی خیال آ گیا تھا کہ پھر کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا کھیل نہ کھیلا ہو۔''

اب طارق بھی مسکرایا۔ ''احتیاط بہر حال اچھی چیز ہے۔ خاص طور سے ان حالات میں جبکہ کل رات ہی آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

داراب اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور بولا۔

''اتنی صبح کیسے آ گئے؟''

''میں تو اس سے بھی جلدی آ جاتا۔ رات کو نیند ہی نہیں آئی۔ آپ کی طرف سے متفکر تھا۔ یہ آپ کا ایک مونڈھا کیوں ابھرا ہوا ہے؟''

''رات کو گرا تھا نا، کوئی پتھر لگ گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے سوجن ہو گئی ہے۔''

''ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟''

''ارے نہیں۔'' داراب ہنسا۔ ''ابھی ناشتے کے بعد دوا لے لی ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گی سوجن۔ اچھا ہوا کہ تم... آ گئے ورنہ میں آتا تمہارے اسٹور۔''

''کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں۔'' داراب کے لہجے میں سنجیدگی آ گئی۔ ''ایک معاملے میں شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔''

''حکم دیجیے۔''

''معلوم کرنا ہے کہ اردشیر کا گھر کہاں ہے، اگر اس کا فون نمبر مل جائے تو اور بہتر ہو گا۔''

''فون کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن گھر کا پتا تو کسی طرح معلوم کر ہی لوں گا لیکن.....'' طارق کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ ''ارادہ کیا ہے آپ کا؟''

''طارق!'' داراب کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا۔ ''شیراں نے زویا کے سلسلے میں جو پریشان کن حرکت کی تھی، اس کی سزا تو اسے مل ہی گئی ہے۔ مر چکا ہے شیراں لیکن اس نے مجھ پر گولیاں چلوا کر مجھے بہت شدید غصہ دلایا ہے۔ میں تو خیر اس شہر سے چلا جاتا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس شہر کو ان ناپاک لوگوں سے پاک کرنا چاہیے۔ کھلے عام گولیاں چلاتے ہیں کم بخت..... میں اب اس شہر کو پُرسکون کر کے ہی جاؤں گا۔''

''اس خطرناک گینگ سے ٹکر لیں گے؟''

''ہاں، کمانڈو ہوں میں۔ خطرناک بے معنی لفظ ہوتا ہے کمانڈوز کے لیے۔''

''لیکن.....''

''کوئی سوال نہیں۔'' داراب نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ ''مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کام میں نے کہا ہے، وہ اگر تم آسانی سے کر ڈالو تو کرنا، کوئی خطرہ مول نہیں لینا۔ میں خود معلوم کر لوں گا۔''

''میں معلوم کر لوں گا انکل لیکن آپ بہت احتیاط سے کام لیجیے گا۔''

''اس شہر کو گندگی سے پاک کرنے کے لیے میں موت کے منہ میں چھلانگ لگانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا، مجھ سے اس بارے میں کوئی بات اب نہ کہنا۔''

''بہتر ہے۔'' طارق نے آہستہ سے کہا۔

''اب تمہیں اپنے اسٹور جانا چاہیے۔'' داراب نے کہا۔ ''اردشیر کا پتا لگانے کے سلسلے میں کوئی خطرہ مول نہ لینا۔''

''جی.....'' طارق کی آواز دھیمی تھی۔

اس کے جانے کے بعد داراب نے الماری سے ایک چرمی کیس نکالا اور اسے کھولا۔ اس میں یوزی سب مشین گن رکھی تھی۔

اس سب مشین گن کا وزن سات اور نو پاؤنڈ کے درمیان ہوتا ہے جسے شانے سے لگا کر دشمن پر فائر کرنے کے علاوہ شانے سے لگائے بغیر بھی کام میں لایا جا سکتا ہے اگر کسی میں اتنا وزن اٹھانے کی طاقت ہو۔

الماری سے داراب نے ایک ریوالور نکالا جو دنیا کے خطرناک ترین ریوالوروں میں سے تھا۔ داراب ان دونوں خطرناک ہتھیاروں کی صفائی کرنے لگا کیونکہ انہیں عرصہ دراز سے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اب داراب نے جو فیصلہ کیا تھا، اس کی وجہ سے ان چیزوں کی ضرورت کسی وقت بھی پڑ سکتی تھی۔ اگر داراب یہ فیصلہ نہ بھی کرتا تو وہ مقدمے کا فیصلہ ہونے تک اس شہر میں رکنے پر مجبور تھا۔ شاید اسی مجبوری کے باعث اس نے جرائم پیشہ افراد پر اتنی شدید ضرب لگانے کا فیصلہ کیا تھا کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے۔

☆☆☆

دوسرے دن اردشیر کو اپنے بیٹے کی لاش مل گئی۔ تدفین کے بعد وہ کچھ افسردہ تھا لیکن اس کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ ناخوشگوار واقعات کو جلد از جلد اپنے ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ جلد ہی اس نے سوچ لیا کہ جو ہونا تھا، سو ہو گیا۔ اب اسے آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اسے یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ داراب اور طارق کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ اسی باعث اس نے فیصلہ کیا تھا کہ طارق کو بھی اس معاملات کے باعث کچھ سزا ملنی چاہیے۔ اس نے دو آدمیوں کو یہ معلومات حاصل کرنے پر مامور کر دیا تھا کہ طارق کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں اور اس کے گھر والوں کی تصاویر بھی مہیا کی جائیں۔

اسی دن اسے ایک ذہنی جھٹکا بھی لگا جب اس کے موبائل پر ایک اجنبی کال آئی۔ ''تم اردشیر بول رہے ہو نا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''تم کون ہو؟'' اردشیر نے بہت سخت لہجے میں پوچھا۔

''جسے تم نے ختم کرانے کی کوشش کی تھی۔ میں داراب بول رہا ہوں۔''

اردشیر کے سارے جسم میں ایک عجیب کیفیت کی لہر دوڑ گئی۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''کیا میری بات نہیں سنی؟ میں داراب بول رہا ہوں۔''

''بچ گئے ہو تم؟'' اردشیر نے دانت پیسے۔

''ہاں، اناڑی تھا تمہارا آدمی جس نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔''

''میں کیوں مان لوں کہ تم داراب ہی بول رہے ہو؟''

''نہ مانو۔'' بے پروائی سے کہا گیا۔ ''میں نے تمہیں صرف اس لیے فون کیا ہے کہ تمہیں ہوشیار کر دوں۔ میں تم جیسے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں جو پیچھے سے وار کرتے ہیں۔ میں للکار کر مارتا ہوں۔ فون تمہیں للکارنے ہی کے لیے کیا ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اس شہر کو تم جیسے زہریلے سانپوں سے نجات دلا کر رہوں گا۔''

''خوش قسمتی سے بچ گئے ہو۔ اب اپنی بدقسمتی کو دعوت دے کر حماقت کرو گے۔'' اردشیر نے کہہ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

''کون خوش قسمت ہے اور کون بدقسمت، اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔'' دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر یا اردشیر کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

PakiBooks.Site

اردشیر نے فون بند کر کے اپنے ایک آدمی کو بُلایا اور اس سے ان چاروں کو طلب کرنے کے لیے کہا جنہیں اس نے داراب کے قتل پر مامور کیا تھا۔

وہ چاروں اس وقت موجود نہیں تھے لیکن بیس منٹ میں حاضر ہو گئے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اردشیر کے حکم کی تعمیل میں دیر لگائیں۔

اردشیر چند لمحے انہیں قہر آلود نظروں سے دیکھتا رہا، پھر اس نے جونی سے پوچھا۔

''جب داراب پر گولی چلائی تھی، اسے تم نے ہی پہچانا تھا؟''

''جی ماسٹر!''

''تم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی تھی اسے پہچاننے میں؟''

''ہرگز نہیں ماسٹر۔''

''اس پر گولی تم میں سے کس نے چلائی تھی؟''

''سب سے اچھا نشانے باز ہم میں صرف یہی ہے۔'' ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا گیا۔

اردشیر کی نظریں اس آدمی پر جم گئیں۔

''جی ہاں ماسٹر!'' وہ آدمی بولا۔ ''میں نے اس پر دو گولیاں چلائی تھیں تاکہ اس کے بچنے کا کوئی ذرا سا بھی امکان نہ رہے۔ اس کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔'' اس نے جواب دے کر اپنے ساتھیوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے ان سے اپنی بات کی تائید چاہتا ہو۔

''جی ہاں ماسٹر!'' جونی بولا۔ ''چیخ تو سنائی دی تھی۔ وہ اس وقت اپنے گھر کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ اس کی لاش احاطے میں گری تھی۔''

دوسروں نے صرف سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

اب اردشیر نے ان میں سے ایک کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''معلوم کیا تم نے؟ اس کی لاش مل گئی پولیس کو؟''

''ابھی کیسے مل سکتی ہے ماسٹر! میں نے معلومات کی تھیں۔ پہلے وہ یہاں اپنی بیوی اور ایک بیٹی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ کچھ دن پہلے بیوی اور بیٹی کو لے کر اس شہر سے چلا گیا تھا۔ واپس لوٹا تو اکیلا ہی لوٹا تھا۔ اب وہاں اس کی لاش پڑی ہوگی۔ جب اس کی بو پھیلے گی تو ہی آس پاس کے لوگ پولیس کو اس کی اطلاع دیں گے اور تبھی.....''

''بکواس بند کرو۔'' اردشیر چیخ پڑا۔ ''تم ہی لوگوں نے بتایا تھا کہ پولیس ہیڈ کوارٹر سے اس کی واپسی اس شخص کے ساتھ ہوئی تھی جس کی وجہ سے شیراں کا اور اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ کیا اس نے گولیاں چلنے کی آوازیں نہیں سنی ہوں گی؟''

''ضرور سنی ہوں گی ماسٹر!'' داراب کو گولیاں مارنے والے نے کہا۔ ''لیکن وہ گھبرا کر نکل ہی بھاگا ہوگا۔ نئی مصیبت اپنے گلے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔''

''ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے والے بہت زور کی ٹھوکر کھاتے ہیں۔'' اردشیر نے غراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے روحیل کے ذریعے تحقیق کروائی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ داراب کی بھانجی کا شوہر ہے۔''

وہ چاروں اس بات پر چونکے اور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

اردشیر پھر بولا۔ ''اگر وہ گھبرا کر بھاگ بھی نکلا ہوتا تو اس کی اطلاع پولیس کو دیتا۔ پولیس وہاں پہنچ جاتی اور ہمدانی اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ پھر وہ مجھے بھی اس کی اطلاع دیتا اور سمجھ بھی لیتا کہ اسے میں نے ختم کروایا ہے۔''

اب ان چاروں کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔

''لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' اردشیر نے اس مرتبہ داراب پر گولیاں چلانے والے کی طرف دیکھا۔ ''اگر وہ زخمی بھی ہوا ہوتا تو کسی ڈاکٹر یا اسپتال کا رخ کرتا۔''

فائر کرنے والے کا رنگ پھر بدلا۔

''وہ زندہ ہے۔'' اردشیر نے اسے بدستور گھورتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اس نے مجھے فون پر چیلنج کیا ہے کہ وہ مجھے تباہ کر دے گا۔''

اردشیر کی یہ بات چونکا دینے والی تھی۔

''اور اسی لیے۔'' اردشیر نے کہا۔ ''ایسے لوگ مستقبل میں میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔''

داراب پر گولیاں چلانے والے کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا۔ اس نے اردشیر کو ریوالور نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''ماسٹر!'' وہ گڑگڑایا۔ ''میں..... معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' لیکن اس کی بات پوری نہیں ہو سکی۔ اردشیر کے ریوالور سے نکلنے والی گولی اس کی پیشانی پر پڑی تھی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر پڑا۔

باقی تینوں کے زرد پڑتے ہوئے چہرے کچھ ٹھیک ہو گئے جب انہوں نے اردشیر کو ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے دیکھا۔

''اسے کہتے ہیں سچا نشانہ۔'' اردشیر نے ان تینوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی کچھ خدمات تو تمہیں میرے لیے۔ اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ تڑپ تڑپ کر مرے۔

چند گولیاں اس کے سینے پر مارتا تو یہ تڑپ تڑپ کر مرتا۔''

وہ تینوں دم سادھے کھڑے رہے۔

''اب یہ لاش لے جاؤ، تیزاب کے کنویں میں ڈال دو اور فرش سے اس کا خون صاف کر دو۔''

وہ تینوں مشینی انداز سے حرکت میں آئے تھے کہ اردشیر پھر بولا۔ ''میں برابر کے کمرے میں جا رہا ہوں جونی..... روحیل کو میرے پاس بھیجو۔''

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ برابر کے کمرے میں داخل ہو کر وہ ٹہلنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں راحیل اس کے سامنے تھا۔

''کیا رہا؟'' اردشیر نے اس سے پوچھا۔

''طارق صرف چار افراد کے ساتھ گھر میں رہتا ہے۔ ایک اس کی ماں ہے۔ بیوی ہے، دو بچے ہیں۔''

''بچوں کی عمر کیا ہے؟''

''ایک پانچ سال کا اور دوسرا چار سال کا معلوم ہوتا ہے جو پانچ سال کا ہے وہ اسکول جانے لگا ہے۔''

''گڈ!'' اردشیر نے کہا۔ ''اتنی جلدی اتنی معلومات حاصل کر لی تم نے، لیکن ان سب کی تصویریں؟''

''کوشش کی جائے گی ماسٹر کہ وہ بھی جلد از جلد مل جائیں۔ میں نے یہ کام صابو کے سپرد کیا ہے۔ وہ چھپ کر بھی بہت صاف فوٹو گرافی کر سکتا ہے۔''

''اب ایک اہم بات سنو، داراب زندہ ہے۔''

''زندہ ہے؟'' چونک کر کہا گیا۔

''ہاں، اور اس میں کچھ دم خم بھی ہے۔ اس نے مجھے فون کر کے چیلنج کیا ہے۔''

''اوہ۔''

''وہ یقیناً سمجھ چکا ہے کہ اسے ختم کرانے کی کوشش میں نے کی تھی۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس کی لاش دیکھوں۔ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے مارنے کا حکم میں نہیں دوں گا۔ اسے اغوا کر کے میرے سامنے لایا جائے۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔ میرے لیے یہ یقین ضروری ہے کہ اسے ختم کر دیا گیا۔''

''جیسا آپ چاہیں ماسٹر۔''

''اور اس کام کا انچارج میں تمہیں بنا رہا ہوں۔ اسے اغوا کرنے کے لیے تمہیں جتنے لوگوں کی ضرورت ہو، ان کا انتخاب تم خود کرو۔''

''بہتر ماسٹر۔'' روحیل نے کہا۔

''بس! اب تم جا سکتے ہو۔''

روحیل کے جانے کے بعد اردشیر نے موبائل پر ہمدانی سے رابطہ کیا۔

''داراب کی کوئی خبر ہے؟''

''نہیں، کیوں؟''

اردشیر نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ ہمدانی کو اپنے غلام سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا تھا۔

☆☆☆

''تم نے یہ نمبر اتنی جلدی اور کہاں سے حاصل کیا تھا؟'' داراب نے اپنے گھر پر طارق سے پوچھا تھا۔

''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اردشیر نے دکھاوے کے لیے ایک کمپنی قائم کر رکھی ہے۔ اس میں کچھ لوگ تو میرا خیال ہے کہ کمپنی ہی کے ہوں گے لیکن زیادہ تر عام لوگ ہیں۔ میرے گھر کے قریب غریب لوگوں کی جو بستی ہے، وہاں اس کمپنی کا ایک چپراسی بھی رہتا ہے۔ بہت دن ہوئے جب مجھے اتفاقاً اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ آج جب میں گھر سے نکلا تو اسے میں نے بس اسٹاپ پر کھڑا دیکھا۔ میں نے کار روک کر اس سے بڑی شائستگی سے پوچھا کہ میاں اتنے گھبرائے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ آج اسے دفتر پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے جس پر اسے ڈانٹ پڑ سکتی ہے۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا کہ وہ کہاں کام کرتا ہے، اس نے اپنی کمپنی کا نام بتایا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے ادھر ہی سے گزرنا ہے اس لیے میں اسے اپنی گاڑی میں وہاں تک چھوڑ سکتا ہوں۔ اس نے فوراً میری پیشکش قبول کر لی۔ وہ بے وقوف ہونے کی حد تک سیدھا سادہ شخص ہے۔ میں اس سے اس کے دفتر کے بارے میں عام قسم کی باتیں کرنے لگا۔ یہ بھی ظاہر کیا کہ بہت جلد میں بھی ایک کاروباری معاملے میں اس کی کمپنی کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں اس کا فون نمبر کیا ہے اور وہ تو چپراسی ہے۔ اسے تو اپنے مالک کا فون نمبر معلوم نہیں ہوگا۔ تب اس نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ وہ جانتا ہے۔ میں ہنس پڑا تو اس نے جوش میں آ کر نمبر بتا دیا۔ غالباً اس نے کبھی کسی سے سن لیا ہوگا۔''

''تو نفسیاتی حربہ آزمایا تم نے۔''

''جی ہاں، وہ کارگر رہا۔'' طارق نے کہا، پھر بولا۔ ''ایک بات مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''آپ نے ابھی اسے کال بھی کر لی۔ چیلنج بھی کر

PakBooks.site

دیا۔ اس طرح تو آپ نے اپنے لیے مشکلات پیدا کرلیں۔ اب وہ ہوشیار ہوجائے گا۔"

"ہوشیار تو ہو جائے گا لیکن اب جلد از جلد مجھے ختم کرانے کے بارے میں سوچ بھی رہا ہوگا۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس سے ٹکراؤ کی نوبت آئے۔"

"اب اگر میں نے یہ کہا کہ آپ نے اس طرح خطرات کو دعوت دی ہے تو آپ وہی بات نہیں کہیں گے کہ کمانڈو کبھی خطرات سے نہیں ڈرتا۔"

داراب ہنس دیا۔ "ہاں، میں یہی کہتا۔"

"میں آپ کے لیے پریشان رہوں گا۔"

"قطعی پریشان نہ ہو۔ یقین کرلو کہ میں اس جنگ میں کامیاب رہوں گا۔"

"ابھی میں آیا تو میں نے ایک کار کھڑی دیکھی تھی۔ میں سمجھا تھا کوئی ملنے آیا ہے آپ سے لیکن....." طارق نے بات ادھوری چھوڑ کر کہا۔ "یہ تو ممکن نہیں کہ وہ آپ نے آج خریدڈالی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس پر نمبر پلیٹ کے بجائے فار اپلائی لکھا ہوتا۔"

"وہ میں نے سعید خان سے لے لی ہے۔"

طارق اس نام سے واقف تھا۔ اسی نے ان دونوں کی ضمانت کرائی تھی۔

"سعید خان کافی پیسے والا آدمی ہے۔ دو کاریں تھیں اس کے گھر میں۔ دوسری کار اس کی بیوی بھی کبھی استعمال کرتی ہے۔ اس نے اپنی کار تھوڑی ہی دیر پہلے مجھے بھجوائی ہے اپنے شوفر سے۔ فی الحال وہ اپنی بیوی کی کار استعمال کرے گا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے بس دس پندرہ دنوں کے لیے ضرورت ہے۔ وہ تو مجھے نئی کار دلانے کے لیے بھی تیار ہوگیا تھا۔ میں نے ابھی تمہیں بتایا نا کہ وہ بہت پیسے والا آدمی ہے لیکن میں اس کی بات ٹال گیا۔ مجھے تو بس اتنے دن کے لیے کار کی ضرورت ہے کہ اردشیر سے نمٹ لوں۔"

طارق کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ "اچھا، میں اب چلتا ہوں۔"

"ہاں تم جاؤ، اپنا اسٹور دیکھو۔"

طارق نے کھڑے ہوکر سلام کیا اور رخصت ہوگیا۔

پھر دو دن گزر گئے۔ داراب دن تو گھر میں ہی گزارتا تھا اور نو بجے گھر سے نکل کر ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے پہنچتا تھا۔ دونوں مرتبہ اس نے ایک ہی راستہ اختیار کیا اور راستہ بھی ایسا کہ بیچ میں ایک خاصی حد تک سنسان سڑک پڑتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی "ریکی" کی جائے گی اور جب یقین کرلیا جائے گا کہ وہ ریسٹورنٹ جانے اور گھر آنے کے لیے ایک ہی راستہ اختیار کرتا ہے، تبھی اس پر حملے کی منصوبہ بندی کی جائے گی۔ خاصی حد تک سنسان سڑک سے بھی وہ اسی لیے گزرتا تھا کہ وہاں دشمن کو حملہ کرنے میں کچھ آسانی ہو۔

تیسرا دن بھی گزر گیا، کوئی بات نہیں ہوئی تو اس نے سوچا کہ اب وہ خود ہی ان لوگوں پر حملہ آور ہو۔ اس دوران میں وہ کچھ معلومات بھی حاصل کرتا رہا تھا۔ شہر میں بدمعاشوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ تھے جو کوئی حرکت کرتے تھے تو اس طرح کہ ان کا تصادم اردشیر کے آدمیوں سے نہ ہو۔ اس نے اردشیر کے گھر کا پتا بھی لگا لیا تھا۔ اس نے یہ بات بھی سوچی کہ ان چھوٹے موٹے گروہوں کو اپنے ساتھ ملائے۔ اس کے لیے شاید اسے پیسے بھی خرچ کرنے پڑ سکتے تھے۔ وہ ایک خاص رقم اپنے دوست سعید خان سے مانگتا تو اسے یقین تھا کہ سعید خان اس سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ اسی لیے اس نے اپنی لائف پالیسی ختم کرنے کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ پالیسی خاصی پڑی تھی۔ اسے اچھا خاصا پیسا مل جاتا جس کی ایک چوتھائی رقم سے بھی اس کا کام نکل سکتا تھا۔ اس روز اس نے خفیہ طور پر دو اہم ملاقاتیں بھی کیں۔

چوتھے دن بھی وہ رات کا کھانا کھانے کے لیے مخصوص راستے سے گزرا۔ واپسی میں وہ کچھ دیر بھی لگاتا تھا تاکہ راستے میں جو قدرے سنسان راستہ پڑتا تھا، وہ اور زیادہ سنسان ہوجائے۔

اس رات بھی اس نے یہی کیا۔ کھانے کے بعد کافی پی۔ کافی پینے کے بعد کچھ دیر بیٹھا رہا، اس کے بعد پھر کافی پی اور اس کے بعد بھی کچھ دیر بیٹھا رہا۔ آخر وہ بل ادا کرنے کے بعد وہاں سے اٹھا۔ معمول کے مطابق اس نے اتنا وقت اور گزار دیا تھا کہ وہ سڑک تقریباً سنسان ہوجائے جہاں اسے اپنے اوپر حملے کی توقع تھی۔ بل ادا کر کے وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ موبائل نکالتے وقت اسے حیرت تھی کہ اتنی رات گئے اسے کون فون کرسکتا ہے۔

موبائل کے اسکرین پر اسے کسی نام کے بجائے نمبر دکھائی دیے جبکہ وہ اپنے ہر جاننے والے کا نمبر اس کے نام سے فیڈ کرتا تھا۔ نمبر دکھائی دینے کا مطلب یہ تھا کہ اسے فون کرنے والا کوئی اجنبی تھا۔

گھنٹی پانچویں مرتبہ بج رہی تھی جب اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو!" وہ غیر ارادی طور پر دھیمی آواز میں بولا۔

"مسٹر داراب ہی بول رہے ہیں نا؟" دوسری طرف سے شائستہ لہجے میں بولنے کی کوشش کی گئی۔

"جی۔" داراب کا ذہن الجھا رہا۔

"میرا تعلق ماسٹر اردشیر کے گروپ سے ہے۔"

یہ جواب سن کر داراب نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔

"ہیلو۔" داراب کی خاموشی پر دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں لائن پر ہوں۔" داراب نے کہا۔ "حیرت ہوئی ہے مجھے جواب سن کر۔"

"یقیناً۔" جواب آیا۔ "تمہیں حیرت ہونی ہی چاہیے تھی۔"

"اب وہ بات کرو جس کے لیے فون کیا ہے۔" داراب کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

"ماسٹر تمہیں ایک پیغام دینا چاہتا ہے۔"

"تو اسی کو فون کرنا چاہیے تھا۔"

"وہ بات چیت کبھی بھی ہوسکتی ہے اس لیے اس نے ہم پانچ افراد کو تم سے وہ بات کرنے کی ذمے داری سونپی ہے۔ ہم ملاقات کر کے ہی بات کرسکیں گے۔ فون پر ممکن نہیں ہے۔"

"یعنی ملاقات؟" داراب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔"

"اور کسی ایسی ویران جگہ پر؟"

"ہاں۔"

"جہاں تم لوگ مجھے آسانی سے مار سکو۔ گولیوں سے چھید ڈالو مجھے۔"

"اگر تم اعتماد نہیں کرنا چاہتے تو میں فون بند کیے دیتا ہوں۔"

"کہاں ملنا چاہتے ہو؟" داراب نے پوچھا۔

جواب میں اسی سڑک کا نام لیا گیا جو داراب جان بوجھ کر اختیار کرتا تھا۔

"بہت خوب!" داراب دھیرے سے ہنسا۔ "بہت مناسب جگہ کا نام لیا ہے تم نے۔"

"کئی دن ہوگئے، تم وہیں سے گزرتے رہے ہو۔ اگر ہمیں تم پر گولیاں برسانی ہوتیں تو اب تک برسا چکے ہوتے۔ ماسٹر نے اب اپنا ذہن بدل لیا ہے اور تم کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے۔ تم اس کی پیشکش پر شبہ کرو گے اس لیے ہمیں سمجھایا گیا ہے کہ ہم تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔"

"کب ملاقات کرنا چاہتے ہو؟"

"اب تم ہوٹل سے اٹھنے ہی والے ہوگے۔ کیوں نا آج ہی ملاقات کرلی جائے۔"

"خوب!" داراب نے کہا۔ "مکمل ریکی کی گئی ہے میری۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ اسی طرح ملاقات کے لیے جگہ کا تعین ہوسکتا تھا، کسی ویران جگہ کا۔"

"کیا ہم اس جگہ انتظار کریں؟"

"ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔"

بل ادا کر کے وہ ہوٹل سے نکلا اور کار میں بیٹھ کر روانہ

آپریشن تھیٹر سے فکرمندی

مریض آپریشن ٹیبل پر خوف اور وحشت کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ آپریشن کے مقام کو دوا دے کر سُن کر دیا گیا تھا۔ معاون عملہ اپنے کاموں سے فارغ ہوا ہی تھا کہ سرجن اپنے مخصوص لباس میں، چہرے پر نقاب لگائے مریض کے قریب آیا اور نشتر سنبھال کر بڑبڑانے لگا۔

"اقبال! فکر مت کرو..... معمولی سا آپریشن ہے، ذرا سی دیر میں تم فارغ ہوجاؤ گے..... ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے!"

مریض نے سرجن کے وہ ہمدردانہ بول سنے تو سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "سر! بہت شکریہ مگر میرا نام اقبال نہیں، حامد ہے!"

"چپ رہو!" سرجن نے اسے ڈانٹ دیا۔ "مجھے سب معلوم ہے..... اقبال میرا اپنا نام ہے۔"

امریکا سے جاوید کاظمی کی سوغات

PAKIBOOKS.SITE

ہوا۔ وہ سوچ چکا تھا کہ اس پُراسرار ملاقات کے سلسلے میں اسے کیا کرنا ہوگا۔

سنسان سڑک پر پہنچ کر اس نے تقریباً نصف فاصلہ طے کرلیا تھا کہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پانچ افراد کھڑے نظر آگئے۔ اس نے کار کی رفتار کم کی۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار تھا کہ اگر اس کی کار پر گولیاں برسائی جائیں تو وہ خود کو پائدان میں گرادے اور پھر اپنی سب مشین گن سے جوابی کارروائی کرے۔ یہ ان لوگوں کے خواب وخیال میں نہیں آسکتا تھا کہ اس کے پاس مشین گن ہوگی۔

اس نے کار اس کار سے کچھ فاصلے پر روکی۔ اس وقت ان پانچوں نے اپنے اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لیے تھے۔

''ہم نے تمہاری کار اس وقت پہچانی جب تم قریب آکر رکے۔'' ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔ ''اسی لیے ہم نے اپنے سروں پر ہاتھ اسی وقت رکھے جب کار پہچان لی۔''

''ٹھیک ہے۔'' داراب نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔ ''اب تم لوگ اپنی کار کے قریب سے ہٹ جاؤ۔ مناسب ہوگا کہ سڑک کے دوسرے کنارے پر چلے جاؤ۔''

''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ تمہارے پاس ریوالور یقیناً ہوگا۔ تم ریوالور لے کر ہم لوگوں کو زد پر رکھتے ہوئے ہمارے قریب آؤ اور ہماری تلاشی لے لو۔'' جواب دیتے ہوئے شخص اپنے چاروں ساتھیوں کو لیے سڑک پار کررہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ''اگر کسی طرف کوئی گاڑی آتی نظر آجائے تو ہم اپنے ہاتھ سروں سے ہٹالیں گے ورنہ آنے والی کار کے لوگوں کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی۔ تم خود کو ایسے زاویے پر کرلینا کہ ہم تمہارے ریوالور کی زد پر رہیں لیکن آنے والی کار میں جو بھی ہو، اسے ریوالور دکھائی نہ دے۔''

جواب دیتے ہوئے وہ پانچوں سڑک پار کر کے رک گئے تھے۔

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' داراب نے جواب دیا اور اپنی کار آہستگی سے آگے بڑھائی۔ اس نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔

''تم تو جارہے ہو؟'' وہی آواز پھر سنائی دی۔

''نہیں۔'' داراب نے جواب دیا۔ ''میں اپنی کار تمہاری کار کے قریب کھڑی کروں گا۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو لیکن اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔''

''میں یہی مناسب سمجھ رہا ہوں۔''

داراب اپنی کار اس کار کے پہلو میں لے گیا اور روک دی۔ اس وقت وہ اپنے ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس کا ریوالور تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ اسے یہ چیک کرنا تھا کہ اس کار میں تو ان لوگوں کا کوئی ساتھی چھپا ہوا نہ ہو۔ وہ ابھی تک ان لوگوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ کار رکتے ہی اس نے پہلو کی نشست پر پڑی ہوئی تیز روشنی کی ٹارچ نکال لی تھی۔ اس نے اس کی تیز روشنی کار کے اندر ڈالی۔

کار اس نے اس طرح روکی تھی کہ درمیانی فاصلہ چھ انچ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں اگلی نشست اور پچھلی نشست کے پائدان بھی دیکھ لیے کہ وہاں کوئی چھپا ہوا نہ ہو۔

''تم نے ہم پر اعتماد نہیں کیا ہے۔'' سڑک پار سے اسی آدمی کی آواز آئی۔

''جب تک اصل بات سامنے نہ آجائے، کسی کو بھی کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ میں کار کی ڈکی بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ ریوالور ہاتھ میں لیے کار سے اُترا۔ انجن اس نے بند کردیا تھا۔

''بہت محتاط شخص ہو۔'' آواز آئی۔

''جب حالات گمبھیر ہوں تو محتاط رہ کر ہی زندہ رہا جا سکتا ہے۔''

''تم نے دیکھ لیا، وہاں کوئی چھپا ہوا نہیں ہے۔''

''میں ڈکی بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہاں بھی چھپا جا سکتا ہے۔''

''وہ لاک ہے۔'' جواب ملا۔ ''کار کا دروازہ کھول کر اندر سے ایک بٹن دبایا جائے گا، وہ تبھی کھلے گی۔ کار بھی مقفل ہے۔''

''تم میں سے کوئی آئے اور یہ کام کرے۔''

''اچھا۔'' بڑی طویل سانس لے کر کہا گیا تھا۔

پھر ایک آدمی سڑک پار کر کے قریب آنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ سر پر ہی رکھے تھے۔ جب وہ قریب آگیا تو داراب نے اس سے کہا۔ ''پہلے میں تمہاری تلاشی لوں گا۔''

''لے لو۔'' اس آدمی نے بُرا سا منہ بنایا۔

داراب نے بڑی چابکدستی سے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ احتیاطاً داراب نے اس شخص کے گریبان میں لگا ہوا فاؤنٹین پین بھی نکال لیا اور

بڑبڑایا۔

''اب ایسے قلم بھی آنے لگے ہیں جن میں موجود زہریلی سوئی سے بھی کسی کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔''

''تم ہر طرح اپنا اطمینان کرلو۔''

''بس ٹھیک ہے، اب تم ڈکی کھولو۔''

اس شخص نے چابی سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر ہاتھ ڈال کر کچھ کیا۔ ڈکی بہ آہستگی کھلتی چلی گئی۔ داراب اس کے قریب ہی رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ ڈکی میں بھی کوئی چھپا ہوا نہیں تھا۔

''کوئی گاڑی آرہی ہے۔'' سڑک پار کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے وہی شخص بولا جس نے داراب سے فون پر بات کی تھی۔

''دیکھ لی ہے میں نے۔'' داراب نے جواب دیا۔ ''اب اپنے ہاتھ سروں سے ہٹالو اور آنے والی کار کے لوگوں کو یہ منظر عجیب سا لگے گا۔''

ان چاروں نے اپنے ہاتھ نیچے کرلیے۔

جو شخص داراب کے قریب تھا، اس سے داراب نے کہا۔ ''تم بونٹ کھول کر انجن دیکھو، میں ٹارچ دکھاؤں گا۔ آنے والے سمجھیں گے کہ ہماری کار خراب ہوگئی ہے۔''

داراب کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا گیا۔

جو کار دھیمی گئی تھی، اس کی رفتار بھی کم ہوئی۔ داراب پہلے سے زیادہ چوکنا ہوگیا۔

وہ کار قریب آکر رک گئی۔ اس کار سے ایک لڑکی نے پوچھا۔

''کوئی بڑی خرابی ہوگئی ہے کیا؟''

''نہیں، ہم ٹھیک کرلیں گے۔''

''میرا ساتھی بہت ماہر ہے۔''

''ضرورت نہیں۔'' داراب نے ہی جواب دیا۔ ''خرابی سمجھ لی ہے ہم نے۔ ابھی دو منٹ میں ٹھیک ہوجائے گی۔''

''اوکے۔'' لڑکی نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ ڈرائیونگ وہ خود ہی کررہی تھی۔ کوئی مرد اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

اس کار کی رفتار بھی تیز ہوتی چلی گئی۔

''اب تم چاروں بھی ادھر آجاؤ۔'' داراب نے سڑک پار کھڑے ہوئے چاروں آدمیوں سے کہا۔ ''ہاتھ پھر اپنے سر پر رکھ لو۔''

ان چاروں نے ایسا ہی کیا اور قریب آگئے۔ داراب نے ان کی تلاشی لی اور ان کی طرف سے مطمئن ہوگیا۔ ان میں سے کوئی بھی مسلح نہیں تھا۔ اب انہوں نے اپنے ہاتھ بھی سروں سے ہٹالیے تھے۔

داراب اطمینان سے کار کے مڈگارڈ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ ''ہاں..... اب بتاؤ، کیا بات کرنی ہے؟''

''تم نے ہمیں غیر مسلح دیکھ لیا ہے۔ اب ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بات چیت کے لیے یہ بات ماحول کو خوشگوار نہیں رکھ سکتی۔'' موبائل پر بات کرنے والے نے کہا۔ ''ریوالور تمہیں اپنی گاڑی میں ڈال دینا چاہیے۔''

''ہوں۔'' داراب نے سر ہلایا اور اپنی کار کا دروازہ کھول کر ریوالور اس میں ڈالا اور کار مقفل کر کے چابی اپنے جوتے کے اندر رکھ لی کیونکہ اب اس کے ذہن میں ایک نیا شبہ جاگ چکا تھا۔ اس وقت ایک کار بھی قریب سے گزر رہی تھی۔

''اب تو ہم بات کرسکتے ہیں؟'' داراب نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔

''بہتر ہوتا کہ تم ہمارے ساتھ ماسٹر کے پاس چلتے۔ براہِ راست بات چیت ہوجاتی۔''

''میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم نے یہاں پر بات کرنے کے لیے کہا تھا اس لیے میں تیار ہوگیا۔''

''یہاں بات کرنے کا طریقہ مختلف ہوگا۔''

''جو بھی ہو۔'' داراب نے بے پروائی سے کہا۔

''ماسٹر نے بتایا تھا کہ تم بہت اچھے لڑاکا ہو اس لیے اس نے اپنے لوگوں میں بہترین لڑاکا منتخب کیے۔ وہی پانچ ہم ہیں۔''

''بات کچھ یہی سمجھ میں آئی تھی ابھی۔'' داراب مسکرایا۔

وہ پانچوں اس طرح آگے بڑھے کہ داراب پوری طرح ان کے نرغے میں آجائے۔

''ہمیں اس کی اجازت نہیں کہ تمہیں گولی ماریں۔ اب ماسٹر تمہیں اپنے ہاتھ سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہم پانچوں کا انتخاب کیا گیا ہے کہ ہم تمہیں اس کے پاس لے جائیں۔''

''لے جاؤ، اگر لے جاسکو تو.....'' داراب ہنسا۔

وہ پانچوں یکبارگی اس پر جھپٹے۔ اس وقت داراب کی دائیں ٹانگ برق رفتار سرعت سے ہوا میں لہرائی اور اس کی ٹھوکر ان میں سے ایک کی ٹھوڑی پر پڑی۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ الٹ کر گرا۔

PakiBooks.Site

اس کے ساتھ ہی ایک ایسا معرکہ شروع ہو گیا جس میں داراب بجلی کی طرح ہچکولے کھاتے ہوئے اپنے گھونسوں اور لاتوں کی برسات کر رہا تھا۔ اس کے اپنے جسم پر بھی ضربات لگ رہی تھیں جن کو وہ برداشت کر سکتا تھا اور ان ضربات کی قوت بھی داراب کی لگائی ہوئی ضربات سے کم تھیں۔

ماسٹر اس بات سے واقف نہیں تھا کہ وہ ایک اچھا لڑاکا ہی نہیں، ایک تربیت یافتہ کمانڈو بھی تھا۔

پانچ منٹ کے اندر اندر ان پانچوں کی حرکات سست پڑنے لگیں۔ اور صرف تین منٹ بعد وہ پانچوں سڑک پر اس طرح پڑے ہوئے تھے کہ اب ان میں لڑنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

''چلو!'' داراب نے ہنس کر کہا۔ ''لے چلو مجھے اپنے ماسٹر کے پاس۔''

وہ سڑک پر پڑے لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے۔ داراب نے ایک کے قریب جا کر اس کے سر کے ایک خاص حصے پر ٹھوکر لگائی۔ اس نے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔'' داراب نے باقی چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پندرہ بیس منٹ سے پہلے تو ہوش میں آ نہیں سکتا۔ یہی حال مجھے تم لوگوں کا بھی کرنا ہے۔''

ان میں سے ایک تو بے حس و حرکت پڑا رہا۔ البتہ تین نے اٹھنے کی کوشش کی۔ نتیجے میں انہیں اپنے سینوں پر فلائنگ کِکس کھانی پڑیں اور ان کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ بھی سڑک پر پڑے پڑے ہانپنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

داراب نے یکے بعد دیگرے تین کے سروں پر ٹھوکریں ماریں اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اب داراب پانچویں کی طرف بڑھا۔

''تم ہم پانچوں پر بھی بھاری پڑے ہو۔'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ''اب ہم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہمیں کیوں بے ہوش کر رہے ہو؟''

''بس تمہیں بے ہوش نہیں کروں گا۔'' داراب نے کہا اور اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ''تم کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

داراب اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنی کار کی طرف لے گیا۔ کار کا دروازہ کھول کر اسے ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیلنے سے پہلے اس نے وہاں رکھی ہوئی اپنی سب مشین گن پچھلی سیٹ پر ڈال دی تھی۔ کہیں سے ریشمی ڈوری کا لچھا نکال کر اس نے اپنے شکار کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ کی طرف لے جا کر خوب کس کر باندھ دیے۔

وہ بے بسی سے کلائیوں کی تکلیف بھی برداشت کرتا رہا۔ وہ اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر داراب نے کار چلا دی اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟'' قیدی بمشکل بول سکا۔

''کچھ مہمان داری کرنا ہے۔'' داراب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک بات کا خیال رہے۔ کار اب اسی سنسان راستے سے نکال کر ایسی سڑکوں پر چلے گی جہاں تھوڑا بہت ٹریفک اب بھی ہو گا۔ اگر اس وقت تم نے مدد کے لیے چیخ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تو اپنی موت کو دعوت دو گے۔ ایک بہت لمبا چاقو بھی ہے میرے پاس۔ تمہاری آنتیں پیٹ سے نکال دوں گا۔'' داراب کے لہجے میں بڑی سفاکی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتنا سنگین جرم کرنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس ایک بار جو ہو گیا تھا، وہ ہو گیا تھا۔ اس کا وہ کسی کے سامنے ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وہ حرکت اضطراری بھی تھی اور اسے شیراں پر شدید غصہ بھی تھا۔

جب اس کی کار اس کے گھر پہنچی تو قرب و جوار میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ اپنے قیدی کو اتار کر گھر میں لے گیا۔ میڈیکل باکس لا کر اس کے ہاتھ بھی کھول دیے اور اس کی چوٹوں پر دوا لگائی۔ قیدی کے چہرے پر اب الجھن تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو گا کہ اس کا اتنا خیال کیوں رکھا جا رہا ہے۔

''کہیں کچھ زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟'' داراب نے پوچھا۔

''کئی جگہ تھوڑی بہت تکلیف تو ہے۔''

''ہوں، پیتے تو ہو گے؟''

''ہاں۔''

''تو دو پیگ پی لو۔ تکلیف کا احساس تو ختم ہو گا۔ دوا تو لگا دی ہے۔ تکلیف ختم بھی ہو جائے گی۔''

داراب نے شراب کی بوتل، پانی کا جگ اور دو گلاس نکالے۔ پیگ بھی بنائے۔ ایک گلاس قیدی کو دیا۔ ''لو، پیو۔''

قیدی نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہی ایک بڑا گھونٹ لیا

اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''بہت پریشان ہو گیا ہے میرا دماغ۔''

''کیوں؟'' داراب مسکرایا۔

''اتنی درگت بنانے کے بعد یہ مہربانیاں کیوں؟''

''درگت تو اس لیے بنائی کہ اس وقت وہ میری مجبوری تھی۔ تم لوگوں سے میری ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔''

''ان چاروں کو تو وہیں چھوڑ دیا۔''

''سب کو تو نہیں لا سکتا تھا۔ اب تک انہیں ہوش بھی آ چکا ہو گا اور اگر وہاں سے گزرنے والے کسی شخص نے انہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو پولیس کو بھی اطلاع دے دی ہو گی۔ ممکن ہے وہ اس وقت کسی پولیس اسٹیشن میں ہوں۔ پولیس انہیں طبی امداد بھی پہنچائے گی۔ انہوں نے پولیس کو کیا بیان دیا ہو گا؟''

''میں اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن اگر وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگے ہوں گے تو اب اس شہر سے بھاگ جانے کی سوچ رہے ہوں گے۔''

''کیوں؟ جا کر ماسٹر کو نہیں بتائیں گے؟''

''نہیں۔'' قیدی نے جواب دیا۔ ''ناکامی کی اطلاع لانے والوں کو وہ گولی مار دیتا ہے۔ ان کی لاشیں تیزاب کے حوض میں ڈال دی جاتی ہیں تاکہ ان کی ہڈیاں تک گل جائیں۔ ان کی لاش کسی کو بھی نہ ملے۔''

ان چند جملوں کے تبادلوں کے دوران میں ہی قیدی نے اپنا گلاس ختم کر لیا تھا جبکہ داراب نے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے تھے۔ اس نے قیدی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے گلاس میں اتنی شراب انڈیل دی جو دو پیگ کے برابر تھی۔

''کیا تم بھی ماسٹر کے پاس واپس نہیں جاتے؟'' داراب نے پوچھا۔

''اگر اپنی لاش تیزاب کے حوض میں ڈلوانے کی خواہش ہوتی تو ضرور جاتا۔'' قیدی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''وہ حوض اس نے اپنے گھر میں بنوایا ہے؟''

''ہاں۔''

''اگر وہ اتنا سفاک ہے تو تم لوگ اس کے لیے کام کیوں کرتے ہو؟''

''ہم اس قسم کے کاموں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے نہیں کریں گے تو کسی اور کے لیے یا خود اپنے لیے کریں گے۔ ہر صورت میں موت یا عمر قید ہمارا مقدر ہو گی اور عمر قید سے تو مر جانا ہی اچھا۔'' پھر اس نے گلاس منہ سے لگا کر آدھا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ حالانکہ اس مرتبہ وہ ڈبل پیگ تھا۔ گھونٹ لے کر اس نے ایک طویل سانس لی۔ ''بہت عمدہ وہسکی ہے۔'' پھر اس نے کہا۔ ''تمہارا تعلق کسی ایجنسی سے ہے نا صاحب؟'' اس کی گفتگو کے انداز میں تبدیلی آ گئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے تو پکا پکا یقین ہو گیا ہے۔ یہ خیال بھی ہے کہ تم مجھے سرکاری گواہ بنانا چاہتے ہو؟''

''میرا ارادہ یہی ہے لیکن اس کا فیصلہ کوئی اور کرے گا۔''

''تم میرے لیے کوشش تو کر سکتے ہو نا صاحب! سفارش۔''

''ہاں وہ میں ضرور کروں گا اگر تم مجھے ماسٹر کے بارے میں ہر بات بتا دو۔ اس کے گروہ میں کتنے آدمی ہیں، کہاں کہاں رہتے ہیں۔ اس کے گھر کا نقشہ کیا ہے، یا کوئی اور سوال میرے دماغ میں آئے۔''

''میں سب کچھ بتا دوں گا صاحب! میرا نام تو جان ہی لو۔'' وہ ہنسا۔ ''مجھے میرے ساتھی بھیڑو کہتے ہیں۔''

''یہ لفظ تو ممبئی میں بولا جاتا ہے۔''

''میں..... میرے باپ ماں وہیں سے آئے تھے..... اس لیے۔''

''ماں باپ کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں ہوں گے یا نہیں ہوں گے اور ہوں گے تو جانے کہاں ہوں گے۔ میں چھوٹا ہی تھا جب گھر سے بھاگ نکلا تھا۔'' جواب دے کر اس نے باقی شراب بھی حلق میں انڈیل لی۔ شراب اور داراب کے نرم رویے نے اس میں خاصی ہمت پیدا کر دی تھی۔

''اتنی زیادہ نہ پیو کہ.....''

''مجھے اتنی جلدی نشہ نہیں ہوتا صاحب!'' بھیڑو نے کہا حالانکہ اس کی زبان میں اب لکنت آ چکی تھی۔ وہ اپنے لیے پیگ بنانے لگا۔

''ان چاروں کے نام کیا ہیں جو تمہارے ساتھ تھے؟'' داراب نے پوچھا۔

بھیڑو نے ان چاروں کے نام بھی بتا دیے۔ اس نے اپنے لیے پیگ بنا لیا تھا۔ اس وقت تک داراب نے ایک ہی پیگ پیا تھا اور اس سے زیادہ پینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب

PakBooks.site

اسے یہ بھی سوچنا پڑ گیا کہ..... جلد از جلد جتنی معلومات حاصل کرنا ہیں، کر لے کیونکہ بھیڑو کو نشہ ہو چکا تھا۔ اب اس پیگ کے بعد اور ہو جاتا۔ اس صورت میں اس کی تمام باتوں پر یقین کرنا بھی مشکل ہوتا۔ وہ بہکی بہکی باتیں بھی کر سکتا تھا۔

''صاحب!'' وہ بولا۔ ''جب شیراں سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا، اس وقت جو تمہارے ساتھ تھا، تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟''

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''ماسٹر اس کے بارے میں میرے کچھ ساتھیوں سے بات کر رہا تھا۔ اب میں تمہیں ایک اہم بات بتاتا ہوں صاحب!..... ماسٹر تمہارے اس رشتے دار سے بھی کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اسے کیا معلوم کرنا ہے۔ بات ہو رہی تھی کہ اسے اغوا کر لیا جائے۔ کل کسی وقت اسے اغوا کرنے کا پروگرام بنا ہے۔''

یہ ایک ایسی بات معلوم ہوئی تھی کہ داراب کے جسم میں ہلکی سی سنسناہٹ پھیل گئی۔

''منصوبہ کیا بنایا گیا ہے؟'' داراب نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں صاحب۔ انہی لوگوں کو پتا ہوگا جن سے وہ یہ کام کروانا چاہے گا۔ جسے جو کام دیا جاتا ہے، بس اسی کو معلوم ہوتا ہے۔''

''اور یہ بات طے ہے کہ پولیس اس معاملے میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔''

''پولیس تو ہمدانی کے اشارے پر چلتی ہے۔ ہمدانی کو جانتے ہو نا صاحب؟''

''ہاں۔''

''اور ہمدانی ماسٹر کے اشارے پر ناچتا ہے۔''

''ہمدانی اس کے اشارے پر کیوں ناچتا ہے؟''

''صحیح تو نہیں پتا صاحب..... شاید اس کی کوئی بہت بڑی کمزوری ہے اس کے ہاتھ میں۔''

''اور پولیس ہمدانی کے اشاروں پر کیوں چلتی ہے؟''

''اس کے لیے انہیں بہت پیسا ملتا ہے جو ماسٹر ہی انہیں ہمدانی کے ذریعے دیتا ہے۔ اگر کسی وقت موقع ملتا ہے تو سازش کر کے کسی پولیس آفیسر کو بھی کسی اسکینڈل میں پھنسا دیتا ہے۔ زیادہ تر خوب صورت لڑکیوں کے اسکینڈل میں۔ آپ سے کیا کہنا صاحب، عورت تو مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔''

بھیڑو کی زبان میں لکنت تو پہلے ہی آ گئی تھی، اب وہ بیٹھے بیٹھے کسی حد تک جھومنے بھی لگا۔ اس عالم میں اس کے ہاتھ سے گلاس بھی چھوٹ سکتا تھا جس میں شراب باقی تھی۔ داراب نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔

''بس کرو۔'' اس نے کہا۔ ''اب تمہیں خاصا نشہ ہو گیا ہے۔''

''اب تو بس مزہ آیا ہے، نشہ وشہ تو کچھ نہیں ہے۔'' بھیڑو اتنا کھل کر مسکرایا کہ اس کے دانت نظر آنے لگے۔

''اب تمہیں سو بھی جانا چاہیے۔'' داراب نے کہا۔

''یہیں؟'' بھیڑو صوفے پر لیٹنے لگا۔

''نہیں۔'' داراب نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ ''میں تمہیں ایک کمرے میں پہنچا دیتا ہوں۔''

''ہاں..... اب نیند تو..... آ رہی ہے۔''

داراب اسے لے کر چلا تو اس نے للچائی ہوئی نظروں سے شراب کی بوتل کی طرف دیکھا۔

''نہیں، اب اور نہیں۔'' داراب نے کہا۔

''یہ گلاس تو..... ختم کر لینے دو..... صاحب!''

''چلو یہ پی لو۔'' داراب نے پلٹ کر گلاس اٹھایا، اسے دیا جو وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

داراب نے اسے ایک کمرے میں پہنچایا۔

''بستر بہت آرام دہ ہے۔ لیٹ جاؤ۔ نیند آ جائے گی۔ پھر تم سے کل بات ہوگی۔''

داراب کو ضرورت پیش نہیں آئی کہ اسے لٹاتا۔ بھیڑو خود ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس نے جوتے بھی نہیں اتارے تھے۔

داراب نے کمرے سے نکل کر دروازہ مقفل کر دیا۔ وہ بھیڑو کی جیب سے اس کا موبائل نکالنا نہیں بھولا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات مسلسل چکرا رہی تھی کہ اگلے دن طارق کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنا لیا گیا تھا۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ جالب سے اس کی ملاقات جلد از جلد ہو جائے۔

☆☆☆

جالب سے اس کی ملاقات دو دن قبل ہو چکی تھی۔ اس کے لیے اسے کچھ زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے تھے۔ اس نے میئر کے گھر پر پہنچ کر محافظ کے ہاتھوں ایک لفافہ جالب تک پہنچوایا تھا۔ لفافے میں اس کے دو ایک کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ تھی جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فوج کا ریٹائرڈ کمانڈو ہے۔ ان فوٹو اسٹیٹ کے ساتھ صرف ایک چھوٹا سا پرچہ بھیجا تھا جس پر مختصر سی عبارت تھی، ملاقات ابھی اور اشد ضروری

ہے۔''

اپنا نام لکھنا اس لیے ضروری نہیں تھا کہ جو فوٹو اسٹیٹ اس نے بھیجی تھیں، ان سے جالب اس کے نام سے واقف ہو جاتا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ جالب ملاقات کرنے سے گریز نہیں کرے گا کیونکہ وہ فوج کا ایک سابق کمانڈو تھا۔

توقع درست ثابت ہوئی تھی۔ جالب نے اسے اندر بلا لیا تھا اور دیکھتے ہی چونک گیا تھا کیونکہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں وہ اسے دیکھ چکا تھا۔

''تم کمانڈو رہ چکے ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں۔'' جواب دیتے ہوئے داراب نے اسے وہ اصل کاغذات وغیرہ بھی دکھا دیے جن کی فوٹو اسٹیٹ بھیج چکا تھا۔ اس طرح وہ شک و شبے کی گنجائش نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔

''تم اس جھگڑے میں کیوں پڑ گئے تھے؟'' جالب کے انداز میں تعجب تھا۔

''میں آپ کو وہی ساری تفصیل بتانے کے ساتھ شہر کے حالات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔''

جالب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

داراب بولا۔ ''آپ کیونکہ شاید دو ایک دن پہلے ہی بیرونِ ملک سے آئے ہیں اس لیے اتنی جلدی آپ کو اندازہ ہو بھی نہیں سکتا کہ یہاں لا اینڈ آرڈر کی پوزیشن اتنی خراب ہے جو ملک کے کسی دوسرے شہر میں ہرگز نہیں ہوگی۔'' پھر اس نے تفصیل سے سب کچھ بتا ڈالا۔

''خاص طور سے۔'' وہ کہتا رہا۔ ''اردشیر جیسا جرائم پیشہ اس وقت شہر کا حکمراں بنا ہوا ہے۔ اگر اس کے گروہ کی کمر توڑ دی جائے تو جرائم کی شرح ٹین چوتھائی کم ہو جائے گی۔ پھر دوسرا کام یہ کرنا ہوگا کہ یہاں کی پولیس کے معاملے میں کیا کرنا ہوگا۔''

''ان باتوں کا کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''ابھی تو نہیں ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد ثبوت بھی مہیا کر دوں۔ خود آپ بھی اس بارے میں کچھ چھان بین کریں لیکن بہت احتیاط سے۔ اگر ہمدانی کو معلوم ہو گیا تو وہ یہ خبر اردشیر کو ضرور دے گا اور آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''تم نے مجھے بڑے سنسنی خیز حالات سے آگاہ کیا ہے اگر یہ سب کچھ سچ ہے۔''

''میں کسی نہ کسی طرح اسے ثابت بھی کر دوں گا، خواہ مجھے اپنی جان پر کھیلنا پڑے۔''

''اور اس معاملے میں تم نے مجھ سے ملنا کیوں ضروری سمجھا؟ میں یہاں کسی ذمے دار پوسٹ پر نہیں ہوں۔''

''میئر صاحب سے آپ کا رشتہ تو قریبی ہے۔ آپ یہ باتیں ان کے کانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میئر صاحب کسی بھی اجنبی سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ اس معاملے کا کوئی توڑ تو انہی کو کرنا ہوگا۔ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آیا کہ آپ سے رابطہ کروں۔''

جالب سوچ میں پڑ گیا، پھر کچھ توقف سے بولا۔ ''بھائی صاحب کو ہمدانی پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ ثبوت کے بغیر اس کے خلاف کوئی بات نہیں مانیں گے۔ میں انہیں بتاؤں گا تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ میں اپنے طور پر چھان بین کی کوشش کرتا ہوں لیکن کوئی ٹھوس ثبوت ملنا ضروری ہے۔''

''میں نے ابھی کہا ہے کہ ثبوت حاصل کرنے کے لیے میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔''

اور داراب نے ایسا ہی کیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلنا اور ایسا مخصوص راستہ اختیار کرنا اس کا معمول بن گیا تھا جہاں راستے میں ایک ویران سی سڑک بھی ملتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس پر حملہ ضرور کیا جائے گا لیکن یہ اندازہ وہ بہرحال نہیں لگا سکا تھا کہ اس حملے کے نتیجے میں وہ ان لوگوں کے سلسلے میں کیا ثبوت حاصل کر سکے گا۔

جو ثبوت اس نے حاصل کیا تھا، اس کی توقع اسے نہیں تھی۔

بھیڑو نے اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ اس نے ریکارڈ بھی کر لیا تھا۔

اب رات کا ایک بجنے والا تھا اس لیے اسے جالب کو فون کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن اگلے ہی دن طارق خطرے میں پڑنے والا تھا اس لیے اس نے ہمت کر ہی ڈالی۔

جالب نے کال ریسیو کی۔ وہ ابھی جاگ ہی رہا تھا۔ داراب نے اپنا فون نمبر اسے بتا دیا تھا اور اس کا فون نمبر معلوم کر لیا تھا۔

''میں کسی اہم بات کے بغیر آپ کو فون نہیں کروں گا۔'' داراب نے اس سے فون نمبر لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ کسی بھی صورت میں میری کال نظر انداز ہرگز نہ کیجیے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا تھا۔

''داراب بول رہا ہوں۔'' کال ریسیو کیے جانے پر

PakiBooks.site

وہ بولا۔

’’تمہارا نمبر ہی دیکھ کر میں نے کال ریسیو کی ہے۔ تم کیا اہم بات بتانا چاہتے ہو۔ کیا تم نے کوئی ثبوت حاصل کرلیا ہے؟‘‘

’’بہت پکا ثبوت، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ وہ ابھی دیکھ لیں۔ کل صبح کے بعد کسی وقت بھی ایک ایسا واقعہ ہونے والا ہے جسے میں ہر قیمت پر روکنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہے ورنہ مجھ سے کوئی غیر قانونی قدم بھی اٹھ سکتا ہے جس سے میں گریز کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’وہ ثبوت لے کر ابھی آنے میں کوئی خطرہ تو محسوس نہیں کرو گے؟‘‘

’’مجھے اگر خطرہ ہے تو صرف اس بات کا کہ میرا آپ کے گھر آنا اردشیر کے علم میں نہ آئے۔‘‘ داراب نے جواب دیا۔ ’’اردشیر اس وقت بہت مشتعل ہوگا کیونکہ اس نے مجھ پر حملہ کروایا تھا جو میں نے نہ صرف ناکام کردیا بلکہ مجھے کچھ ثبوت بھی اسی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔‘‘

’’تم پر حملہ کہاں ہوا؟‘‘

’’ایک ویران سڑک پر۔‘‘ داراب نے سڑک کا نام بھی بتایا۔

’’اوہ۔‘‘ جالب نے چونکے ہوئے انداز میں کہا۔ ’’ابھی ٹی وی پر میں نے ایک بریکنگ نیوز سنی ہے۔ کوئی اس سڑک سے گزر رہا تھا۔ وہاں اسے چار افراد بے ہوش پڑے نظر آئے تو اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس ان چاروں کو اٹھا لے گئی ہے۔ وہیں سے ایک کار بھی ملی ہے جو شاید انہی کی ہوگی۔ کیا اس خبر کو تم پر حملے سے جوڑا جاسکتا ہے؟‘‘

’’انہیں میں نے ہی مار مار کر بے ہوش کیا تھا۔ وہی مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ان کے پانچویں ساتھی کو میں اپنے گھر اٹھا لایا ہوں۔ اس سے بہت کچھ اگلوایا ہے۔ اس کی باتوں کی ریکارڈنگ ہی میں آپ کو سنوانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’گڈ!‘‘ جالب نے کہا۔ ’’تمہاری کار تو وہ پہچانتے ہوں گے۔ میں تمہارے لیے دوسری گاڑی بھیج سکتا ہوں۔ کیا تمہارے گھر کے قریب کوئی ایسی جگہ ہے کہ تم چھپ کر اپنے گھر سے نکل سکو اور اس گاڑی تک پہنچ جاؤ۔‘‘

’’ہاں ایسی ایک جگہ ہے تو......‘‘ داراب نے کہا۔ ’’میں نے آپ کو اس کا پتا بتا دیا تھا۔ وہ کار میرے گھر کی عقبی گلی میں آجائے تو میں پچھلے دروازے سے نکل کر اس گاڑی تک پہنچ جاؤں گا۔ اردشیر اگر کسی سے میرے گھر کی نگرانی کروا بھی رہا ہوگا تو شاید نگرانی کرنے والوں کو یہ خیال نہ آئے کہ میں باہر نکلنے کے لیے پچھلا دروازہ بھی استعمال کرسکتا ہوں۔‘‘

’’اپنے ساتھی کو چھڑوانے کے لیے وہ لوگ تمہارے گھر پر حملہ آور بھی ہوسکتے ہیں۔‘‘

’’ایسا وہ اسی صورت میں کرسکتے ہیں جب انہیں یقین ہو کہ ان کا آدمی میرے گھر میں ہوگا۔‘‘

’’اس آدمی کے غائب ہونے کا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟‘‘

’’اردشیر کے ذہن میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ وہ ان چاروں سے پہلے ہوش میں آکر فرار بھی ہوسکتا ہے۔‘‘

’’فرار؟ کیوں؟‘‘

’’یہ باتیں ہم ملاقات پر بھی کرلیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد از جلد گاڑی بھیجیں میرے لیے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ میں بھیجتا ہوں۔‘‘

’’ایک ضروری بات سن لیں۔‘‘ داراب جلدی سے بولا۔ ’’اس گاڑی میں آپ جسے بھی بھیجیں، اسے بتا دیں کہ جب وہ گلی کے قریب پہنچے تو آپ کو اطلاع دے دے اور آپ مجھے باخبر کردیں تاکہ میں اسی وقت گھر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر دروازہ مقفل نہ کردوں۔ اس گاڑی کو وہاں رک کر میرا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ راستے میں تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ کار کے شیشے کالے ہوں گے۔‘‘

’’تو بس میں انتظار کررہا ہوں۔‘‘

اور اسی تدبیر پر عمل کرتے ہوئے داراب ایک گھنٹے سے کم وقت میں میئر کے گھر پہنچ گیا۔ جو آدمی کار لے کر آیا تھا، اسی نے...... اس کمرے تک پہنچایا جہاں صرف جالب ہی نہیں بلکہ میئر بھی موجود تھا۔ داراب نے اس کی تصویریں ایک مقامی اخبار میں دیکھی تھیں۔ اس کے بارے میں اسے تفصیلات بھی معلوم تھیں اس لیے اسے یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوا کہ ’’میئر صاحب‘‘ کے ہاتھ میں اس وقت بھی شراب کا گلاس تھا۔

’’یہ بھائی صاحب ہیں، اس شہر کے میئر۔‘‘ جالب بولا۔

’’میں ان کی تصویریں دیکھ چکا ہوں۔‘‘ داراب نے کہا۔

میئر متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’’تم نے ریکارڈنگ ریکارڈ پلیئر پر کی ہوگی؟‘‘

’’نہیں، اپنے موبائل میں کی ہے۔‘‘

’’تو سنواؤ، بھائی صاحب کو ساری باتوں سے آگاہ کردیا ہے مگر بھائی صاحب کو یقین نہیں آرہا ہے کہ ہمدانی شہر کے حالات سے انہیں بے خبر رکھے ہوئے ہے۔‘‘

’’ابھی یقین آجائے گا۔‘‘

داراب نے اپنی اور بھیڑو کی ساری باتیں ان دونوں کو سنوادیں۔

’’تو یہ حالات ہیں۔‘‘ میئر کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’جی میئر صاحب!‘‘

’’اور یہ اسی گروپ کا پانچواں آدمی ہے جس نے تم پر حملہ کیا تھا؟‘‘

داراب کے جواب دینے سے پہلے جالب بول پڑا۔ ’’میں بھائی صاحب کو اس بارے میں بھی بتا چکا ہوں۔‘‘

’’بہت تشویش کی بات ہے۔‘‘ میئر نے شراب کا گھونٹ لے کر کہا۔

’’میں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ کل کوئی خاص واقعہ ہونے والا ہے۔‘‘ جالب نے میئر سے کہا۔

میئر سوالیہ نظروں سے داراب کی طرف دیکھنے لگا۔

’’جی ہاں۔‘‘ داراب نے کہا۔ ’’ابھی آپ ریکارڈنگ میں سن ہی چکے ہیں۔ میری بھانجی کے شوہر کو اغوا کروانے کا ارادہ ہے اردشیر کا۔ میں ان لوگوں کو کسی قیمت پر کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اگر ان کی طرف سے کوئی شدید کارروائی کی گئی تو میں بھی ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔‘‘

’’تم نے جس طرح ان پانچوں کو مارا ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تم بہت اچھے کمانڈو ہو۔ تم نے شہر کے حالات سے میری بے خبری بھی ختم کی ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں نوجوان!‘‘

داراب بمشکل اپنی مسکراہٹ پر قابو پاسکا۔ اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اسے ’’نوجوان‘‘ کہا جاسکتا۔

میئر نے ایک گھونٹ اور لینے کے بعد گلاس ایک طرف رکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بہت متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ جالب اور داراب اس کی طرف دیکھتے رہے۔

’’ان حالات میں یہاں کی پولیس تو کام نہیں آسکتی۔‘‘ میئر نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’وہ تو اردشیر اور اس کے آدمیوں کو پہلے ہی سے خبردار کردے گی اسے براہِ راست میری طرف سے کیا احکام مل رہے ہیں۔‘‘

’’جی ہاں، یہ تو طے ہے۔‘‘

’’مجھے ابھی چیف منسٹر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ ضرورت ایک بڑے آپریشن کی ہے۔ پولیس وہیں سے منگوانا پڑے گی۔‘‘

’’صوبائی دارالحکومت سے پولیس کو یہاں آنے میں دیر بھی لگ سکتی ہے۔‘‘ داراب نے کہا۔

’’کوشش کی جائے گی کہ زیادہ دیر نہ لگے۔‘‘ میئر نے کہا۔ ’’اسی لیے میں ابھی چیف منسٹر سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’خود آپ کی پوزیشن بھی خراب ہوجائے گی۔‘‘ جالب نے تشویش ظاہر کی۔ ’’آپ سے جواب طلب کیا جاسکتا ہے کہ شہر کی صورتِ حال اتنی خراب کیسے ہوگئی۔‘‘

’’جواب تو یقیناً طلب کیا جائے گا۔ میری یہاں کی میئر شپ بھی ختم ہوسکتی ہے لیکن میں اس کے لیے تیار ہوں۔ بس میرا شہر ٹھیک ہونا چاہیے۔‘‘

’’ان کے معاملے میں کیا ہوسکتا ہے؟‘‘ جالب نے داراب کی طرف اشارہ کیا۔

میئر متفکر نظروں سے داراب کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ’’میں تمہیں اپنا اسپیشل ایجنٹ مقرر کیے دیتا ہوں۔ غالباً اس صورت میں یہاں کی پولیس تم سے کوئی تعرض کرنے کی ہمت نہیں کرسکے گی۔ اسپیشل ایجنٹ کی حیثیت سے تمہارا کارڈ صبح ہونے تک مل جائے گا۔ مجھے ابھی بہت تیزی سے احکامات جاری کرنے پڑیں گے۔‘‘

’’کیا آپ کسی کو اپنا اسپیشل ایجنٹ مقرر کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟‘‘ داراب نے تعجب سے کہا۔

’’نہیں، مجھے یہ اختیار نہیں ہے۔ میرا یہ اقدام غیر قانونی ہے۔ میرے خلاف کوئی بھی کارروائی ہوسکتی ہے لیکن ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس شہر کے حالات کو معمول پر لانے کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم کو یہ اختیار نامہ بھی دوں گا کہ پولیس تم سے تعاون کرے۔ اس کے باوجود تم سے شاید تعاون تو نہ کیا جائے لیکن تمہارے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی ہمت پولیس بہرحال نہیں کرے گی۔ ہمدانی کو بھی مطلع کرتا ہوں۔‘‘

’’ابھی یہ قدم نہ اٹھائیں۔‘‘ داراب جلدی سے بولا۔ ’’اردشیر چوکنا ہوجائے گا۔ یہ کام مرکز سے پولیس کے آنے کے بعد کیا جانا چاہیے۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ میئر نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر بولا۔ ’’یہ بھی ٹھیک ہے تم بہت ذہین بھی ہو نوجوان۔‘‘

PakiBooks.Site

داراب کو ایک بار پھر اپنی مسکراہٹ دبانا پڑی۔

''صبح ہونے سے پہلے سب چیزیں تمہارے گھر پہنچ جائیں گی۔ میرا مطلب ہے اسپیشل ایجنٹ کا کارڈ اور اختیار نامہ۔''

پھر میئر نے کچھ کہا نہ سنا، بس اپنا شراب کا گلاس اٹھا کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''اب میری واپسی کا بندوبست بھی کر دیجیے۔'' داراب نے جالب سے کہا۔

''ہاں، میں ابھی اسی آدمی کو بلاتا ہوں جو تمہیں لے کر آیا تھا۔''

☆☆☆

دوسری صبح روشنی بھی نہیں پھوٹی تھی کہ داراب نے اپنے گھر پر جالب کی کال ریسیو کی۔ جالب نے اس سے کہا۔ ''بھائی صاحب نے جو چیزیں آپ کو فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا، وہ پندرہ منٹ میں آپ کو مل جائیں گی۔ آپ ٹھیک پندرہ منٹ بعد اپنے گھر سے باہر نکلیے گا۔ جو شخص آپ کے لیے ایک پیکٹ لے کر آرہا ہے، اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ ہارن دے، بس آپ کو پیکٹ دے اور لوٹ جائے۔''

داراب کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ آگئی۔ جالب کا اندازِ تخاطب بدل گیا تھا۔ داراب کو سرسری سا خیال آیا کہ اس تبدیلی کا سبب کیا یہ ہے کہ اب وہ میئر کا ''اسپیشل ایجنٹ'' بن گیا تھا۔

''جی۔'' جالب کہہ رہا تھا۔ ''میں نے صرف یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔''

''شکریہ جالب صاحب۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

داراب نے جلدی سے اٹھ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ چہرے پر پانی کے دو چھپکے مارے اور تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے باتھ روم سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔ وہاں اس نے مائیکرو ویو اوون میں تھوڑا سا پانی گرم کر کے ایک پیالی چائے بنائی۔ دو سلائس سینکے اور ہلکا سا ناشتا وہیں کھڑے کھڑے کیا۔ نظر گھڑی پر بھی رہی۔ سب کچھ عجلت میں کیا تھا اس لیے صرف تیرہ منٹ گزرے تھے۔

مقررہ وقت پر جب وہ گھر سے نکلا تو ایک کار گھر کے سامنے رکنے ہی والی تھی۔ داراب تیزی سے چوبی دروازے کی طرف بڑھا۔ کار رک گئی تھی۔ داراب دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر وہی آدمی بیٹھا تھا جو گزشتہ رات داراب کو لینے اور پھر واپس چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے بلا تاخیر ایک لفافہ جیسا پیکٹ داراب کے حوالے کیا اور کار آگے بڑھا دی۔

داراب اطراف کا جائزہ لیتا ہوا گھر میں لوٹ آیا، پیکٹ کھول کر دیکھنے پر اسے وہی سب چیزیں ملیں جن کا میئر نے وعدہ کیا تھا۔

''واہ!'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''ریٹائرمنٹ کے بعد ایک عہدہ!''

پھر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں بھیڑو کو قید کیا تھا۔ دروازہ کھول کر دیکھنے پر اس نے بھیڑو کو بے سدھ پڑا سوتا ہوا دیکھا۔

داراب نے اسے جگایا تو وہ اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے کسی نے اس پر حملہ کر دیا ہو۔

''واش روم کا دروازہ وہ ہے۔'' داراب نے اشارہ کیا۔ ''اپنا حلیہ درست کر لو۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتا ہوں۔''

''اچھا صاحب!'' بھیڑو نے سعادت مندی سے کہا۔

داراب کمرا مقفل کر کے پھر کچن میں گیا۔ اس نے ناشتا تیار کیا اور ایک بڑی ٹرے میں سب چیزیں لے کر دوبارہ بھیڑو کے پاس پہنچا۔ ''ناشتے کے ساتھ دو ڈبل روٹیاں بھی ہیں۔ مکھن اور جیل بھی ہے۔ آج تمہیں شام تک اسی پر گزارا کرنا ہے۔''

''میرا کچھ بندوبست ہوا؟'' بھیڑو نے بے چینی سے پوچھا۔ ''مطلب یہ کہ سرکاری گواہ؟''

''بات کر لی ہے۔ اب تم مجھے اردشیر کے بارے میں وہ سب کچھ بتاؤ جو ابھی تم نے مجھے نہیں بتایا۔'' داراب نے اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا اور اسے مزید معلومات حاصل ہوئیں جن میں کچھ بہت اہم تھیں۔ وہ اٹھ کر فوراً اپنے کمرے میں آیا۔ کمپیوٹر پر بیٹھ کر اس نے تیزی سے وہ سب کچھ ٹائپ کر ڈالا جو اسے معلوم ہوا تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی بھول جانا مناسب نہیں ہوتا۔ اس سے فارغ ہو کر داراب نے اپنی روانگی کی تیاری کی۔

وہ جب گھر سے روانہ ہوا تو کار کی پچھلی سیٹ پر ایک کارٹن بھی رکھا ہوا تھا۔ کار روانہ ہوئی۔

طارق جس وقت اپنے اسٹور جاتا تھا، اس سے پانچ منٹ پہلے ہی وہ اس کے گھر پہنچ گیا۔

''اتنی صبح صبح؟ خیریت تو ہے؟'' بڑی بہن نے پوچھا۔

''بہت بور ہو گیا ہوں۔ آج کا دن طارق کے ساتھ ہی گزاروں گا۔''

کچھ دیر بعد طارق جب گھر سے روانہ ہوا تو اس کے پیچھے داراب کی کار بھی تھی۔ داراب محسوس کر رہا تھا کہ طارق نے اس کے جواب پر یقین نہیں کیا تھا اور الجھن میں پڑ گیا تھا۔ داراب کو اس کی الجھن گوارا تھی۔ وہ اسے حقیقت بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ اسٹور پہنچے تو ملازمین اپنی ڈیوٹی سنبھال چکے تھے۔

''کسی سے کہہ کر یہ کارٹن اٹھوا لو میری کار سے۔'' داراب نے طارق سے کہا اور کار کی چابی اس کے حوالے کر دی۔

''کیا لے آئے اس میں؟''

''بتاتا ہوں ابھی۔''

وہ دونوں اسٹور میں داخل ہوئے۔ طارق نے اپنے معتمد کو چابی دیتے ہوئے کہا۔ ''انکل کی گاڑی سے کارٹن اٹھوا لاؤ۔''

''زیادہ وزنی نہیں ہے لیکن اٹھوانا دو آدمیوں سے۔'' داراب بولا۔ اسے خیال تھا کہ اگر اردشیر کا کوئی آدمی اس کی نگرانی کر رہا ہو تو اندازہ نہ لگا سکے کہ کارٹن میں کیا ہوگا۔

جب کارٹن لے آیا تو داراب نے کہا۔ ''طارق کے کیبن میں پہنچا دو۔''

کارٹن پہنچا کر معتمد ملازم نے کار کی چابی داراب کو دے دی۔

''ذرا آؤ۔'' داراب نے طارق سے کہا۔

''طارق الجھا ہوا سا اس کے ساتھ کیبن میں پہنچا۔

''اخبارات تو ہوں گے؟'' داراب نے پوچھا۔

''یہ رکھے ہیں۔'' طارق نے اشارہ کیا۔

''دو ایک اخبار نکالو۔'' داراب نے کہا اور کارٹن کھولنے لگا۔

طارق نے اخبار نکالنے کے بعد دیکھا کہ داراب نے کارٹن سے اپنی سب مشین گن نکالی تھی۔

''یہ کیا انکل!'' طارق نے حیرت سے کہا۔

''ضروری تھا کہ یہ میرے ساتھ رہے۔'' داراب نے جواب دیتے ہوئے مشین گن کیس سے نکالی۔ ''کسی وقت بھی کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آسکتی ہے۔''

کمانڈو

طارق نے پھر کچھ نہیں کہا۔ داراب نے سب مشین گن کاغذ میں لپیٹ لی پھر طارق سے کہا۔ ''ابھی تو کاؤنٹر پر ہی بیٹھو گے؟''

''جی ہاں۔''

''میں بھی وہیں بیٹھوں گا، آؤ۔''

طارق خاموشی سے اس کے ساتھ کیبن سے باہر آگیا۔ غالباً اب وہ فوری طور پر تو کوئی سوال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

طارق جہاں بیٹھتا تھا، وہاں دو تین اضافی کرسیاں تھیں، کبھی کوئی قریبی جاننے والا آجاتا تھا تو طارق اسے اندر ہی بلا لیتا تھا یا اسے لے کر کیبن میں چلا جاتا تھا۔ داراب انہی کرسیوں میں سے ایک پر اس طرح بیٹھا کہ سب مشین گن اس کی گود میں تھی۔ اس نے وہ کاغذ میں اس لیے لپیٹی تھی کہ اسٹور کے ملازمین نہ دیکھ سکیں۔

''آج کسی ہوٹل سے لنچ یہیں منگوا لو۔'' داراب نے کہا۔ ''گھر فون کر دو کہ آج دو ایک دوست آگئے ہیں اس لیے کھانا یہیں کھاؤ گے۔''

''کبھی کبھی ایسا ہوتا بھی ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''بارہ بجے تک ہی فون کروں گا۔ سچ بتایئے انکل! کیا اسٹور پر حملے کا خطرہ ہے؟''

''حملہ ہوگا تو مجھے ختم کرنے کے لیے ہوگا۔'' داراب نے اسے ٹالا۔ ''لیکن اس مشین گن کی وجہ سے کسی کی چل نہیں سکے گی۔''

طارق نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے چہرے سے الجھن بدستور عیاں رہی۔ ایک بجے لنچ منگوا کر کھا لیا گیا۔

دن اس طرح گزر گیا کہ کوئی خاص صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی۔ داراب نے اس دوران میں سوچ لیا تھا کہ واپسی پر وہ جالب کو فون کر کے پوچھے گا کہ صوبائی مرکز سے پولیس کے آنے کی کیا توقع ہے؟

اسٹور ساڑھے آٹھ بجے بند کیا گیا۔ روانگی سے پہلے داراب نے دوبارہ اپنی سب مشین گن کارٹن میں نہیں رکھی۔ ایسا تو اس نے اس لیے کیا تھا کہ مشین گن اسٹور کے ملازمین کے علم میں نہ آئے۔ اب واپسی میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے دن وہ آتا تو مشین گن ایک اور کارٹن میں رکھ لاتا۔ اس وقت وہ اسے کاغذ میں چھپائے ہوئے اپنی کار میں جا بیٹھا۔ مشین گن اپنے برابر کی نشست پر رکھ لی۔ کار اس نے طارق کی کار کے پیچھے رکھی۔ وہ ایک

PakiBooks.com

پل کے لیے بھی طارق کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر اس نے دوسرے ہاتھ سے موبائل پر جالب سے رابطہ کیا۔ جالب نے فوراً کال ریسیو کی۔ داراب بولا۔

''معاف کیجیے گا، میں اس وقت کسی اہم وجہ سے فون نہیں کررہا ہوں جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا لیکن کچھ اہمیت بہرحال اس بات کی بھی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ پولیس بُلانے کی بات ہوگئی؟''

''ہاں۔'' جالب نے جواب دیا۔ ''لیکن اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔ پولیس کل صبح تک آسکے گی۔ بھائی صاحب چیف منسٹر سے مسلسل رابطے میں ہیں۔''

''مجھے بس یہی پوچھنا تھا۔''

''جب تک پولیس آکر آپریشن شروع نہ کردے، آپ اپنا خیال رکھیے گا۔''

''میں بہت ہوشیار ہوں اور یہ بھی محسوس کررہا ہوں کہ اردشیر مجھ سے کچھ مرعوب ضرور ہوگیا ہے۔ اب وہ بہت احتیاط سے کوئی ایسا منصوبہ بنانا چاہتا ہے کہ ناکام نہ رہے۔''

''مرعوب تو وہ ہوگا۔ اس نے اپنے پانچ ماہر لڑاکا آپ کو اغوا کرنے کے لیے بھیجے تھے اور آپ نے ان پانچوں ہی کو خاک چٹوادی۔ اب وہ ہیں تو پولیس کی قید میں لیکن ہمدانی کے ذریعے اسے معلوم تو ہوگیا ہوگا۔ جو چاروں قید میں ہیں، انہوں نے بیان دیا ہے کہ وہ کہیں سے آرہے تھے کہ ایک سڑک پر انہیں ڈاکوؤں کی دو کاروں نے گھیر لیا۔ وہ ان سے خاصی رقم بھی لوٹ لے گئے اور انہیں اتنا مارا بھی کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ اپنے پانچویں ساتھی کا انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پولیس دکھاوے کے لیے ان سے پوچھ گچھ جاری رکھے ہوئے ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آج ہی کسی وقت انہیں ضمانت پر رہا کردیا جائے گا۔ اب بھائی صاحب پوری طرح فعال ہوچکے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ نہیں کیا۔ انہوں نے سوچا ہے کہ انہیں ضمانت پر رہا ہونے دیا جائے۔ ان سب کی سرکوبی آپریشن کے آغاز سے ہی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب مجھے بس پولیس کا انتظار ہے۔''

بات ختم کرکے موبائل داراب نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس نے جالب کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ چاروں اپنے جسم تیزاب کے حوض کی نذر کرنے کے بجائے شہر سے کہیں بھاگ جائیں گے۔ بھیڑو نے یہی بتایا تھا کہ اردشیر اپنے ناکام لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑتا۔

جالب سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ طارق کی طرف سے بالکل غافل نہیں رہا تھا۔

کاریں جب گھر کے قریب پہنچیں تو وہاں خاصے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کی دو گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ داراب کے اعصاب میں تناؤ آگیا۔ اس وقت طارق نے اپنی کار بہت تیزی سے آگے بڑھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نے بھی وہ سب کچھ دیکھ لیا ہوگا جو داراب نے دیکھا تھا۔

جب وہ دونوں کار سے اُترے تو داراب نے سب مشین گن اپنی کار ہی میں چھوڑ دی تھی۔ ریوالور اس کی جیب میں تھا۔

ہجوم ان لوگوں کا تھا جو طارق کے گھر کے آس پاس رہتے تھے۔

معلوم ہوا کہ بیس منٹ پہلے کچھ مسلح لوگوں نے طارق کے گھر پر دھاوا بولا تھا اور طارق کی بیوی ریحانہ کو اٹھا لے گئے تھے۔ انہوں نے بے تحاشا فائرنگ کی تھی تاکہ وہاں رہنے والے خوف زدہ ہوکر دور ہی رہیں۔ جاتے وقت بھی انہوں نے فائرنگ کی تھی۔ مجمع ان لوگوں کے جانے کے بعد لگا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں پانچ سات منٹ پہلے ہی وہاں پہنچی تھیں۔

پڑوس کی کچھ عورتیں گھر میں پہنچ گئی تھیں۔ طارق کے بلکتے بچوں کو بہلایا جارہا تھا اور داراب کی بڑی بہن کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

''یہ کیا ہوگیا انکل؟'' طارق کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''یہ اردشیر ہی کی بزدلانہ کارروائی ہوسکتی ہے۔'' داراب نے دانت پیسے۔ ''اس کا مقصد......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''آپ ہی اس گھر کے مالک ہیں۔'' ایک پولیس افسر طارق کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''جی۔'' طارق نے جواب دیا اور پھر پولیس آفیسر پر برس پڑا۔ ''شہر میں یہ ساری شیطنت آپ ہی لوگوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہے۔ میں جو ایف آئی آر کٹواؤں گا، اس میں اپنی بیوی کے اغوا کا ذمے دار آپ ہی لوگوں کو ٹھہرایا جائے گا۔''

داراب کی دانست میں طارق نے احمقانہ دھمکی دی تھی۔ سارے شہر کی پولیس ایک دوسرے کی دم ساز بن چکی تھی، لیکن داراب نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔ اس کا دماغ کئی خیالات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔

پولیس آفیسر سے طارق کی تلخ بیانی جاری تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے موبائل نکالا اور چیختی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ ''تم!'' وہ مشتعل ہوگیا تھا۔

داراب نے فوراً اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ کال کرنے والا اردشیر ہی ہوگا۔ وہ موبائل کان سے لگاتے ہوئے طارق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پولیس والوں اور لوگوں سے دور لے جانے لگا۔

موبائل پر دوسری طرف سے آواز آرہی تھی۔ ''ہاں، میں ہی ہوں۔ اردشیر، اس شہر کا مالک۔ میرے آدمی تمہاری بیوی کو اغوا کرلائے ہیں۔ فی الحال میں اسے ایک کمرے میں بند کروارہا ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ تم اگر چاہو میرے گھر آکر اسے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ مجھے تم سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔ میں تمہیں ہی اغوا کرواتا لیکن تم نے آج ایک ایسے آدمی کو اپنا باڈی گارڈ بنائے رکھا کہ ہنگامہ بہت زیادہ ہوجاتا۔ اسی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہاری بیوی کو اغوا کروالیا جائے۔ اس کی خاطر تو تمہیں آنا ہی پڑے گا۔''

لوگوں سے کچھ دور نکل آنے کے بعد داراب نے موبائل کا اسپیکر آن کردیا تھا تاکہ طارق بھی اردشیر کی آواز سن لے جس کے لیے وہ بے تاب نظر آرہا تھا۔

داراب نے موبائل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بات کرنے کا اشارہ کیا۔

''کیا معلومات کرنی ہیں تمہیں؟'' طارق کی آواز کانپ رہی تھی۔

''یہ تمہیں اسی وقت معلوم ہوگا جب تم یہاں آؤ گے۔''

''تم ہم دونوں کو مار بھی سکتے ہو؟''

''مجھے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔''

''اگر میں نہ آؤں تو تم کیا کرو گے؟'' طارق نے کہا۔

''یہاں میری بیوی کی ماں کی حالت خراب ہے۔ تمہارے بزدل اور بے حیا آدمیوں نے ان پر بھی ہاتھ اٹھایا۔ بے ہوش کردیا انہیں۔ مجھے ان کا بھی خیال رکھنا ہے۔ وہ صرف میری بیوی ہی کی ماں نہیں ہیں۔ میں بھی انہیں اپنی ماں سمجھتا ہوں۔''

''اگر اس بوڑھی عورت کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کا سبب ایک ہی ہوسکتا ہے۔ مزاحمت کی گئی ہوگی۔ خیر! اگر تم بڑھیا کی وجہ سے وہاں رکنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم دو گھنٹے بعد آجاؤ۔ ہاں، اس وقت ساڑھے نو بجنے والے ہیں۔ میں تمہیں ساڑھے گیارہ بجے تک کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اگر تم اس وقت تک نہ آئے تو پھر تمہاری بیوی کی خیریت نہیں۔ ابھی تو اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی ہے لیکن اگر تم ساڑھے گیارہ بجے تک نہ آئے تو تم سوچ سکتے ہو، اس کے ساتھ یہاں کیا کچھ ہوسکتا ہے۔''

''کمینے!'' غصے سے طارق کا سارا جسم لرز اٹھا۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''میں جاؤں گا انکل!'' طارق نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ریحانہ کی خاطر میں اپنی زندگی سے بھی کھیل سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے بدگمان تو رہنے لگی ہے لیکن میں اسے بہت چاہتا ہوں۔ میں جاؤں گا۔''

''بہکانا باتیں نہ کرو۔ تم باجی کا اور اپنے بچوں کا خیال رکھو۔ میں جاتا ہوں اس کے گھر۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بیوی کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔''

''آپ اکیلے یہ خطرہ کیوں مول لیتے ہیں۔ میں بھی چلوں گا آپ کے ساتھ۔''

''تم میرے لیے آسانی پیدا کرنے کے بجائے مشکل کھڑی کردو گے، میں ان سے مقابلہ کروں گا یا تمہارا خیال رکھوں گا۔ میری بات مانو۔ تم بچوں وغیرہ کی دیکھ بھال کرو۔''

داراب بمشکل طارق کو روکنے میں کامیاب ہوسکا اور اسے چھوڑ کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کیا اور کار تیزی سے دوڑا دی۔ اسے یقین تھا کہ یہ جال دراصل اس کے لیے پھیلایا گیا ہے۔ اردشیر نے یہی سمجھا ہوگا کہ طارق یہ باتیں اسے ضرور بتائے گا اور داراب ریحانہ کو بچانے کے لیے شیر کی کچھار میں کودنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اسے ختم کرنے کے لیے اردشیر کے آدمی پوری طرح تیار ہوں گے۔

یہ ایسی صورت حال تھی کہ داراب کا اس کے گھر میں داخلہ ہی بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا۔ اس سلسلے میں کئی خیالات اس کے ذہن میں گردش کررہے تھے۔ آخر اس نے ایک تدبیر پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کار کی رفتار دھیمی کی اور اس نے ایک ایسی سڑک پر موڑی جہاں زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔

PakiBooks Site

زیادہ ٹریفک کی جگہ کار میں بیٹھے بیٹھے موبائل کا استعمال خطرناک ثابت ہوجاتا ہے۔

اس سڑک پر پہنچ کر اس نے بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اپنا موبائل نکالا اور جالب سے رابطہ کیا۔

''ہیلو!'' جالب کی آواز سنائی دی۔ ''کیا پھر پولیس کے بارے میں کوئی بات پوچھنا ہے؟''

''جی نہیں۔'' داراب نے کہا۔ ''اب پولیس جب بھی یہاں پہنچ سکے، پہنچے۔ مجھے اب خود کچھ ایکشن لینا ہے۔''

''صورتِ حال میں کچھ تبدیلی آئی ہے کیا؟''

''جی ہاں۔'' داراب نے کہا اور اسے ساری بات بتا دی۔

''یہ تو واقعی آپ کے لیے بہت سنگین صورتِ حال پیدا ہوگئی۔'' جالب کے لہجے میں تشویش تھی۔

''جی ہاں، ریحانہ آخر میری بھانجی بھی ہے۔ میں اس کی آبرو سے کھلواڑ نہیں ہونے دوں گا، خواہ اس میں میری جان چلی جائے۔ دراصل یہ جال اردشیر نے میرے لیے ہی بچھایا ہے۔ اسے یقین ہوگا کہ میں اس کے گھر پہنچوں گا۔ وہاں اس کے آدمیوں نے مورچے سنبھال لیے ہوں گے تاکہ جیسے ہی میں وہاں قدم رکھوں، مجھے گولیوں سے بھون ڈالا جائے لیکن آج میں اپنی زندگی کے سارے تجربات کا امتحان ضرور لوں گا۔''

''ہوسکتا ہے آپ کو خود پر بہت زیادہ اعتماد ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح آپ خودکشی کریں گے۔''

''میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ اگر آپ میری کچھ مدد کرسکیں تو میرے لیے خطرہ بہت کم ہوجائے گا۔ میں بس اس کے گھر کے احاطے میں لگے مورچوں کی زد پر نہ آؤں اور عمارت میں داخل ہوجاؤں تو سب سنبھال لوں گا۔''

''میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جو تدبیر بھی آپ کے ذہن میں ہو، مجھے بتا دیجیے۔ میں ابھی اس سلسلے میں بھائی صاحب سے بات کرلوں گا۔ نا جانے کیوں، وہ آپ سے خاصے متاثر ہیں۔''

''آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ ہمدانی اس وقت جہاں بھی ہو، اسے وہاں سے لے آئیں۔''

''اپنے گھر پر؟ یعنی میئر صاحب کے گھر پر؟''

''جی ہاں، لیکن یہ کام آپ خود کریں۔ آپ خود اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہیں۔ کسی اور کو بیچ میں نہ ڈالیں۔ دو اہم باتیں اور بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمدانی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ آپ اچانک اس کے سامنے پہنچ جائیں اور اس سے کہیں کہ اسے میئر صاحب نے بلایا ہے۔ وہ اس بات سے کھٹک تو جائے گا لیکن آپ کی بات ماننے سے انکار نہیں کر سکے گا۔ دوسری بات یہ کہ آپ اسے اتنی مہلت نہ دیں کہ وہ کسی کو بھی فون نہ کر سکے۔ کسی کو کیا، وہ بس اردشیر کو ہی اطلاع دینا چاہے گا کہ اسے میئر صاحب نے طلب کیا ہے۔''

''یہ تو کچھ زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔ میں ابھی بھائی صاحب سے بات کرلوں گا، اسے لے بھی آؤں گا جاکر۔ اسے اس وقت اپنے گھر پر ہی ہونا چاہیے۔ اگر وہ کہیں اور ہوا تو بھی اس کا پتا لگالوں گا کسی طرح۔ اس میں کچھ دیر سویر ہوجائے تو دوسری بات ہے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا سکیں گے؟''

''یہ میں وہیں آکر آپ کو بتاؤں گا۔ اسے یہ ہدایت دینا بھی ضروری ہے کہ وہ وہی سب کچھ کرے جو میں اس سے کہوں۔ جیسے ہی آپ اسے لے آئیں، مجھے اطلاع دے دیجیے گا۔''

''میں ابھی بات کرتا ہوں میئر صاحب سے۔''

''خیال رہے کہ وقت بہت کم ہے۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔ اب آپ مجھے اپنا ای میل ایڈریس بتا دیں۔''

''کچھ بھیجنا ہے مجھے؟''

''جی ہاں۔ تفصیل میں آپ کو آکر ہی بتاؤں گا۔ وقت کی کمی کے باعث فون پر وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ لکھ لیں ای میل ایڈریس۔''

''بتایئے۔''

جالب نے بتا دیا۔ وہ اتنا آسان ایڈریس تھا کہ اسے نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ داراب کو یاد رہتا۔ جالب سے یہ بات ختم کرکے داراب نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ اب اسے جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا اور کمپیوٹر کھولا۔ اس نے بھیڑو سے جو معلومات حاصل کی تھیں، وہ اس نے صبح ہی ٹائپ کرلی تھیں۔ وہ اس نے جالب کے ای میل ایڈریس پر بھیج دیں۔ یہ اس نے اس لیے کیا تھا کہ اگر وہ اس مہم میں مارا جائے تو وہ معلومات جالب کے ذریعے اس پولیس کے سربراہ کو مل جائیں جسے آپریشن کرنا تھا۔

پھر اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ہمدانی کو میئر کے گھر لانے میں جالب کو ساٹھ منٹ لگ سکتے ہیں... اسی لیے اس نے اپنے قیدی کے کمرے کا رخ کیا۔ اس سے باتیں کرکے مزید معلومات حاصل کرنی چاہئیں لیکن جو کچھ وہ بتا چکا تھا، اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں بتا سکا۔

''اچھا تم آرام کرو۔'' داراب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں آج رات بہت مصروف ہوں۔''

''وہ دے دیں گے تھوڑی سی۔'' بھیڑو گھگھیایا۔

داراب نے ایک مرتبہ اسے گھور کر دیکھا تو وہ نظریں چرانے لگا۔

''اچھا، لاتا ہوں۔''

داراب نے بوتل لاکر اسے دے دی جو نصف کے لگ بھگ تھی۔ بوتل دے کر وہ گھر سے روانہ ہوگیا۔ کمرا مقفل کرنا وہ نہیں بھولا تھا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں ہی اس نے طارق کو فون کیا۔

''کچھ ہوا انکل؟'' طارق نے بے تابی سے پوچھا۔

''ابھی نہیں لیکن ہوجائے گا۔ ابھی میں کچھ انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ امید ہے کہ میں گیارہ بجے سے پہلے اردشیر کے گھر میں ہوں گا۔ اس کے بعد تمہیں جلد ہی خوش خبری ملے گی کہ [illegible] کو چھڑا لیا گیا ہے۔''

''[illegible]''

''[illegible] کی کیا پوزیشن ہے؟''

''اسپتال میں ہیں۔ میں بھی وہیں ہوں۔ ہوش آچکا ہے انہیں۔ بڑا بھی میرے ساتھ ہے۔ چھوٹے کو میں مسز قادر کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ اچھے لوگ ہیں وہ۔''

اس کے بعد داراب نے طارق کو تسلی دینے کے لیے دو تین فقرے اور کہے، پھر رابطہ منقطع کردیا۔ کار تیزی سے آگے بڑھتی رہی۔ اسے کچھ اندیشہ تھا کہ جالب کو ہمدانی شاید گھر پر نہ ملے اس لیے کچھ دیر بھی ہوسکتی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں وقت کا حساب لگایا اور فیصلہ کیا کہ اگر زیادہ دیر لگی تو وہ اکیلا ہی اپنی مہم پر چل پڑے گا۔ اس کے رگ و پے میں چنگاریاں سی چٹخ رہی تھیں۔

کار اس نے میئر کے گھر سے دو منٹ کے فاصلے پر روکی۔ وہ چاہتا تھا کہ جالب کی طرف سے خوشگوار اطلاع ملتے ہی وہ وہاں پہنچ جائے۔ اسے توقع تھی کہ وہ اطلاع اسے دس منٹ کے اندر اندر مل جائے گی لیکن وہ اطلاع اسے پانچ منٹ میں ہی مل گئی۔

''آجائیں۔'' جالب نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

اتنی مختصر بات کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمدانی کو لانے میں کامیاب رہا تھا۔

''میں قریب ہی ہوں۔ دو منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ گیٹ پر اطلاع دے دیجیے کہ میری کار دیکھ کر فوراً گیٹ کھول دیا جائے۔ اس وقت ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔'' یہ باتیں کرتے ہوئے داراب کار حرکت میں لے آیا تھا۔

بہت جلد وہ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں ہمدانی کے ساتھ جالب اور میئر بھی موجود تھے۔ ہمدانی کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

''مجھے صدمہ پہنچا ہے ہمدانی کہ تم اب تک یہ کردار ادا کرتے رہے ہو۔'' میئر ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

داراب کو دیکھ کر ہمدانی اچھل پڑنے کی حد تک چونک گیا۔

جالب نے ہمدانی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اب وہی سب کچھ کرنا ہے جو یہ تمہیں بتائیں گے۔'' اس نے داراب کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔'' داراب نے کہا۔ ''ذہن منتشر ہو تو ذہن کسی اہم معاملے میں بھی چوک جاتا ہے۔ اس شخص کی کار بھی یہاں ہونا چاہیے تھی۔''

''کار اس کے گھر سے منگوائی جاسکتی ہے۔'' جالب بولا۔ ''ہاں آدھا گھنٹا لگے گا اس میں۔''

''اس صورت میں گیارہ بجے سے پہلے میں وہاں نہیں پہنچ سکتا۔''

''کرنا کیا ہے؟'' میئر نے پوچھا۔

''یہ اپنی کار میں ہی مجھے لے جاتا۔ اسے ابھی اردشیر کو فون کرنا ہے کہ میئر صاحب اس کے ذریعے اسے یعنی اردشیر کو کوئی تحریری پیغام بھیج رہے ہیں۔''

''اس طرح تو وہ کھٹک جائے گا کہ مجھے اس کے معاملات کا کچھ علم ہوچکا ہے۔''

''کھٹک تو جائے گا لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کی کار کو اندر داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی جائے۔ وہ جاننا تو چاہے گا کہ شہر کا میئر اس کے لیے کیا پیغام بھیج رہا ہے۔''

''تو اس کے لیے تم میری کار استعمال کرو تو اور بہتر ہوگا۔ یہ تمہیں میری ہی کار میں لے جائے گا تو وہ لوگ دبے دبے سے رہیں گے۔ میری کار تو وہ پہچانتے ہی ہوں گے۔''

''آپ کی یہ مہربانی تو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا میئر صاحب۔''

''مہربانی نہیں ہوگی یہ۔ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو، وہ

میرے لیے خوشی کی بات ہے۔"

"تم نے سن لیا؟" داراب نے ہمدانی سے کہا۔ "تمہیں میری ہدایت کے مطابق چلنا ہے۔ پہلے تو تم اسے فون کرو۔"

"میرے ہی فون سے کرو بات۔" میئر نے کہا۔ "شاید اسے میرا نمبر معلوم بھی ہوگا۔" میئر نے موبائل ہمدانی کی طرف بڑھا دیا۔

موبائل لیتے ہوئے ہمدانی کے ہاتھ میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔ اس نے اردشیر کا نمبر ملایا۔

"اسپیکر آن کردو۔" داراب نے کہا۔

ہمدانی نے تعمیل کی۔

رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے اردشیر کی متحیر آواز سنائی دی۔ "کیا آپ میئر صاحب بول رہے ہیں۔ یہ نمبر تو....."

"میں ہمدانی بول رہا ہوں۔" اس نے اردشیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں میئر صاحب کے گھر میں ہوں۔ انہوں نے مجھے طلب فرمایا تھا۔ وہ اپنا کوئی تحریری پیغام آپ تک میرے ذریعے سے پہنچانا چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہوا اس کا؟" اردشیر نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ تو انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔"

"معاملہ کچھ گڑبڑ ہوگیا ہے کیا؟ کچھ معلوم ہوگیا ہے میئر کو؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ضرور سمجھ میں آرہا ہے..... کہ وہ کوئی ایکشن لینے کے بجائے معاملات کو کسی اور طرح سدھارنا چاہتے ہوں گے۔"

"ابھی تم کہاں ہو؟"

"ابھی تو میں میئر صاحب کے سامنے ہی بیٹھا ہوں لیکن بس روانہ ہونے والا ہوں۔ وہ اپنی کار مجھے دے رہے ہیں۔"

"ان سے میری بات کراؤ۔"

داراب نے فوراً میئر کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ اس کا یہ اشارہ میئر کے علاوہ ہمدانی نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر میئر کی طرف دیکھا۔

داراب بولا۔ "اس سے کہو کہ میئر صاحب بات نہیں کرنا چاہتے۔ سب کچھ تحریر کی صورت میں آپ کے سامنے آجائے گا۔"

"اچھا آؤ تم!"

ہمدانی نے رابطہ منقطع کردیا۔

اسی دوران میں میئر نے ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر جاکر ایک اور موبائل پر کسی سے کچھ مختصر سی بات کی تھی۔ اب اس نے داراب سے کہا۔ "گاڑی تیار کروادی ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

"چلو۔" داراب کھڑا ہوگیا۔

ہمدانی کے ساتھ جالب بھی اٹھا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔" میئر نے کہا۔

"شکریہ سر۔" داراب نے کہا۔

جالب نے اسے اور ہمدانی کو باہر کھڑی ہوئی میئر کی کار تک پہنچایا۔

"ڈرائیونگ تم ہی کرو گے۔" داراب نے ہمدانی سے کہا۔ خود اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا دروازہ کھولا تھا اور اس سے پہلے اپنی کار سے سب مشین گن نکال لی تھی جسے دیکھ کر ہمدانی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا تھا۔

"گڈ لک۔" جالب نے اس وقت کہا جب کار حرکت میں آگئی۔

داراب سیٹ کے بجائے پائدان کے خلا میں بیٹھا تھا۔ باہر سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ سب مشین گن وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھا۔ ریوالور بھی اس کی جیب میں تھا۔

"خیال رہے۔" اس نے ہمدانی سے کہا۔ "کار گیٹ سے اندر لے جاتے ہوئے اگر تم نے کسی کو کچھ اشارہ کیا تو وہ مجھ سے چھپا نہیں رہے گا اور وہیں اس مشین گن کی بے شمار گولیاں تمہارا جسم چھلنی کردیں گی۔"

جواب میں ہمدانی کچھ نہیں بولا۔

☆☆☆

کار کو اردشیر کے گھر کے پھاٹک پر نہیں رکنا پڑا۔ گیٹ فوراً ہی کھول دیا گیا تھا جس کی ہدایت گیٹ کھولنے والوں کو اردشیر ہی سے ملی ہوگی۔

کار آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس وقت داراب نے ہمدانی پر کڑی نظر رکھی تھی۔ اس نے سوچا کہ احاطہ اتنا بڑا ہے کہ عمارت کے صدر دروازے تک پہنچنا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ احاطے میں مورچے لگائے بیٹھے ہوئے گن بردار اسے بھون کر رکھ دیتے۔

صدر دروازے پر ہمدانی نے کار روک دی۔ وہاں

وہ آدمی کھڑے تھے جو کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی مخالف سمت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اس طرف کا دروازہ کھلتے ہوئے تو دیکھ لیا ہوگا لیکن یہ نہیں دیکھ سکے ہوں گے کہ اس طرف سے داراب بہت جھکا ہوا باہر نکلا تھا۔

جب داراب ان کے سامنے پہنچا تو وہ چونک پڑے۔ داراب کے ہاتھوں میں دبی ہوئی سب مشین گن دیکھ کر ان کے اعصاب چٹخ گئے ہوں گے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سنبھل سکتے، فضا میں سب مشین گن سے نکلنے والی گولیوں کی تڑتڑاہٹ پھیل گئی۔ نہ جانے کتنی ہی گولیاں ان کا جسم چھلنی کرگئی ہوں گی۔ وہ اس طرح گرے کہ پھر ان کے جسم ذرا بھی حرکت نہیں کرسکے۔

اس وقت گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

داراب جست لگا کر صدر دروازے پر پہنچا۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ داراب اسے کھولتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن احتیاط کے طور پر داراب نے ایک برسٹ گھما دیا اور پھر تیزی سے ایک طرف بڑھا۔

بھیڑو نے اسے اس گھر کا اندرونی نقشہ سمجھا دیا تھا اس لیے اس نے اسی طرف بڑھنا شروع کیا جہاں فوری طور پر کسی کا سامنا ہونے کا امکان بہت کم تھا۔ یہ بات البتہ طے تھی کہ مشین گن کی گولیوں نے بھی کوئی نہ کوئی چونکا دیا ہوگا۔ بھیڑو نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کے چالیس پچاس افراد اس گھر میں ہر وقت رہتے تھے۔ گھر بہت بڑا تھا۔

اور پھر جلد ہی سامنا بھی ہونے لگا۔ ان لوگوں کے پاس رائفلوں یا ریوالور سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہاں انہوں نے اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی ہوگی اس لیے داراب کی مشین گن انہیں بھونتی رہی۔ سارے گھر میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج رہی تھی۔

داراب اس طرف بڑھنے کی کوشش کررہا تھا جہاں اردشیر کا کمرا ہونا چاہیے تھا۔ وہ جب ایک راہداری سے گزرا تو اس نے فائرنگ روک دی۔ وہاں اس کے سامنے کوئی تھا ہی نہیں لیکن گولیاں چلنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ اردشیر کے آدمی شاید پاگل ہوگئے تھے۔ ہدف ان کے سامنے نہیں تھا لیکن وہ ہر طرف گولیاں برساتے چلے جارہے تھے۔

راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے وہاں کے ایک کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا تو دیوار سے چپک کر رک گیا۔ اس نے کمرے سے ایک آدمی کو اس طرح نکلتے دیکھا کہ وہ اپنی پتلون درست کررہا تھا۔ وہ داراب کی مخالف سمت میں دوڑتا چلا گیا۔ اس نے اس طرف نہیں دیکھا تھا جدھر داراب دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔

داراب نے اسے نظروں سے اوجھل ہوجانے دیا۔ اسے کچھ شبہ ہوا تھا اس لیے وہ مشین گن چلا کر دشمن کو یہ اندازہ لگانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔

اس آدمی کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی داراب تیزی سے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں سے وہ شخص نکلا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ داراب کو سامنے ہی وہ بستر دکھائی دیا جس پر ریحانہ موجود تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اتنا سرخ تھا جیسے اسے بے تحاشا تماچے لگائے گئے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ وہ بستر کی چادر سمیٹ کر اپنا جسم ڈھک رہی تھی۔

ایک چیخ داراب کے جسم میں ہی کہیں گھٹ گئی۔ بات بالکل واضح ہوگئی تھی۔ اردشیر نے ریحانہ کے سلسلے میں طارق سے جو وعدہ کیا تھا، اسے فراموش کردیا تھا۔

داراب کو دیکھ کر ریحانہ چونکی۔ پھر ایسا لگا جیسے وہ بے تحاشا لپک کر داراب کے سینے سے لگ جانا چاہتی ہو لیکن پھر اسے احساس ہوگیا کہ اس کی ایسی کوئی حرکت اس کے جسم کو چادر سے بے نیاز کردیتی۔ وہ ساکت رہ گئی اور ہچکیاں لینے لگی۔

داراب نے تیزی سے اس کے قریب جاکر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ "اسے کمینہ ثابت ہونا ہی چاہیے تھا شاید۔" اس نے کہا۔

"انکل....." ریحانہ نے دھنسی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا۔

"خاموش رہو۔ کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔" داراب کی آواز میں لرزش تھی۔ "سب کچھ سمجھ میں آگیا ہے۔ میری۔ اس کا حساب تو میں اچھی طرح لوں گا۔ میں جارہا ہوں باہر۔ تم کمرے کا دروازہ بند کرلینا۔"

ریحانہ کچھ نہیں بولی۔ شاید بولنے کے قابل ہی نہیں رہ گئی تھی۔ داراب چھلاوے کی طرح کمرے سے نکلا۔ اس کی رگوں میں خون اب اس طرح رواں تھا جیسے کوئی سمندر ٹھاٹیں مار رہا ہو۔

سامنے پھر کچھ لوگ آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی داراب نے مشین گن کا دہانہ کھول کر ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔

اسی وقت کسی جانب سے رائفل کی دو تین گولیاں اس کی

PakiBooks.Site

طرف آئیں۔ ان میں سے ایک گولی اس کی ران میں پیوست ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر اس سمت میں مشین گن سے گولیاں چلا دیں۔

وہ ایک بالکونی تھی جہاں سے داراب پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ وہاں سے ایک آدمی چیخ مار کر نیچے گرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی رائفل بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر رہی تھی۔

داراب نے غصے میں ایک طویل برسٹ مارا اور ساری بالکونی کو چھلنی کر دیا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد یہ اس کی پہلی حماقت تھی کہ اس نے گولیاں ضائع کی تھیں۔ یہ فائرنگ اس کا ایک مجنونانہ اقدام تھا۔

اب اس نے پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ران سے خون بہہ کر جوتے تک پہنچ رہا تھا لیکن ریحانہ کی حالت دیکھنے کے بعد اس کی جذباتی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں تھا جبکہ چلنے میں لنگڑاہٹ بھی آ گئی تھی۔

اس رات اس گھر میں غالباً چالیس پچاس سے بھی زیادہ افراد تھے کیونکہ گولیاں چلنے کی شدت میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی تھی جبکہ داراب کے اندازے کے مطابق وہ تیس سے زیادہ آدمیوں کو موت کی نیند سلا چکا تھا۔

آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ داراب کو آڑ لینا پڑ گئی۔ سامنے کچھ ایسے لوگ آ گئے تھے جو آڑ لے کر ہی فائرنگ کر رہے تھے اور انہوں نے داراب کو دیکھ لیا تھا۔ اگر داراب نے بروقت آڑ نہ لی ہوتی تو وہ خاصی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔

جب وہ آڑ میں ہو گیا تو سامنے سے گولیاں چلنی بند ہو گئیں اور ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے پاگل آدمی! اب تم یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔“ وہ آواز اردشیر کی تھی۔ ”تم خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ یہاں سے تم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آخر کار تم مارے ہی جاؤ گے۔ یہ خیال ذہن میں نہیں لانا کہ گولیوں کی اس بارش کی آواز آس پاس کے لوگوں نے نہیں سنی ہو گی۔ وہ پولیس کو اطلاع دے چکے ہوں گے لیکن پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑے گی۔“

”یہ تو میں جان چکا ہوں اردشیر۔“ داراب نے بلند آواز میں کہا۔ ”اس شہر کی پولیس کو تو تم نے ہمدانی کے ذریعے اپنا غلام بنا لیا ہے لیکن غلام کبھی کسی وقت دھوکا دے سکتا ہے۔ ہمدانی ہی مجھے یہاں لایا ہے۔“

”اسے اس کی سزا بھی مل چکی ہے۔ باہر اس کی لاش پڑی ہے۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ جب تک میرے پاس ایک بھی گولی ہے، میں ہار نہیں مانوں گا مارا جانا گوارا ہے مجھے۔“

”تو پھر مارے ہی جاؤ گے۔“

ان باتوں کے دوران میں دوسری طرف سے گولیاں چلنی بند ہو گئی تھیں جس سے داراب نے فائدہ اٹھایا۔ ایک دم آڑ سے نکل کر مشین گن کا دہانہ کھول دیا۔ کئی چیخیں سنائی دیں۔ پھر جب جواب آیا تو داراب پھر آڑ لے چکا تھا۔

”پولیس آ گئی ہے ماسٹر۔“ کسی جانب سے کوئی چلایا۔

”تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟“

”پولیس ہمارے شہر کی نہیں ہے۔ عمارت کو چاروں طرف سے گھیرا جا رہا ہے۔“

”یہ..... یہ کیسے.....؟“ اردشیر ہکلا سا گیا۔

داراب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یہ پولیس صوبائی مرکز سے آئی ہو گی اردشیر..... اوہاں سے منگوائی گئی ہے یہ تم لوگوں کے خلاف آپریشن کرنے کے لیے۔ بس کچھ دیر ہو گئی ہے اس کے آنے میں ورنہ مجھے تن تنہا اندر آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اب سمجھ لو کہ کسی طرح بھی یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔“

اردشیر کچھ نہیں بولا۔ دوسری طرف سناٹا سا چھا گیا تھا۔

”کیا موت آ گئی تمہیں؟“ داراب ہنسا۔

اب بھی اردشیر کی آواز نہیں سنائی دی لیکن اس طرف سے گولیاں وقفے وقفے سے چلتی رہیں۔

اچانک داراب کو خیال آیا کہ نئی سچویشن کو سمجھ کر اردشیر وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں ہی سوچ سکتا ہے۔ داراب یہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ فرار ہونے کے لیے کیا راستہ اختیار کرے گا۔ بھیڑو سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس عمارت کی چھت پر ایک ہیلی کاپٹر ہر وقت موجود رہتا تھا۔

”نہیں۔“ داراب زیر لب بڑبڑایا۔ ”میں تجھے یہاں سے بھاگنے نہیں دوں گا۔“

پھر وہ بلند آواز میں بولا۔ ”اب تم کیا کرو گے اردشیر؟“

اب بھی جواب نہیں آیا تو داراب کو مکمل یقین ہو گیا کہ اردشیر اپنے آدمیوں کو چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کا رخ چھت ہی کی طرف ہو سکتا تھا۔

”نہیں بھاگنے دوں گا۔“ داراب ایک مرتبہ پھر بڑبڑایا اور پھر مشین گن سے مسلسل گولیاں برساتے ہوئے آڑ سے نکلا اور نکلا بھی یہ فیصلہ کر کے کہ اب خود مارا جائے گا یا اردشیر کو ایک اذیت ناک انجام تک پہنچائے گا۔

بھیڑو کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق چھت پر جانے کا ایک زینہ اس کمرے کے قریب ہی تھا جہاں اردشیر

قیام کیا کرتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی خواب گاہ تھی۔

اس طرف بڑھتے ہوئے داراب نے ایسی آواز سنی جیسے کوئی مخص لاؤڈ اسپیکر پر بول رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ شاید پولیس کا کوئی آدمی میگا فون پر اردشیر کے آدمیوں کو وارننگ دے رہا ہو۔

داراب آگے بڑھتے ہوئے پلٹ پلٹ کر مشین گن کا ایک برسٹ بھی چلاتا رہا۔ اس کا یہ اقدام حفظ ماتقدم کے طور پر تھا۔

اچانک گولیاں چلنی بند ہو گئیں۔ اس سے داراب نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس نے جو آواز سنی تھی، وہ کسی میگا فون ہی کی تھی اور اسی کے نتیجے میں اردشیر کے آدمیوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

آگے بڑھتے ہوئے داراب کو خیال آیا کہ اردشیر دو تین منٹ پہلے نکل گیا تھا۔ اب تک شاید چھت پر پہنچ گیا ہو۔

اگر ایسا ہوتا تو داراب کو اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کا افسوس رہتا لیکن جب وہ زینے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اردشیر نصف زینے طے کر چکا تھا۔

”رک جاؤ اردشیر!“ داراب چیخا۔ ”ورنہ میں تمہیں گولی کر دوں گا۔“

اردشیر نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا لیکن رکا نہیں۔ داراب نے ایک آدھ فائر کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ شاید اس کے پاس ریوالور تو ہو لیکن اس میں گولیاں نہ ہوں۔

داراب نے بھی مشین گن چلانے کی صرف دھمکی ہی دی تھی۔ وہ اردشیر کو زیادہ اذیت ناک موت مارنا چاہتا تھا۔

چھت پر پہنچنے میں اردشیر کو تاخیر اس لیے ہوئی کہ ایک آدھ گولی نے اس کی کوئی ٹانگ زخمی کی تھی۔ وہ لنگڑا کر اوپر چڑھ رہا تھا۔

ٹانگ داراب کی بھی زخمی تھی لیکن وہ ایک کمانڈو تھا اور اس کی جسمانی طاقت بھی اچھی تھی۔

اردشیر ہیلی کاپٹر کی طرف لپک رہا تھا جب داراب نے اسے جا لیا۔ اردشیر بھی اب مجبور تھا کہ اس سے لپٹ پڑے لیکن وہ داراب کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ اس کے برخلاف داراب نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور دوسرا ہاتھ اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ڈال کر جھٹکے سے اپنے سر سے اوپر اٹھا لیا۔ اس وقت اس کی ہتھیلیوں کے مقام پر اور ران میں شدید ٹیسیں اٹھیں لیکن وہ برداشت کر گیا۔ جنون کی طاقت بھی اس وقت اس کے جسم میں تھی۔ مشین گن اس نے ایک طرف ڈال دی تھی۔

اردشیر بہت چیخا لیکن کچھ نہ کر سکا۔ وہ اس وقت ایک کمانڈو کی گرفت میں تھا اور وہ کمانڈو اسے اپنے سر سے اوپر اٹھائے چھت ہی کے ایک حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”تم مجھے بلندی سے نیچے پھینکنا چاہتے ہو؟“ اردشیر ہانپ رہا تھا۔

”نہیں۔“ داراب نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔ ”تم اس اذیت ناک موت سے دوچار ہو گے جو تم دوسروں کو دیتے رہے ہو۔ تیزاب کا یہ حوض غالباً تم نے اپنے لیے ہی بنوایا ہو گا۔“

”نہیں..... نہیں.....“ اردشیر گھگیایا۔

بھیڑو ہی نے داراب کو بتایا تھا کہ چھت پر وہ حوض کہاں ہے اور اس کے چاروں طرف ایک فٹ کی منڈیر بھی ہے۔ نیز تیزاب بارہ فٹ کی گہرائی میں ہے تاکہ کسی کو اس حوض میں پھینکنے والے پر تیزاب کی ایک چھینٹ بھی نہ آ سکے۔

”میں تمہیں اس کی داد ضرور دوں گا اردشیر!“ داراب بولا۔ ”یہ دنیا کا شاید پہلا اور آخری حوض ہو گا جو کسی عمارت کی چھت پر بنایا گیا ہے، اس کے لیے تمہیں نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑا ہو گا۔ اب تم بھی اس تاریخی حوض میں جاؤ گے۔“

اردشیر گھگیایا مگر داراب نے اسے اچھال کر حوض میں پھینک دیا۔ اردشیر کی چیخ بہت تیزی سے نیچے گئی اور پھر ایک چھپاکے کی آواز سنائی دی۔

اب داراب حوض کی منڈیر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ بیٹی اور بھانجی کا انتقام لینے کے بعد اس کے جنون کی طاقت کم ہوتی چلی گئی تھی۔ اس کا خون بھی بہت بہہ چکا تھا۔ اس کی کیفیت غنودگی میں اور پھر بے ہوشی میں تبدیل ہو گئی۔

☆☆☆

جب داراب کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک ایسے کمرے میں پایا جو کسی اسپتال ہی کا ہو سکتا تھا۔ اسے اپنے سارے جسم میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ سینے پر پٹی پسلیوں کے قریب لگنے والی گولی کی وجہ سے تھی اور ران پر بھی پٹی کسی ہوئی تھی۔ ہلکی سی ایک پٹی سر پر تھی۔ سر پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں اسے علم ہی نہیں تھا کہ کیسے اور کیوں لگی تھی۔

سامنے ہی اس نے اپنی بیوی نسرین کو بھی کھڑا دیکھا۔

”نرس!“ نسرین نے دائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انہیں ہوش آ گیا۔“

ایک نرس قریب آئی۔ اس نے گہری نظر سے داراب کی طرف دیکھا اور اس کی نبض دیکھنے کے بعد بولی۔ ”میں ابھی جا کر ڈاکٹر صاحب کو بتا دیتی ہوں۔“ وہ چلی گئی۔

”تم کب آئیں؟“ داراب نے نسرین سے پوچھا۔

”میں دوپہر کو آ گئی تھی۔“ نسرین نے جواب دیا۔

PakiBooks.site

''طارق کا فون ملنے کے بعد دوپہر کی ہی فلائٹ ملی تھی۔''
''اب کیا بجا ہے؟''
''اب تو شام ہو رہی ہے۔ سات بجنے والے ہیں۔''
''کیا مطلب؟ شام کے چھ؟''
''آپ کو رات ساڑھے بارہ بجے اسپتال لایا گیا تھا۔ اس وقت کے بعد اب ہوش آیا ہے آپ کو۔''
''اوہ! سات گھنٹے بے ہوش رہا ہوں میں؟''
''جی۔''
''میرا خیال ہے میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم اتنی افسردہ کیوں ہو رہی ہو۔ زندگی میں اس قسم کے واقعات ہو ہی جاتے ہیں۔''
''مجھے طارق سے سب معلوم ہو چکا ہے۔ آپ نے مجھ سے چھپایا کہ آپ کا اصل ارادہ کیا ہے۔''
''طارق نہیں ہے یہاں؟ کیا مجھے دیکھ کر چلا گیا ہے؟''
نسرین نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ عجیب سا چہرہ ہو گیا تھا اس کا؟
''کیا بات ہے نسرین؟'' داراب نے بے تابی سے پوچھا۔
''وہ ریحانہ کو لے کر گیا ہے۔'' نسرین کی آواز بھرا گئی۔
''کہاں لے کر گیا ہے؟'' داراب نے بے چینی محسوس کی تھی۔
''قبرستان۔'' نسرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
داراب چونک گیا۔ نسرین نے مزید کہا۔ ''ریحانہ نے آج صبح خودکشی کر لی ہے۔''
داراب کے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور اس نے اتنی زور سے آنکھیں بھینچ لیں جیسے شدید درد محسوس کیا ہو۔
اسی وقت نرس ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں آئی۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح داراب کا چیک اپ کیا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں پہلے ہی آپ کی بیگم کو بتا چکا ہوں کہ پسلیوں کے قریب کی گولی نکالنے میں بہت احتیاط تو برتنی پڑی تھی لیکن تسلی بخش کام ہو گیا تھا۔ ران میں لگنے والی گولی کا تو خیر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ سر پر بھی معمولی چوٹ ہے۔''
داراب نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے نرس کو کچھ ہدایات دیں اور چلا گیا۔
''زویا کہاں ہے؟'' داراب نے آہستہ سے پوچھا۔
''وہ سو رہی ہے۔'' نسرین نے ایک طرف اشارہ کیا۔
داراب نے اس طرف دیکھا۔ زویا ایک صوفے پر پڑی سو رہی تھی۔
نسرین بولی۔ ''ویسے تو اس کی نیندیں ہی اڑ گئی ہیں۔ کبھی کبھی تو ساری رات جاگتی رہتی ہے۔ رات کو بھی سوئی نہیں تھی۔ یہاں آنے کے بعد بھی تین چار گھنٹے تک آپ کے قریب کھڑی رہی تھی۔ ابھی کوئی تین گھنٹے پہلے سوئی ہے۔ بہت کچھ سمجھاتی رہی ہوں اسے ورنہ یہ بھی نہ جانے کیا کر گزری ہوتی۔''
داراب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
''میں تو چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے۔ بات بھی کی تھی اس سے۔ پہلے تو جواب ہی نہیں دیتی تھی۔ پرسوں اس نے جواب دیا۔ وہ صرف اس شخص سے شادی کرے گی جسے بتا دیا جائے کہ وہ کن حالات سے گزر چکی ہے۔ وہ سب کچھ جان لینے کے بعد اسے قبول کرتا ہے تو ٹھیک ورنہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔''
داراب نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔
''طارق کو تو اس کا علم ہو ہی چکا ہے۔'' وہ بولی۔ ''آپ نے تو بتایا نہیں ہوگا اسے لیکن ریحانہ نے خودکشی کرنے سے پہلے ایک پرچہ لکھ دیا تھا۔ اس میں اس نے بتایا ہے کہ اسے سات آٹھ آدمیوں نے بے آبرو کیا تھا۔ وہ سب شراب پیتے، قہقہے لگاتے اور اسے بے آبرو کرتے تھے۔ انہی میں سے کسی نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے کسی ساتھی سے کہا تھا کہ داراب کی بیٹی کے ساتھ تو ان کے یار شیران نے مزے کیے تھے۔ اب داراب کی بھانجی کے ساتھ ہم مزے کر رہے ہیں۔''
''ہوں۔'' داراب کچھ اور نہیں کہہ سکا۔
نرس نے اسے دو گولیاں کھلا کر ایک انجکشن لگایا۔ اس نے نسرین کی کوئی بات نہیں سنی ہوگی۔ نسرین نے اسی کی وجہ سے بہت دھیمی آواز میں سب کچھ بتایا تھا۔
وہ انجکشن لگا کر ہٹی تھی کہ طارق آ گیا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنا حلیہ درست کیے بغیر قبرستان سے سیدھا وہیں آیا تھا۔
''اب کیسی طبیعت ہے انکل؟'' اس نے تیزی سے بستر کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔
''ڈاکٹر نے تو یہی بتایا ہے کہ حالت اطمینان بخش ہے۔'' داراب نے جواب دیا، پھر کہا۔ ''مجھے بے حد افسوس ہے طارق کہ ریحانہ......''
''خدا کو یہی منظور تھا انکل۔'' طارق نے ٹھنڈی سانس لی۔

PakiBooks.Site

''میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے ریحانہ کے سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا، وہ ایفا نہیں کر سکا۔''
طارق نے نسرین کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے انکل کو ریحانہ کی آخری تحریر کے بارے میں بتا دیا ہے شاید۔''
نسرین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اب طارق نے پھر داراب کی طرف دیکھا۔ ''اس میں بھی آپ کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ وعدہ خلافی تو اس کم بخت نے کی۔ اس نے کہا تھا کہ گیارہ بجے تک ریحانہ سے کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔''
''ہاں ایک پہلو یہ بھی ہے۔'' داراب نے کہا۔ ''ورنہ میں فوراً ہی اس کے گھر پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑتا۔ کچھ انتظامات کرنے میں خاصا وقت لگا۔''
''اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو چکا انکل...... آپ ایک بہت بڑا کام کر گزرے ہیں۔ ہیرو بن گئے ہیں آپ اس شہر کے۔ [illegible] صاحب نے ایک ٹی وی پر انٹرویو دیتے ہوئے بتا دیا تھا کہ آپ نے کیا کر دکھایا ہے۔''
''کیا آپریشن مکمل طور پر کامیاب رہا؟''
''اردشیر کے گھر تک تو سو فیصد کامیاب رہا۔ اس کے [illegible] کی گرفتاری کے سلسلے میں چھاپے اب بھی [illegible] ان لوگوں کے [illegible] بھی آپ ہی نے [illegible] کی ہے۔ کوئی بچ کر [illegible] نکل سکا۔''
''تم نے کیا کہا کہ اردشیر کے گھر کی حد تک آپریشن سو فیصد کامیاب رہا۔ وہ تو سو فیصد کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ [illegible] پولیس وہاں بروقت پہنچ گئی تھی۔''
''سو فیصد کی بات میں نے اس لیے کی کہ اردشیر ہاتھ نہیں لگا۔ نہ جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان...... گرفتار کیے جانے والوں نے تو بتایا ہے کہ پولیس کی آمد تک وہ اسی گھر میں تھا۔''
''ہوں۔'' داراب خاموش رہ گیا۔
''معاف کیجیے گا۔'' نرس قریب آتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب نے آپ کو ہدایت کی تھی کہ ان کو آرام کرنے دیا جائے۔ [illegible] نہ کی جائیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ نسرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''ہاں۔'' نسرین نے داراب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ آرام کیجیے۔''
''میں بھی چلتا ہوں انکل۔'' طارق بولا۔ ''مجھے آپ کی اطلاع ملی تھی اس لیے قبرستان سے سیدھا یہیں آ گیا تھا۔ اب جا کے گھر کی خبر لوں۔ امی کو اسپتال سے تو گھر لے آیا تھا۔ آج ریحانہ کے انتقال کی وجہ سے ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ بار بار میرے دونوں بچوں کو لپٹا کر رونے لگتی ہیں۔ ایک بار آپ کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔ میں نے ان سے یہ بات چھپائی کہ آپ کس حال میں اسپتال میں پڑے ہیں۔''
''اچھا کیا تم نے۔''
''آپ تو شاید یہیں رہیں گی؟'' طارق نے کھڑے ہوتے ہوئے نسرین سے کہا۔
''ہاں۔'' نسرین نے جواب دیا۔ ''یہ جب تک اسپتال میں ہیں، میں اور زویا یہیں رہیں گے۔''
طارق نے زویا پر ایک نظر ڈالی اور کمرے سے چلا گیا۔
''اب آپ آرام کیجیے۔'' نسرین نے داراب سے کہا۔
داراب بھی غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ ان دواؤں کا اثر ہو جو نرس نے اسے کھلائی تھیں اور انجکشن بھی لگا تھا۔ جب اس نے آنکھیں بند کیں تو جلد ہی اسے نیند بھی آ گئی۔
رات کے دو بجے تھے جب اس کی آنکھ کھلی۔
''جاگ گئے آپ؟'' نسرین بولی۔ ''میں بھی سو گئی تھی۔ پندرہ منٹ پہلے ہی جاگی ہوں۔''
اس وقت صوفے پر گم صم بیٹھی زویا تیزی سے قریب آئی اور داراب کے قریب بیٹھ کر داراب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے رونے لگی۔
''یہ کیا ہے میرے جگر کے ٹکڑے؟'' داراب نے اپنا دوسرا ہاتھ زویا کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ جیسے آدمی کی بیٹی کو بہادر ہونا چاہیے۔''
لیکن زویا کچھ دیر تک روتی ہی رہی۔
''فون آیا تھا طارق کا۔'' نسرین نے داراب کو بتایا۔ ''آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ شاید خود بھی دوبارہ آتا لیکن باجی کو سنبھالنے میں بھی لگا ہوا ہے۔ کسی طرح باجی کو علم ہو گیا ہے آپ کے بارے میں۔ شاید پاس پڑوس کی کسی عورت نے بتا دیا ہوگا۔ ٹی وی تو طارق نے بند رکھا ہے۔ باجی آپ کے پاس آنے کے لیے بے تاب ہو گئی تھیں۔ طارق نے بھی انہیں یہ سمجھا کر روکا کہ ابھی آپ کو آرام کرنے دیا جائے۔ اب وہ انہیں صبح لائے گا۔''
اور ایسا ہی ہوا۔ داراب دوبارہ سونے کے بعد اٹھا ہی تھا کہ طارق اپنی ساس کو لے کر آ گیا۔ کمرے کا منظر کچھ دیر تک خاصا جذباتی رہا۔ شاید زیادہ دیر تک وہی منظر رہتا لیکن جالب اپنے میٹر بھائی کے ساتھ اسے دیکھنے آ گیا۔ میٹر کے

ہاتھ میں ایک خوب صورت گلدستہ بھی تھا۔
''میں رات کو ہی آتا تمہیں دیکھنے۔'' میئر نے گلدستہ داراب کو دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پولیس آپریشن کے باعث مصروف رہنا پڑا۔''
''شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے۔''
''شکر گزار تو میں تمہارا ہوں۔ یہ شہر آسیب صرف تمہاری ہی وجہ سے معمول کی طرف آسکے گا بلکہ خبروں کی وجہ سے آچکا ہے۔ تمہارے حق میں نعرے لگاتا ہوا ایک جلوس بھی اسپتال کی طرف آیا تھا۔ پولیس نے اور ڈاکٹروں نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیجا۔ ہر طرف تمہاری تعریف ہو رہی ہے۔ پولیس بس اس لیے پریشان ہے کہ اردشیر بچ نکلا۔''
''وہ کہیں بچ نہیں نکلا میئر صاحب۔'' داراب نے کہا۔ ''میں نے جو حالات بذریعہ ای میل انہیں بھیجے تھے۔'' اس نے جالب کی طرف اشارہ کیا۔
جالب بول پڑا۔ ''اسی میں تو گروہ کے لوگوں کے پتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ باقی کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔''
داراب نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور دوبارہ میئر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے وہ میل دیکھی ہے تو آپ کے علم میں ہوگا کہ اردشیر نے اپنے گھر کی چھت پر ایک حوض بنوایا تھا جس میں تیزاب......''
''تو کیا؟'' میئر جلدی سے بول پڑا۔
''جی ہاں، آپ نے میری بات سنے بغیر ہی سمجھ لیا۔'' داراب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''وہ وہاں کھڑے ہوئے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر فرار ہونا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے پکڑ لیا۔'' داراب نے ساری بات بتا دی۔
''شاندار۔'' میئر نے اسے بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ ''یہ بات تو اب ٹی وی پر بریکنگ نیوز کے طور پر آئے گی۔ تم نے ابھی تک کسی کو بتایا نہیں تھا اس بارے میں؟''
''آج پولیس میرا بیان لینے آئے گی۔ میں نے سوچا تھا کہ اسی کو بتاؤں گا۔ اس وقت آپ سے ذکر چھڑ گیا تو میں نے آپ کو ہی بتا دیا۔''
''بہت بڑا کام کیا ہے تم نے۔'' میئر نے کہا۔ ''اس کے بچ جانے کے خیال سے مجھے ڈر تھا کہ وہ پھر کوئی بڑا گروہ منظم نہ کر لے۔ یہاں جو معمولی قسم کے جرائم پیشہ ہیں، ان میں تو اتنی سکت نہیں۔''
اسی موضوع پر تینوں میں گفتگو ہوتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد جالب اور میئر چلے گئے۔ جاتے جاتے جالب نے کہا تھا۔ ''میں پھر وقتاً فوقتاً آتا رہوں گا۔''
ان کے جانے کے بعد نسرین نے داراب سے پوچھا۔
''اب تو ہم پھر اسی شہر میں رہیں گے نا؟''
''اگر یہ شادی کے لیے تیار ہو جائے۔'' نسرین نے صوفے پر بیٹھی گم صم زویا کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔
''ہوں۔'' داراب پھر چپ ہو گیا۔
شام کو پولیس آئی۔ داراب نے اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تھا۔
یہ بات میئر کے خیال کے مطابق ٹی وی چینلز نے بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کی۔
چند دن گزر گئے۔
ایک شام زویا اور نسرین، دونوں ہی سو رہی تھیں۔ طارق، داراب کو دیکھنے آیا۔ روزانہ دو مرتبہ آنا اس کا معمول بنا رہا تھا۔
باتوں باتوں میں طارق نے کہا۔ ''اس کی ذہنی حالت شاید شادی ہی سے ٹھیک ہو سکے گی۔''
''اس کی شادی ممکن نہیں ہے۔''
''کیوں انکل؟''
''شادی کے لیے اس کی شرط ہی ایسی ہے۔'' داراب نے کہا اور وہ شرط بھی بتا دی۔ طارق کو اس کا علم ریحانہ کی تحریر سے ہو ہی چکا تھا۔
طارق سوچ میں پڑ گیا پھر آہستہ سے بولا۔
''زویا مجھ سے عمر میں بہت کم ہے لیکن اگر وہ مجھے قبول کر سکے تو میں حاضر ہوں۔''
داراب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''جی انکل!'' طارق نے نظریں جھکا لیں۔
داراب کے چہرے سے جذباتیت ظاہر ہونے لگی۔ آنکھوں میں کچھ جھلملاہٹ بھی ہوئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ طارق کی طرف پھیلائے۔ طارق اس کا مطلب سمجھ گیا اور کرسی سے اٹھا۔ داراب اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہتا تھا۔ طارق نے اس کی خواہش پوری کر دی لیکن اس نے اس کا خیال رکھا کہ اس کا بوجھ داراب کے جسم کے اس حصے پر نہ پڑے جہاں گولی لگی تھی۔

محبت بڑی ظالم ہوتی ہے... جب ہوتی ہے تو گرد و پیش نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں... دل ہوتا ہے اور دل بند کھڑکیاں توڑ کے صرف محبوب کی گلی میں جانے کی ضد کرتا ہے... دو ایسے ہی پیار بھرے دلوں کا معاملہ... وہ منزل کی جانب گامزن تھے... مگر ٹوٹی کہاں کمند... دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا...

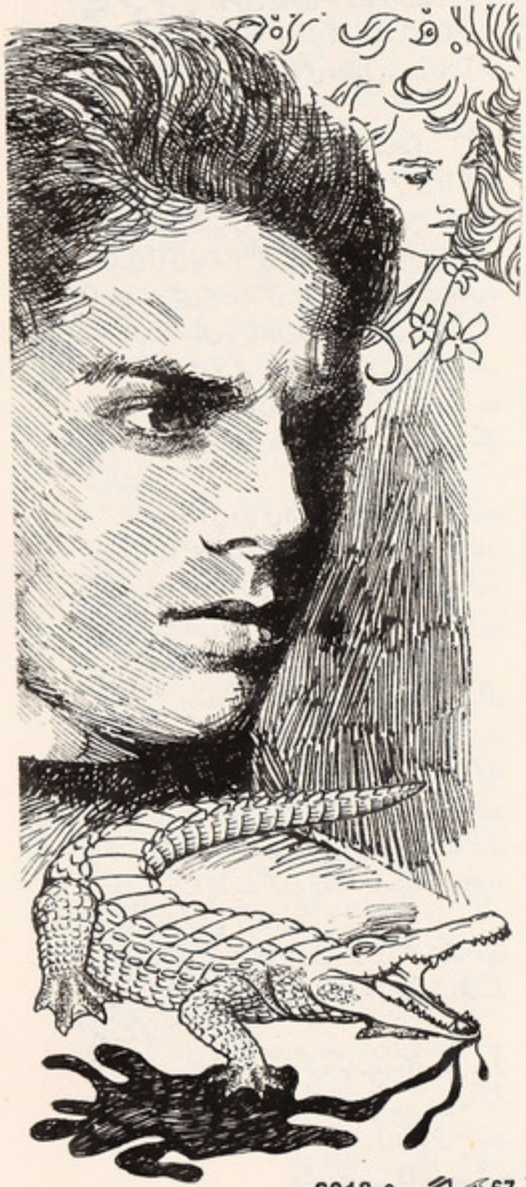

سنسنی خیز کہانی کے دلچسپ موڑ

بے رحم

شاکر لطیف

''آج تم نہیں یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آرہی کہ طارق شادی ممکن نہیں ہے۔ تم پہلے سے شادی شدہ ہو اور قانون کے مطابق مرد ایک وقت میں صرف ایک ہی ...'' روزی نے سامنے بیٹھے جسٹن سے کہا۔
''مگر ... شادی بھی تو کر سکتے ہیں۔'' جسٹن نے ... لہجے میں کہا۔
''دیکھو جسٹن!'' روزی نے سخت لہجے میں جواب ... کہ تم ... شادی کے خواب دیکھنا بند کر

PakiBooks.site

دو۔ تم متعدد بار مجھ سے یہ بات کہہ چکے ہو۔ آج میرا دوٹوک جواب بھی سن لو۔ میں ایک امریکی شہری ہوں یہاں کے قوانین کی پاسداری کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ میں خود بھی تم سے شادی کرنے کی خواہشمند ہوں مگر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جو خلافِ قانون تصور کیا جائے اور پھر تم خود بھی جانتے ہو کہ کچھ عرصے پہلے خفیہ طور پر دوسری شادی کرنے والے افراد کو عدالت نے کتنی سخت سزائیں دی تھیں۔ اس مسئلے کا سب سے آسان حل یہی ہے کہ تم کیتھی کو طلاق دے دو۔ آخر اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

''میرے لیے یہ خاصا مشکل فیصلہ ہوگا۔'' جسٹن نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم نے امریکی قوانین کا حوالہ دیا ہے تو پھر یہ بھی جانتی ہوگی کہ طلاق کی صورت میں مجھے اپنی آدھی جائداد کیتھی کے حوالے کرنی ہوگی۔ صرف ایک صورت میں بچت ہوسکتی ہے کہ کیتھی خود مجھ سے طلاق کا مطالبہ کرے مگر میں جانتا ہوں وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔''

''تم ویسے تو مجھ سے محبت کے بڑے بلند و بانگ دعوے کرتے ہو مگر میری خاطر اپنی آدھی جائداد سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہو۔'' روزی نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''دولت اس دنیا کی ایسی حقیقت ہے جس کی اہمیت سے کسی بھی باشعور انسان کو انکار نہیں ہے۔'' جسٹن ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ''اگر ہم دونوں کی شادی ہوجاتی ہے تو کل کو ہمارے بچے ہوں گے۔ انہیں معاشرے کا ایک کامیاب فرد بنانے کے لیے یہی دولت ہمارے کام آئے گی۔''

''مگر دولت کی اس قربانی کے بغیر ہماری شادی بھی ممکن نہیں ہے۔'' روزی پُرخیال لہجے میں بولی۔ ''بہتر ہے کہ جلد از جلد کوئی فیصلہ کرلو۔ تمہیں اب اپنی آدھی جائداد اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میں اب مزید انتظار نہیں کرسکتی۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے میری کمپنی کے منیجر ڈیوڈ نے بھی پرپوز کر رکھا ہے۔ میں جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے چند دن اور دو' میں کچھ سوچتا ہوں۔'' جسٹن نے سامنے میز پر رکھا کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اب سوچنے کا وقت گزر گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کوئی فیصلہ کرلو۔'' روزی ہلکے سے غصے سے بولی۔ ''ویسے اگر تم واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تم اپنی بیوی کیتھی کو طلاق دے دو۔ میں اب مزید تمہاری ٹال مٹول اور حیل و حجت برداشت نہیں کروں گی۔''

''ٹھیک، میں چند دن میں کوئی فیصلہ کرلوں گا۔'' جسٹن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہارے ہاتھ کا کیا حال ہے؟'' روزی نے اسے رضامند ہوتے...... دیکھ کر مطمئن لہجے میں پوچھا۔

''اب درد کا احساس خاصا کم ہوگیا ہے۔'' جسٹن نے اپنا بایاں ہاتھ اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر ظاہر ہے ہڈی جڑنے میں چند ماہ تو لگ ہی جاتے ہیں۔''

''ہونہہ۔'' روزی نے جسٹن کے پلستر چڑھے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ چند دن پہلے گھر میں ایک تصویر لگانے کے لیے کیل ٹھونکتے ہوئے جسٹن کے نیچے موجود لکڑی کی سیڑھی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ سیدھا زمین پر جاگرا تھا۔ اپنے سر کو زمین سے براہِ راست ٹکرانے سے بچانے کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں کو آگے کرلیا تھا۔ تاہم بائیں ہاتھ پر نیچے گرتے وقت شدید دباؤ پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ہڈی جڑنے میں کم از کم تین ماہ لگ جائیں گے۔

اس وقت جسٹن، روزی کے ہمراہ ایک خوبصورت جھیل کے کنارے پر واقع چھوٹی سی کافی شاپ میں موجود تھا۔ یہ جگہ ایک اہم سیاحتی مقام کے طور پر جانی جاتی تھی اور سیاحوں کی یہاں آمد کی سب سے بڑی وجہ یہ خوبصورت اور بڑی جھیل ہی تھی۔ جھیل کی سیر کرنے کے لیے کافی بڑی تعداد میں کشتیوں کا انتظام بھی موجود تھا۔ کشتیاں مناسب کرائے پر ہر خاص و عام کے لیے دستیاب تھیں۔ روزانہ ہزاروں سیاح اس دلفریب مقام کا رخ کرتے تھے اور سیکڑوں سیاح کرائے پر لانچیں حاصل کرکے جھیل کی سیر کرتے تھے۔ اس جگہ لانچیں کرائے پر فراہم کرنے کے لیے باقاعدہ ایک چھوٹی سی کمپنی قائم تھی۔ اس کمپنی نے حکومت سے جھیل میں اپنی لانچیں چلانے کا ٹھیکہ حاصل کر رکھا تھا۔ ایک طرح سے اب جھیل کا سارا انتظام اسی کمپنی کے پاس تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک اس جھیل میں خطرناک اور خونخوار مگرمچھ موجود تھے اور بوٹ کے ذریعے جھیل کی سیر کو جانے والوں کو اس بارے میں باقاعدہ متنبہ بھی کیا جاتا تھا تاکہ کوئی جھیل میں تیراکی کا شوق پورا کرنے کی بے وقوفی نہ کرے۔

مگرمچھوں کے خوف اور دہشت کی وجہ سے کوئی

[illegible] پانی میں نہانے کی جرأت نہیں کرتا تھا مگر پھر یوں ہوا کہ [illegible] جھیل میں موجود تمام مگرمچھوں کو کسی دوسری جھیل میں منتقل کر [illegible] اس کے بعد سیاحوں نے جھیل میں نہانا بھی شروع کر [illegible] اب وہاں نہانے اور تیراکی کرنے [illegible] مگر پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ [illegible] انتظامیہ کو وہاں نہانے پر بھی پابندی عائد کرنا پڑی۔ [illegible] جھیل میں نہانے والے کچھ افراد پانی [illegible] ہوگئے۔ انہوں نے سب کے سامنے [illegible] دوبارہ سطح آب پر نہ ابھر سکے۔ [illegible] جھیل کی تہ میں ایسی گھنی اور گنجلک [illegible] اگر کسی غوطہ خور کا پاؤں یا ہاتھ ان [illegible] جھاڑیوں میں الجھ جاتا تو وہ کو چھڑاتے چھڑاتے اس کا [illegible] گھنی جھاڑیاں پوری جھیل میں میلوں تک [illegible] انہیں تلف کرنا ممکن نہ تھا اس لیے جھیل [illegible] انتظامیہ نے یہی مناسب سمجھا کہ وہاں نہانے پر پابندی عائد کردی جائے۔

اس پابندی پر سختی سے عمل درآمد کرایا جاتا تھا۔ تاہم پھر بھی اکثر اوقات کچھ سرپھرے نوجوان اس پابندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پانی میں کود جاتے [illegible] سے نمٹنے کے لیے [illegible] کے باوجود یہ [illegible] سے باز نہیں آتے تھے۔ ان واقعات نے جھیل انتظامیہ کو خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ کسی بھی وقت جھیل کی جھاڑیوں میں پھنس کر کسی کی جان جاسکتی تھی۔ اس طرح کی اموات سیاحوں کو خوف زدہ کرتی تھیں اور وہ ادھر کا رخ کرنے سے کترانے لگتے تھے جس کی وجہ سے لانچیں فراہم کرنے والی کمپنی کا بزنس متاثر ہوتا تھا۔

روزی اسی کمپنی میں ملازمت کرتی تھی اور جسٹن سے اس کی پہلی ملاقات بھی اسی جگہ ہوئی تھی۔ جسٹن اپنے [illegible] کے ہمراہ جھیل کی سیر کو آیا تھا اور روزی کو [illegible] ہوگیا تھا۔ تاہم اسے روزی کے [illegible] اظہار کرنے میں کچھ عرصہ لگا تھا۔ روزی [illegible] کے بعد جسٹن نے ہر دوسرے دن وہاں [illegible] شروع کردیا تھا اور [illegible] روزی کے قریب ہونے کی [illegible] تھا۔

[illegible] روزی نے بھی اس کی خود میں دلچسپی محسوس کرلی تھی۔ اس وقت تک روزی کے علم میں نہیں تھا کہ جسٹن شادی شدہ ہے اس لیے اس نے بھی جسٹن کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کردی۔ اس کے جوابی مثبت ردِعمل سے جسٹن کی ہمت بندھی اور اس نے روزی کو باقاعدہ پرپوز کر ڈالا۔ تاہم کسی جھوٹ اور دروغ گوئی کا سہارا لیے بغیر روزی کو یہ سچائی بھی بتادی کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی کا نام کیتھی ہے جو ایک سال پہلے ایک کار حادثے میں اپنی ایک ٹانگ گنوا چکی ہے۔ اس حادثے میں اس کی بیوی کا چہرہ بھی بُری طرح متاثر ہوا ہے جس کی وجہ سے حسین و جمیل کیتھی اب اتنی بدصورت ہوچکی ہے کہ اس کا چہرہ دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔

روزی کو جسٹن کا سچ بولنا اچھا لگا تھا۔ تاہم وہ اس کے بارہا اصرار کے باوجود اس بات پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ دونوں خفیہ شادی کرلیں۔ وہ ایسا کوئی قدم اٹھانے پر تیار نہیں تھی جس کی اجازت اس کے ملک کا قانون نہیں دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مسئلے کا سب سے آسان حل یہی ہے کہ وہ کیتھی کو طلاق دے دے اور پھر کیتھی اور جسٹن کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی اس لیے جسٹن کے لیے اسے طلاق دینے کا فیصلہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔

جسٹن کی سوچ روزی کے برعکس تھی۔ وہ کیتھی سے اپنی راہیں جدا کرنے کا خواہاں تھا مگر طلاق کی صورت میں اپنی آدھی جائداد کیتھی کے حوالے کرنی پڑتی اور یہ اسے کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔ آج اس نے روزی کے سامنے عندیہ دے دیا تھا کہ وہ چند دن تک کوئی فیصلہ کرلے گا۔ روزی اس کی بات کا مطلب یہی سمجھی تھی کہ جسٹن اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ ہوگیا ہے مگر جسٹن کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کیتھی کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس کی موت بھی اس طرح واقع ہو کہ سب اسے ایک حادثہ سمجھ لیں تو اس طرح کیتھی سے نجات مل جائے گی اور اس کی جائداد بھی بچ جائے گی۔

اس وقت اس کے ذہن میں ایک منصوبہ زیرِ گردش تھا جس پر عمل پیرا ہوکر کیتھی کو راستے سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ وہ روزی سے اپنا منصوبہ ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ روزی بہت حساس اور زود رنج طبیعت کی مالک واقع ہوئی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنے پر رضامند تو ہوگئی تھی مگر کسی تخریبی منصوبے میں اس کا ساتھ دینے والی نہیں تھی۔ جسٹن دل ہی دل میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تو

روزی سمیت سب اسے ایک حادثہ ہی سمجھیں گے۔ ویسے بھی اسے اصل خطرہ روزی سے نہیں تھا بلکہ امریکی پولیس سے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس کے سراغ رساں بال کی کھال کھینچنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اس لیے ممکن تھا کہ وہ کیتھی کی موت پر مشکوک ہو کر اس سے پوچھ گچھ کرتے۔ اسے بہت سوچ سمجھ کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ اس طرح کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

وہ روزی کے ہمراہ کافی پی چکا تھا۔ اس نے بل پے کیا اور پھر روزی سے چند دن تک ملنے کا کہہ کر گھر روانہ ہو گیا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں بھی وہ کیتھی کو راستے سے ہٹانے کے لیے اپنے ذہن میں پنپنے والے منصوبے کی جزئیات کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اس کے پلان کا سب سے کلیدی نکتہ یہی تھا کہ کیتھی کی موت کو ایک حادثہ سمجھا جاتا اور پولیس اس سے مشکوک نہ ہوتی۔ اسے اب جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ روزی اسے متنبہ کر چکی تھی کہ اس کی کمپنی کے منیجر نے بھی اسے پرپوز کر دیا ہے اور اب وہ جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہے۔

جسٹن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ اگر اب اس نے مزید دیر کی تو وہ روزی کو کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ روزی کا شادی کے لیے پہلا انتخاب تو جسٹن تھا۔ تاہم اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ اپنے منیجر کی جانب بھی راغب ہو سکتی تھی اور جسٹن کو یہ کسی صورت قبول نہ تھا۔ وہ ہر صورت سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی اس حسینہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور پھر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ کیتھی حادثے کے بعد اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو چکی تھی جس کی وجہ سے جسٹن نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس نرس کی ماہانہ تنخواہ بھی جسٹن کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑ رہی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ کیتھی پر کیے جانے والے اخراجات اب اسے چبھنے لگے تھے۔ ایک معذور اور بدصورت عورت پر اپنا پیسا ضائع کرنا اسے خاصا ناگوار گزر رہا تھا مگر ابھی تک وہ مجبوراً یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ کیتھی قانونی طور پر اب بھی اس کی بیوی تھی۔

وہ کیتھی کے کمرے میں داخل ہوا تو کیتھی اپنے بیڈ پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ تاہم وہ جاگ رہی تھی اس لیے جسٹن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جسٹن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات عود آئے۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ جب سے وہ حادثے میں اپنی ٹانگ اور حسن و جمال سے محروم ہوئی تھی۔ جسٹن نے اپنے سونے کا انتظام دوسرے کمرے میں کر لیا تھا۔ وہ بہت کم ہی اس کے کمرے کا رخ کرتا تھا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے کیتھی۔'' جسٹن کے نرم اور ہمدردانہ لہجے نے لمحہ بھر کے لیے اسے حیران کر دیا۔ ورنہ جسٹن اب اس سے خاصے درشت لہجے میں بات کرتا تھا۔

''ٹھیک ہوں مگر تمہیں بڑی جلدی میری طبیعت کا خیال آ گیا۔'' کیتھی شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

''وہ دراصل کام کی مصروفیت کی وجہ سے تم سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔'' جسٹن نے کھسیانے لہجے میں جواب دیا تو جواباً کیتھی نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ اس نے بے اختیار سٹپٹا کر نگاہیں چرا لیں۔ کبھی وہ وقت تھا جب کیتھی کے بغیر اس کا وقت ہی نہیں گزرتا تھا اور وہ کیتھی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کیا کرتا تھا مگر وہ وقت اب قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ کیتھی سے اس کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ شہر کے ایک مشہور ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے گیا تھا۔ کیتھی اس ہوٹل میں ویٹرس کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ دل پھینک فطرت کا مالک جسٹن پہلی ہی نگاہ میں اس جاذب نظر اور حسین دوشیزہ پر دل ہار بیٹھا تھا۔ کیتھی کے والد کا تعلق کسی ایشیائی ملک سے تھا جبکہ ماں امریکن تھی۔ اس لیے اس کے حسن میں مشرق اور مغرب دونوں کی جھلک پائی جاتی تھی اور جسٹن کے اس پر فریفتہ ہونے کی وجہ..... بھی اس کے مشرقی نقوش تھے۔ وہ عام امریکی لڑکیوں سے خاصی منفرد تھی۔

کیتھی کو دیکھنے کے بعد جسٹن نے تقریباً روزانہ ہی اس ریسٹورنٹ میں جانا شروع کر دیا۔ اس کا اصل مقصد صرف کیتھی سے ملاقات کرنا ہوتا تھا۔ کیتھی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اپنے حسن و جمال اور مردوں کی خود میں دلچسپی سے بھی خوب واقف تھی۔ اس کی مخصوص نسوانی حس نے اسے جلد ہی احساس دلا دیا تھا کہ جسٹن ریسٹورنٹ میں روزانہ کھانا کھانے کے لیے نہیں بلکہ اسے دیکھنے کے لیے آتا ہے۔ وہ خوب صورت اور وجیہہ تھا۔ کسی عورت کے لیے اسے آسانی سے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ بھی نہ پانی اور اس میں دلچسپی لینے لگی۔ اس کی خود میں دلچسپی محسوس

کرتے ہی جسٹن نے اسے کسی دوسرے ریسٹورنٹ میں کھانے کی دعوت دے ڈالی جو کیتھی نے قدرے تذبذب کے بعد قبول کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مرتبہ ایک ساتھ کھانا کھایا۔ جسٹن ایک امریکی تھا اسی لیے اس نے زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور بالآخر ایک کھانے کی دعوت پر کیتھی کو پرپوز کر ڈالا۔ کیتھی نے اس کی توقع کے مطابق خوش دلی سے اس کا پرپوزل قبول کر لیا اور پھر چند ماہ بعد ہی ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

ان کی شادی اس وقت تک کامیاب رہی جب تک کیتھی ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار نہیں ہوئی۔ اس حادثے میں اس کی ٹانگ تو کٹ ہی گئی مگر ساتھ ہی ساتھ چہرے کی ہڈیاں بھی کئی جگہ سے ٹوٹ گئیں۔ ڈاکٹرز نے آپریشن اور پلاسٹک سرجری کے بعد اس کے چہرے کو ٹھیک تو کر دیا مگر کیتھی کا وہ حسن لوٹانے میں ناکام رہے جس پر جسٹن فریفتہ تھا۔ خوب صورت کیتھی ماضی کے دھندلکوں میں کہیں دفن ہو گئی اور اب ایک بدستور بلکہ کریہہ الصورت کیتھی جسٹن کے سامنے تھی۔ کیتھی کے حسن و جمال نے اس سے منہ موڑا تو جسٹن کا عشق بھی گویا فضا میں تحلیل ہو گیا۔

اب کیتھی اس کے لیے ایک ایسی ذمے داری تھی جسے وہ مجبوراً برداشت کر رہا تھا اگر امریکی قوانین کے مطابق طلاق کی صورت میں اسے اپنی آدھی جائداد کیتھی کے حوالے نہ کرنا ہوتی تو وہ اسے بہت پہلے طلاق دے کر گھر سے نکال چکا ہوتا۔

اور پھر اس کی ملاقات روزی سے ہوئی تو وہ اپنی دل پھینک فطرت کی وجہ سے اس پر بھی فریفتہ ہو گیا اور اب اس نے روزی سے شادی کرنے کے لیے کیتھی کو راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس وقت کیتھی کے کمرے میں اس کی آمد بھی اس کے اس منصوبے کا ایک حصہ تھی۔ اس نے دانستہ کیتھی کے ساتھ بات کرتے وقت اپنے لہجے کو نرم اور ہمدردانہ رکھا تھا تاکہ کیتھی کو اس پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔ کیتھی بہت ذہین عورت تھی اس لیے جسٹن محتاط ہو کر اس سے بات چیت کر رہا تھا اگر کیتھی اس پر مشکوک ہو جاتی تو اس کے لیے اپنے پلان پر عمل درآمد مشکل ہو جاتا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کہیں سیر کے لیے لے کر جاؤں۔ کافی عرصہ ہو گیا ہے ہم کہیں گھومنے نہیں گئے۔ پہلے تو ہر ویک اینڈ پر ہم کہیں نہ کہیں جاتے تھے۔'' جسٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں اس کمرے میں بند ہو کر اکثر اس وقت کو یاد کرتی ہوں۔'' کیتھی حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''جب تمہارے لیے میرے بغیر ایک پل کاٹنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ نہ جانے اب وہ جسٹن کہاں گیا؟ شاید اس جسٹن کو کیتھی کی خوب صورت شکل و صورت سے ہی الفت تھی اور وہ خوب صورت چہرہ اور شکل اب میرے پاس نہیں رہی۔ حادثے کے بعد تمہارے رویے میں بہت زیادہ سرد مہری آ گئی ہے۔''

''نہیں، نہیں..... تم میرے لیے آج بھی وہی کیتھی ہو۔'' جسٹن نے اس کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ورنہ دل ہی دل میں وہ کیتھی کی اس بات سے سو فیصد متفق تھا کہ اب وہ پہلے والی حسین و جمیل کیتھی نہیں رہی بلکہ اب تو وہ ایک ایسا بوجھ ہے جس سے چھٹکارا پانا ضروری ہو گیا تھا۔

''رہنے دو جسٹن۔'' کیتھی اداسی سے بولی۔ ''بھلا حقیقت کو بھی آج تک کوئی جھٹلا پایا ہے؟''

''حقیقت یہی ہے کہ تم میرے لیے آج بھی وہی کیتھی ہو جس سے میں نے عشق کیا تھا۔ وہ تو بس میں کام کی مصروفیت کی وجہ سے تمہیں وقت نہیں دے پاتا۔'' جسٹن نے مکارانہ لہجے میں کہا۔ تاہم کیتھی اس کے لہجے کی مکاری کو محسوس نہ کر پائی۔

''تم کہہ رہے تھے کہ ہم کہیں سیر کرنے جائیں گے مگر کہاں؟'' کیتھی نے استفسار کیا۔

''ہم جھیل کی جانب جائیں گے اور کشتی پر سیر بھی کریں گے اس طرح ہم اپنے ماضی کی کچھ اچھی یادیں بھی تازہ کر لیں گے اور تھوڑی سی تفریح بھی میسر آ جائے گی۔'' جسٹن نے کیتھی کو راستے سے ہٹانے کے اپنے منصوبے کے پہلے مرحلے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کیتھی تیراکی نہیں جانتی اور پھر ایک کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ تیرنا کسی ماہر تیراک کے لیے بھی مشکل ہوتا۔ کیتھی تو اس فن سے یکسر نابلد تھی۔ اسے جھیل میں ڈبو کر مارنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ جسٹن ایک ماہر تیراک تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تو اس سے یہ سوال ضرور ہو گا کہ ماہر تیراک ہونے کے باوجود اس نے کیتھی کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کیوں نہ کی۔ اس سوال کا بھی اس کے پاس ایک معقول جواب موجود تھا اور وہ یہ کہ ایک ہاتھ زخمی ہونے کی وجہ سے اس کے لیے پانی میں تیرنا خاصا مشکل تھا۔ اس لیے وہ بمشکل خود کو ہی بچا پایا۔ اس کا یہ جوابی عذر

ہر لحاظ سے قابلِ قبول تھا۔

وہ کیتھی کو اسی جھیل میں ڈبو کر مارنا چاہتا تھا جہاں آج روزی سے مل کر آرہا تھا مگر اس کا ارادہ جھیل کے اس مخصوص پکنک پوائنٹ پر جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ کیتھی کو لے کر میلوں تک پھیلی ہوئی جھیل کے کسی ویران مقام پر جانا چاہتا تھا۔ جہاں ان دونوں کے سوا کوئی دوسرا نہ ہوتا۔ اس کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار بھی ہوسکتا تھا جب اسے کیتھی کو پانی میں ڈبو کر مارتے کوئی نہ دیکھتا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے پلان کی تمام جزئیات طے کر چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کیتھی کے ساتھ جھیل کے اندر ربڑ کی کشتی پر جائے گا اور پھر کسی ویران مقام پر ربڑ کی کشتی کو کسی نوک دار شے سے پھاڑ ڈالے گا۔ کیتھی ڈوب کر ہلاک ہوجائے گی اور وہ خود تیرتا ہوا جھیل سے باہر آجائے گا۔ اس طرح کوئی بھی اس پر شک نہیں کرے گا۔ ربڑ کی مخصوص کشتیوں کے ساتھ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ پانی میں تیرنے والی کوئی کانٹے دار جھاڑی کشتی کے ربڑ اور کپڑے کو پھاڑ ڈالتی اور ہوا خارج ہوتے ہی کشتی پانی میں ڈوبنے لگتی۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ اس لیے جسٹن کو یقین تھا کہ سب اس کی بات کا یقین کرلیں گے اور کیتھی کی موت کو ایک حادثہ ہی سمجھیں گے۔ اس کے بعد اگر جھیل سے کیتھی کی لاش مل بھی جاتی تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی اس کی موت کی وجہ پانی میں ڈوب کر مرنا ہی بتائی جاتی اور جسٹن کسی الزام سے بری الذمہ ہی رہتا۔ بادی النظر میں جسٹن کو اپنے منصوبے میں کوئی سقم یا جھول نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک حادثے میں اتفاقی طور پر زخمی ہوا تھا۔ تاہم اب یہی زخمی ہاتھ اس کے منصوبے کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کرنے والا تھا۔ وہ سب سے کہہ سکتا تھا کہ جب ان کی کشتی ڈوبی تو زخمی ہاتھ کی وجہ وہ صرف ایک ہاتھ کی مدد سے تیرتا رہا اسی لیے کیتھی کو بچانے میں ناکام رہا۔ مگر اس پلان پر مکمل درآمد تبھی ممکن تھا جب کیتھی جانے کی ہامی بھر لیتی۔

''ٹھیک ہے ہم کل جھیل کی سیر کو چلیں گے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے میں بور ہو جاتی ہوں۔'' کیتھی نے رضامندی ظاہر کی تو جسٹن کا دل باغ باغ ہوگیا۔

''تمہاری دیکھ بھال کرنے والی نرس کہاں ہے، میں جب گھر آیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا؟'' جسٹن نے استفسار کیا۔

''وہ بازار گئی ہے۔ اسے کوئی کام تھا۔ میں نے ہی کہا تھا کہ دروازہ کھلا چھوڑ جائے۔ اگرچہ میرے پاس بیسا کھیاں موجود ہیں مگر دروازے تک جانے میں بھی مجھے مشکل پیش آتی ہے۔ چلتے وقت میرا پورا وجود دکھنے لگتا ہے۔'' کیتھی نے جواب دیا۔

''مگر اس طرح دروازہ کھلا چھوڑ دینا بھی دانشمندی نہیں۔'' جسٹن ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ''اگر گھر میں کوئی چور وغیرہ گھس آیا تو؟ آج کل ہمارے شہر میں اس طرح کی وارداتیں عام ہیں۔''

''میں ایک ٹانگ سے معذور ہوئی ہوں، ہاتھوں سے نہیں، تم جانتے ہو کہ میرے پرس میں ایک چھوٹے سائز کا پستول ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔'' کیتھی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ میری بیوی اتنی آسانی سے کسی کے قابو میں نہیں آنے والی۔'' جسٹن نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مگر بسا اوقات پستول نکالنے اور چلانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ بہرحال اس بحث کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ کافی پیو گی؟''

''کیوں نہیں، تمہارے ہاتھ کی کافی پیے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔'' کیتھی نے تصحیحی لہجے میں کہا تو جسٹن اثبات میں سر ہلاتا ہوا کچن کی جانب بڑھ گیا۔

کافی بنانے کے دوران بھی وہ اپنے پلان کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اس..... از سرِ نو غور کے بعد بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس کا منصوبہ فول پروف ہے اور پکڑے جانے کا امکان نہیں ہے۔

کافی کے دو بڑے مگ بنا کر وہ کیتھی کے کمرے میں واپس آگیا اور پھر اسے کافی کا مگ تھماتے ہوئے خود ایک طرف موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج وہ کافی عرصے بعد اکٹھے کافی پی رہے تھے۔ کیتھی کے چہرے پر بھی مسرت کے تاثرات نمایاں تھے۔ جسٹن کافی دیر تک کیتھی کے پاس بیٹھا اس سے ہلکی پھلکی گپ شپ کرتا رہا۔ کیتھی بھی اس کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ کبھی اس ہنسی پر جسٹن فدا ہوجاتا تھا مگر آج اس کی کریہہ الصورتی کی وجہ سے اس کی ہنسی جسٹن کو بہت عجیب لگ رہی تھی مگر وہ خود پر جبر کیے مسکرا کر کیتھی کی ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔ دانستہ اس کی دلجوئی کررہا تھا۔ اس کے منصوبے کی کامیابی کے لیے یہ ضروری تھا کہ کیتھی اس کے ساتھ جھیل کی سیر پر جانے سے انکار نہ کرتی اور وہ رضامندی ظاہر کرچکی تھی۔ اب جسٹن کو صرف ایک دن کے لیے اسے برداشت کرنا تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اس سے جان چھوٹ جاتی۔

جسٹن، کیتھی سے اگلے دن کا پروگرام فائنل کرتے ہوئے کمرے سے اس وقت اٹھا جب کیتھی کی دیکھ بھال کرنے والی نرس بازار سے واپس آگئی۔

وہ اپنے کمرے میں آکر ایک آرام دہ کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اس وقت اسے اپنے اعصاب پر سخت دباؤ محسوس ہورہا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ سا بزنس مین تھا۔ کسی کو قتل کرنا تو درکنار آج سے پہلے اس نے کسی کی جان لینے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا مگر اپنی آدھی جائداد کیتھی کے قبضے میں جانے سے بچانے اور روزی کو حاصل کرنے کی خاطر اس نے قتل جیسا بھیانک اقدام سرانجام دینے کا فیصلہ بھی کرہی لیا تھا۔ کل صبح وہ ایک ایسا کام کرنے جارہا تھا جس کی ناکامی کی صورت میں اس کا اپنا انجام بھی خاصا بھیانک ہوسکتا تھا۔ اسے ہر صورت کامیاب ہونا تھا۔ وہ ناکامی کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ رات دیر تک جاگتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ کیتھی کی دیکھ بھال کرنے والی نرس رات نو بجے چلی جاتی ہے اور پھر صبح دس بجے تک ہی اس کی واپسی ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حادثے کے بعد سے کیتھی کے جسم میں درد رہتا تھا۔ اسے رات کو اس درد کی وجہ سے ٹھیک طرح نیند نہیں آتی تھی۔ اس لیے اب وہ سونے کے لیے باقاعدہ نیند کی دوا لیتی تھی۔ دوا کے زیرِ اثر وہ گہری نیند سوتی تھی۔ اس لیے جسٹن کو یقین تھا کہ جب وہ اس کے کمرے میں جائے گا تو اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ اسے ابھی ایک اہم کام نمٹانا تھا۔ اب رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور پھر اپنے کمرے سے نکل کر کیتھی کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ جوتے پہننے سے کھٹکا ہوتا تھا جو رات کے گہرے سکوت میں زیادہ آواز پیدا کرتا تھا۔ جسٹن نہیں چاہتا تھا کہ کھٹکے کی آواز سن کر کیتھی بیدار ہوجائے۔ دوا کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاہم جسٹن اپنے کمرے میں لوٹا تو وہ اپنا کام نمٹا چکا تھا۔ اب اسے بس صبح کا انتظار تھا تاکہ کیتھی سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرسکے۔

وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ اپنا کام نمٹانے کے بعد اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات عود آئے تھے، اعصاب پر بوجھ بھی خاصا کم ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ سے اب اسے نیند آنے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

بے رحم

صبح دروازے پر ہونے والی دستک نے اُسے جاگنے پر مجبور کردیا۔ وہ رات دیر سے سویا تھا اسی لیے آج اس کی آنکھ بھی خلافِ معمول دیر سے کھلی تھی۔ وہ کسلمندانہ انداز میں انگڑائی لیتا ہوا بستر سے اٹھ گیا۔

دروازہ کھولا تو باہر وہ نرس موجود تھی جو جسٹن نے کیتھی کی دیکھ بھال کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ ایک نرس تھی مگر گھر کے کچن کا کام بھی اسی نے سنبھال رکھا تھا اور جسٹن اس کام کے اسے الگ سے پیسے دیتا تھا۔ گویا ایک بدصورت بیوی اسے خاصی مہنگی پڑ رہی تھی۔

''میڈم کو کہو کہ گیارہ بجے تک تیار ہوجائیں۔ آج ہم نے سیر پر جانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔'' جسٹن نے اس کے ہاتھوں سے ناشتے کی ٹرے لیتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا تو نرس اثبات میں سر ہلاتی ہوئی کیتھی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ملگن لگے توس اور کافی کا ایک بڑا مگ پینے کے بعد اسے اپنے جسم میں توانائی کا ایک نیا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آگیا اور روانگی کے لیے ضروری انتظامات کرنے لگا۔ اس نے اپنی گاڑی کی ڈکی میں ربڑ کر کشتی بھی منتقل کرلی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کشتی میں ہوا بھرنے کے لیے بیٹری سے چلنے والا مخصوص پمپ بھی۔ اب ربڑ کی یہ کشتی خاصی چھوٹی محسوس ہورہی تھی اور جسٹن نے اسے لپیٹ کر کار کی ڈکی میں رکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جیسے ہی اس میں ہوا بھرنا شروع ہوگی اس کا حجم بڑھتے بڑھتے اتنا ہوجائے گا کہ وہ اور کیتھی آرام سے اس میں سوار ہوکر جھیل کی سیر کرسکیں گے۔ کشتی کے ساتھ کار کی ڈکی میں دو چھوٹے چپو بھی موجود تھے۔ جسٹن کسی زمانے میں کشتی رانی کا خاصا شوقین رہا تھا۔ اگرچہ اب اس کا یہ شوق ماضی کا حصہ بن چکا تھا مگر یہ کشتی اس کے پاس اس وقت سے ہی موجود تھی اور یہ کشتی آج بھی قابلِ استعمال حالت میں تھی۔ ویسے جسٹن کو آج اس کا آخری بار ہی استعمال کرنا تھا۔ گاڑی کی ڈکی میں اپنا مطلوبہ سامان منتقل کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اب وہ غسل کرنا چاہتا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر کیتھی کے کمرے کی جانب گیا تو غسل سے فارغ ہوکر پینٹ کوٹ پر مشتمل ایک نفیس لباس زیبِ تن کرچکا تھا۔

اس نے نرس کے توسط سے کیتھی کو گیارہ بجے تک تیار

PAKSOCIETY.COM

ہونے کا کہا تھا اور اب ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

وہ کیتھی کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی توقع کے مطابق وہ تیار ہو چکی تھی۔ کیتھی اس وقت کمرے میں رکھی ایک آرام دہ کرسی پر براجمان تھی۔ پاس ہی اس کی دیکھ بھال کرنے والی نرس بھی موجود تھی۔ کیتھی نے خاصا شوخ اور بھڑکیلا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اپنے چہرے کو میک اَپ سے خوب صورت بنانے کی بھی ناکام کوشش کی تھی۔ کبھی کیتھی کے خوب صورت چہرے کو کسی میک اَپ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا مشرقی حسن کسی بناوٹ کا محتاج نہیں تھا مگر آج میک اَپ کرنے کے بعد اس کی کریہہ الصورتی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ حادثے نے اس کے چہرے کو اس بُری طرح بگاڑا تھا کہ اب پہلے والی کیتھی اور موجودہ کیتھی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ خود کو خوب صورت بنانے کے اس کے سارے جتن بیکار ہی گئے تھے۔

''چلیں۔'' اسے تیار دیکھ کر جسٹن نے بھی مزید وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''ہاں۔'' کیتھی نے بیساکھی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ارے، ارے، میرے ہوتے ہوئے تمہیں بیساکھیوں کی کیا ضرورت ہے۔'' جسٹن نے آگے بڑھ کر کیتھی کو سہارا دیا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''ہم شام تک واپس آجائیں گے، گھر کا خیال رکھنا۔'' جسٹن نے ایک طرف کھڑی نرس سے کہا اور پھر کیتھی کو سہارا دیتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ کیتھی کی ایک ٹانگ نہیں تھی اس لیے اس نے ایک سائڈ کا سارا بوجھ جسٹن پر ڈال دیا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے بیڈ پر آرام کرتے ہی گزرتا تھا۔ کسی سرگرم جسمانی مشقت کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ خاصی فربہ ہو گئی تھی۔ جسٹن کو اسے سہارا دیتے وقت خاصی قوت صرف کرنا پڑی۔

کچھ ہی دیر میں وہ روانہ ہو گئے۔ جسٹن نے کیتھی کو فرنٹ سیٹ پر بٹھایا تھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان کار چلا رہا تھا۔ کیتھی کے چہرے پر اس وقت ایسے تاثرات تھے جیسے اسے ہفت اقلیم کی کوئی دولت مل گئی ہو۔ جب سے اس نے حادثے کا شکار ہو کر اپنا حسن گنوایا تھا۔ وہ جسٹن کی توجہ کے لیے ترس رہی تھی اور کل جسٹن نے جس طرح ایک عرصے بعد اسے جھیل کی سیر کی دعوت دی تھی۔ اس سے کیتھی گویا ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔ اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ وہ وہی کیتھی ہے جس کے پیچھے جسٹن گھنٹوں خوار ہوا کرتا تھا۔ یہ کیتھی کی سوچ اور خیالات تھے۔ ایک ایسی عورت کے خیالات جو دانستہ حقیقت سے نظریں چُرا رہی تھی اگر ٹھنڈے دماغ سے غور کرتی تو سمجھ جاتی کہ جسٹن کی اس اچانک ہونے والی کایا پلٹ کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما ہو سکتا ہے مگر وہ جذبات کے دھارے میں بہہ رہی تھی۔ عقل سے کام لینا ہی نہیں چاہتی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جسٹن جھیل کے ایک ویران مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ گھنے درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ جسٹن نے اپنی کار ایک سائڈ پر روک دی۔ سامنے جھیل کا کنارہ تھا۔ ''جسٹن تم جھیل کے مخصوص پکنک پوائنٹ کی طرف کیوں نہیں گئے۔'' کیتھی نے آس پاس کسی ذی روح کو نہ پا کر کہا۔

''جھیل کے پکنک پوائنٹ پر لوگوں کا رش ہو گا اور میں تمہارے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے شور شرابا پسند نہیں ہے۔'' جسٹن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ اب وہ کیتھی کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ پکنک پوائنٹ پر روزی موجود ہو گی جس کی خاطر اس نے اسے مارنے کا منصوبہ بنایا ہے اور پھر اسے اپنے منصوبے کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جھیل کے کسی ایسے ویران مقام کی ہی ضرورت تھی جہاں اسے کیتھی کو پانی میں ڈبوتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔ اس لیے جسٹن نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''میرے خیال میں ہمیں کشتی پر جھیل کی سیر کرنی چاہیے۔'' جسٹن نے کہا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے کار کی ڈکی میں سے ربڑ کی کشتی اور دوسرا سامان نکال لیا۔ وہ تمام سامان اٹھا کر جھیل کے عین کنارے پر لے آیا۔

کیتھی گاڑی کی ونڈ اسکرین سے اس کی تمام حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر بھی تذبذب کے تاثرات امنڈ آئے تھے۔ شاید سیر کے لیے جسٹن کا میلوں تک پھیلی اس جھیل کے کسی ویران مقام کا انتخاب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تاہم اسے کسی خطرے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جسٹن نے بیٹری سے چلنے والے مخصوص اور جدید پمپ کا پائپ کشتی کی نوزل سے جوڑا اور پمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ بیٹری سے چلنے والے اس جدید پمپ نے انتہائی تیزی سے ربڑ کی اس کشتی میں ہوا بھرنا شروع کر دی۔ ربڑ کی وہ چھوٹی سی کشتی جو کچھ دیر پہلے تک بہت چھوٹی نظر آ رہی تھی، ہوا بھرنے کے بعد اتنی بڑی ہو گئی کہ اس میں دو افراد آرام سے سوار ہو سکتے تھے۔

ہوا بھرتے ہی جسٹن نے پمپ نوزل سے علیحدہ کیا اور پھر اسے کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔ اس نے دونوں چپوؤں میں سے ایک چپو بھی کار کی ڈکی میں ہی رہنے دیا تھا۔ کیونکہ ایک ہاتھ زخمی ہونے کی وجہ سے وہ صرف ایک چپو کا استعمال ہی کر سکتا تھا۔

''آؤ کیتھی۔'' اس نے کار کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر کیتھی کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے تو کیتھی اپنا پرس سنبھالتی ہوئی اس کا سہارا لے کر کار سے باہر آ گئی۔ جسٹن اسے سہارا دیتے ہوئے ربڑ کی کشتی کے پاس لے آیا اور پھر احتیاط سے کیتھی کو کشتی پر بٹھا دیا۔ ایسا کرنے کے بعد اس نے زور لگا کر کشتی کو جھیل کے پانی میں داخل کیا اور پھر خود بھی چھلانگ مارتے ہوئے کشتی پر سوار ہو گیا۔ ربڑ کی وہ ہلکی سی کشتی تیزی سے گہرے پانی کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ جسٹن نے اپنے دائیں ہاتھ سے چپو سنبھالا اور پھر اسے کبھی دائیں اور کبھی بائیں چلانے لگا۔

''کیتھی تمہیں یاد ہے ایک دفعہ سمندر کنارے نہاتے ہوئے تم ڈوبنے سے بال بال بچی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہاری جان بچائی تھی۔'' تقریباً پندرہ منٹ تک چپو چلانے کے بعد جسٹن نے خاموشی کے منجمد لمحات کو پگھلاتے ہوئے کہا۔ اب وہ کنارے سے کافی دور آ چکے تھے۔

''ہاں۔'' کیتھی جو جھیل کی خوب صورتی میں کھوئی ہوئی تھی۔ چونک کر بولی۔ ''میں سمندر کنارے نہاتے ہوئے تیز لہروں کی زد میں آ گئی تھی۔ اگر تم نہ ہوتے تو آج میں زندہ نہ ہوتی۔''

''مگر آج تمہیں کون بچائے گا کیتھی ڈارلنگ۔'' جسٹن نے یکلخت چپو پانی میں پھینکتے ہوئے بدلے ہوئے لہجے میں کہا تو کیتھی لمحہ بھر کے لیے انگشت بدنداں رہ گئی۔

''تمہاری اس بات کا کیا مطلب جسٹن؟'' اس نے متحیر لہجے میں استفسار کیا۔ جسٹن کے بدلے ہوئے لہجے نے اسے خطرے کا احساس دلا دیا تھا اور اس کا سیر کے لیے اس ویران مقام کا انتخاب بھی اب سمجھ میں آنے لگا تھا۔

''مطلب بڑا سیدھا اور صاف ہے۔'' جسٹن اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکالتے ہوئے بولا۔ ''میں اب تم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اب پہلے والی کیتھی نہیں رہی ہو مگر میں تمہیں طلاق دیتا ہوں تو مجھے

امریکی قوانین کے مطابق اپنی آدھی جائداد تمہارے حوالے کرنا پڑے گی۔ دراصل میں ایک اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے مجھے تم سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جسٹن نے کشتی کے ایک سائڈ پر چاقو مار دیا۔ چاقو لگتے ہی ربڑ کی کشتی میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہو گیا اور اس میں سے ہوا خارج ہونے لگی۔ جسٹن نے چاقو جھیل میں پھینک دیا۔

''ہوا خارج ہونے کے بعد اب کچھ ہی دیر میں یہ کشتی ڈوب جائے گی۔ تم تیرنا نہیں جانتی ہو اس لیے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر جاسوسی نایاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کوئنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

PakBooks.site

تمہاری موت یقینی ہے جبکہ میں تیر کر کنارے پر پہنچ جاؤں گا اور سب سے یہی کہوں گا کہ ربڑ کی کشتی کسی بڑے کانٹے کے لگنے کی وجہ سے پھٹ گئی تھی اور کیونکہ میرا ایک ہاتھ زخمی تھا اسی لیے میں صرف ایک ہاتھ سے تیر سکتا تھا اور اسی مجبوری کی وجہ سے تمہاری جان بھی نہ بچا سکا۔ جھیل سے تمہاری لاش اور ربڑ کی پھٹی ہوئی کشتی برآمد ہوگی تو سب کو میری بات پر یقین آجائے گا۔''

''نہیں، نہیں...... تم اتنے بے رحم کیسے ہو گئے جسٹن؟'' اس کی بات سن کر کیتھی خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اپنی دولت بچانے اور ایک لڑکی کی خاطر اتنا گر سکتے ہو؟''

''جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔'' جسٹن نے ایک انگریزی محاورہ بولا۔ ''میں روزی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور تم میرے راستے کی رکاوٹ ہو۔ بڑے مقاصد کے حصول کے لیے انسان کو بے رحم بننا ہی پڑتا ہے۔''

''میں تمہیں اتنی آسانی سے یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔'' کیتھی یکلخت بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم بھول گئے کہ میرے پرس میں ہمہ وقت ایک چھوٹا پستول موجود رہتا ہے۔ میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے کیتھی نے پھرتی سے اپنے پرس سے ریوالور نکالا اور اس کا سیفٹی لاک ہٹاتے ہوئے جسٹن پر تان لیا۔

''میرا نام جسٹن ہے کیتھی، میں نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔'' جسٹن اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اپنے پاس ایک پستول رکھتی ہو۔ رات میں اس کا سدِباب بھی کر چکا ہوں۔ رات میں تمہارے کمرے میں آیا تھا۔ میں نے پرس سے تمہارا ریوالور نکالا اور پھر اس کے اندر سے وہ مخصوص پن نکال دی جو ٹریگر دبانے پر گولی پر ضرب لگاتی ہے اس کے بعد میں نے اس پستول کو دوبارہ تمہارے پرس میں رکھ دیا۔ اب یہ محض لوہے کا ایک ٹکڑا ہے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' جسٹن کا جواب سن کر کیتھی کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات عود آئے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں یقین نہیں آرہا تو مجھ پر گولی چلا کر دیکھ لو۔ میں نے تمہیں مارنے کا پلان بناتے وقت چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی خیال رکھا ہے۔ اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے جسٹن کیتھی کی طرف بڑھا۔

''مجھ پر رحم کرو جسٹن، میں ایک معذور عورت ہوں۔'' کیتھی نے زندہ بچنے کے امکانات معدوم ہوتے دیکھ کر اس سے باقاعدہ رحم کی بھیک مانگی مگر ساتھ ہی ریوالور کا ٹریگر دبا کر جسٹن کی بات کی تصدیق بھی کر لی اور ٹرچ کی آواز نے جسٹن کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔

''میری بقا کے لیے تمہاری موت ناگزیر ہو چکی ہے۔'' یہ کہتے ہی جسٹن نے کیتھی کے منہ پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ زندگی بچانے کے فطری جذبے کے تحت کیتھی نے جسٹن کی لات کو روکنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے کیا مگر اس کی یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ جسٹن کی لات اس کے منہ پر پڑی اور وہ چیختی ہوئی پانی میں جا گری۔ اس کا پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک غوطے کھاتی رہی۔ اس کا جسم کبھی پانی میں ڈوب جاتا تو کبھی سطحِ آب پر نمودار ہو جاتا اور پھر چند ثانیوں بعد ہی اس کا جسم پانی میں غائب ہو گیا اس بار وہ سطحِ آب پر نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے پانی میں غرق ہو گئی تھی۔ دو منٹ یونہی گزر گئے۔ جسٹن جانتا تھا کہ کیتھی اب تک دم گھٹنے کی وجہ سے مر چکی ہو گی، وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ جھیل کے کھارے اور گدلے پانی میں کچھ دیکھ پانا ممکن ہی نہ تھا۔ ربڑ کی کشتی کا ایک حصہ ہوا خارج ہونے کی وجہ سے تقریباً پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اب جسٹن کو بس اپنے ایک ہاتھ سے تیرتے ہوئے کنارے تک جانا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ آسانی سے کنارے تک پہنچ جائے گا۔ وہ ایک ماہر تیراک تھا۔ ایک ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود محض دوسرے ہاتھ سے بھی بہ آسانی تیر سکتا تھا۔

اب کشتی کے اس حصے سے بھی ہوا خارج ہونے لگی تھی جہاں اس وقت جسٹن کھڑا تھا۔ مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ تھا۔ اس نے پانی میں چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کے کوٹ کی جیب میں موجود موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا تو روزی کا نمبر دیکھ کر چونک پڑا۔ فون سننے میں کوئی حرج نہ تھا۔ ''ہیلو۔'' اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس نے روزی سے بات کرنے کا تو ارادہ کر لیا تھا مگر ابھی اسے کیتھی کی موت کے بارے میں کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ویسے بھی اسے روزی اور سب کے سامنے کیتھی کی موت کو ایک حادثے کے طور پر ہی پیش کرنا تھا اور اس کا خیال تھا کہ پہلے وہ کنارے پر پہنچے گا اس کے بعد کیتھی کی حادثاتی

موت کا واویلا کرے گا۔

''ہیلو جسٹن! کیسے ہو تم؟'' فون پر روزی کی آواز ابھری۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' جسٹن نے جواب دیا۔ ربڑ کی کشتی کا ایک حصہ پانی میں غرق ہونے کے قریب تھا دوسرے حصے سے بھی ہوا آہستہ آہستہ خارج ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ حصہ اب قدرے اوپر اٹھ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے جسٹن کو کشتی پر اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے دشواری کا سامنا تھا۔ وہ اس حالت میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا تھا۔

''روزی کیا کوئی اہم بات کرنی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں، میں نے تو بس یونہی فون کیا تھا مگر تمہارے لہجے سے لگتا ہے کہ تم خاصے مصروف ہو۔''

''ہاں، میرے خیال میں اگر تم مجھے تھوڑا سا وقت دے دو تو میں ایک دو گھنٹوں کے بعد تم سے خود بات کروں گا۔ اس وقت میں خاصا مصروف ہوں۔'' جسٹن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' روزی کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری عود آئی۔ ''ویسے میں تم سے بھی زیادہ مصروف ہوں مگر اس کے باوجود تمہیں فون کیا۔''

''ارے تم تو ناراض ہو گئی ہو۔ میں نے تو یونہی بات کر دی تھی۔ ویسے تمہیں کیا مصروفیت لاحق ہے؟'' جسٹن نے روزی کو پچکارتے ہوئے کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی۔'' روزی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں واقعی میں آج بہت مصروف ہوں۔ آج میلوں تک پھیلی ہوئی اس جھیل کے کناروں پر بڑے بڑے بورڈز آویزاں کیے جانے ہیں اور اس کام کی نگرانی مجھے سونپی گئی ہے۔''

''کیسے بورڈز؟'' جسٹن نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میری کمپنی نے جھیل میں نہانے پر اس لیے پابندی عائد کر رکھی تھی کیونکہ اس کی تہ میں موجود کیچڑ اور جنگلی جھاڑیوں میں پھنس کر کچھ لوگ مارے گئے تھے۔'' روزی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تاہم سطحِ آب پر تیرنے والے محفوظ رہے تھے اور اب بھی محفوظ ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں، تم نے یہ بات مجھے خود ہی بتائی تھی۔'' جسٹن نے تفہیمی لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ کچھ سرپھرے نوجوان اب بھی جھیل میں نہانے سے باز نہیں آرہے جس کی وجہ سے مزید ہلاکتوں کا خطرہ ہے اور میری کمپنی نے ان سرپھرے نوجوانوں کو وہاں نہانے سے روکنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے۔''

''کون سا انوکھا طریقہ؟'' جسٹن نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''تم جانتے ہی ہو کہ کافی عرصہ پہلے اس جھیل میں مگرمچھ ہوا کرتے تھے اور پھر ان مگرمچھوں کو کسی دوسری جھیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔'' روزی نے کہا۔

''ہاں! یہ بات بھی تم ہی نے بتائی تھی۔'' جسٹن نے جواب دیا۔

''جب اس جھیل میں مگرمچھ موجود تھے تو کوئی بھی یہاں نہانے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور جھیل میں لوگوں کو نہانے سے باز رکھنے کے لیے آج صبح جھیل میں پھر سے مگرمچھ چھوڑ دیے گئے ہیں اور اسی سلسلے میں لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے جھیل کے کناروں پر میلوں تک بورڈز آویزاں کیے جا رہے ہیں۔ میں اسی سلسلے میں خاصی مصروف ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' بات کرتے ہوئے جسٹن کے لہجے میں خوف امنڈ آیا۔ ''میں کل تمہارے پاس موجود تھا اس وقت تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''مجھے خود آج ہی اس بارے میں معلوم ہوا تھا۔ صبح جھیل میں دس بارہ مگرمچھ میرے سامنے ہی چھوڑے گئے ہیں۔ یہ فیصلہ جھیل انتظامیہ نے انتہائی اچانک کیا ہے اور اس پر فوری عمل درآمد بھی ہو گیا ہے۔ دو تین دن سے موسم خاصا سرد ہے جس کی وجہ سے جھیل میں نہانے کا سلسلہ بھی موقوف ہے۔''

مسئلہ

خاتون غذائیات کے ڈاکٹر کے کلینک میں گئیں تو ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ خاتون بہت فربہ تھیں۔

ڈاکٹر کے استفسار پر وہ بولیں۔ ''وزن تو خیر کوئی مسئلہ نہیں، مجھے پریشانی یہ ہے کہ وزن کے حساب سے میرا قد نو فٹ تین انچ ہونا چاہیے مگر یہ صرف سوا پانچ فٹ پر کئی سال سے رکا ہوا ہے۔''

کابل سے ماریہ خان کی معصومیت

اسی لمحے ربڑ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ایک جھٹکا لگا اور موبائل فون جسٹن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پانی میں جا گرا۔ کوئی چیز اس کی کشتی سے ٹکرائی تھی اور جسٹن کو یہ باور کرنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کوئی مگرمچھ تھا۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی کشتی چند لمحوں بعد پانی میں ڈوبنے والی تھی اور اسے تیر کر کنارے تک پہنچنا تھا مگر پانی میں ایک خطرناک مگرمچھ موجود تھا مگرمچھ پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہو چکا تھا مگر جسٹن جانتا تھا کہ وہ وہیں کہیں تھا۔

ابھی جسٹن اس خطرے سے نمٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے آس پاس پانی میں گویا بھونچال سا آ گیا۔ وہاں اب کئی مگرمچھ نمودار ہو گئے تھے۔

جسٹن کو معلوم تھا کہ مگرمچھ پانی میں خون کی بُو بہت دور سے محسوس کر لیتے ہیں۔ اس نے جب کیتھی کے چہرے پر ٹھوکر مار کر اسے پانی میں غرق کیا تھا تو اس کا چہرہ پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔ پانی میں اس کے خون کی آمیزش ہوتے ہی مگرمچھ اس جانب متوجہ ہو گئے تھے اور اب یہاں پہنچ چکے تھے۔

اور پھر جسٹن نے کشتی کے آس پاس کے پانی کا رنگ سرخ ہوتے دیکھا۔ ایک بڑے مگرمچھ نے جھیل میں ڈوبی ہوئی اس کی بیوی کے مردہ وجود کو جا لیا تھا اور اب اس کی لاش کو اپنے جبڑوں میں دبائے سطحِ آب پر نمودار ہو چکا تھا۔ کئی دوسرے مگرمچھ بھی اپنا حصہ وصول کرنے اس مگرمچھ پر جھپٹ پڑے اور کیتھی کے خون سے کشتی کے آس پاس کا پانی سرخ ہو گیا۔ جسٹن نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی انسانی وجود کو اتنی جلدی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا دیکھا تھا۔ بہت خوفناک اور دہشت ناک منظر تھا۔ مگرمچھ کا جبڑا بہت طاقتور ہوتا ہے مگر وہ چبانے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے شکار کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لیے جبڑوں میں دبا کر باقاعدہ گھومتا ہے۔ اس کے اس عمل میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ شکار کی مضبوط ہڈیاں بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس وقت مگر مچھ کیتھی کی لاش کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک کر رہے تھے۔ ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کے بعد کسی مگرمچھ کے دہانے میں کیتھی کی ٹانگ تھی تو کسی کے جبڑوں میں اس کا بازو۔

کچھ چھوٹے مگرمچھ ان بڑے مگرمچھوں کے قریب جانے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے جو کیتھی کی لاش کی ضیافت اُڑانے میں مصروف تھے شاید ان کی باری بعد میں آتی تھی۔

ان چھوٹے مگرمچھوں نے جسٹن کی کشتی کو گھیر لیا تھا۔ غالباً ڈوبتی ہوئی کشتی کو دیکھ کر ان خطرناک جانوروں کو بھی احساس ہو گیا کہ کشتی کا سوار کچھ دیر میں ان کی دسترس میں ہو گا اور وہ اس کے پارچوں سے اپنی بھوک مٹا سکیں گے۔

جسٹن نے کیتھی کو راستے سے ہٹانے کے لیے بڑا بے داغ اور شاطرانہ پلان بنایا تھا مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے دام میں آپ ہی آ جائے گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جھیل میں مگرمچھوں کو دوبارہ چھوڑ دیا جائے گا مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ وہ مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا۔ اس کے زندہ بچنے کے تمام امکانات معدوم ہو چکے تھے۔

اب بڑے مگرمچھ بھی کیتھی کے مردہ وجود کو ہڑپ کرنے کے بعد جسٹن کی کشتی کے قریب آنے لگے تھے۔ جسٹن نے چاقو کی مدد سے کشتی میں اپنے ہاتھوں سے سوراخ کیا تھا۔ اب وہ ربڑ کی اس کشتی میں سے ہوا کے اخراج کو کسی صورت نہیں روک سکتا تھا۔ آدھی سے زیادہ کشتی پانی میں ڈوب چکی تھی اور باقی آدھی بھی لمحہ بہ لمحہ ڈوب رہی تھی۔ موت لمحہ بہ لمحہ جسٹن کے قریب آتی جا رہی تھی اور وہ بے بسی سے ربڑ کی اس کشتی کے ایک حصے پر بیٹھا موت کے خوف سے کانپ رہا تھا۔

اسے اپنی ذہانت پر بڑا ناز تھا مگر آج اس کی ذہانت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو بڑی بے رحمی سے مارا تھا اور اب مکافاتِ عمل کا قانونِ قدرت بھی اس پر کوئی رحم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ کیتھی سے کہیں زیادہ اذیت ناک موت کا شکار ہونے والا تھا۔ سرد موسم کے باوجود اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

مگرمچھ اب اس کے بہت قریب آ گئے تھے کیونکہ اس کی کشتی اب پانی میں مکمل طور پر ڈوبنے والی تھی۔ بس چند ثانیوں کی ہی بات تھی۔ اس کے بعد وہ مگرمچھوں کی دسترس میں ہوتا۔ جسٹن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کیونکہ اسے موت کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی اور پھر جیسے ہی کشتی ڈوبی خونخوار مگرمچھ جسٹن پر جھپٹ پڑے۔ اور جھیل کا وہ ویران مقام جسٹن کی لرزہ خیز چیخوں سے گونج اٹھا۔ اپنی بیوی کو بے رحمی سے مارنے والا جسٹن خود بھی ایک بے رحمانہ موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میرا بازو

منظر امام

کچھ بھی نہیں گھر میں یوسف
ایک حوصلہ، بس رہ گیا ہے

عزم... ہمت اور حوصلہ ساتھ ہو تو بڑے سے بڑا پہاڑ ذرہ ثابت ہوتا ہے... ایسے ہی باحوصلہ اور باہمت کرداروں سے گندھی مختصر سی یادگار کتھا...

ماضی..... حال اور مستقبل سے وابستہ شناس کہانی.....

فرخ نے اپنے باپ وقار علی کی طرف دیکھا۔ کیا شاندار پرسنالٹی تھی۔ اس کے پاپا کی، وہ ان پر فخر کیا کرتا تھا۔ پاپا اس کے ذہن میں ہمیشہ سے محفوظ رہے۔ وقار علی کی ہر ادا، ہر انداز فرخ کے لیے ایک نئے تجربے، ایک نئے اسٹائل کی طرح تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا۔ ''ارے تم لوگوں کو کیا معلوم کہ میرے پاپا کیا چیز ہیں۔ وہ میرے آئیڈیل ہیں۔''

اس کی ماں پیار سے کہا کرتی۔ ''ارے یہ لڑکا تو اپنے باپ کا عاشق ہے۔''

وقار علی مسکرا کر کہتا۔ ''تو پھر تم کیوں جلتی ہو؟''

''میں تو اس لیے جلتی ہوں کہ اس کو ماں کی پروا ہی نہیں ہے۔'' امینہ مصنوعی خفگی سے کہا کرتی۔

PakiBooks.Site

یہ ان لوگوں کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔

فرخ کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ سپروائزر کیا ہوتا ہے لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کے باپ کے پاس پیسے آگئے ہیں اسی لیے وہ گھر میں مٹھائی لے کر آیا ہے اور اپنے نئے کپڑے لے کر آیا ہے۔ جب وہ ان کپڑوں کو پہن کر نکلا کرے گا تو سب تعریف کرتے رہ جائیں گے۔

وقار علی کی ترقی ہوتی چلی گئی۔ دو سال کے بعد ہی اسے فیکٹری والوں نے منیجر بنا دیا۔

ان کا کہنا تھا کہ وقار علی سے زیادہ فیکٹری کے معاملات کو اور کوئی نہیں جانتا۔ اسی لیے پرانے منیجر کے انتقال کے بعد وقار علی کو منیجر بنا دیا گیا۔ وہ ایک ایمان دار اور محنتی انسان تھا۔ فیکٹری کے مالکان اس کی قدر کرتے تھے۔ اس نے ہر مرحلے پر اپنی ایمان داری اور کارگزاری ثابت کر دی تھی۔

وقار علی کے پاس اب بائیک بھی آگئی تھی۔

چھٹی والی شام جب وہ تینوں اسی بائیک پر گھومنے جاتے تو فرخ کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔

وقار علی اپنے جوتوں کو خود ہی پالش کیا کرتا تھا۔ وہ کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا۔ امینہ سے کہا کرتا۔ ''نیک بخت یہ جوتے میرے لیے بہت مبارک ہیں۔ ان کے آتے ہی میری ترقی ہوتی چلی گئی۔ میں پہلے پیدل گھستا تھا۔ اب بائیک پر جاتا ہوں۔ فرخ کی پڑھائی بھی اچھی چل رہی ہے۔ اس کا اسکول بھی اچھا ہو گیا ہے۔ زندگی میں اور کیا چاہیے۔ قدرت نے کس کس طرح ساتھ دیا ہے۔''

فرخ کے لیے اس کا باپ ہی سب کچھ تھا۔ وقار علی اس کا آئیڈیل تھا۔ اسکول میں ایک بار اپنے آئیڈیل پر جب مضمون لکھنے کو کہا گیا تو اس نے اپنے باپ ہی پر لکھا تھا۔

اس سال کے آخر تک وقار علی نے اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر خود اپنی فیکٹری کی بنیاد رکھ دی۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو بہت کم عرصے میں اس کے پاس آئی تھی۔

فرخ اپنے دوستوں سے کہا کرتا۔ ''دیکھا، میں نے کہا تھا نا کہ میرے پاپا بہت بڑے انسان ہیں۔ اب تو میرے پاپا کے پاس ایک گاڑی بھی ہے۔''

کچھ دنوں بعد انہوں نے اپنا مکان بھی بدل لیا تھا۔

اب وہ شہر کے پوش علاقے میں رہا کرتے۔ اگرچہ وہ مکان بھی کرائے کا تھا لیکن اب وقار علی اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ اتنا مہنگا کرایہ افورڈ کر سکے۔

وقار علی کے پاس اب نئے اور قیمتی جوتوں کے بہت سے جوڑے تھے۔ اس کا وارڈ روب نئے تھری پیس سوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس گھر میں ایک ایسی ملازمہ تھی جو روزانہ وقار علی کے کپڑے سیٹ کر کے دیا کرتی۔

امینہ نے اب کچن کی طرف جانا کم کر دیا تھا۔ گھر میں دو، دو لوگ تھے جو دنیا بھر کی ڈشز بنایا کرتے۔

سب کچھ ہونے کے باوجود وقار علی نے اپنی روش نہیں بدلی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس اتوار کو بھی ٹائم نہیں ہوتا تھا لیکن ہر اتوار کو معمول کے مطابق شام کے وقت سب سیر کے لیے ضرور جاتے۔

وقار علی امینہ سے کہا کرتا۔ ''میرے لیے ان کامیابیوں سے زیادہ اہم محبت کے میدان میں کامیاب ہونا ہے۔''

''کس کی محبت؟''

''ظاہر ہے۔ تمہاری اور اپنے بیٹے فرخ کی۔''

''ہم دونوں کے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ پیسے آنے کے بعد بھی میرے لیے تم وہی وقار علی ہو اور فرخ کے لیے وہی پاپا ہو۔''

''اور ہمیں ہمیشہ اسی طرح رہنا ہے۔''

''وقت بھی کیا چیز ہے۔ ہم پہلے بھی سیر کے لیے جاتے تھے۔ اس وقت ہم رکشا یا ٹیکسی کرتے تھے۔''

''یاد ہے مجھے۔'' امینہ ہنس پڑی۔ ''ایک بار ہمارے پاس رکشا یا ٹیکسی کا کرایہ بھی نہیں تھا تو ہم بس میں آئے تھے۔''

''اور وہ بس کا کرایہ بھی میں پرانے اخبارات کی ردی بیچ کر جمع کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد قدرت نے مجھے بائیک دے دی۔ ہم اس پر جانے لگے اور اب ہمارے پاس گاڑی ہے۔ ہم نے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کیا ہے۔''

فرخ کے لیے اپنے پاپا کی باتیں بہت متاثر کرنے والی ہوتی تھیں۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا۔ ''تم نہیں جانتے کہ میرا باپ کتنا بڑا آدمی ہے۔''

اس کے ذہن میں بچپن سے یہ بٹھا دیا گیا تھا کہ بڑا آدمی اسے نہیں کہتے جس کے پاس بہت سی دولت ہو بلکہ بڑا وہ ہوتا ہے جس کے خیالات بڑے ہوں۔ اس کے پاپا کے خیالات بہت بڑے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ وہ فیکٹری خسارے میں جانے لگی۔ وقار علی نے جس کے اشتراک سے فیکٹری قائم کی تھی، اس نے علیحدگی اختیار کر لی۔ وقار علی نے جو کچھ لگایا تھا وہ ڈوب گیا۔ نقصان کو پورا کرنے کے چکر میں سب سے پہلے اس کا گھر فروخت ہوا پھر گاڑی بھی گئی۔

اس وقت فرخ اپنی ماں سے جا کر لپٹ جاتا۔ ''ماما، آپ تو میری ماں ہیں۔ میری جان ہیں۔''

سب ہنس دیتے۔ کل تین ہی افراد تھے اس گھر میں۔ فرخ، امینہ اور وقار علی۔ فرخ کے بعد ان کے یہاں اور اولاد نہیں ہوئی تھی۔ امینہ اور وقار دونوں صابر و شاکر قسم کے بندے تھے اسی لیے انہیں کوئی شکوہ بھی نہیں تھا۔ بس یہی خواہش تھی کہ کسی طرح فرخ کو اچھی تعلیم دلوا سکیں۔

اس زمانے میں فرخ کا باپ ایک فیکٹری میں جاب کیا کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی بہت کم تھی۔ اتنے بھی نہیں ہوتے تھے کہ ڈھنگ کے کپڑے خرید سکیں۔ گھر بھی بہت چھوٹا سا تھا۔ اس میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک بڑا کمرا اس کی ماما اور پاپا کا تھا۔ دوسرا فرخ کا تھا۔ یہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کمرے میں فرخ کی کتابیں اور کھلونے بکھرے رہتے۔ اس کے پاس کھلونے بھی ڈھنگ کے نہیں ہوتے تھے۔

وقار علی عام طور پر اس کے لیے ٹھیلوں سے پرانے کھلونے خرید کر لے آتا۔ یہ وہ کھلونے ہوتے تھے جو عام طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ کچروں میں پھینک دیا کرتے ہیں جن کو کباڑیے چن کر لے جاتے اور صاف ستھرا کر کے ٹھیلوں پر فروخت کیا کرتے ہیں۔

فرخ کو اسی قسم کے کھلونے نصیب ہوا کرتے تھے لیکن اس نے کبھی اپنے باپ سے بے جا فرمائش نہیں کی۔ وقار علی جب بھی اس قسم کا کوئی کھلونا لے کر آتا تو فرخ خوش ہو کر اس سے لپٹ جاتا۔

اس وقت وقار علی کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے جن کو وہ فرخ سے چھپا لیا کرتا۔

خود وقار علی کے پاس بھی ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ فرخ کو یاد تھا کہ اس کے باپ کے پاس چمڑے کی ایک موٹی سی چپل ہوا کرتی تھی۔ جسے پہن کر وہ فیکٹری جایا کرتا اور جب خاندان میں کوئی تقریب ہوتی تو وہی چپل مرمت کروا کے پہن لی جاتی۔

اس کے باوجود اس نے کبھی اپنے باپ کو شکوہ کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ایک مہربان صفت انسان تھا۔ ہر حال میں خوش رہنے والا۔ کبھی تیوریوں پر بل ڈالے گھر میں داخل نہیں ہوا۔ ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا جبکہ امینہ کبھی کبھی پھٹ پڑتی۔ ''کیا زندگی ہے۔ میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔''

''خدا کی بندی خدا کا شکر ادا کرو۔ اس نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔''

''اچھا بتائیں کیا دیا ہے؟'' امینہ تنک کر پوچھتی۔

''کم از کم مجھے تو فرخ جیسا بیٹا دیا ہے اور تم جیسی خوب صورت اور اچھی بیوی دی ہے۔''

فرخ یہ سب سُن کر ہنستا رہتا۔

ایک دن کسی شادی میں جانا تھا۔ کپڑے تو تھے لیکن وقار علی کی چپل اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ اسے پہن کر جایا جا سکتا۔

امینہ نے ضد شروع کر دی۔ ''حد ہو گئی۔ کب سے یہ چپلیں پہنے جا رہے ہیں۔ جائیں، آج ہی بازار سے اپنے جوتے خرید کر لے آئیں۔''

''نیک بخت تم تو جانتی ہو کہ آج کل جوتے کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔ جتنے میں جوتے آئیں گے، اتنے میں پورے مہینے کا راشن آجائے گا۔''

''میں یہ سب نہیں جانتی۔ کچھ پیسے میرے پاس ہیں۔ کچھ آپ ملا لیں۔ جوتے آجائیں گے۔''

امینہ کی ضد پر وقار علی جوتے خرید کر لے آیا۔

براؤن کلر کے چمکتے ہوئے جوتے۔ وہ ان پر پالش کرنے کے لیے پالش اور برش بھی لایا تھا۔

فرخ کو یاد تھا کہ اس دن اس کا باپ کتنا خوش تھا۔ بالکل بچوں کی طرح۔ وہ بار بار جوتے پہن کر امینہ اور فرخ کو دکھا رہا تھا۔ ''دیکھو، میں کیسا لگ رہا ہوں؟''

امینہ ہنس کر بولتی۔ ''میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ کوئی اچھا سا جوتا خرید لو۔''

''نیک بخت یہ جوتے اپنے ساتھ اور بھی خرچ لے کر آئے ہیں۔'' وقار نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''اب خود سوچو، کیا ایسے جوتوں کے ساتھ وہ برسوں کے کپڑے اچھے لگیں گے۔ جن میں کئی پیوند لگ چکے ہیں۔''

''یہ تو ہے، پھر کیا کرنا ہوگا؟''

''کرنا کیا ہے۔ کچھ پیسے اور جمع کر کے نیا کرتہ شلوار لے لوں گا۔'' وقار نے کہا۔ ''جب تک ان جوتوں کو رکھ دیتا ہوں۔''

کچھ دنوں کے بعد اس کا باپ ایک نیا سوٹ بھی لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبا بھی لایا تھا۔ ''یہ لو تم دونوں اپنا منہ میٹھا کرو۔''

''یہ مٹھائی کیا نئے سوٹ کی خوشی میں لائے ہو؟'' امینہ نے پوچھا۔

''ارے نہیں، آج میری ترقی ہوئی ہے۔'' وقار علی نے بتایا۔ ''پورے دو ہزار بڑھ گئے ہیں۔ میں پورے یونٹ کا سپروائزر ہو گیا ہوں۔''

اور جب کئی مہینوں کی فرخ کی اسکول کی فیس ادا نہیں ہو سکی تو اس دن اس نے ہمت ہار دی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر روتا رہا تھا۔

فرخ جب کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنے پاپا کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس کا باپ تو ہمت اور محنت کا پہاڑ تھا۔ اس نے کتنے دن گزارے تھے۔ وہ فرخ کا آئیڈیل تھا اور آج وہ آئیڈیل رو رہا تھا۔

وقار نے فرخ کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

فرخ دبے قدموں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''پاپا۔'' اس نے آواز دی۔

وقار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جلدی سے آنسو پونچھے۔ ''کیا ہے میری جان؟''

''پاپا! مجھے آپ کا رونا اچھا نہیں لگا۔'' فرخ نے کہا۔ ''جانتے ہیں، میں اپنے دوستوں سے کیا کہتا ہوں؟ میں کہتا ہوں کہ میرے پاپا ایک بریو انسان ہیں۔''

''ہاں بیٹا، تمہارا پاپا ایک بریو انسان ہے۔''

''چلیں تو پھر تیاری کریں۔'' فرخ نے کہا۔

''کس بات کی تیاری؟''

''پاپا آپ بھول گئے؟ آج تو آپ کی برتھ ڈے ہے نا۔ ہم ہر سال سلیبریٹ کرتے ہیں تو اس سال کیوں نہیں؟''

''نہیں بیٹا اس سال پاپا کا موڈ نہیں ہو رہا۔''

''آپ چلیں تو پاپا۔ ہم رات کا کھانا کہیں باہر جا کر کھائیں گے۔ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ پیسے ہیں ہمارے پاس۔''

''پیسے کہاں سے آ گئے؟''

''ماما نے جمع کیے تھے۔'' فرخ نے بتایا۔ ''ہم نے تو آپ کے لیے گفٹ بھی لیے ہیں۔''

''اور یہ گفٹ کہاں سے لے لیے؟'' وقار نے مسکرا کر پوچھا۔

''ماما تو بازار سے آپ کے لیے پرفیوم لائی ہیں اور میں نے ایک اسپیشل گفٹ لیا ہے۔''

''ارے واہ، وہ کیا ہے؟''

''اس طرح نہیں بتاؤں گا۔ آئیں، میرے ساتھ۔''

فرخ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

فرخ اپنے پاپا کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

امینہ نے ایک میز پر ایک چھوٹا سا کیک سجا رکھا تھا۔

''ارے یہ سب کیا؟'' وقار علی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''یہ سب آپ کے بیٹے نے کیا ہے۔'' امینہ نے بتایا۔

وقار نے پیار اور حیرت سے فرخ کی طرف دیکھا۔

''پاپا! یہ کیک میں نے ان ہی پیسوں سے خریدا ہے جو آپ مجھے پاکٹ منی کے طور پر دیتے رہے ہیں اور میں نے اسی دن کے لیے سیونگ کی تھی۔''

''اور آپ کے بیٹے نے آپ کے لیے گفٹ بھی لے رکھا ہے۔'' امینہ نے بتایا پھر اس نے فرخ سے کہا۔ ''جاؤ بیٹا پاپا کا گفٹ لے آؤ۔''

فرخ دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک تھا۔ ''یہ لیں پاپا، یہ آپ کا گفٹ۔''

''کیا ہے بیٹا؟''

''یہ آپ خود دیکھ لیں۔''

وقار نے وہ پیک کھول لیا۔ اس میں ایک بہت پرانی چپلوں کی جوڑی تھی۔ یہ وہی چپلیں تھیں جن میں اس نے بہت مہینے گزار دیے تھے اور جن کو پہن کر فیکٹری جایا کرتا تھا۔ عرصہ ہوا اس نے ان چپلوں کو پھنکوا دیا تھا۔ آج وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئی تھیں۔

''بیٹا..... یہ.....'' اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

''ہاں پاپا، یہ وہی چپلیں ہیں، آپ والی۔''

''لیکن یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گئیں؟'' وقار نے پوچھا۔

''پاپا، آپ کو شاید یاد نہیں ہے کہ بہت پہلے آپ ہی نے دی تھیں کہ جاؤ ان کو پھینک کر آ جاؤ۔ لیکن یہ میرے کمرے میں پڑی رہ گئی تھیں اور آج آپ کو اس لیے دے رہا ہوں پاپا کہ ان ہی چپلوں کو پہن کر آپ نے محنت کی تھی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ چپلیں آپ کو یاد دلائیں گی پاپا کہ آپ میں ابھی بھی وہی ہمت اور حوصلہ ہے۔ آپ پھر سے اپنی کامیابیوں کا سفر شروع کر سکتے ہیں پاپا۔ ابھی کچھ نہیں گیا ہے اور اب اس سفر میں، میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا کیونکہ میں آپ کا بازو بن سکتا ہوں، کیوں ماما؟''

وقار نے آگے بڑھ کر بیٹے کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت وہ تینوں رو رہے تھے۔

جرم کرنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا بھی آخری دن آسکتا ہے... جرم کی دلدل میں دھنسے ایسے ہی مجرموں کی روداد... ہر شخص کا جرم سے گہرا تعلق تھا مگر اس کے باوجود ہر شخص خود کو پارسا ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

کئی مجرموں کے درمیان اصلی مجرم کی تلاش کا دلچسپ احوال

اصلی مجرم

تنویر ریاض

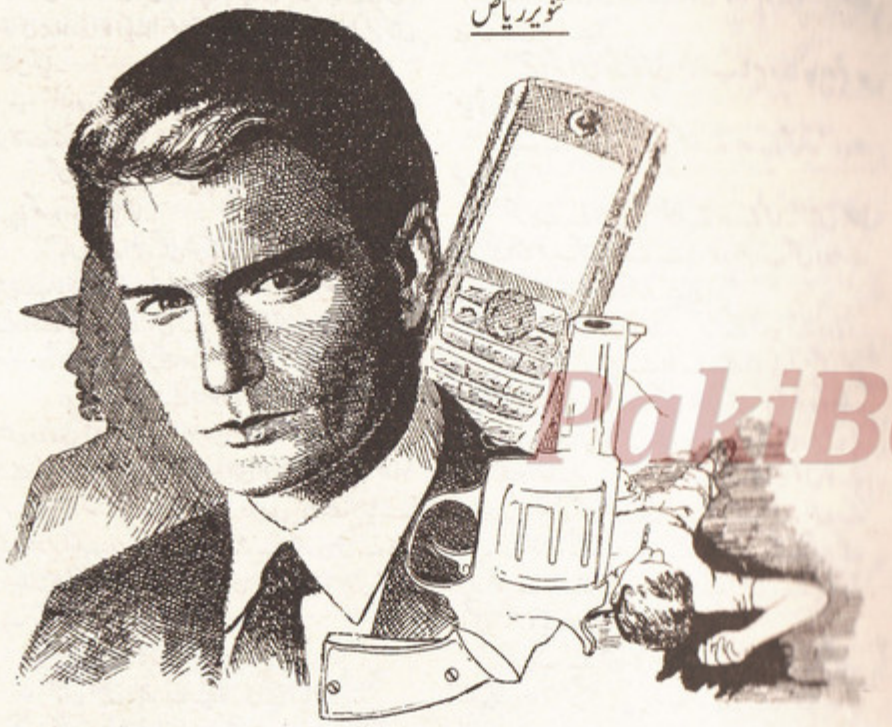

گھنٹی کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے لائٹ جلا کر دیکھا۔ یہ آواز بستر کے سرہانے رکھے ہوئے فون سے آ رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو۔''

''بگ! یہ تم ہو۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''

بگ، اس کا نک نیم تھا اور ہائی اسکول کے ساتھی اسے اسی نام سے پکارتے تھے لیکن گزشتہ تیس سال سے کسی نے اس کا یہ نام نہیں لیا تھا۔ اس نے فون کے برابر میں

PakiBooksSite

رکھے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے پونے دو بج رہے تھے۔

''معاف کرنا۔ میں نے پہچانا نہیں۔''

''بگ، میں فرانسس بول رہا ہوں۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے دوست۔''

''میں کسی فرانسس کو نہیں جانتا۔''

''میں کریب ہوں...... کریب فرانسس۔''

اسے یاد آگیا۔ وہ اس کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ اس نے وکیل بن کر اپنے باپ کی جگہ سنبھال لی تھی۔ وہ مقامی برادری کا ایک اہم ستون بن گیا اور شہر چھوڑ کر کہیں نہیں گیا۔

''اوہ، ہائے کریب۔'' اس نے کہا۔ ''تم سے کل ملاقات نہیں ہوئی۔''

گزشتہ روز اس کے باپ کی تدفین تھی اور وہ اسی لیے اپنے گھر واپس آیا تھا۔

''ہاں مجھے اس میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہے۔ میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ بیری مر گیا ہے۔ کسی نے اسے قتل کر دیا۔ اسی لیے میں نے کہا کہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم آسکتے ہو؟''

بیری بھی اس کے اسکول کے زمانے کا ساتھی تھا لیکن دونوں کی عادتیں اور مزاج مختلف تھا۔ بگ کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا جبکہ بیری کند ذہن اور دوسروں پر انحصار کرنے والا تھا۔ ایک وقت تھا کہ دونوں دوست دنیا سے بیگانہ ہو کر ایک دوسرے کے ہو گئے تھے پھر بیری نے کار میکینک کا کام سیکھنے کے لیے آخری سال میں اسکول چھوڑ دیا۔

''مجھے کہاں آنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تمہیں لینے کے لیے گاڑی بھیج رہا ہوں۔''

وہ ستمبر کا مہینا تھا اور رات میں سردی ہونے لگی تھی۔ بگ اپنے ساتھ گرم کپڑے لے کر نہیں آیا تھا تاہم اس وقت اس نے ایک اونی جیکٹ پہن رکھی تھی جو اس کے باپ نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں لندن سے خریدی تھی۔ سیاہ رنگ کی کار اسے لینے کے لیے آئی۔ اس پر برازیل کے قانون کے مطابق سرخ رنگ کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ غالباً کوئی ٹیکسی تھی۔ اس نے بیس منٹ بعد ایک عمارت پر پہنچا دیا جس کے مرکزی دروازے پر کارب ڈائم کلب (صرف بالغان کے لیے) کا سرخ نیون سائن جگمگا رہا تھا۔

کریب اس کے استقبال کے لیے مرکزی دروازے پر موجود تھا۔ وہ بھاری جسم اور ہلکے بالوں والا شخص تھا۔ اس نے براؤن سوٹ اور زرد رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔

''یہاں آنے کا شکریہ بگ۔'' اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے باپ کی وفات کا سن کر افسوس ہوا، ہم سب......''

''رہنے دو کریب۔ تم نے آخری بار مجھ سے آٹھویں جماعت میں اظہارِ افسوس کیا تھا۔ ہم سب سے تمہاری کیا مراد ہے اور یہ کون سی جگہ ہے۔ کوئی گودام وغیرہ...... مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''تم اگر اس جگہ کو کوئی مناسب نام دینا چاہو تو یہ عیاشی کا کلب ہے۔''

بگ نے اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب۔''

کریب نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ہم اب بھی دوست ہیں۔ چلو لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ ایک راہداری سے گزر کر گئے جس کے دونوں جانب بھاری پردے پڑے ہوئے تھے وہ جگہ گرم تھی اور فضا میں بوربن اور بیئر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بالآخر وہ ایک گول کمرے میں پہنچے جس میں چاروں طرف اور فرش پر ماربل لگا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی گول لوہے کی میز رکھی ہوئی تھی لیکن کوئی کرسی نظر نہیں آئی۔ اس کے عقب میں لفٹ کے دو دروازے تھے اور میز کے گرد تین افراد کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کے اسکول کے پرانے ساتھی سلنگر، بک اور تھروٹ تھے۔

کریب نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تمہیں یہ پرانے ساتھی یاد ہیں لیکن اب یہ ایلڈر مین ٹیڈ سورس، ڈاکٹر فرانسس پریرا ایک ممتاز ماہرِ قلب اور مارکوس پیشے کے لحاظ سے سول انجینئر لیکن اب ٹریبون اخبار کا مالک ہے۔''

''میرا اندازہ ہے کہ یہ اخبار اسے ورثے میں ملا ہو گا۔ بہرحال یہ تینوں مجھے یاد آگئے۔'' بگ نے کہا۔ ''اب بتاؤ مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟''

ڈاکٹر پریرا نے جواب دیا۔ ''بیری مر چکا ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا لیکن تم کیا چاہتے ہو؟''

''ہمیں تمہارے بارے میں معلوم ہے۔'' انجینئر اور

[illegible] مارکوس نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں جو کچھ تم نے [illegible] کے معاملے میں کیا تھا۔''

[illegible] ایک شخص دورانِ پرواز جہاز کے [illegible] کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ [illegible] پرواز ختم ہونے سے پہلے قاتل کو [illegible] قتل کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ [illegible] طور پر شائع کیا تھا۔

''کیا وہ [illegible] ہوا؟ اسی سونگر کلب میں؟ تمہیں [illegible]''

''[illegible]'' ڈاکٹر نے لفٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلی منزل پر جہاں جوا کھیلا جاتا ہے۔''

وہ چاروں دوست اس کیسینو میں شراکت دار تھے جو ایک [illegible] مستطیل کمرے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں اور چھت پر ہر طرف آئینے اور دیدہ زیب روشنیاں لگی ہوئی تھیں [illegible] کمرے کے وسط میں جوا کھیلنے کے لیے دو بڑی [illegible] ایک دیوار کے ساتھ بگ نے گولڈن سلاٹ مشینیں بھی ایک قطار میں دیکھیں۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک بار تھا اور اس کے آخری کونے پر ایک پردے والا [illegible] کمروں کی طرف کھلتا ہو گا۔ [illegible] کی دھن بج رہی تھی اور سب لوگ [illegible] بگ کو وہاں کوئی لاش نظر نہیں آئی۔

''تم [illegible] اطراف میں دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے [illegible] کیوں نہیں بلایا۔'' کریب نے کہا۔

بگ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو اسے کچھ جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ ان میں شہر کا موجودہ میئر بھی [illegible] وہاں دیکھ کر بگ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس کا یہ شوق ایک کھلا راز تھا۔ البتہ قابلِ احترام ریٹائرڈ جج [illegible] کی وہاں موجودگی حیران کن تھی۔ بگ جانتا تھا کہ وہ اخلاقی قدروں کا علمبردار ہے، اس نے ہمیشہ [illegible] کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ بار کے پاس ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس پکڑے ہوئے کھڑا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی پھولی ہوئی ناک کو دبا رہا تھا۔

''لاش کہاں ہے؟'' بگ نے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ آؤ۔''

وہ کمرا عبور کر کے ایک لفٹ میں داخل ہوئے جو اوپر کی منزل پر جا کر رک گئی۔ یہ درمیانی منزل تھی۔ اس کے اوپر کلب اور نیچے کیسینو تھا۔ وہ لفٹ سے باہر آکر شیشے کے فرش پر چلنے لگے جو اتنا شفاف تھا کہ وہ نیچے کی منزل میں جوئے خانے کی تمام سرگرمیاں دیکھ سکتے تھے۔

''یہ انتظامی منزل ہے۔'' ڈاکٹر پریرا نے بتایا۔ ''یہاں دفاتر اور آبزرویشن بوتھ ہیں۔''

''بوتھ؟'' بگ نے حیرت سے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ ہم یہاں کیمرے نہیں لگا سکتے۔'' کریب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے گاہک اسے پسند نہیں کریں گے لیکن ہمیں کھیل کی نگرانی بھی کرنی ہے تاکہ کسی قسم کی بے ایمانی نہ ہو۔ لہٰذا یہ شیشے کا فرش لگایا گیا ہے جو نیچے سے ایک آئینے کی چھت کی طرح نظر آتا ہے اور ان بوتھ میں ہم نے اپنے بھروسے کے آبزرور بٹھائے ہیں۔ بیری بھی ان میں سے ایک تھا۔'' اس نے راہداری کے آخری سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ''یہ مرکزی بوتھ ہے۔ جوئے کی میز کے بالکل اوپر۔''

وہ وہاں چلے گئے۔ بگ نے دیکھا کہ بوتھ کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اسے باہر کی طرف سے توڑا گیا تھا۔ ''یہاں کا ہر کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔'' مارکوس نے کہا۔ ''اسی لیے کلب، کیسینو یا دوسرے کمروں میں کوئی آواز نہیں سنی گئی۔''

''دروازے میں اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی جب بیری کی شفٹ ختم ہونے پر ڈیوڈ ڈیوٹی پر آیا تو انہیں یہ دروازہ توڑنا پڑا۔''

''انہیں......؟''

''جب بار بار دستک دینے پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو ڈیوڈ نے فون کر کے دو سیکیورٹی گارڈ بلائے اور بالآخر انہیں دروازہ توڑنا پڑا۔'' کریب نے وضاحت کی۔

بگ نے بوتھ کے اندر دیکھا۔ وہ ایک شیشے کے پنجرے کے مانند تھا۔ عقبی دیوار کے علاوہ جہاں دروازہ لگا ہوا تھا دوسری تمام دیواریں شفاف تھیں اور جب باہر سے دیکھا جائے تو آئینے کی طرح لگتی تھیں۔ وہاں ایک کرسی الٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کنٹرول پینل تھا جس پر سیاہ بٹن، مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر نصب تھا۔ شیشے کے فرش پر اس کے پرانے کلاس فیلو بیری کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس کے گرد خون کا تالاب بن گیا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس لیے فوری طور پر خون نکلنے کی جگہ معلوم نہ ہو سکی لیکن قریب سے معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے پیٹ کے دائیں جانب زخم آیا ہے۔

''تم نے کہا کہ جب اس کی لاش دریافت ہوئی تو

دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی تھی۔

''ہاں۔'' کریب نے جواب دیا۔

بگ نے چاروں طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں دروازے پر جم گئیں۔ لکڑی کا مضبوط دروازہ اوپر والے قبضے پر جھول رہا تھا۔

''چٹخنی پر تھوڑا سا خون نظر آرہا ہے۔ کیا تم میں سے کسی نے اس پر توجہ دی؟''

کریب کچھ الجھا ہوا نظر آنے لگا۔

''کیا کسی نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا؟'' بگ نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے لاش کا معائنہ کیا تھا۔'' پریریا نے کہا۔

''اس جگہ کئی خون آلود قدموں کے نشانات ہیں۔'' بگ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ جب تمہارے آدمی بوتھ میں داخل ہوئے تو یہاں کوئی نہیں تھا؟''

''ہاں، انہوں نے یہی بتایا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہے؟''

''یہ شیشے کا بنا ہوا بوتھ ہے۔ یہاں خفیہ راستہ کس طرح ہوسکتا ہے؟'' انجینئر بولا۔

''ڈیوڈ اور تمہارے دونوں سیکیورٹی گارڈ جنہوں نے دروازہ توڑا، کیا وہ ایک ہی وقت میں آئے تھے اور انہیں یہاں پہلے سے کوئی نظر نہیں آیا؟''

''ہاں جہاں تک میں جانتا ہوں۔''

''یعنی تمہیں بھی پورا یقین نہیں ہے۔'' بگ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ہر شخص سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کریب نے کہا۔ ''اس کے علاوہ کوئی اور بات؟''

بگ نے ڈاکٹر پریریا سے پوچھا۔ ''موت کا وقت؟''

''میں پیتھالوجسٹ تو نہیں ہوں لیکن اسے مرے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔ جسم کے درجۂ حرارت سے مزید معلوم ہوسکتا ہے لیکن یہاں کوئی تھرمامیٹر نہیں ہے۔''

''آخری بار اسے کس وقت زندہ دیکھا گیا؟''

اس کا جواب مارکوس نے دیا۔ ''پچھلی شفٹ کے آبزرور نے جس کی ڈیوٹی نو بجے ختم ہوتی تھی۔''

''اس کے بعد؟ کسی نے نہیں؟''

مارکوس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کیسینو میں موجود ہمارے محافظوں نے جنہیں باؤنسر کہا جاتا ہے، نصف شب کے قریب اس کی آواز سنی تھی۔ وہ انہیں لڑکیوں کے ایک گروپ کے بارے میں ہوشیار کررہا تھا جو جوئے کی میز کے قریب کچھ غلط حرکتیں کررہی تھیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اس آبزرور اور باؤنسرز کو میرے پاس بھیج دو۔''

ایک بار پھر بگ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ دروازے میں ایک تالا بھی ہے۔ اگر کسی کے پاس چابی ہوتو کیا اسے باہر سے مقفل کیا جاسکتا ہے؟''

''ہاں۔''

''لیکن یہ مقفل نہیں تھا۔ قتل کی اطلاع ملنے کے بعد تم نے کیا کارروائی کی؟''

''پورے فلور کی مکمل تلاشی لی گئی۔'' مارکوس نے کہا۔ ''تمام دوسرے بوتھ اور دفتر دیکھا گیا لیکن کہیں بھی کوئی ہتھیار نہیں ملا۔''

''کمرا اندر سے مقفل تھا۔ کوئی ہتھیار نہیں ملا اور ایک آدمی قتل ہوگیا۔'' بگ نے اپنی بھویں اٹھائیں اور بولٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ پیتل کا بنا ہوا ہے۔ اگر لوہے یا فولاد کا ہوتا تو میں مقناطیس کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ بہرحال۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''کہیں اور چلتے ہیں۔''

رات کے تین بجے بگ نے منیجر کے کمرے میں اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔ وہاں دو کرسیاں، ایک صوفہ، ایک کافی ٹیبل اور ایسپریسو مشین بھی تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر پریریا کی باری آئی۔

''تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟'' بگ نے پوچھا۔

''ہاں، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پیتھالوجسٹ نہیں بلکہ کارڈیالوجسٹ ہوں لیکن سب کچھ بہت واضح تھا۔''

''موت کی وجہ؟''

''اس کے پیٹ میں چاقو گھونپا گیا تھا۔''

بگ کچھ بے چین نظر آنے لگا۔ ''کیا واقعی تم نے پڑھ کر میڈیکل کی ڈگری حاصل کی ہے یا تمہارے باپ نے خرید کردی تھی؟''

پریریا نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کیں پھر بولا۔ ''خون کی مقدار اور اس کے پیٹ کے دائیں حصے میں لگنے والے زخم کی پوزیشن کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے جگر کی شریان منقطع ہوگئی ہے۔ اس طرح کے زخم میں بہت زیادہ خون بہتا ہے اور بہت جلدی موت واقع ہوجاتی ہے۔''

''فوراً ہی؟''

''نہیں، اس میں چند منٹ لگ سکتے ہیں۔''

''اگر اس کے پاس چند منٹ بلکہ کچھ سیکنڈ بھی تھے تو اس نے مدد کے لیے کیوں نہیں بلایا؟''

ڈاکٹر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اس نے کسی کو بلایا ہو لیکن سارے بوتھ ساؤنڈ پروف ہیں۔''

''وہ اپنا سیل فون استعمال کرسکتا تھا؟''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بوتھ میں سیل فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ جگہیں کیمرا فری ہیں۔ ہر آبزرور کو ڈیوٹی شروع ہونے سے پہلے اپنا سیل فون سیکیورٹی والوں کے پاس رکھوانا ہوتا ہے۔''

''لیکن میں نے وہاں ایک مائیکروفون اور اسپیکر بھی دیکھا ہے بلکہ اس پر تھوڑا سا خون بھی لگا ہوا تھا۔''

''ہاں اور اس نے نصف شب کے قریب اسے استعمال بھی کیا۔ مارکوس نے تمہیں بتایا تو تھا۔''

''گویا نصف شب کے بعد کسی وقت اس نے کام کرنا چھوڑ دیا اور اسی لیے وہ کسی کو مدد کے لیے نہیں بلاسکا۔''

''شاید۔''

بگ نے گلا صاف کرتے ہوئے۔ ''کیا تم کسی ایسے شخص کو بلا سکتے ہو جو یہ تصدیق کرسکے کہ مائیکروفون اور اسپیکر صحیح حالت میں ہیں؟''

''ہاں۔''

واقعی وہ یونٹ کام نہیں کررہا تھا۔ اس کے پینل کے نیچے کچھ تار نکلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے بوتھ میں بیٹھے شخص کے لیے دوسرے لوگوں سے رابطہ کرنا ممکن نہ رہا۔ اس کے بعد بگ نے آبزرور ڈیوڈ اور دونوں سیکیورٹی گارڈز جورجی اور جوسی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ہر ایک سے الگ الگ انٹرویو کیا لیکن ان کے بیانات تقریباً ملتے جلتے تھے۔

ڈیوڈ ایک پچیس سالہ سیاہ فام شخص تھا۔ اس نے بتایا۔ ''ہماری شفٹ چار گھنٹے کی ہوتی ہے۔ بیری نے سیمونیکل سے نو بجے چارج لیا پھر ایک بجے میں آیا۔ کیونکہ بوتھ ساؤنڈ پروف ہے۔ اس لیے ہم اپنی آمد کی اطلاع دروازے کے ساتھ لگے ہوئے بٹن کو دبا کر دیتے ہیں۔ جو بزر کا کام کرتا ہے۔ اس طرح اندر بیٹھے ہوئے آبزرور کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا متبادل آگیا ہے۔

''میں نے بٹن دبایا لیکن اس نے میرے لیے دروازہ نہیں کھولا۔ دوبارہ بٹن دبانے پر بھی کچھ نہیں ہوا تو میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے پھر میں نے دروازے کی ناب گھمانے کی کوشش کی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ اندر سے بند تھا چنانچہ میں منیجر کے کمرے میں آیا اور سیکیورٹی والوں کو فون کرکے بلایا۔''

''کیا اس وقت منیجر کے کمرے میں کوئی تھا؟''

''نہیں، یہ عموماً رات کے وقت خالی ہوتا ہے۔ سیکیورٹی والوں نے ریڈیو سسٹم کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی پھر جورجی اور جوسی اوپر آئے اور ہم تینوں نے مل کر دروازہ توڑ دیا اور پھر ہم نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔''

''کیا وہ مرچکا تھا؟''

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔''

''تم میں سے کسی نے اس کی لاش کو ہاتھ لگایا؟''

''نہیں۔''

''کیا وہاں کوئی چاقو نظر آیا؟''

''نہیں۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''ہم نے ڈاکٹر پریریا کو بلایا کیونکہ اس وقت وہی یہاں کا انچارج تھا۔ اس نے پورے فلور کی تلاشی لینے کا حکم دیا اور کہا کہ اس واقعے کی اطلاع نیچے کیسینو میں موجود لوگوں کو نہیں ہونی چاہیے۔''

اس کے بعد بگ نے اس شخص کو بلایا جس نے آدھی رات کو بیری سے بات کی تھی۔ وہ ایک طویل قامت گنجے سر اور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس پر جگہ جگہ باؤنسر لکھا ہوا تھا۔

''مسٹر فونیکا۔'' بگ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ تم آخری شخص تھے جس کا بیری سے رابطہ ہوا؟''

فونیکا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس نے بوتھ سے تمہیں مخاطب کیا تھا؟''

''یہی طریقہ ہے جب آبزرور کوئی غلط بات دیکھتا ہے تو وہ ہمیں بتاتا ہے تاکہ اس کا سدباب کیا جائے۔''

''اس نے کیا غلط بات دیکھی تھی؟''

''لڑکیوں کا ایک گروپ جوئے کی میز کے پاس کھڑا

PakiBooks.Site

ہو صحیح یا غلط کی شرطیں لگا رہا تھا۔"
"معاف کرنا۔ مجھے اس معاملے میں کچھ معلوم نہیں۔"
فونیکا مسکرایا اور اس نے اس کھیل کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ "اس میں ہر کھیلنے والے کو دو پانسے پھینکنے ہوتے ہیں۔ اس پر لوگ شرط لگاتے ہیں کہ پانسا گرنے کے بعد کس نمبر کو ظاہر کرے گا۔ صحیح شرط وہ ہوتی ہے جب پانسا پھینکنے والا اپنے مطلوبہ نمبر حاصل کرے جبکہ غلط شرط اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ہوشیار کھلاڑی اپنے ذہن میں صحیح عدد رکھ کر کسی کوشش کے بغیر جیت سکتا ہے۔"
"یعنی کچھ ہوشیار لڑکیاں حساب کتاب کر کے دوسرے کھلاڑیوں کی رقم پر ہاتھ صاف کر رہی تھیں جو کیسینو کو ملنی چاہیے تھی۔"
فونیکا نے تائید میں سر ہلا دیا۔
"اور پھر بیری نے تمہیں ہوشیار کر دیا۔"
"ہاں، وہ کچھ کر رہی تھیں۔ وہ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ بلندی سے انہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ بیری نے یہ دیکھنے کے بعد مجھے بتادیا۔"
"کیا وہ ٹھیک لگ رہا تھا؟ میرا مطلب ہے صحت مند یا پریشان؟"
"وہ ہمیشہ کی طرح چہک رہا تھا۔"
"اور وہ لڑکیاں...... ان کے بارے میں کیا کہو گے؟"
"میں کچھ سمجھا نہیں۔"
"کیا وہ خوب صورت تھیں؟ ہنسی مذاق کر رہی تھیں؟ کیا وہ دیکھنے میں پیشہ ور جواری لگ رہی تھیں؟"
فونیکا مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں وہ خوب صورت تھیں۔ ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں لیکن پیشہ ور جواری نہیں تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ ان کے لیے ایک مذاق ہے۔"
"جب تم نے انہیں پکڑا تو ان کا ردِعمل کیا تھا؟"
"پہلے تو وہ تھوڑی سی خوف زدہ ہوئیں لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ میں نے ان سے جانے کے لیے کہا اور وہ خاموشی سے چلی گئیں۔"
"وہ ناراض یا غصے میں تو نہیں لگ رہی تھیں؟"
فونیکا لمحہ بھر خاموش رہا پھر اس نے اپنی طرف سے ایک سوال کر دیا۔ "کیا تمہارے خیال میں ایسا ہوسکتا ہے......؟"
بگ نے کندھے اچکا دیے اور بولا۔ "جب تم نے انہیں کھیلنے سے روکا، اس کے فوراً بعد ہی بیری کی موت واقع ہوگئی۔ کیا یہ قتل کا محرک ہوسکتا ہے؟"
"لیکن انہیں آبزرویشن بوتھ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"
بگ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔ "کیا تم ان کا حلیہ بتا سکتے ہو؟"
فونیکا نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد کہا۔ "ان میں ایک ایشیائی تھی۔ چھوٹے قد کی تھوڑی سی موٹی، کندھوں تک سرخ رنگے ہوئے بال، اس نے چمڑے کی جیکٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ دیکھنے میں ہی شرارتی لگ رہی تھی۔ دوسری کا قد لمبا، سنہرے بال، بادامی آنکھیں اور پتلی ناک۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ تیسری کے سیاہ بال، درمیانہ قد، سانولی رنگت، سیاہ آنکھیں اور اس نے زرد لباس پر فر کا کوٹ پہن رکھا تھا۔"
"ان کی عمر کیا ہوگی؟"
"وہ تینوں نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ان کی عمر بیس کے لگ بھگ ہوگی۔"
"ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارے اور بیری کے درمیان اس ریڈیو کے ذریعے گفتگو ہوئی تھی؟" بگ نے اس کے کان میں لگے ہوئے ائرپیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔"
"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت تمہارے چاروں مالکان کہاں تھے؟"
"ان میں سے تین عمارت میں موجود نہیں تھے۔ البتہ ڈاکٹر پریا، نائٹ منیجر کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اس نے اپنا زیادہ وقت بار میں گزارا۔ باقی تینوں کو بعد میں اطلاع دی گئی۔"
"بار میں؟ تمہارا مطلب ہے کہ اس نے یہ دفتر استعمال نہیں کیا؟"
"نہیں جناب۔ یہ دفتر زیادہ تر دن میں ہمارے منیجر مسٹر کارنیر وحساب کتاب اور دیگر دفتری امور کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر رات میں نہیں آتے اور ان کی جگہ مالکان باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ! اب تم جاسکتے ہو۔"
اس کے بعد بگ کی آبزرور سیموئل سے بات ہوئی جس نے پانچ سے نو کی شفٹ میں ڈیوٹی کی تھی۔ اس کی عمر تیس سال، بھورے بال اور نیلی آنکھیں تھیں۔ اس نے

[illegible] اپنے وقت پر آگیا تھا اور ہمیشہ کی طرح چاق چوبند اور خوش مزاج لگ رہا تھا۔
"کیا تم نے اپنی شفٹ کے دوران باؤنسرز سے [illegible]؟" بگ نے پوچھا۔
"ہاں، تقریباً ساڑھے سات بجے جب میں نے ایک شخص کو تاش کے کھیل میں گڑبڑ کرتے دیکھا تو فوراً ہی انہیں ہوشیار کر دیا۔"
"پھر کیا ہوا؟"
"وہ اسے باہر چھوڑ آئے۔"
"تم بیری کو کتنا جانتے تھے؟ کیا وہ تمہیں پسند تھا؟"
سیموئل نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "یہاں بہت کم لوگ اسے ٹھیک طرح جانتے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ [illegible] میں نظر آتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا اور دوسروں کی بات [illegible] سنتا تھا۔"
سیموئل سے فارغ ہونے کے بعد بگ نے چاروں [illegible] کو دوبارہ بلالیا۔ کریب بہت بے چین تھا۔ اس نے [illegible] کہا۔ "تم جانتے ہو یہ کیسے ہوا؟ قاتل کون ہے؟"
"یہ نظر آرہا ہے کہ قتل کیسے ہوا لیکن قاتل تک پہنچنے [illegible] اس کا محرک تلاش کرنا ہوگا۔"
ایلڈرمین بہت دل شکستہ تھا۔
"[illegible] شخص نے کیا ہے جس کی اس فلور تک رسائی [illegible] یہ جاننا ضروری ہے کہ اس نے یہ قتل کیوں کیا؟"
"یہ کوئی عدالت نہیں ہے۔" پریا نے کہا۔ "تم [illegible] سب سے زیادہ ممکنہ شخص کا نام بتاؤ، اس سے ہم خود معلوم کرلیں گے۔"
"تم واقعی ایک ڈاکٹر کی طرح بول رہے ہو۔" بگ [illegible] کہا۔ "میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو [illegible]۔ ہمیں اس قتل کا محرک تلاش کرنا ہو[illegible]۔"
"اب کیا کیا جائے؟" مارکوس نے کہا۔
"مجھے یقین ہے کہ بیری کا سیل فون تمہارے سیکیورٹی اسٹاف کے اسٹور میں ہوگا۔ ہمیں اس سے کوئی سراغ مل سکتا ہے۔"
ان چاروں کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ کوئی بات انہیں پریشان کر رہی تھی۔ بگ نے اس کا نوٹس لیا اور [illegible] بولا۔ "لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ [illegible] میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہمارے لیے کارآمد ہوگا یا نہیں۔"
کریب دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "میں چیک کرلوں گا۔"
"اسے یہیں لے آؤ۔ اگر اس میں پاس ورڈ لگا ہو[illegible] ہے تب بھی ہمیں سب کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔"
کریب کے جانے کے بعد بگ، مارکوس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تم ایک مقامی اخبار کے مالک ہونے کے علاوہ اس کلب اور جوئے خانے کے پارٹنر بھی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم اس شہر میں ہونے والی کسی برائی کے بارے میں نہ جانتے ہو یا تمہیں اس کا اندازہ نہ ہو۔"
"میں نہیں جانتا۔"
"بیری یہاں کیوں کام کر رہا تھا۔ ایک چالیس سالہ کارمیکینک اس غیرقانونی جوئے خانے کی سیکیورٹی ٹیم کا ممبر کیسے بن گیا جبکہ اس سے پندرہ بیس سال کم عمر کے لڑکے بھی یہی کام کر رہے ہیں۔"
ڈاکٹر، ایلڈرمین اور پبلشر خاموش تھے لیکن ان کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔
"اوکے، جب تک تم سوچو۔ میں ایک اور سوال کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ جج اباد لی جیسے بوڑھے یہاں کیا کر رہے ہیں؟"
"تم جانتے ہو کہ لوگوں کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کتنی مختلف ہوتی ہے۔"
"ہاں، ہم سب کا یہی حال ہے۔" بگ نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ "لیکن وہ یہاں غیرمتعلق لگ رہا تھا۔ اس نے جوا نہیں کھیلا اور وہ اورنج جوس پی رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہاں زیادہ نہیں آتا۔"
"حقیقت تو یہ ہے کہ وہ باقاعدگی سے آتا ہے۔" ایلڈرمین نے کہا۔
"لیکن وہ لوگوں کو نظر نہیں آتا۔"
"نہیں۔" پبلشر نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس چند پرائیویٹ روم بھی ہیں۔"
"کیا وہ اب بھی نیچے موجود ہے؟"
ایلڈرمین اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوار میں نصب فون تک گیا اور ایک نمبر ڈائل کر کے کسی سے بات کی اور بولا۔ "وہ دو بجے کے قریب چلا گیا تھا۔"
"معلوم کرو کہ وہ کب آیا تھا؟"
چند لمحوں بعد ایلڈرمین نے فون رکھ دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس نے ایک بجے سے کچھ دیر پہلے

PakiBooks.Site

اور نج جوس کا آرڈر دیا تھا۔"

"بیری کی شفٹ ایک بجے ختم ہوتی تھی۔" بگ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

مارکوس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "بیری ایک سپلائر تھا۔ وہ لوگوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں مہیا کرتا جن میں اسمگل شدہ غیر ملکی شراب، الیکٹرونکس کا سامان اور ملبوسات شامل ہیں۔"

"اور اسی وجہ سے وہ یہاں آبزرور کے طور پر بھی کام کر رہا تھا؟"

"ہم نے اسے یہ سہولت دے رکھی تھی کہ وہ چار گھنٹے کی شفٹ کے بعد اپنا کاروبار کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر پریریا نے کہا۔ "اس مقصد کے لیے وہ ایک پرائیویٹ روم کو اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ اس ناجائز کاروبار کی کشش لوگوں کو کیسینو آنے پر مجبور کرتی ہوگی۔" بگ نے کہا۔ "اور تم اس کے کاروبار میں سے اپنا کمیشن بھی وصول کرتے ہو گے۔"

مارکوس کا منہ بن گیا۔ بگ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی شفٹ ایک بجے ختم ہوتی تھی۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ اس کے بعد ہی وہ اپنے گاہکوں سے ملتا ہوگا۔ جج اس سے پرائیویٹ میٹنگ کرنے کے لیے ایک بجے آیا اور ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد چلا گیا۔ بیری اس کے لیے کس قسم کی اشیا کا انتظام کرتا تھا؟ کیا موزے؟"

ان چاروں نے ایک بار پھر نظریں ملائیں پھر پریریا آہستہ سے بولا۔ "لڑکے۔"

بگ نے کہا۔ "مجھے یاد ہے کہ میں نے اسکول میں ہم جنس پرستی کے بارے میں افواہیں سنی تھیں لیکن میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا....."

"اوہ نہیں۔" پبلشر نے جلدی سے کہا۔ "کم عمر نہیں بلکہ انیس بیس سال کے۔ بوڑھے جج کو نوجوان لڑکے پسند ہیں۔"

"اس میں کیا مضائقہ ہے؟" ایلڈرمین نے کہا۔ "آج کل تو لوگ کھلم کھلا ہم جنس پرستی کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ سیاست داں بھی۔"

"لیکن یہ بڑی نامناسب بات ہے اگر وہ اس رفاقت کا معاوضہ ادا کر رہا ہے اور ایک جج کے لیے تو یہ بالکل ہی ناموزوں ہے جو ہمیشہ اخلاقیات اور قانون کی بالادستی کا دفاع کرتا رہا ہو۔"

"کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ جج نے بیری کو قتل کیا ہے؟" ایلڈرمین نے کہا۔

"میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ بیری کی موت پہلے سے طے شدہ حملے کی وجہ سے ہوئی۔ اس طرح کا حملہ کسی کے کہنے پر کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں حملہ آور سے زیادہ اس کا حکم دینے والے کی شناخت زیادہ اہم ہے۔"

"اگر اس قتل کے پیچھے جج کا ہاتھ ہے۔" پریریا نے اعتراض کیا۔ "تو وہ اس وقت یہاں کیوں ہوتا؟"

"تاکہ اس پر کسی کو شک نہ ہو۔"

ایلڈرمین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں مانتا۔ اگر ہم پولیس کو اطلاع کرتے تو وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح پکڑا جاتا۔"

بگ نے کہا۔ "وہ جانتا تھا کہ کسی میں پولیس کو بلانے کی ہمت نہیں۔"

اسی وقت کریب مقتول کا فون لے کر آ گیا۔ بگ نے اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس ورڈ کو امریکن ایف بی آئی بھی نہیں کھول سکتی لیکن اس سے کوئی نہ کوئی ثبوت مل ہی جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے وہ سیل فون اپنی جیب میں رکھ لیا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "اب میں کچھ دوسرے گواہوں سے بات کرنے اوپر کلب میں جا رہا ہوں۔"

"وہاں کون سے گواہ ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم، شاید کسی سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

اس نے سروس لفٹ استعمال کی اور تقریباً دس منٹ بعد کلب کے فلور پر پہنچا۔ اس کی نظریں ہجوم میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ سرخ بالوں والی ایشیائی لڑکی اسے مل گئی۔ اس نے پیچھے سے جا کر اس کا بازو پکڑ لیا، اس لڑکی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور بولی۔

"میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"کیا تم سیموئیل کی زندگی بچانا چاہتی ہو؟"

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا؟"

"تم سیموئیل کی دوست ہو؟ اس کی کلاس فیلو؟"

"نہیں۔"

"شاید اس نے تمہیں اور دوسری لڑکیوں کو بتا دیا تھا کہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیں۔ حالانکہ اس نے ہی تمہیں اس جگہ کے بارے میں بتایا اور یہاں آ کر کھیلنے کے لیے کہا۔ لیکن اب یہ بھید کسی وقت بھی کھل سکتا ہے اور وہ

بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو جائے گا۔ کیا تم میری بات سمجھ رہی ہو؟"

"ہاں سمجھ رہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔" بگ نے بیری کا فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اسے سنبھال کر رکھنا۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تمہارے پاس ہے اور نہ ہی اسے کھولنا۔ سیموئیل شاید تمہارے پاس آ کر اس کے بارے میں پوچھے تو یہ اسے دے دینا۔ اگر وہ نہیں آتا تو پندرہ دن انتظار کر لینا۔ کیا تم یہ کام کر سکتی ہو؟ ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد بگ نے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔ پھر وہ واپس ان چاروں کے پاس آ گیا۔ وہ اس وقت بیری کے بوتھ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں چھ کرسیاں ایک دائرے کی شکل میں لگا دی گئی تھیں۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" ایلڈرمین نے کہا۔

"خاموش ہو جاؤ سلنگر۔" بگ نے کہا۔ "میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس پورے معاملے کی چابی اس قتل کا محرک ہے۔ جیسے ہی وہ یہاں آئے گا ہم اپنی کارروائی شروع کر دیں گے۔"

"لیکن کون؟"

گھنٹی کی آواز سنائی دی اور کریب دروازہ کھولنے گیا۔ وہاں باؤنسر فونیکا اور ریٹائرڈ جج رینالڈو ابادیلی کھڑے ہوئے تھے۔

"میں نے جج سے آنے کے لیے کہا تھا اور فونیکا کو ہدایت کر دی تھی کہ جیسے ہی وہ یہاں پہنچے۔ اسے عزت و احترام کے ساتھ اوپر لے آئے۔"

ابادیلی اندر داخل ہوا اس کے پیچھے فونیکا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر مجھے اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ اس کے پاس سے برآمد ہوا ہے۔"

"گڈ۔" بگ نے جواب دیا۔ "اب تم باہر جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد بگ نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے وہ فائلیں دیکھ لی ہوں گی جو میں نے بھیجی تھیں۔"

جج کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ہاں۔"

بگ نے چاروں طرف دیکھا اور باقی لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ میں نے بتایا تھا کہ یہ قتل ایسے ہوا لیکن وہ پورا سچ نہیں تھا۔ اب میں پوری بات

پہلا

"ڈاکٹر صاحب! ذرا آرام سے..... یہ میرا پہلا آپریشن ہے۔" مریض نے گھگیا کر التجا کی۔

"فکر نہ کرو!" سرجن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں پوری احتیاط کروں گا..... یہ میرا بھی پہلا آپریشن ہے۔"

☆☆☆

انڈے

سردار جسونت سنگھ دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کرپا سنگھ نے دور سے دیکھا تو اسے بڑا ترس آیا۔ قریب جا کر پوچھا۔ "بھایا جی! اتنا کیوں رو رہے ہو، کیا ہو گیا؟"

"میری مرغی مر گئی!" جسونت سنگھ نے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتایا۔

کرپا سنگھ نے حیرت سے کہا۔ "تو اس میں اتنا غم کرنے کی کیا بات ہے۔ اتنا تو میں تب نہیں رویا تھا جب میرے باپو جی مرے تھے۔"

جسونت سنگھ نے روتے روتے غصے سے بھڑک کر کہا۔ "تیرے باپو جی انڈے تو نہیں دیتے تھے نا!"

تھرپارکر سے موہن سنگھ کا تعاون

بتاتا ہوں ہوا۔ یوں کہ کوئی شخص بیری سے بوتھ کے دروازے پر ملا اور آناً فاناً اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ کر اسے اندر دھکیل دیا۔ مقتول نے مزید حملوں سے بچنے کے لیے دروازہ اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی لیکن پہلا زخم ہی اتنا مہلک تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ چٹخنی پر لگا ہوا خون دیکھ کر ہی میں یہ بات سمجھ گیا تھا۔ اس کے بعد قاتل چاقو سمیت وہاں سے چلا گیا جو اس نے باہر جا کر کہیں پھینک دیا۔"

سب خاموشی سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"اب تم جاننا چاہو گے کہ قاتل کون تھا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ اسی فلور کا کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ اس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ گھنٹی کا بٹن دبائے اور دروازہ کھلنے پر حملہ کر دے۔ کئی ایک پر شبہ کیا

PakBooks.Site

جاسکتا ہے لیکن نہیں۔" اس نے مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیری نے مدد کے لیے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن سسٹم کام نہیں کر رہا تھا۔"

کریب اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ سیموئیل تھا۔"

"بیٹھ جاؤ۔ ہاں وہی تھا۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھا کہ قاتل کو یہ اطمینان ہو جائے کہ بیری کو کوئی مدد نہیں ملے گی اور باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے جرم سرزد ہونے سے پہلے ریڈیو کو ناکارہ بنا دیا جائے۔ بیری کو معلوم نہیں تھا کہ سسٹم کام نہیں کر رہا ہے۔ خون کے دھبے ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیری کے آنے سے پہلے ہی سسٹم کو نقصان پہنچ چکا تھا۔"

اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "سیموئیل نے بیری کے آنے سے پہلے سسٹم کے تار نکال دیے تھے۔ اس سے پہلے وہ صحیح کام کر رہا تھا۔ سیموئیل نے مجھے خود بتایا کہ اس نے اپنی شفٹ کے دوران اس سسٹم کو استعمال کیا تھا۔"

"ہم کیسے یقین کر لیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ بیری نے بارہ بجے سیکیورٹی والوں سے بات کی تھی۔ اگر سسٹم خراب تھا تو اس نے اسے کیسے استعمال کر لیا؟" مارکوس نے کہا۔

"وہ بیری نہیں بلکہ سیموئیل تھا۔ اس نے کسی دوسری جگہ سے بیری کی آواز کی نقل بنا کر سیکیورٹی والوں کو ان لڑکیوں کے بارے میں بتایا۔"

"فونیکا کا کہنا ہے کہ وہ لڑکیاں ایسی جگہ کھڑی ہوئی تھیں جو صرف اس بوتھ سے صاف نظر آتی ہے۔" ایلڈرمین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"سیموئیل اسی بوتھ میں ڈیوٹی دے چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دوستوں کو کہاں کھڑا ہونا ہے۔ وہ وہی کچھ کر رہی تھیں جو اس نے انہیں بتایا تھا۔"

"اس کی دوست؟" کریب نے پوچھا۔

"وہ بھی سینٹ تھامس میں پڑھتی ہیں۔" بگ نے وضاحت کی۔ "سیموئیل نے انہیں اپنے کام کے بارے میں بتایا اور یہاں آنے کی دعوت دی۔ ان میں سے کچھ اس کی اور کچھ اس کے بھائی پال کی کلاس فیلو ہیں۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی بھی سینٹ تھامس میں پڑھتا ہے۔" اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اس قتل کا محرک معلوم کرنا ہے۔"

سب لوگوں کی نظریں جج کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر مارکوس نے کہا۔ "کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ جج نے بیری کو قتل کرنے کے لیے سیموئیل کی خدمات حاصل کی تھیں؟"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ شاید بیری سیلائر سے ترقی کر کے بلیک میلر بن رہا تھا یا شاید جج نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اپنے تمام برے کاموں کے ثبوت ضائع کر دے گا لیکن جب کریب کو بیری کا فون بیچ سالم ملا تو یہ نظریہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اس بات کو عقل تسلیم نہیں کرتی کہ کوئی شخص بلیک میلر کو قتل کرنے کے لیے کسی کی خدمات حاصل کرے اور اس کی فون کالز کا ریکارڈ محفوظ رہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب سیموئیل کی شفٹ ختم ہوئی اور وہ باہر جانے سے پہلے اپنا فون لینے گیا تو وہ بیری کا فون چرانے یا اسے ضائع کرنے کا کوئی راستہ نکال سکتا تھا۔"

"ہاں۔" فونیکا نے کہا۔ "ہم اس پر تو نظر رکھتے ہیں کہ کوئی شخص فون سمیت بوتھ میں داخل نہ ہو لیکن عمارت سے باہر جاتے وقت اس کی کوئی چیکنگ نہیں ہوتی۔"

"جب میری بیری کے فون تک رسائی ہوئی تو میں وہ سب کچھ جان گیا جس کی مجھے ضرورت تھی اور اس طرح مجھے قتل کے محرک کے بارے میں پتا چل گیا۔" بگ نے کہا۔ "اس کا بلیک میلنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز تھی۔ حفاظتی اقدام کی طرح۔"

"کیا؟" کریب کے منہ سے نکلا۔

"ریکارڈ سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ بیری، سیموئیل کے چھوٹے بھائی پال کو تیار کر رہا تھا تاکہ اسے جج کی خدمت میں پیش کر سکے۔ ظاہر ہے کہ سیموئیل کو اس پر اعتراض تھا۔"

ابادیلی نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور برہمی سے بولا۔ "میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔"

"چپ ہو جاؤ۔" بگ نفرت سے چلاتے ہوئے بولا۔ "گزشتہ پچاس برس کے دوران اس شہر میں رہنے والا ہر شخص تمہارے بارے میں یہ افواہ سنتا آرہا ہے کہ تم لڑکوں کو خریدتے ہو اور ان کی زندگی برباد کر دیتے ہو۔ تقریباً سبھی لوگ یہ سن کر ہنستے اور یہی سوچتے کہ یہ عداوت، بدخواہی یا کوئی بے ہودہ مذاق ہے۔ جب تک ہم میں سے چند لوگوں کو اس حقیقت کا پتا نہ چل گیا۔ اگر تم اپنے آپ کو ہم جنس پرستوں تک محدود رکھتے تو یہ ایک عام سی بات ہوتی لیکن تمہاری ہوس بڑھتی جا رہی تھی اور تم وقتاً فوقتاً تازہ خون کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔"

"مجھے غصہ آرہا ہے۔" جج بولا۔

"سیموئیل کو بھی غصہ آیا تھا۔"

"لیکن فون میں تو پاس ورڈ لگا ہوا تھا۔" کریب نے کہا۔

بگ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اب ٹیکنالوجی بہت ترقی کر گئی ہے۔ یہ ماڈرن فون مالک کی انگلیوں کے نشان سے کھل جاتے ہیں۔"

"لیکن مالک تو مر چکا ہے۔" ایلڈرمین چلایا۔

"ہاں، اس کی لاش کولڈ اسٹوریج میں موجود ہے لہٰذا اس کے فنگر پرنٹ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں نے اس کا فون کھولنے کے بعد اس میں موجود تمام ای میلز، پیغامات اور ریکارڈ ایک دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا اور اس میں سے چند نمونے جج کو بھیج کر یہاں آنے کی دعوت دی۔ ان نمونوں کو دیکھنے کے بعد وہ مجبور ہو گیا کہ اتنی رات گئے ہم سے ملنے کے لیے آئے۔"

کریب کھانستے ہوئے بولا۔ "تم نے بیری کے فون سے کیا ڈیٹا کاپی کیا؟"

"بہت سی چیزوں کے ثبوت، اس جگہ کی موجودگی اور بیری کے کاروبار میں اس کا کردار بشمول منشیات، اسمگلنگ، عصمت فروشی، یہ سب وہ مواد ہے جسے اٹارنی کا دفتر ڈاؤن لوڈ کرنا پسند کرے گا۔ اگر تمہارا گھناؤنا اور ناجائز کاروبار سرکار کے علم میں آگیا تو تم کہاں کھڑے ہو گے۔ شاید تم پانچوں اس شہر میں سب کچھ خرید سکتے ہو لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری جیبیں اتنی بڑی ہیں کہ حکومت سے معاملہ طے کر سکو۔"

مارکوس اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "اور بیری کا فون.....!"

"میں نے اسے سیموئیل تک پہنچانے کا انتظام کر دیا ہے۔"

"کیا؟" جج چلایا پھر بوتھ میں خاموشی چھا گئی۔

"اب تم سب شیشے کے فرش پر کھڑے ہو۔" بگ نے انہیں بتایا۔ "کوئی بھی شگاف، کھٹکا یا ضرب لگی تو تم لوگوں سمیت سب کچھ نیچے گر جائے گا لیکن اس کا ذمے دار میں یا سیموئیل نہیں بلکہ تم ہو گے۔ اب یہ ہتھوڑا تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ "تمام ڈیٹا ایک محفوظ اکاؤنٹ میں ہے اور جو لوگ اس تک رسائی کر سکتے ہیں۔

اصلی مجرم

انہیں تم نہیں جانتے۔ اگر مجھے یا سیموئیل کو کچھ ہوا یا اس کے بھائی کو دوبارہ ہراساں کیا گیا تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔"

"تم قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہو۔" کریب نے الزام لگایا۔ "اور جان بوجھ کر ایک قاتل کو آزاد چھوڑ رہے ہو۔"

"تم اسے سزا دے کر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہو۔ یہ تمہارا نہیں بلکہ عدالت کا کام ہے، اگر تم واقعی اسے سزا کا مستحق سمجھتے ہو تو پولیس کو اطلاع کر دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گے کیونکہ اس میں تمہاری اپنی گردن پھنستی ہے۔"

"بیری تمہارا دوست تھا۔" مارکوس نے کہا۔ "تمہیں اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔"

"وہ تیس سال پہلے میرا دوست تھا لیکن اب نہیں۔ میں کسی بے ایمان اور دلال کا دوست نہیں ہو سکتا۔ سیموئیل نے اسے قتل کر کے ایک برائی کا خاتمہ کیا۔ اسے اپنے بھائی کی زندگی کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے یہ جرم کرنا پڑا۔ ورنہ وہ بھی اس بوڑھے جج کی ہوس کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ اس لیے میں سیموئیل کو نہیں بلکہ اسے اصلی مجرم سمجھتا ہوں۔"

"وہ اس مواد کو منظرِ عام پر لا سکتا ہے۔" جج نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ اس کا استحقاق ہے۔" بگ مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میری اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ بہت ذمے دار لگتا ہے لیکن اگر تمہیں کوئی شک ہے تو تم اپنے اعشاریہ اڑتیس کے ریوالور کو استعمال کر کے اس پریشانی سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کریب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میرے لیے ٹیکسی منگوا دو۔"

اس کے بعد وہ تین دن شہر میں رہا۔ اس دوران اس نے اپنے والد کی عظیم الشان لائبریری کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے علاوہ اپنے پرانے مکان کو فروخت کرنے کے لیے ایک دلال سے بھی رابطہ کیا۔ تیسرے روز صبح وہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر اموات کے کالم پر گئی اور وہ چونک پڑا۔ "جج ابادیلی اپنی گن صاف کرتے ہوئے اتفاقاً گولی چلنے سے ہلاک ہو گیا۔" اس نے گہرا سانس لے کر اخبار میز پر رکھ دیا۔ ابادیلی کو اس کے کیے کی سزا مل گئی تھی۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

اڑتیسویں قسط

PakiBooks.Site

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہورنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپین تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مائی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پاراہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پاراہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی تیغی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرِ زمین چلے گئے تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرِ زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم بن مشہد اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے نکل پایا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ اب قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں، دھماکے اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پستی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آ چکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے آئی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اجنبی بن گیا تھا۔ سیف کے گھر اور تاجور تک رسائی کے بعد میں مطمئن تھا مگر تاجور کی شادی وراب فیملی میں طے پا چکی تھی۔ تاجور کی زندگی ادھوری تھی، میں اسے ساتھ لے آیا تھا مگر اچانک انیق کی آمد ہوئی، اس نے سیف کے حوالے سے غلط باتیں کر کے دل متنفر کر دیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں انیق کی اس حرکت پر مشتعل تھا۔ وہ بیاہ کے داراب ہاؤس جا چکی تھی۔ بالآخر ہم نے دشمن کا کھوج لگایا۔ وہ ہاناوانی کے کالے علم کی زد میں تھا۔ ہاناوانی اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ ہم سب سے لینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں انیق کا قتل کروایا۔ اب سجاول کی باری تھی۔ ہم پوری شدت سے ہاپاوانی کی تلاش میں تھے کیونکہ اس کی خون ریزیاں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرا سینہ جل رہا تھا۔ یہاں جو کچھ تاجور کے ساتھ ہوا تھا، وہ ہرگز ہرگز اس کے لائق نہیں تھی۔ وہ تو چاند گڑھی کی سترنگی فضاؤں کا ایک خوش رنگ پھول تھی اور اسے ایک حبس زدہ چار دیواری میں مرجھانے اور پتی پتی ہونے کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔

تاجور کو مارنے کی کوشش میں دارج اپنی وہیل چیئر سے گرا تھا۔ اس کی ناک سوج کر کپا ہو گئی تھی اور اس تبدیلی نے اس کی شکل کو کچھ اور بھی منحوس کر ڈالا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک خونخوار بھیڑیا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی والدہ اس واقعے کے بعد مسلسل اس کے اردگرد موجود تھی اور یقیناً اس نے اپنی بہو تاجور کی شامت لا رکھی ہوگی۔

تاجور کا یہ قصور کم نہیں تھا کہ اسے تھپڑ مارنے یا اس کے بال کھینچنے کی کوشش میں اس کا اپاہج بیٹا کرسی سے گرا ہے۔ اس نے کیوں نا اس طریقے سے بال کھنچوائے یا تھپڑ کھایا کہ دارج کرسی پر رہتا اور فرش پر نہ گرتا۔

اس رات کو دس بجے کے لگ بھگ پھر میرے موبائل کے ریسیور پر دارج کی چیخ چیخ سنائی دی۔ لگتا تھا کہ بال کی کھال اتارنا اس کی عادت ہے۔ اس خبیث نے بحث کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا، جہاں کل اس کے گرنے سے ٹوٹا تھا۔ اس نے پھر ملنگی ڈیرے والی کتھا چھیڑ دی تھی اور تاجور سے کہہ رہا تھا کہ وہاں اس شخص مائیکل نے اس کی جو تصویریں اتاری تھیں، وہ بے شمار لوگوں تک پہنچی ہیں۔ ان

تصویروں اور اس مضمون کی وجہ سے ان لوگوں نے لاکھوں پاؤنڈ کمائے ہیں۔ اب مزید لوگ بھی پاؤنڈ اور ڈالر کمانے کے لیے میری سوہنی بیوی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میرے لیے اور داراب فیملی کے لیے یہ کتنی بڑی 'عزت' کی بات ہے۔

اس کے جسم کے بہت سے اعضا حرکت نہیں کرتے تھے، شاید وہ یہ کسر اپنی زبان کو مسلسل حرکت دے کر پوری کر رہا تھا۔

اگلے روز دارج کی ناک کی ہڈی میں شدید درد شروع ہو گیا اور اسے فوراً اسپتال جانا پڑا۔ اس کی والدہ اور خود شکیل داراب بھی اس کے ساتھ اسپتال گئے۔ تاجور گھر پر ہی تھی۔ اس روز تاجور سے بات کرنے کا مجھے ایک زبردست موقع مل گیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔'' میں نے کہا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اندر آنے والی خود تاجور ہو گی۔ وہ ذرا لنگڑاتی ہوئی سی آئی اور بولی۔ ''کوئی اچھی آئنٹ مینٹ ہو گی یہاں؟''

''کیوں، کیا ہوا؟'' میں نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے پاؤں کی ایک انگلی نیلی ہو رہی تھی مگر کوئی کٹ وغیرہ نہیں تھا۔ ایسی چوٹ بغیر کسی ٹریٹ مینٹ کے بھی ٹھیک ہو جاتی ہے مگر شاید اس نے یہاں کمرے میں آنے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔

میں نے جلدی سے ڈریسنگ کا سامان نکالا، وہ بولی۔ ''نہیں، بس تھوڑی سی آئنٹ مینٹ دے دیں، میں خود ہی لگا لیتی ہوں۔''

شاید وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں علاج کے لیے بھی اس کے جسم کو چھوؤں۔ میں نے آئنٹ مینٹ، روئی اور میڈیکل ٹیپ وغیرہ اُسے دے دی۔ وہ اپنے پاؤں کو دوسری کرسی پر رکھ کر خود ہی انگلی کی ڈریسنگ کرنے لگی۔ شاید یہ چوٹ بھی کسی زبردستی کا نتیجہ ہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس بار شوہر کے بجائے شوہر کی ماں نے اسے یہ تکلیف پہنچائی ہو۔ لیکن پوچھنا بے کار تھا۔ اس نے کہاں بتانا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ اسی طرح ''سیڑھیوں'' سے گری تھی۔ اس ''گرنے'' پر میڈیا پر تبصرے بھی چل گئے تھے۔

میری نظر اس کے چہرے پر پڑی اور میں چونک گیا۔ بظاہر تو وہ اپنی انگلی کی طرف متوجہ تھی لیکن شدید جذباتی کیفیت میں تھی۔ آنکھوں کے کٹوروں میں وہی آنسو تھے جن سے میری جان پہچان بہت پرانی ہو چکی تھی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''پلیز شاہ زیب! اگر آپ کے دل میں میرے لیے تھوڑی بہت بھی جگہ ہے تو میں ہاتھ جوڑ کر آپ کی منت کرتی ہوں، آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میری مشکلوں کو اور نہ بڑھائیں۔ ورنہ میرے پاس مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہے گا۔''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم زندہ ہی کہاں ہو جو مرو گی۔ تم صرف زندہ نظر آتی ہو۔ کچھ رحم کرو اپنے آپ پر...... کچھ رحم کرو...... اپنے گھر والوں کی حالت دیکھو...... ان کی ذلت کو محسوس کرو۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کی بے چارگی پر نظر ڈالو۔ ان کے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے اور جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ بھی سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ کیوں لعنت نہیں بھیج دیتی ہو ایسی زندگی پر۔ کیوں ایک تھپڑ نہیں مارتی ہو اس کمینے کے منہ پر جس نے تمہیں زرخرید لونڈیوں سے بھی بری حالت میں پہنچایا ہوا ہے؟ لوگوں کے سامنے وہ حرام زادہ تمہیں آپ...... اور آیئے کہہ کر بلاتا ہے اور تنہائی میں تمہیں ایسی گندی گالیوں سے نوازتا ہے جن کو سن کر شیطان بھی شرمانے لگے......''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کیوں غلط اندازے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آپ کو...... آپ کو کوئی حق نہیں ایسی باتیں کرنے کا۔''

میں اسے کیسے بتاتا، میں غلط اندازے نہیں لگا رہا۔ میں اپنے کانوں سے وہ مغلظات سن رہا ہوں جو اس کے بیڈ روم میں گونجتے ہیں۔ میں ان دونوں کی خلوت کا ایک ایک لفظ سن رہا ہوں...... میں یہ سب نہیں کہہ سکا لیکن میں نے اتنا ضرور کہا کہ وہ بے حس ہوتی جا رہی ہے اور ایک روز یہ بے حسی اسے پستی کی انتہا میں گرا دے گی۔ وہ ایک ایسا پتھر ہو گی جو اپنے شوہر اور اپنے سسرالیوں کی ٹھوکروں سے گھر کی چار دیواری میں لڑھکتا پھرے گا اور کوئی اسے اٹھا کر ایک طرف رکھنے کی زحمت بھی نہیں کرے گا۔

تین چار منٹ کے اندر ہمارے درمیان دھیمی آواز میں نہایت تند و تیز گفتگو ہوئی۔ وہ سرتاپا ایک شوہر پرست بیوی نظر آ رہی تھی۔ جب میں نے کہا۔ ''طلاق لے لو اس حرام زادے سے۔'' اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے پورے جسم پر ہلکی سی لرزش تھی۔ میری طرف دیکھے بغیر ذرا لنگڑاتی ہوئی دروازے کی طرف

گئی، پھر رکی، مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''اگر آپ...... کل تک یہاں سے چلے نہیں گئے تو پھر امرا ہوا منہ دیکھیں گے۔''

اس نے یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا اور یہ ایسا لہجہ تھا جس کا ارتعاش میرے جسم سے گزر کر میری ہڈیوں کے گودے تک میں چلا گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ آج مجھ سے ہر بندھن توڑ گئی ہے...... ہر معمولی سے معمولی تعلق کو بھی ختم کر گئی ہے اور اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو واقعی یہاں اس چار دیواری میں کچھ بہت بُرا ہو جائے گا۔ میرے سینے میں آتش تھی اور وہ آنسو بن کر میری آنکھوں میں آنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے آنکھوں تک نہیں آنے دیا...... انیق کی موت پر بھی میں کہاں رویا تھا۔ آنسو ہی تو توانائی تھے۔ یہ پارا بن کر میرے جسم میں پھیل رہے تھے۔ مجھے زندگی اور موت سے بے پروا کر رہے تھے۔ اس گھڑی میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں مزید اس چار دیواری میں نہیں رہوں گا۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد دارج اسپتال سے واپس آ گیا۔ اس کی ناک کے ایکسرے وغیرہ ہوئے تھے اور ریڑھ کی ہڈی کا بھی عمومی معائنہ ہوا تھا۔ اس کا آپریشن اب ایک ہفتہ آگے چلا گیا تھا۔ دارج کے آنے کے بعد میں اس کا لباس تبدیل کروانے اس کے بیڈ روم میں گیا۔ اس کی دبنگ والدہ بھی وہیں پر موجود تھی۔ وہ فون پر کسی ہیوی ویٹ سیاست داں سے تند و تیز باتیں کر رہی تھی۔ اس کی اور دارج کی نظر بچا کر میں نے اپنا زخمی کیمرا اس کی جگہ سے اتار لیا۔

شام تک میں داراب ہاؤس سے نکل آیا۔ نکلنے سے پہلے ہی میں نے داؤد بھاؤ کو فون کر دیا تھا اور سعید کھوکھر کو بھی۔ میں نے سعید کھوکھر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب اپنی ڈیوٹی پر واپس آ سکتا ہے۔ اس کے باپ کی حالت بہتر تھی اور وہ خود بھی چاہتا تھا کہ بھانڈا پھوٹنے سے پہلے پہلے داراب ہاؤس میں پھر سے اپنی ڈیوٹی سنبھال لے۔

بعد از شام آٹھ بجے کے لگ بھگ میں اسی چھوٹے سے ہوٹل میں موجود تھا جہاں پہلوان حشمت اور فخر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بے قرار تھے کہ میں انہیں داراب ہاؤس میں گزارے ہوئے چار پانچ دنوں کی رُوداد سناؤں۔ میں نے مختصراً دونوں کو آگاہ کیا، بہرحال تنہائی میں تاجور کو ذرا تفصیل سے بھی بتا دیا۔ فخر بھی داراب ہاؤس میں تاجور کی حالتِ زار کا سن کر ملول ہوا۔ فخر کا زیادہ عرصہ یورپ میں ہی گزرا تھا۔ تاجور جس مشرقیت اور شوہر پرستی کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ اس کے لیے کافی حیران کن تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی اپنے شوہر کی مٹھی چاپی کرتی ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔

پہلوان حشمت اپنی جگہ بہت پریشان تھا۔ فخر کی زبانی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہاناوانی کے غنڈوں نے غیظ و غضب کے عالم میں ''میری قبر'' کو بھی نہیں بخشا۔ اسے دو ماہ پہلے اُدھیڑ ڈالا تھا اور کتبے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

فخر ہوٹل سے نیچے اتر کر سگریٹ وغیرہ لینے بازار گیا ہوا تھا۔ پہلوان حشمت نے دروازے کو اندر سے بولٹ کیا اور بڑے تفکر سے بولا۔ ''شاہ زیب! مجھے تمہاری طرف سے بہت فکر لاحق ہو گئی ہے...... وہ ٹیکساری گینگ والی دشمنی ہی کم نا ہیں تھی اب یہ بدذات عورت بھی تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ میں تو کہوت ہوں کہ تم کچھ دن کے لیے کہیں غائب ہی ہو جاؤ۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چاچا حشمت میں غائب ہی تو ہوں۔ اپنے دشمنوں کے سامنے سے بھی گزر جاتا ہوں اور وہ مجھے پہچان نہیں سکتے۔''

''لیکن یہ بدذات زنانی اور طرح کی ہے۔ سب کہوت ہیں کہ یہ کالا علم وغیرہ بھی جانت ہے۔ کیا پتا کہ تمہاری بدلی ہوئی شکل کے ساتھ بھی یہ تمہیں پہچان لے اور نہ بھی پہچانے تو رضوان اور فخر وغیرہ تو اس کے نشانے پر ہی ہیں۔ تم سب کو سیلف ڈیفنڈ (سیلف ڈیفنس) سیکھنے کی بہت ضرورت ہے اور میرے خیال میں ہماری دیسی کشتی سے زیادہ ''سیلف ڈیفنڈ'' کوئی بھی نا ہیں سکھاتا۔''

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں سردار سجاول کے ڈیرے پر میں نے تمہاری اچھی بھلی ٹریننگ شروع کر دی تھی اور تمہیں کافی داؤ پیچ آ بھی گئے تھے مگر پھر تم نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔ وہ کیا کہوت ہیں کہ نہ رہا بانس، نہ رادھا ناچی۔ تم تاجور کو اور مجھے لے کر نکل آئے سجاول کے ڈیرے سے...... میں تو کہوت ہوں تھوڑا بہت سیکھ لو مجھ سے۔ یاد کرو گے اور زندگی میں تمہارے کام آوے گا۔ یہ جوڈو شوڈو اور باکسنگ کچھ نا ہیں ہیں پہلوانی کے سامنے۔''

میرا موڈ کچھ اور طرح کا تھا مگر پہلوان پر بھوت سوار تھا کہ مجھے آج ہی ''سیلف ڈیفنڈ'' میں طاق کر کے رہے گا بلکہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ فخر اور رضوان بھی اس کی بے پایاں صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر خود کو کسی قابل کر لیں۔ وہ علامہ

PakiBooks.Site

اقبال کے معروف شعر کی ٹانگ توڑتے ہوئے بولا۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ کس کو دکھائیں، کسی میں اتنی عقل ہی نہیں

وہ مجھے دیسی کشتی کے مزید داؤ پیچ سکھانے پر پوری طرح کمربستہ ہوگیا۔ یہ تین بیڈ کا بڑا کمرا تھا۔ ایک طرف کافی جگہ خالی تھی۔ شدید جذبۂ ہمدردی کے تحت اس نے مجھے مختلف طرح کی ''پکڑیں'' اور دھوبی پٹکے اور پٹھیاں وغیرہ سکھانا شروع کردیں۔ میں سعادت مندی سے سیکھتا رہا..... اور اس کی تعریف بھی کرتا رہا۔ وہ ماضی قریب کے یورپی چیمپئن کو بالکل ابتدائی چیزیں سکھا رہا تھا جیسے یونیورسٹی کے طالب علم کو بڑی اور چھوٹی اے بی سی لکھنا سکھائی جائے۔ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب سچ کہوت ہوں تم میں ٹائمیلٹ (ٹیلنٹ) بہت ہے، بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ..... ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی خونریز ہے ساقی..... تم نے سجاول جیسے بندے کو نیچا دکھایا تھا تو..... کوئی بات تو ہے ناں تم میں۔''

اسی دوران میں فخر بھی آگیا۔ فخر مکس مارشل آرٹ کے ان فائٹرز میں سے تھا جنہوں نے Ring کے اندر اور باہر بڑے بڑے سور ماؤں کو ناکوں چنے چبوائے تھے، تاہم پہلوان نے فوراً سے پہلے اسے بھی اپنے ''احاطۂ شاگردی'' میں لے لیا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے فخر کو سمجھایا کہ پلوان جو کررہا ہے اسے کرنے دو۔ پہلوان کی یہی پُرخلوص معصومیت ہی تو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وہ اپنی عقل سمجھ کے مطابق ہروقت ہر کسی کے کام آنے کے لیے تیار ہوتا تھا۔

ہماری ''ٹریننگ'' کے دوران میں ایک موقع پر پہلوان نے مجھے اور فخر کو ایک ساتھ اڑنگا لگایا اور نیچے گرنے کو کہا۔ ہم نے عمل کیا۔ پہلوان نے میرا بازو مروڑ کر مجھے الٹا کیا اور اپنا بھاری بھرکم پاؤں میری کمر پر رکھ کر بولا۔ ''اگر تمہارے مخالف کے ہاتھ میں پستول بھی ہوگا تو پکے ہوئے آم کی طرح نیچے گر جاوے گا۔ پاؤں کا پریشر ذرا سا اور بڑھاؤ گے تو بچہ جی کا کندھا بھی اکھڑ جاوے گا انشاء اللہ۔''

اس نے جب پاؤں کا دباؤ بڑھا کر دکھانا چاہا تو اس کے اپنے گوڈے کا کڑاکا نکل گیا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا پھر ہم دونوں کو اٹھنے کو کہا..... اب اس نے پریکٹیکل کے بجائے تھیوری پر اکتفا بہتر سمجھا۔ ہمیں زبانی کلامی مختلف داؤ سمجھانے لگا۔ اس دھما چوکڑی میں پہلوان کے زخمی جبڑے کو بھی تھوڑی سی دب سہنا پڑی تھی۔ اس سے ٹھیک سے بولا نہیں جارہا تھا اس لیے تھیوری کا پیریڈ بھی جلد ہی ختم ہوگیا۔

رات کو میں دیر تک تاجور کے اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک عجیب سی دلدل تھی جو مجھے اپنے اندر غرقاب نہیں کرتی تھی اور رہائی بھی نہیں دیتی تھی۔ سوچ کی لہروں پر سفر کرتے کرتے میرا دھیان ایک بار پھر سیف اور اس کے گھر والوں کی طرف چلا گیا۔ سیف کی موت کے بعد اس کی ماں اور پھر اس کا باپ دونوں یہ صدمہ نہیں سہہ سکے تھے اور چل بسے تھے اور سیف کا صدمہ ہی تھا جسے شاید میرا اور تاجور کا پیار بھی نہیں سہہ سکا تھا..... اور چل بسا تھا۔ وہ مجھے بالکل کنارے پر آکر چھوڑ گئی تھی۔ میرا خیال تاجور کے ان جملوں کی طرف چلا گیا جو چند ہفتے پہلے ایک ملاقات میں اس نے مجھ سے کہے تھے (اس وقت ہم دونوں ایک چھینی ہوئی ٹیکسی پر سوار تاجور کی قیام گاہ کی طرف جارہے تھے) تاجور نے کہا تھا..... شاہ زیب! میری ایک بات ضرور مانیے گا۔ سیف کی یتیم بہنوں کو تنہا نہ چھوڑیے گا۔ آپ ان کا خیال رکھیں گے تو شاید اوپر والا میرے اور آپ کے دکھ بھی کم کردے۔

مجھے افسوس ہوا کہ تاجور سے وعدے کے باوجود میں ابھی تک سیف کی تینوں بے آسرا بہنوں کی پوری خبر گیری نہیں کرسکا تھا۔ میں نے اسی وقت پہلوان حشمت کو اپنے پاس بلایا۔ میں نے ایک معقول رقم پہلوان کے سپرد کی اور اس سے درخواست کی کہ وہ سکھیرا گاؤں کا ایک چکر لگا آئے۔

''اس رقم کا کیا کرنا ہے؟'' پہلوان نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''سیف کی بہنوں کا ہم پر حق ہے۔ ہمیں اُن کا خیال رکھنا ہوگا۔ سنا ہے کہ ان کے ایک چچا آکر ان کے پاس رہنے لگے ہیں، آپ یہ رقم ان کے حوالے کریں اور ان کے گھریلو حالات کی پوری خبر لے کر آئیں۔''

پہلوان نے فوری رضامندی ظاہر کردی۔ ویسے بھی پہلوان یہاں کے موجودہ حالات سے سخت ڈسٹرب تھا۔ اس کے ذہن میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ ہانا وانی کے لوگ اچانک پھر حملہ کریں گے اور رضوان ٹی کے ساتھ ساتھ مولانا حبیب کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔ (حالانکہ ہانا وانی والے معاملے سے مولانا حبیب کا کوئی تعلق نہیں تھا)

میری درخواست پر پہلوان حشمت اسی سہ پہر سکھیرا جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کی روانگی کے وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے پہلوان سے حاذق ذکری مرحوم کے اس خط کا ذکر کیا جو میری غفلت کے سبب ابھی تک میری نظر سے اوجھل تھا اور سکھیرا میں چوہدری دین محمد کے ڈیرے کے ایک کمرے میں پڑا تھا۔ میں نے پہلوان سے کہا کہ وہ ڈیرے پر جاکر اس خط کو ڈھونڈے، اگر مل جائے تو لے آئے.....

پہلوان چلا گیا۔ مجھے خط کے سلسلے میں زیادہ امید نہیں تھی۔ تاہم اگلے روز سہ پہر کو جب پہلوان واپس آیا تو اس کے پاس وہ کئی ماہ پرانا خط موجود تھا جو جاماجی میں جناب حاذق ذکری نے مجھے دیا تھا۔ وہ وہیں ڈیرے کی ایک الماری میں گرد آلود اخباروں کے نیچے پڑا تھا۔ اسے کھولا تک نہیں گیا تھا۔ سیف کی بہنوں کے حوالے سے میں نے پہلوان کو جو ہدایات دی تھیں، اس نے ان پر پورا عمل کیا تھا۔

رات کو جب فخر سو گیا اور پہلوان کے خراٹے بھی کمرے میں گونجنے لگے تو میں نے موبائل فون کی ٹارچ آن کی اور خط کھول کر پڑھنے لگا۔ یہ خط اردو میں لکھا گیا تھا۔ شاید جناب حاذق ذکری نے اپنے کسی اردو دان مرید سے لکھوایا تھا۔ باریک لکھائی تھی۔ تفصیل سے لکھا گیا یہ خط تین صفحات پر مشتمل تھا۔ اس خط کا لُبِ لباب کچھ یوں تھا۔

''شاہ زیب! مجھے پوری امید ہے کہ تم خیر خیریت سے اپنے وطن اور اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ گے۔ یہاں جاماجی کے لوگوں کے لیے تم نے جو کچھ کیا ہے، اسے یہاں کے باشندے کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔ تم ان کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہو۔ اپنی برداشت اور حوصلے سے تم نے اہلِ جاماجی میں ایک ایسی روح پھونکی ہے جس نے انہیں کھلے آسمان پر لمبی پروازوں کا حوصلہ دیا ہے۔ شاباش..... میرے بچے۔''

اس تمہید کے بعد جناب حاذق ذکری نے لکھا تھا۔ ''شاہ زیب! یہاں کے لوگ مجھے بہت بڑا پیش گو کہتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ مجھے بھی اپنے اگلے سانس کا پتا نہیں کہ آئے گا یا نہیں۔ یہ ساری پیش گوئی درحقیقت قیافہ شناسی ہے۔ گہری سوچ، تجربہ، مشاہدہ اور مراقبہ بہت سے لوگوں کو فاش کوئی کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ میں بھی شاید انہی میں سے ایک ہوں۔ کسی وقت مجھے الہام اور القا کا شبہ ہوتا ہے..... اور اکثر یہ الہام اور القا درست ثابت ہوجاتا ہے۔ تمہارے بارے میں جو القا مجھے ہورہے ہیں، میں ان کے بارے میں تمہیں مختصراً بتا دیتا ہوں..... مجھے لگتا ہے کہ ہانا وانی تمہاری جرأتوں کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔ وہ میری بہن ہے، میں اس کی خصلتوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو وہ دن رات انگاروں پر لوٹے گی۔ شاید تمہیں حیرانی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا پیچھا کرے گی۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے کسی ساتھی کو قبضے میں کرے اور اس کو اپنے انتقام کے لیے استعمال کرے۔ اس حوالے سے انیق یا سجاول کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔ اگر ان دونوں میں سے کسی کے رویے میں تمہیں اچانک کوئی اہم تبدیلی نظر آئے تو یہ شدید خطرے کی گھنٹی ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق ہانا وانی کی دشمنی سے ہو۔

''مجھے لگتا ہے کہ یورپ میں تم نے جو ایک بڑی دشمنی پال رکھی ہے وہ بھی عنقریب تمہارا تعاقب کرسکتی ہے۔ وہ گینگسٹرز تمہیں ڈھونڈتے ہوئے تم تک پہنچ سکتے ہیں۔ تمہیں ان کی طرف سے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ یہ لوگ تمہارے وطن میں پہنچ کر عام افراد کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو تمہارے اور تمہارے قریبی ساتھیوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد کم از کم تین چار ماہ کے لیے بالکل روپوش ہوجاؤ۔ اس اثنا میں تم اپنے اور تاجور کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور سوچ لو۔ تاجور کا ذکر آیا ہے تو میں چند سطور اس کے بارے میں بھی لکھنا چاہوں گا۔ شاہ زیب جہاں تک میں اس لڑکی کو سمجھ سکا ہوں وہ تم سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ یہ پیار سطحی نہیں ہے اس میں اتھاہ گہرائی اور ٹھہراؤ ہے۔ اس پیار کی شدت سے زیادہ مجھے اس کی گہرائی اور اس کے ٹھہراؤ نے متاثر کیا۔ یہ عشق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کی جڑیں اس خوبرو لڑکی کے اندر بہت آگے تک جاچکی ہیں۔ یہ بھی تم کو بتائے گی نہیں مگر تمہارے بغیر اگر اسے زندہ رہنا پڑا تو ایک مسلسل عذاب سے کم نہیں ہوگا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اسے جلد سے جلد اپنا لو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ کوئی دیوار تمہارے درمیان آجائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوگیا اور اس لڑکی کی زندگی کسی اور کی زندگی سے نتھی ہوگئی تو پھر واپسی قریباً ناممکن ہوجائے گی۔

''شاہ زیب! جب تم لڑائی کے محاذ پر تھے تو یہ لڑکی میرے پاس تھی۔ ان دنوں میں نے اس کی حالتِ زار کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ وہ راتوں کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارتی رہی ہے، روتی رہی ہے اور تمہاری سلامتی کی دعائیں کرتی رہی ہے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ صدقہ آفتوں سے بچاتا ہے اور اگر کسی کو آفتوں سے بچانے کے لیے وہ مخلص صدقہ دے جو اس کا شریکِ زندگی بھی بننا چاہتا ہے تو اثرات غیر معمولی ہوجاتے ہیں۔ اس دن تاجور

نے اپنی طلائی بالیاں اور چوڑیاں تک اتار کر ایک حاجت مند بیوہ کو دے دی تھیں اور یہیں پر بس نہیں، اس نے تمہاری سلامتی کی خاطر خدا ترسی کا ایک اور بڑا کام بھی کیا۔ شاید میں تمہیں نہ ہی بتاتا (کیونکہ اس نے منع کیا تھا) مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بات کا وزن بڑھانے کے لیے یہ بات بھی تمہیں بتا ہی دوں..... تاجور نے اسی وقت کھڑے کھڑے ایک خطیر رقم تمہاری خاطر میری جھولی میں ڈال دی تاکہ میں اسے جاماجی کی لڑائی کے زخمی بچوں اور پناہ گزینوں کی امداد اور بحالی پر خرچ کر سکوں۔ جانتے ہو کہ کتنی رقم تھی..... یہ قریباً ڈیڑھ لاکھ برطانوی پاؤنڈ تھے جو تمہارے ملک کی کرنسی کے مطابق تقریباً ایک کروڑ اسّی لاکھ روپے بنتے ہیں۔ تمہارے ذہن میں یہ سوال آئے گا کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ اس رقم کے پیچھے ایک چھوٹی سی کہانی ہے اور شاید تم بھی اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔

''پاکستان میں جب تم اور تاجور کسی ''ملنگی'' نامی جگہ پر قید تھے تو مائیکل نام کے ایک شخص نے تاجور کی کچھ تصاویر اتاری تھیں اور پھر اپنی کتاب میں تفصیل سے تاجور کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ تصویریں اس کتاب کے ذریعے بے شمار لوگوں تک پہنچیں اور ان کو پسند کیا گیا۔ مائیکل کے لیے یہ تصویریں مالی فائدے کا باعث بھی بنیں۔ تم یورپ میں رہے ہو، ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو۔ خامیوں کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ زبردست خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ حق دار تک اس کا حق پہنچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں، بلکہ کئی بار اسے ڈھونڈ کر اس تک اس کی کاوش کا معاوضہ پہنچاتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ پچھلے دنوں مائیکل بھی تاجور کو ڈھونڈتا ہوا ہمارے جنگ زدہ جاماجی آن پہنچا تھا۔ ایک روز وہ میری رہائش گاہ تک آ گیا اور تاجور اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ دل و جان سے تاجور کا پرستار ہے۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کروڑ پتی شخص تاجور کو اپنانا بھی اپنی ایک بہت بڑی خوش نصیبی سمجھتا لیکن تاجور نے بس پردے کی اوٹ سے اس سے دو چار جملے ہی بولے۔ وہ اپنے ساتھ ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ کا چیک لایا تھا، اس کا کہنا تھا کہ یہ اس رقم میں سے ہے جو اسے تصویروں اور آرٹیکل کی اشاعت سے حاصل ہوئی ہے اور یہ تاجور کا حق ہے۔ تاجور نے یہ رقم لینے سے صاف انکار کیا۔ اس کو وہم تھا کہ شاید یہ مائیکل نامی بندہ اس کے بارے میں کسی اور انداز سے سوچتا ہے۔ اور کسی اور ارادے سے یہاں آیا ہے (تمہیں معلوم ہی ہوگا مائیکل نے اپنی کتاب میں تاجور کی خوب صورتی کا ذکر بڑے خاص انداز میں کیا ہے) بہرحال میں نے تاجور کو سمجھایا کہ وہ مائیکل کی نیت پر ہرگز ہرگز شک نہ کرے۔ بعد ازاں میرے سمجھانے پر تاجور نے یہ رقم لے لی لیکن دو دن بعد جب اسے یہ خبر ملی کہ ڈی پیلس کے عین سامنے گرین اور گرے فورسز کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہونے والا ہے اور تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اگلی صفوں میں ہو تو اس نے مجھ سے کہا..... کہ وہ یہ ساری رقم تمہاری جان کے صدقے میں خیرات کرنا چاہتی ہے..... اور ابھی اسی وقت کرنا چاہتی ہے۔

یہ رقم مجھے سونپتے وقت تاجور بیٹی نے مجھ سے درخواست بھی کی تھی کہ میں یہاں مائیکل کی آمد اور اس رقم کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

میں نے حاذق ذکری کا لکھا ہوا یہ طویل خط آخر تک پڑھا اور مجھ پر کئی انکشافات ہوئے۔ میرا یہ پچھتاوا کئی گنا بڑھ گیا کہ میں اس خط کو بروقت کھول کر کیوں نہ پڑھ سکا۔ اپنی اس تحریر میں حاذق ذکری نے کئی حیران کن اشارے دیے تھے۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا، تاجور اپنی ہمت کے مطابق پوری کوشش کرے گی کہ اس کی زندگی کسی اور شخص سے وابستہ نہ ہو لیکن اس کے قریبی عزیزوں میں سے کوئی ایک اس کی راہ میں سخت رکاوٹ بنے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس رکاوٹ کو بھی عبور کر لے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو تم اسے اپنے نکاح میں لانے میں تاخیر نہ کرنا.....

گزرے دنوں کے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے اور سینے میں درد کی بلند لہریں پیدا ہوئیں۔ شاید اُس موقع پر واقعی غیر ضروری تاخیر ہوئی تھی۔ نکاح کا انتظام ہونے میں تو ایک دن سے زیادہ نہیں لگتا اور ہم نے کئی دن گزار دیے تھے..... اور پھر اسی دوران میں انیق اور تاجور کا رابطہ ہو گیا تھا۔

نہ چاہنے کے باوجود میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ اگر میں یہ خط بروقت کھول کر پڑھ لیتا تو آج حالات کی تصویر کچھ اور ہوتی۔ شاید انیق بھی زندہ ہوتا۔ شاید خورسند اور اس کا بچہ بھی اپنے گھر میں ہنسی خوشی موجود ہوتے..... شاید حاذق ذکری بھی حیات ہوتے اور شاید..... ابھی تاجور بھی مجھ سے جدا نہ ہوئی ہوتی۔ وہ جو ایک روز اپنا سب کچھ سونپنے کے لیے میرے ساتھ راولپنڈی چلی آئی تھی، میری زندگی کا حصہ بن چکی ہوتی۔ بہار کی اس دلنشیں رات میں، میں لاہور کے اس ہوٹل میں ہونے کے بجائے، تاجور کے ساتھ کسی دوسرے ملک میں..... شاید..... کسی چھوٹے سے خوب صورت گھر میں ہوتا، اس کی خوشبودار بانہیں میرے گلے میں ہوتیں..... میں اس کی پیشانی پر جھولتی لٹوں کو اپنی انگلی سے پیچھے ہٹاتا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے بے مثل چہرے کے قریب تر کر دیتا۔

ایک طویل سرد آہ بھر کر میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور حاذق ذکری مرحوم کے خط کو پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ بے شک خط کی ہر سطر میں میرے لیے ایک پچھتاوا تھا..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ شاید تقدیر میں لکھا اٹل ہوتا ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ہم آئندہ حالات کے بارے میں جان بھی جائیں تو بھی اپنے مقدر سے بھاگ نہیں سکتے۔

حاذق ذکری صاحب نے تاجور کے بارے میں جس واقعے کا ذکر کیا، وہ بھی میرے لیے کسی بڑے انکشاف سے کم نہیں تھا۔ تاجور نے آج تک مجھے اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ مائیکل نامی وہ شخص اور اس کے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے جاماجی جا پہنچے تھے اور مائیکل نے اسے ایک خطیر رقم دی تھی۔ پتا نہیں، ایسی کتنی ہی باتیں اس نے اپنے سینے میں چھپا رکھی تھیں..... اور ان سارے پنہاں رازوں کے ساتھ وہ اب مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔

حاذق ذکری کے خط کے الفاظ ایک بار پھر میری نگاہوں میں گھومنے لگے..... وہ تم سے بے انتہا پیار کرتی ہے لیکن اگر خدانخواستہ اس کی زندگی کسی اور کی زندگی سے نتھی ہو گئی تو پھر واپسی تقریباً ناممکن ہو جائے گی..... اور تاجور کی زندگی نتھی ہو چکی تھی..... اور نتھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوئی تھی جو انسان کہلانے کا حق دار ہی نہیں تھا۔

میں رات دیر تک جاگتا رہا۔ سینے میں ایک عجیب سی بے کلی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ پتا نہیں اس بلند و بالا چار دیواری کے اندر تاجور کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہوگا۔ وہ مسلسل ایک جنونی شخص کے قبضے میں تھی۔ اس کی شخصیت بُری طرح ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ایسے موقعوں پر اکثر انیق میرے آس پاس ہوتا تھا۔ وہ عقب سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا اور میری ڈھارس بندھانا شروع کر دیتا، لیکن اب تو وہ بھی منوں مٹی کے نیچے تھا۔ کئی بار میں بڑی حیرت کے عالم میں بہ زبانِ خاموشی اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا تھا۔ ''کیا انیق واقعی مر چکا ہے؟'' میرا دوسرا قریبی ساتھی جاوید تھا۔ وہ بھی نہایت مخدوش حالات کا شکار تھا۔ میں نے کئی بار اسے فون کیا لیکن حسب سابق فون بند جا رہا تھا۔ پھر میں نے فیض سے رابطے کی کوشش کی۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''ہیلو، کون؟''

''وقاص بول رہا ہوں چاچا فیض۔''

میرے سوال سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ''سردار کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ نہ کوئی فون، نہ کوئی اطلاع۔ انہوں نے تلاش سے بھی منع کر دیا تھا۔ اب تو بس انتظار ہی ہو سکتا ہے..... اور تم کہاں ہو؟''

''لاہور میں..... اور یونس کے بارے میں کوئی خبر؟''

''نہیں۔'' فیض نے ذرا ڈرے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر توقف کر کے بولا۔ ''اس کے بارے میں تو کوئی خبر نہ ہی ملے تو چنگا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے ہوش حواس بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کالے علم کی مار بہت بُری ہوتی ہے۔ وہ کسی ایسے ہی علم کے اثر میں ہے۔ سنا ہے کہ پچھلے بدھ کو اس نے مسجد کے پاس تمہارے کسی دوست کو مارنے کی کوشش بھی کی ہے۔''

''ہاں..... لیکن بچت ہو گئی ہے۔''

''پُرادھر لالہ موسیٰ میں تو بچت نہ ہوئی۔ باقر کو اس نے جتنی بے دردی سے قتل کیا اور اس کی دوست کڑی کو جس طرح تیسری منزل سے دھکا دے کر مارا، اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سب ڈرے ہوئے ہیں۔ سامنے آ کر لڑنے والے دشمن کا مقابلہ تو بہادری سے ہو سکتا ہے پر جو نظر نہ آئے اور سائے کی طرح آلے دوالے بھی رہے اس کا خوف ہڈیوں میں بیٹھ جاتا ہے۔''

فیض کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سجاول کا تقریباً سارا گروہ ہراس کی سی کیفیت میں ہے۔ وہ یونس پمپ والا کی موجودہ حالت اور اس کی دیوانگی کو عملیات کا نتیجہ قرار دے رہے تھے اور اس کا تعلق ہوائی چیزوں سے جوڑتے تھے۔ بے شک یہ سب کے سب سکہ بند ڈکیت تھے مگر ان کی اکثریت کا تعلق دیہاتی علاقوں سے تھا۔ ان میں پڑھا لکھا بھی شاید ہی کوئی ہوگا۔ ایسے ذہنوں میں توہمات بڑی جلدی جگہ بناتے ہیں اور..... بڑی تیزی سے پھلتے پھولتے ہیں۔

یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ ہوٹل کے نیچے بازار اب مکمل طور پر خاموش تھا۔ بازار کی دوسری طرف مولانا حبیب اللہ والی مسجد کے نیم روشن مینار بھی اونگھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ خالی چوراہے سے کبھی کبھار کسی گاڑی کے گزرنے کی

آواز سنائی دے جاتی تھی۔

''کیا بات ہے شاہ زیب! جاگ رہے ہو؟'' فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا۔

میں گہری سانس لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''فخری! ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ورنہ سجاول اور اس کے بیوی بچے کے ساتھ کچھ بہت بُرا ہو جائے گا۔ آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں۔''

فخر نے بستر سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کل میں سوچ رہا تھا کیوں نا اس سلسلے میں تم داؤد بھاؤ سے مدد لو۔ اس کا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔''

''لیکن مسئلہ تو وہی ہے جو تمہیں بتایا تھا۔ داؤد کا دل سجاول کی طرف سے ابھی تک صاف نہیں ہے۔ وہ انیق کی موت کا ذمے دار اسی کو سمجھ رہا ہے۔ وہ سجاول کی تلاش کے سلسلے میں کبھی بھی مخلص نہیں ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''مجھے زیادہ فکر خورسنہ اور اس کے بچے کی ہے۔ ان دونوں کو یونس لے کر گیا تھا اور... جس طرح کی ذہنی حالت ہے اس کی، ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔''

میں اور فخر دیر تک سوچتے رہے کہ خورسنہ اور سجاول کو ڈھونڈنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے فیض محمد کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو وقاص! بی بی اور بچہ واپس آ گئے ہیں..... وہ خود ہی واپس آ گئے ہیں۔ بالکل خیر خیریت سے ہیں۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟ سجاول کی بیگم کی؟''

''ہاں، ہاں..... بیگم جی کی..... اور بچے کی..... یہ لو..... یہ تم خود بھی بات کر لو۔''

چند لمحے کی خاموشی کے بعد فون پر سانسوں کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ''ہیلو..... کون..... خورسنہ؟''

''ہاں۔'' دوسری طرف سے مختصر اً جواب ملا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ یہ سب کیسے ہوا ہے؟''

''میں تھوڑی دیر بعد فون کرتی ہوں۔'' خورسنہ نے کہا، یقیناً وہ فیض وغیرہ کے سامنے مجھ سے آزادانہ بات نہیں کر سکتی تھی۔ فون بند ہو گیا۔

میری طرح فخر بھی حیران تھا۔ ہم نے دو تین منٹ سخت بے قراری میں گزارے۔ آخر میرے نمبر پر کال کے سگنل آئے۔ خورسنہ اب یقیناً کسی بند کمرے میں موجود تھی۔

''ہیلو کون؟''

''میں خورسنہ بول رہی ہوں شاہ زیب صاحب۔'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''تم خیریت سے تو ہو..... اور ذیشان؟''

''ہاں جی، ہم بالکل خیریت سے ہیں۔ ابھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے یہاں لالہ موسیٰ اپنے گھر پر پہنچے ہیں۔''

''سجاول کہاں ہے؟''

''وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔'' خورسنہ کی آواز زیادہ بھرا گئی۔ ''وہ وہیں پر ہیں، ان لوگوں کے پاس۔ م..... میرا خیال ہے کہ ہمیں فون پر زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے۔ آ..... آپ کسی طرح یہاں آ سکتے ہیں؟'' میرے لیے اس کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح احترام تھا۔

میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں..... میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔ دو ڈھائی گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا لیکن سجاول خیریت سے تو ہے نا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی..... آپ..... بس جلد سے جلد یہاں آ جائیں۔''

''او کے..... ذیشان کہاں ہے؟''

''وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ خیریت سے ہے وہ بھی۔''

''ٹھیک ہے، تم لوگ پوری طرح چوکس رہو، ہم آ رہے ہیں۔ میں فیض کو بھی فون کر دیتا ہوں کہ گھر کے اردگرد کڑی نگرانی رکھے۔''

خورسنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے کال منقطع کی پھر فیض کو کال ملائی اور اس سے پوچھا کہ بیگم اور بچہ کیسے پہنچے ہیں یہاں؟

فیض نے بتایا۔ ''ایک ٹیکسی پر۔ ٹیکسی پر جہلم کا نمبر تھا۔ ڈرائیور چھوڑ کر فوراً چلا گیا۔ بہرحال میں نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ کروا لیا ہے۔''

''بیگم نے کچھ بتایا ہے سردار سجاول کے بارے میں؟''

''ابھی تک تو کچھ بھی نہیں۔ بس بچے کے ساتھ کمرے میں چلی گئی ہے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔''

''دیکھو چاچا فیض! بیگم اور بچے کی حفاظت کی سخت ضرورت ہے۔ تم اپنے بندوں کے ساتھ، آس پاس رہو۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑیں گے۔''

PakiBooks.site

''تم کو بتانے کی لوڑ نہیں۔ ہم پوری طرح چوکنے ہیں۔'' فیض محمد نے کہا۔

پہلوان بھی اب جاگ چکا تھا اور اس ساری صورتِ حال پر ششدر تھا۔ فیض سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے فخر سے کہا۔ ''فخر! جانا تو ہم دونوں کو چاہیے لیکن یہاں بھی کسی کا موجود رہنا ضروری ہے۔ رضوان ان لوگوں کے نشانے پر آچکا ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔''

پہلوان بولا۔ ''لیکن میرے خیال میں اگر آپ دونوں جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں یہاں ہوں ناں۔''

کہنے کو تو پہلوان یہ بات کہہ رہا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ کافی تناؤ میں تھا۔ وہ ڈرپوک نہیں تھا مگر اس ناقابلِ فہم اور کسی حد تک پُراسرار صورتِ حال نے اسے اضافی طور پر پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ چوکنا ہوگیا تھا۔ شکر تھا کہ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ اب تک صرف شبہے کی بنا پر کسی کو فائر مار چکا ہوتا۔

فیصلہ ہوا کہ فخر اور پہلوان ابھی یہیں ہوٹل میں رہیں گے۔ میں اکیلا لالہ موسیٰ جاؤں گا۔ تاہم اگر ضرورت پڑی تو میں انہیں بلالوں گا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا، سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ میں خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا قریباً تین گھنٹے میں لالہ موسیٰ اس گھر تک پہنچ گیا جہاں خورسنہ اپنے بچے کے ساتھ موجود تھی۔ یہ ایک گنجان آبادی تھی۔ جونہی میری گاڑی رکی، ایک جانب نیم تاریکی سے ایک سایہ نمودار ہوا اور میرے پاس پہنچ گیا۔ یہ چاچا فیض ہی تھا۔ اس کے نزدیک میری شناخت، سردار سجاول کے ایک نئے ساتھی کی تھی۔

میں نے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا۔ ''ہاں بھئی وقاص! پہنچ گئے ہو؟'' وہ اپنی نیم سفید مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔

''ہاں..... بیگم اور بچہ اندر ہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

فیض نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے گاڑی سے اتر کر خورسنہ کے نمبر پر کال کی اور اسے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔

تھوڑی ہی دیر بعد گھر کے ایک کمرے میں خورسنہ اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ذرا سہما ذیشان بھی ایک طرف موجود تھا۔ اس کے قریب پلیٹ رکھی تھی اور اردگرد چاول بکھرے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک خورسنہ اسے چاول کھلانے کی ناکام کوشش کرتی رہی ہے۔ خورسنہ کی اپنی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز سے مجھے شک گزرا کہ اسے کچھ چوٹیں بھی آئی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خورسنہ نے ''اونگھتے ہوئے ذیشان'' کو ساتھ والے کمرے میں لٹا دیا اور دھیمی آواز میں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس سے پہلا سوال سجاول کے حوالے سے ہی پوچھا۔ ''سجاول کہاں ہے خورسنہ؟''

''وہ وہیں پر ہیں جہاں سے میں آئی ہوں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ یہ ایک طرح سے میرے خدشات کی تصدیق بھی تھی۔

''لیکن کہاں پر؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ میرا چہرہ دیکھیں شاہ زیب صاحب! یہاں آنکھوں کے پاس آپ کو سرخ نشان نظر نہیں آرہے۔''

میں نے غور سے دیکھا۔ اس کی سفید گلابی ملائم جلد پر ہلکے نشان تھے۔ یہاں لاتے ہوئے اس کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی گئی تھی اور یہ اسی کا نشان تھا۔

وہ بولی۔ ''ذیشان کی آنکھوں پر بھی پٹی تھی۔ حالانکہ اس بے چارے کو راستے کا کیا پتا چلنا تھا۔ میرے خیال میں ہم نے اونچی چھت والی کسی گاڑی میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا تیز رفتاری سے سفر کیا ہے۔ پھر ایک جگہ کسی نہر کے کنارے والی سڑک پر ہماری آنکھوں سے پٹی اتاری گئی اور ہمیں ایک ٹیکسی میں دھکیل دیا گیا۔ وہ ٹیکسی ہمیں یہاں لے آئی۔''

''اس کا مطلب یہ ہے خورسنہ! کہ تمہیں اور ذیشان کو اس شرط پر چھوڑا گیا کہ سجاول نے خود کو ان لوگوں کے حوالے کردیا۔''

خورسنہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی خوب صورت آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کی گود میں گر گئے۔ وہ اپنی عمر سے چھوٹی نظر آتی تھی اور اس کے بھرے بھرے جسم میں نظر کو جذب کرنے والی موزونیت تھی۔ سجاول کی بیوی کی حیثیت سے وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام تھی۔

''تمہیں یہاں سے لے کر کون گیا؟''

''وہی یونس۔ سجاول اس پر پورا بھروسا کرتے تھے۔ اسی طرح میں بھی کرتی تھی۔ اس روز وہ بڑی تیزی سے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا..... بی بی جی! یہاں بہت خطرہ

ہے۔ سردار نے کہا ہے کہ آپ کو اور بچے کو فوراً یہاں سے نکال لیا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں سجاول کو فون کرلوں لیکن سجاول کا فون پچھلے کئی گھنٹے سے بند جارہا تھا۔ تب بھی بند ہی تھا۔ میں ذیشان کو لے کر فوراً اس کی سفید سوزوکی کار میں جا بیٹھی..... ہم آبادی سے باہر نکلے تو دو اور بندے گاڑی میں سوار ہوگئے۔ میں نے یونس سے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ اس نے بس گول مول سا جواب دیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے یونس کے رویّے میں کوئی تبدیلی نوٹ نہیں کی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''شاہ زیب صاحب! وہ کبھی کبھار نشے میں ہوتا تھا لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی نشے میں لگ رہا تھا، آواز بھی بھاری تھی۔ کسی وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اور شخص بول رہا ہو۔ لیکن تب میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہاناوانی جیسی خطرناک عورت کے ہتھے چڑھ چکا ہے..... اور اس کے ہوش حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں، ذیشان کے ساتھ بیٹھا ہوا بندہ ایک دم ہی، چلتی گاڑی میں مجھ پر جھپٹا تھا۔ میری ناک میں کسی کیمیکل کی تیز بُو گھسی۔ مجھے ذیشان کے چلّانے کی آواز آئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو خود کو ایک بند کمرے میں پایا۔ ذیشان بھی میرے ساتھ ہی سو رہا تھا۔ میں بہت روئی چلائی مگر کسی نے میری آواز نہیں سنی پھر شام کو ہاناوانی سے ملاقات ہوگئی۔''

خورسنہ بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ یوں لگا جیسے ہاناوانی سے ملاقات کا تصور ہی اس کے لیے روح فرسا ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلا گئے۔ کچھ دیر چپ رہ کر وہ بولی۔ ''جاما جی میں، میں نے اس منحوس عورت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ایک دو مرتبہ ٹی وی کے علاوہ بھی اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن دور دور سے۔ اس دن پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھا۔ یوں لگا جیسے کسی عورت کو نہیں ایک ہیبت ناک اور بدبودار مادہ جانور کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ بہت بُری ہے شاہ زیب صاحب، ہماری سوچوں سے بڑھ کر خطرناک ہے۔''

''اس نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟''

''تکلیف بھی پہنچائی ہے لیکن جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی تکلیف۔ کئی دن گزر گئے ہیں لیکن میرا سر اب بھی پھوڑے کی طرح دکھتا ہے اور آنکھوں کی پُتلیوں میں اینٹھن محسوس ہوتی ہے۔'' اس نے اپنا ماتھا تھام لیا۔

میرے استفسار پر خورسنہ نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ ہاناوانی نے اسے جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا۔ خورسنہ نے اپنے کندھے پر قمیص ہٹا کر چھڑی کی ضرب کا سرخی مائل نشان دکھایا۔ ایسے ہی نشان اس کی ساری پشت پر موجود تھے۔ ہاناوانی نے اسے نیم برہنہ کرکے دو روز تک سخت تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس نے یہ مار پیٹ خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ شاید اس نے یوں اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ یقیناً اسے اس بات کا بہت قلق رہا ہوگا کہ جاما جی کی خوبرو خورسنہ نے جاما جی کو چھوڑ کر ایک پردیسی سے دل لگایا، اور پردیسی بھی وہ جس نے اس کے بیٹے رائے زل کا سر اپنے ہاتھوں سے کاٹا..... یعنی سجاول۔ جسمانی تکلیف پہنچانے کے علاوہ ہاناوانی نے خورسنہ کو ذہنی طور پر بھی زبردست طریقے سے رگیدا تھا۔ اس نے اسے اپنے بدنام زمانہ ٹرانس میں لیا تھا اور پتا نہیں کہ اس کے اندر سے کیا کیا کھوجتی رہی تھی۔ اس کا اہم ترین ٹارگٹ یقیناً یہی رہا ہوگا کہ خورسنہ سے ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے جو اس کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ یعنی اس کے شیطان فرزند کے قاتلین۔ خورسنہ نے بتایا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کتنے دن یا کتنے گھنٹے اس کے ٹرانس میں رہی ہے..... لیکن جب وہ اپنے حواس میں واپس آئی تو اسے صاف پتا چلا کہ وہ کسی نادیدہ شکنجے میں تھی۔ اس پر نشہ آور دواؤں کا اثر بھی تھا، اس کے علاوہ اس کے سر اور اس کی دونوں آنکھوں میں شدید قسم کی چبھن تھی۔

ایک دم ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے لگا کہ میرے سینے میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی ہے۔ ایک خدشہ تھا جس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ خورسنہ ان چند افراد میں سے تھی جو جانتے تھے کہ میں ابھی ''بقیدِ حیات'' ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہاناوانی کے ٹرانس میں آنے کے بعد جہاں خورسنہ نے اور بہت کچھ اگلا ہو وہاں میرے بارے میں بھی بتا دیا ہو؟

میں نے کہا۔ ''خورسنہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہاناوانی کے ٹرانس اور نشہ آور دواؤں کے زیرِ اثر تم نے اسے میرے بارے میں بھی کچھ بتا دیا ہو؟''

خورسنہ کی آنکھوں میں خوف کے سائے ابھرے۔ وہ لرز کر بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! مم..... میں..... اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی..... لیکن.....'' وہ کہتے کہتے

Pakistanipoint

خاموش ہوگئی۔

''لیکن کیا؟ بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟''

اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''جب میں پورے ہوش میں تھی اس وقت بھی ہاناوانی سے کئی باتیں ہوئیں..... لیکن تب اس نے آپ کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کوئی سوال پوچھا۔''

''چلو..... یہ تو ایک اچھی علامت ہے۔ باقی، اگر کوئی بات ہوگئی ہے تو اس کا بھی پتا چل جائے گا۔''

خورسنہ کے چہرے پر تشویش کے سائے تھے اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ میں نے اصل موضوع پر واپس آتے ہوئے کہا۔ ''سجاول وہاں کیسے پہنچا اور تمہاری اس سے ملاقات کب ہوئی؟''

وہ گہرے دکھ سے بولی۔ ''شاہ زیب صاحب! مجھے سجاول نے بتایا کچھ نہیں لیکن مجھے اچھی طرح پتا چل گیا ہے کہ..... سجاول نے ہاناوانی کی کوئی شرط مانی ہے اور وہ شرط شاید یہی ہوگی کہ ہاناوانی مجھے اور ذیشان کو چھوڑ دے گی اور سجاول خود کو اس کے حوالے کردیں گے۔''

خورسنہ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے محبوب شوہر کے لیے ازحد پریشان ہے۔ ابھی ان کی شادی کو چند ماہ ہی تو ہوئے تھے اور اس میں سے بھی زیادہ وقت خورسنہ نے خوف کے سائے میں ہی گزارا تھا۔ وہ ہر وقت سجاول کی خیریت کے حوالے سے تشویش میں مبتلا رہی تھی..... اور پھر وہ خود ایک بڑے سانحے کا شکار ہوئی تھی۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں اور اس کے بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ قریباً تین ماہ تک بستر پر رہنے کے بعد حال ہی میں روبصحت ہوئی تھی اور اب یہ افتاد اس پر آن پڑی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ سجاول سے اس کی ملاقات کب ہوئی۔ جواب میں اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ ''یہ کل رات کی بات ہے۔ میں اور ذیشان سو رہے تھے۔ کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ تالا کھلنے کی آواز آئی اور پھر میں نے سجاول کو اپنے سامنے دیکھا۔ میں ششدر رہ گئی..... اور اُن سے لپٹ گئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے؟ اور کیسے یہاں تک آئے ہیں؟ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا..... ان کا مطلب تھا کہ میں آہستہ بولوں کہیں ذیشان جاگ نہ جائے۔ ہم وہاں بیٹھ کر دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ کتنے بے پروا ہیں، لیکن کل میں نے پہلی بار انہیں پریشان دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ ہاناوانی ایک بڑی مشکل عورت ہے..... لیکن اس سے بات چیت چل رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن میں یہاں سے ہماری رہائی کا کوئی راستہ نکل آئے۔ اس وقت مجھے بالکل شبہ نہیں ہوا کہ وہ کسی شرط کے تحت یہاں پہنچے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر یہی ظاہر کیا کہ انہوں نے کوشش کر کے ہم دونوں کو ڈھونڈا ہے لیکن بعد میں انہوں نے جو باتیں کیں، ان سے مجھے ہلکا سا شک ضرور گزرا تھا.....''

''کس طرح کی باتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ ہاناوانی یہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ بڑی زہریلی عورت ہے اور ان سب لوگوں کو ڈسنا چاہتی ہے جنہوں نے اس کے شیطان بیٹے کو مارنے میں حصہ لیا ہے۔ سجاول نے مجھ سے آپ کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ موجودہ صورتِ حال میں آپ کوئی بہتر راستہ نکال سکتے ہیں بلکہ اگر میں چاہوں تو آپ کچھ عرصے کے لیے مجھے اور ذیشان کو پاکستان سے باہر بھی بھجوا سکتے ہیں..... میں نے کہا، سجاول! آپ ایسی بات سوچیں بھی نہ۔ اب میرا جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میری کمر کی چوٹوں کے بارے میں جان کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا..... وہ بے قراری سے کمرے کے اندر ہی ٹہلنے لگے۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے نارمل کیا۔ وہ ذیشان سے بہت محبت کرتے ہیں مگر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ کل رات پہلی بار انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوما۔''

خورسنہ کی آواز پھر بھرا گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''رات کے آخری حصے میں مجھے تھوڑی دیر کے لیے اونگھ آگئی۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وہ بیڈ کے دوسرے سرے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے بے پروا نظر آنے کی کوشش کی اور بولے۔ بھئی آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کل میں اکیلی یہاں سے جاؤں گی..... سجاول میرے ساتھ نہیں ہوں گے۔''

خورسنہ نے دکھی انداز میں سر جھکا لیا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں خورسنہ! بہت جلد سجاول ہمارے ساتھ ہوگا۔''

میں نے خورسنہ سے مختلف سوالات پوچھے..... اسے اور ذیشان کو کیسے وہاں سے روانہ کیا گیا۔ گاڑی کس قسم کی تھی۔ کیا انہوں نے کچے راستے پر بھی سفر کیا؟ کیا وہ کسی ٹول پلازا وغیرہ سے بھی گزرے؟ اردگرد سے آنے والی آوازیں کس طرح کی تھیں۔ کیا ہیوی ٹریفک کی آواز بھی سنائی دیتی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں اگلے روز شام تک وہیں خورسنہ اور ذیشان کے پاس رہا اور سجاول کے حوالے سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ چاچا فیض سے بھی دو تین اہم میٹنگز ہوگئیں۔ مجھے پوری تسلی ہوگئی کہ اب چاچا فیض اور اس کے مسلح ساتھی پوری طرح چوکس ہیں اور خورسنہ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ سجاول کی تلاش کے سلسلے میں میرے ذہن میں ایک موہوم سا خاکہ بن رہا تھا۔

☆☆☆

رات دس بجے تک میں جی ٹی روڈ کے ذریعے واپس لاہور پہنچ چکا تھا۔ راستے میں فون پر مجھے اپنے ایک غیر ملکی دوست کی زبانی یہ خبر ملی کہ کوپن ہیگن میں، نیکساری گینگ کے دونوں گروپوں میں ایک بڑا تصادم ہوا ہے جس میں دو اہم ممبران سمیت آٹھ دس افراد جان سے گئے ہیں۔ وانس وائے کے بندوں سے جان بچانے کے لیے جان ڈیرک کو ایک جوا خانے کی تیسری منزل سے چھلانگ لگانا پڑی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اس قسم کی خبریں مجھے ملتی رہتی تھیں اور ان سے پتا چلتا تھا کہ اس عظیم الشان گینگ کی بینڈ کس طرح بج رہی ہے۔ بہرحال میں ہوٹل میں فخر اور پہلوان حشمت کے پاس پہنچا تو رضوان بٹ کو بھی وہیں پایا۔ وہ سب سونے کی تیاری کررہے تھے۔

''کیوں بھئی خیریت ہے رضوان! مسجد چھوڑ کر یہاں چلے آئے؟''

''یہ نہیں آیا، میں زبردستی لایا ہوں۔'' فخر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب ذرا پریشان کن ہے۔'' فخر نے رضوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رضوان بھی الجھا ہوا اور گم صم دکھائی دے رہا تھا۔ فخر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اندازہ ہو رہا ہے کہ یہاں مسجد کے اردگرد کچھ لوگ موجود ہیں۔ کچھ پُراسرار سے معاملات چل رہے ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ رضوان یہاں ہمارے پاس رہے۔''

''کن معاملات کی بات کررہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

فخر اور پہلوان نے ایک ساتھ رضوان کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ وہ خود ہی بتائے۔ رضوان نے اپنی چھوٹی چھوٹی خوب صورت داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب! وہ آس پاس موجود ہیں۔ پرسوں رات میرے کمرے کا وہ دروازہ دیر تک بجتا رہا جو مسجد کے صحن کی طرف کھلتا ہے۔ میں نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور دروازہ کھول کر دیکھا لیکن کوئی نہیں تھا۔ بس مجھے ایک پرچھانواں سا نظر آیا، وہ اوپر سے پکی زمین پر گرا اور پھر یوں اچھلا جیسے ربڑ کی گیند اچھلتی ہے۔ مجھے تو یہی لگا کہ وہ اوپر درخت کی شاخوں میں کہیں گم ہوگیا ہے۔ بہرحال میں نے اسے وہم ہی سمجھا اور خود کو تسلی دی لیکن کل رات پھر یہی کچھ ہوا ہے۔ چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آتی رہی۔ لیکن یہ انسانی قدموں کی آواز نہیں تھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، کوئی جانور بھی نہیں لگتا تھا۔ پھر شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں ایک بار پھر پستول لے کر موقع پر پہنچا۔ میرے کوارٹر میں چھوٹا سا کچن ہے اس کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے ٹوٹے شیشے سے باہر جھانکا۔ مسجد کے صحن کے ساتھ ساتھ گارڈینیا کی جو باڑ ہے وہاں مجھے دو نقطے چمکتے نظر آئے۔ یہ کسی کی آنکھیں تھیں۔ میں نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ ایک دم آنکھیں نظر آنا بند ہوگئیں لیکن پھر ایک دم یہی آنکھیں ایک درخت پر نظر آئیں۔ جیسے وہ کوئی چھلاوا ہو۔ جو ابھی یہاں تھا ابھی تیس چالیس فٹ دور چلا گیا۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ درخت پر نظر آنے والی آنکھیں کسی دوسری چیز کی ہوں۔ اگلے روز صبح کو میں نے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے آس پاس پکی زمین پر نشان وغیرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی پر کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

پہلوان نے رضوان کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ کوئی ہوائی چیز تھی تو پھر اس کے پاؤں کہاں ہوویں گے۔ مجھے تو لگت ہے کہ یہ چیزیں مولانا حبیب صاحب کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ مولانا کیونکہ مسجد کے اندر ہوت ہیں اس لیے وہ چیزیں مسجد کے آس پاس ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہیں۔''

فخر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''پہلوان جی کا خیال ہے کہ یہ ''ہوائی اشیا'' دارچ یا اس کی فیملی کے کسی فرد نے پال رکھی ہیں..... اور ان چیزوں کو اپنے دشمنوں کا دھڑن تختہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔''

پہلوان نے غور کر فخر کو دیکھا۔ جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ فخر نے یہ بات سنجیدگی سے کہی ہے یا مذاق سے۔ اگر پہلوان کو غصہ آجاتا تو یقیناً اگلے آدھ پون گھنٹے تک ہوائی اور زمینی چیزوں کے حوالے سے زبردست قسم کی بحث ہوتی اور ہمیں پہلوان کے کئی دھواں دھار

PakiBooks.Site

آہنگ والے ذاتی شعر بھی سننا پڑتے۔ میں نے بروقت مداخلت کر کے موضوع بدلا اور فخر کو ایک بڑی مصیبت سے بچایا۔

یہ تین بیڈ والا کمرا تھا۔ ایک بیڈ تو بمشکل پہلوان کو ہی سہولت فراہم کرتا تھا۔ دو بیڈز کو جوڑ کر ہم تینوں نے شیئر کر لیا۔ میں نے فخر وغیرہ کو مختصراً آگاہ کیا کہ وہاں لالہ موئی میں خورسند سے کیا بات چیت ہوئی ہے۔ میری طرح فخر، رضوان اور پہلوان کو بھی سجاول کی طرف سے شدید تشویش محسوس ہوئی۔ رات کوئی ڈیڑھ دو بجے کا عمل تھا جب پہلوان حشمت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا یا شاید وہ ابھی تک سویا ہی نہیں تھا۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کرنا چاہی مگر بجلی گئی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا چاچا حشمت؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے دروازے کے پاس کچھ کھسر پھسر سی لگت ہے۔''

فخر نے بیزاری سے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''پر تو میں نے نہیں سنی لیکن شاید تھوڑی سی کھسر ہوئی ہوگی۔''

پہلوان نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ کوریڈور میں بھی نیم تاریکی تھی، کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پہلوان نے اِدھر اُدھر جھانک کر دروازہ پھر بند کر دیا...... اور پھر کھڑکی کے کھٹکے وغیرہ بھی اچھی طرح چیک کیے...... ہم دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

فخر نے میرے کان میں غنودگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ پہلوان جی نے ہوائی چیزوں کو یہاں بلا کر ہی چھوڑنا ہے۔''

یہ وہ لمحے تھے جب میں نے کمرے میں ایک بہت ہلکی سی بے نام سی بُو محسوس کی لیکن میں بھی نیم غنودگی میں تھا اس لیے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ جلد ہی میں پھر سے سو گیا۔ یقیناً فخر اور رضوان بھی سو گئے۔ پہلوان کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں ایک ساعت شکن شور کے ساتھ جاگا۔ اندھیرے کمرے میں کوئی تھا...... اور رضوان سے چمٹا ہوا تھا۔ تب مجھے رضوان کی دردناک کراہ سنائی دی۔

پھر شاید رضوان نے اپنے مدِمقابل کو کوئی ضرب لگائی تھی۔ ایک پرچھائیں سی رضوان سے جدا ہو کر ٹی وی سے ٹکرائی اور اسے چکنا چور کر گئی۔ اندھیرے کے سبب یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ ٹی وی سے ٹکرانے اور اسے گرانے والا خود حملہ آور تھا یا رضوان تھا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے اپنا بریٹا پسٹل نکالا...... اور پھر سوئچ بورڈ کی طرف جھپٹا مارا۔ لائٹ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اسی دوران میں ایک کرسی ٹوٹنے کی واضح آواز سنائی دی...... اور اس کے ساتھ ہی پہلوان حشمت کی للکار بھی ابھری۔ اس نے کسی چیز سے حملہ آور کو طوفانی ضرب لگائی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی ٹھیک سے سمجھ پاتا، کمرے کی بائیں جانب والی کھڑکی کا شیشہ دھماکے سے ٹوٹا اور پرچھائیں اوجھل ہو گئی۔ مجھے بس اس کے زردی مائل لباس کی ہلکی سی جھلک ہی دکھائی دی۔

''رضوان تم ٹھیک ہو؟'' فخر کی پکارتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

رضوان کا جواب سنے بغیر میں پستول بدست کمرے سے نکل آیا اور اس سمت بڑھا جدھر پرچھائیں اوجھل ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کی طرف سے پنجابی چوکیدار کی بلند آواز آئی۔ ''اوئے کون ہے؟''

اس کے ساتھ ہی اس کی کربناک چیخ سنائی دی۔ شاید اس پر حملہ کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اپنے موبائل وغیرہ کی ٹارچیں روشن کر لی تھیں، ان میں، میں بھی شامل تھا۔ چوکیدار کے چلانے کی آواز سیڑھیوں کے نچلے سرے سے آئی تھی۔ میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تو ایک خوفناک منظر نظر آیا۔ فربہ اندام چوکیدار کا نرخرہ اُدھڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے آناً فاناً اس کی گردن پر ایک تیز دھار چھری چلا دی ہے۔ خون اس کی گردن میں سے ہلکوروں کے ساتھ ابل رہا تھا اور فرش کی ٹائلوں پر پھیل رہا تھا۔ کسی نے بوکھلا کر اس کے زخم پر ایک کپڑا رکھ کر دبا دیا لیکن خون کا یہ اخراج ایسا نہیں تھا جو یوں رک سکتا۔

میں نے کپڑا ہٹا کر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ یہ عجیب سا زخم تھا۔ گردن پر ایک نہیں دو تین کٹ تھے لیکن ایک کٹ اتنا گہرا تھا جس نے بدقسمت شخص کی شہ رگ جزوی طور پر کاٹ ڈالی تھی۔ اب شور ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف سے اٹھ رہا تھا۔ زخمی پر فقط ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں شور کی جانب لپکا۔ یہی وقت تھا، جب لائٹ آ گئی۔ ہوٹل میں روشنی ہو گئی۔ میں چھوٹے سائز کے ڈائننگ ہال سے گزر کر عقبی سیڑھیوں کی طرف آیا۔ یہاں سات آٹھ افراد جمع ہو چکے تھے۔ ایک ملازم لوہے کے ایک چھوٹے دروازے کی طرف اشارے کر رہا تھا اور واویلا مچا رہا تھا۔ یہ ہوٹل کا ایک ویٹر ہی تھا۔ وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''وہ اِدھر ہی گھسا ہے، اندھیرا تھا، پھر بھی مجھے صاف پتا

چلا ہے، وہ اندر ہی ہوگا۔'' اس کے لہجے میں یقین تھا۔

اب دروازے کے سامنے دس پندرہ افراد جمع ہو چکے تھے۔ اکثر چہروں پر ہراس تھا۔ سیڑھیوں کی طرف سے بھی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زخمی ہونے والے پنجابی چوکیدار کو اسپتال پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ویٹر جس دروازے کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ ایک تہ خانے میں کھلتا تھا۔ ایک تنگ سا زینہ نیچے اترتا دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے مکمل خاموشی تھی۔ کسی نے کہا۔ ''پولیس کو اطلاع دو۔''

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''وہ اکیلا بندہ ہے۔ ہمت کر کے اندر گھسو، پکڑ لو اُسے۔''

پہلے نے کہا۔ ''تو تم گھسو اندر۔ ہم تمہارے پیچھے ہیں۔''

دوسرا شخص جو ایک لمبا چوڑا پنجابی گبرو تھا، دروازے کے قریب گیا مگر ایک عمر رسیدہ شخص نے اسے کندھے سے تھام کر روک لیا۔ ''بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کوئی ہتھیار ہے تو پھر جاؤ اندر۔''

بریٹا پسٹل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور میرے پاس اس کا باقاعدہ لائسنس بھی تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ہے ہتھیار۔ میں دیکھتا ہوں۔''

کئی افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ ان کی باتوں کا مفہوم یہ تھا کہ اندر گھسنے کے بجائے حملہ آور کو پہلے باہر آنے کی وارننگ دی جائے۔

اس مشورے پر عمل ہوا۔ گھونگرالے بالوں والے گوجر نما پنجابی گبرو نے دروازے کو لات مار کر کھولا اور للکار کر بولا۔ ''تم جو بھی ہو، باہر آ جاؤ۔ ورنہ اندر ہی مارے جاؤ گے۔ یہاں پھنس تو گئے ہو پر نکل نہیں سکتے ہو تم۔''

اس وارننگ کو دو تین بار مختلف الفاظ میں دہرایا گیا مگر نتیجہ کوئی نہیں نکلا۔ اندر تقریباً خاموشی رہی۔ اب پہلوان حشمت اور فخر وغیرہ بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور لوہے کے دروازے سے گزر کر اندر چلا گیا۔ تہ خانے میں ہلکی روشنی موجود تھی۔ تنگ زینوں پر احتیاط سے قدم رکھتا میں نیچے پہنچ گیا۔ یہ تہ خانہ قریباً تیس فٹ ضرب بیس فٹ کا ہوگا۔ اس کے دو پورشن تھے۔ تہ خانہ سیلن زدہ تھا اور اس کی مجموعی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یہاں ہوٹل کا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ چند دیگچے، ٹوٹی ہوئی تین چار کرسیاں، ایک جہازی سائز کے ریفریجریٹر کا ڈھانچا، دو تین بے کار گیس سلنڈر وغیرہ۔

میں نے دروازے کی آڑ لے کر بڑی احتیاط سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میں نے انگلی پسٹل کے ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔ مجھے بظاہر کہیں بھی کسی متنفس کے آثار دکھائی نہیں دیے...... لیکن ویٹر نے جس یقین کے ساتھ واویلا مچایا تھا اسے کچھ نہ کچھ تو دکھائی دیا ہی تھا۔ میرے بعد فخر اور گرانڈیل پنجابی گبرو بھی احتیاط سے قدم رکھتے نیچے اتر آئے۔ اس کے بعد چار پانچ مزید افراد نے حوصلہ کیا اور سیڑھیوں پر آ گئے۔ ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں پمپ ایکشن رائفل بھی دکھائی دے رہی تھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ اس ہوٹل کے مالک کا بیٹا تھا۔

اگلے پانچ منٹ میں تہ خانے کے سارے کونے کھدرے دیکھ لیے گئے۔ وہاں کچھ نہیں ملا لیکن یہ بات تو تقریباً کنفرم تھی کہ حملہ آور ابھی اس ہوٹل کے اندر ہی کہیں ہے۔ سب لوگ تہ خانے سے نکل کر ہوٹل کی دونوں منزلوں پر پھیل گئے۔ کچھ چھت پر چڑھ گئے۔ میں، فخر اور پہلوان واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ فخر نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں کلائی کو تھام رکھا تھا۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چوٹ لگی ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔'' فخر نے اپنی کلائی کا بڑا سا نیل دکھاتے ہوئے کہا۔

''اور رضوان؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے پسلیوں پر چوٹ آئی ہے۔ خون بھی نکل رہا تھا۔ اسے زخمی چوکیدار کے ساتھ ہی اسپتال لے گئے ہیں۔ ویسے وہ خیریت سے ہے۔ میں نے اس کا زخم دیکھا ہے۔''

''کس چیز کا زخم تھا؟''

''کوئی تیز دھار آلہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی شیشہ لگ گیا ہو۔ وہ ٹوٹے ہوئے ٹی وی پر گرا تھا۔''

''لیکن میرا خیال کچھ اور ہے۔''

''کیا مطلب؟'' فخر نے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔''

ہمارے کمرے کے سامنے بھی کئی افراد جمع تھے......

وہ سب ٹوٹی ہوئی کھڑکی اور چکنا چور ہو جانے والے ٹی وی سیٹ کو ہراس آمیز تجسس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ایک بستر پر خون کے کچھ دھبے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ یقیناً رضوان کے زخم سے ٹپکنے والا خون تھا۔ ہوٹل کے مالک کا ''رائفل بدست بیٹا'' بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بڑا تیز طرار

بن رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں گاؤدی پن صاف جھلک دکھاتا تھا۔ وہ کچھ ڈرا ہوا بھی تھا اور ڈر کی وجہ بھی عیاں تھی۔ دراصل جب یہ واقعہ ہوا ہوٹل میں دو چار ایمرجنسی لائٹوں کے علاوہ مکمل تاریکی تھی۔ کوئی بھی حملہ آور کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ یہاں تک کہ ہم بھی نہیں جن کے کمرے میں وہ گھسا تھا۔ تہ خانے کے قریب بیرے کو بھی بس ایک پرچھائیں سی دکھائی دی تھی۔ اب یہ پرچھائیں کسی چیز کی بھی ہو سکتی تھی۔

ہوٹل مالک کے بیٹے نے ہم سے سوال جواب شروع کر دیے کہ ہماری کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں ہے..... اور کیا وجہ ہے کہ حملہ آور سب سے پہلے ہمارے کمرے میں گھسا۔ پہلوان اس سوال پر غیض میں آ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ نوجوان سے جھگڑ پڑتا، میں نے اور فخر نے معاملہ سنبھال لیا۔

ہوٹل کی چھت پر اور اردگرد کی چھتوں پر ابھی تک تلاش جاری تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد فخر سے کہا۔ ''ان لوگوں کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ حملہ کرنے والا آس پاس کہیں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' فخر نے ذرا چونک کر اور حیران ہو کر کہا۔

''وہ وہیں نیچے اس تہ خانے میں موجود ہے۔'' میں نے انکشاف کیا۔

فخر اور پہلوان کے چہرے ایک ساتھ حیرت کی آماجگاہ بن گئے۔ ''یہ تم کیا کہوت ہو شاہ زیب!'' پہلوان لرزاں آواز میں بولا۔ ''وہاں تو کچھ بھی نظر نا ہیں آیا۔''

''اس نے نظر آنا بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ انسان نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

پہلوان حشمت کا چہرہ تاریک ہو گیا اور آنکھوں کے ڈیلے بے ساختہ باہر کو اُبل پڑے۔ فخر بھی تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا مذاق کر رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''مذاق نہیں ہے فخری! وہ اس لیے نظر نہیں آیا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ وہ ایک مختصر سی جگہ پر بھی چھپ سکتا ہے۔ وہ ایک جانور ہے۔''

''جانور؟'' فخر کی متحیر نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

میں دھیان سے اس بستر کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک دو جگہوں پر خون کے دھبے تھے۔ یقیناً یہ رضوان کے زخم سے نکلنے والا خون ہی تھا۔ میں نے چادر پر سے کچھ خاکستری بال اٹھائے اور انہیں روشنی کی طرف کر کے توجہ سے دیکھا۔ یقیناً یہ انسانی بال نہیں تھے۔ فخر اور پہلوان حشمت بھی ان بالوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

''یہ کس کے بال ہیں؟'' فخر نے پوچھا۔

''میں پچاس ساٹھ فیصد تو جان گیا ہوں لیکن ابھی کنفرم ہونا باقی ہے۔''

''یار پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔'' فخر نے کہا۔

پہلوان حشمت منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کی صورت دیدنی تھی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تہ خانے میں جو چیز چھپی ہوئی ہے..... وہ ایک بندریا ہے۔ ایک بندریا جو خونخوار ہو چکی ہے۔''

''یہ تم کیا کہوت ہو؟ کہیں تم پر بھی تو کسی چیز کا سایہ نا ہیں ہو گیا۔'' پہلوان حشمت نے ہراساں آواز میں خیال ظاہر کیا۔

میں نے فخر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''چاچا حشمت کو تو معلوم نہیں، لیکن تم تو اس وقت میرے ساتھ تھے جب ہم نے صادق آباد میں ہاناوالی کے درشن کیے تھے۔ وہ اس وقت سجاول کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی.....''

ایک دم جیسے فخر کو یاد آ گیا۔ وہ بولا۔ ''ہاں..... اس وقت ہمیں ہاناوالی کی گود میں ایک بندریا نظر آئی تھی.....''

''یہ وہی ہے فخر! مجھے ساٹھ فیصد سے زیادہ یقین ہے کہ یہ وہی بندریا ہے۔ یہ بال دیکھو، یہ کسی اور جانور کے نہیں ہو سکتے۔''

فخر کے چہرے پر بھی اب ہیجان نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک توقف کے بعد بولا۔ ''اگر تمہیں پتا لگ گیا تھا کہ وہ تہ خانے میں ہے تو پھر اسے مارنے یا پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''اس کی وجہ ہے۔ میں یہ کوشش سب کے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن اگر وہ واقعی وہاں ہے تو پھر وہاں سے نکل بھی سکتی ہے۔ مزید نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' فخر نے کہا۔

''نہیں نکلے گی۔ مالک کے بیٹے نے تہ خانے کو باہر سے لاک لگا دیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم پھر تہ خانے میں اتریں گے۔ ذرا یہ ہلچل ختم ہو جائے۔'' بات اب فخر کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

☆☆☆

دس پندرہ منٹ بعد رضوان سے ہمارا رابطہ ہو گیا۔ وہ ایک قریبی اسپتال میں تھا۔ اس نے فون پر بتایا کہ اس کے زخم کی بینڈیج ہو گئی ہے۔ اسے کچھ ٹانکے بھی لگائے گئے تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔''

اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں اس نے وہی کچھ بتایا جس کا مجھے اندازہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوئی تیز پنجوں والا جانور تھا، وہ اسے کتا یا بڑے سائز کا بلا سمجھا تھا۔ تاہم حملے کے دوران میں جو مدھم سی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچی تھیں وہ کتے یا بلے کی نہیں تھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ یہاں پہنچے اسے سب پتا چل جائے گا۔ وہ اس بات پر بھی سخت اُلجھن میں تھا کہ حملہ آور جو کوئی بھی تھا، بند کمرے میں کیسے پہنچ گیا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''تمہیں یاد ہے سب سے پہلے چاچا حشمت کو کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ جھانکا تھا یا نہیں؟'' رضوان نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے کہا۔ ''حملہ کرنے والے نے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا اور اس وقت کمرے میں کھسک آیا۔ بعد میں ہم نے دروازہ اندر سے پھر لاک کر لیا۔ اس حوالے سے کافی حد تک رضوان کی تسلی ہو گئی۔

رضوان نے کہا۔ ''میرے ساتھ جس زخمی چوکیدار کو یہاں لایا گیا تھا، وہ مسلسل بے ہوش ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

رضوان کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد ہم نے اپنی توجہ اصل کام پر مرکوز کی۔ مالک کے بیٹے نے تہ خانے کے دروازے کو باہر سے تالا لگایا تھا اور چابی میرے سامنے ہوٹل کے ہیڈ ویٹر کو دی تھی۔ یہ ہیڈ ویٹر طوطے جیسی ناک والا ایک دبلا پتلا گنجا شخص تھا۔ ہم نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ہوٹل کے دیگر عملے کی طرح وہ بھی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہوٹل میں اور ہوٹل کے باہر حملہ آور کی تلاش ناکام رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ کوئی پھرتیلا بچہ تھا جو آناً فاناً دو بندوں کو زخمی کر کے غائب ہو گیا ہے۔ گہرے اندھیرے میں بس اس کی پرچھائیں ہی دکھائی دی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟''

اس نے رازداری کے انداز میں کہا۔ ''نہیں، ابھی تک نہیں۔ یہ مالکوں کا کام ہے، پتا نہیں کہ وہ دیتے بھی ہیں یا نہیں۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ شاید ہوٹل والوں کے اپنے کوئی ایشوز ہیں جن کی وجہ سے وہ پولیس کو اطلاع دینے سے کترا رہے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے منظور نامی اس ہیڈ ویٹر کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ ویسے بھی وہ لالچی بندہ تھا۔ ایسے لوگوں کو شیشے میں اتارنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

میں نے منظور سے پوچھا۔ ''تہ خانے کی چابی تمہارے پاس ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''آہو جی۔ میرا کمرا تہ خانے کے دروازے کے ساتھ ہی ہے۔ میں اب تک وہیں پر تھا۔ شروع میں، میں نے ہی رولا ڈالا تھا کہ کوئی تہ خانے کی طرف آیا ہے۔ ویسے مجھے تو اب بھی شک ہے کہ کوئی اندر گھسا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''منظور! ہمیں بھی لگتا ہے کہ تمہارا شک درست ہے۔''

منظور نے اپنی گول گول آنکھوں کو نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور مزید حیران نظر آنے لگا۔ فخر نے اس سے پوچھا۔ ''دروازہ لاک ہونے کے بعد تمہیں اندر سے کوئی آواز وغیرہ تو سنائی نہیں دی؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے آواز کا شک بھی ہوا ہے۔''

میں نے منظور کو مختصر الفاظ میں سمجھایا کہ ہم کیا چاہ رہے ہیں۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا اور ڈرے ڈرے انداز میں ہماری طرف دیکھتا رہا۔

بجلی ایک بار پھر جا چکی تھی۔ نچلے درجے کے اس ہوٹل میں مختلف جگہوں پر پورٹ ایبل لائٹس اور گیس لیمپ تھوڑی بہت روشنی دے رہے تھے۔ ہوٹل میں مقیم زیادہ تر لوگ دوبارہ اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عملے کے بیشتر لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ ہوٹل کے بیرونی دروازے کے پاس دو تین کی ٹولیوں میں کھڑے لاحاصل تبصروں میں مصروف تھے۔ میں اور فخر..... منظور کی رہنمائی میں بڑی خاموشی کے ساتھ تہ خانے کے آہنی دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ منظور نے مجھے ایک بھاری کمبل فراہم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی ٹارچ تھی جو فخر کے پاس تھی۔ ایک چھوٹی ٹارچ میں نے بھی اپنے پسٹل سمیت قمیص کے نیچے اُڑس رکھی تھی۔ دستانوں کا ایک جوڑا بھی میرے پاس موجود تھا۔ یہ رات کے قریباً تین بجے کا عمل تھا۔ ہمارے کمرے پر ہونے والے حملے کو..... اور اس کے نتیجے میں بھگدڑ والی بھاگ دوڑ کو اب تقریباً ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل

PakiBooks.Site

بار بار یہ گواہی دے رہا تھا کہ تہ خانے کی تاریکی میں وہ لومی نامی بندریا موجود ہے جو ہم نے چند روز پہلے ہانا دانی کی گود میں دیکھی تھی..... میرے کہنے پر منظور نے بڑی آہستگی سے ہضمی قفل میں چابی گھمائی اور خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اور فخر آگے پیچھے تہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچے۔ منظور نے دروازہ بند کیا اور ہم نے اسے اندر سے بولٹ کر دیا۔ میرے پاس بھاری بھرکم کمبل تھا۔ اپنا پستول میں نے فخر کو تھما دیا۔ بڑی ٹارچ بھی اس کے پاس تھی۔ اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے ٹارچ کا روشن دائرہ اسی جہازی سائز کے ریفریجریٹر پر ڈالا جو ایک بیکار ڈھانچے کی صورت دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ ریفریجریٹر اور دیوار کے درمیان بمشکل، چھ سات انچ کا فاصلہ ہوگا۔

فخر نے سرگوشی کی۔ ''یہ تو بڑی تھوڑی سی جگہ ہے۔''

''لیکن وہ جو کوئی بھی ہے یہیں پر ہے۔ میں نے اس خلا میں اس کی چمکتی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اب وہ کہیں اور چھپ گئی ہو..... یا چھپ گیا ہو۔ تم بالکل چوکس رہو۔ اگر گولی چلانے کی ضرورت پڑے تو بالکل دریغ نہ کرنا۔''

''بے فکر رہو۔ سیدھا ماتھے پر ماروں گا۔'' فخر نے سرگوشی میں جواب دیا۔

تہ خانے میں مکمل سناٹا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کوئی ذی روح ہے ہی نہیں۔ ہم بڑی احتیاط سے چلتے ریفریجریٹر کے چھ سات فٹ اونچے ڈھانچے کے قریب پہنچے..... پروگرام یہی تھا کہ فخر ریفریجریٹر کے عقبی خلا میں ایک جانب سے روشنی پھینکے گا اور آہٹ پیدا کرے گا۔ جانور دوسری طرف سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور میں اس پر کمبل پھینک کر اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کروں گا مگر جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع تھا۔ ابھی ہم ریفریجریٹر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کھڑکھڑاہٹ ہوئی، اس کے ساتھ ہی وہ تیز غصیلی آواز ابھری جو ''بندر جاتی'' سے مخصوص ہوتی ہے۔ ایک پرچھائیں برق رفتاری سے مجھ پر جھپٹی۔ شکر کا مقام تھا کہ کمبل میرے ہاتھوں میں تھا اور میں نے اسے تقریباً کھولا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کے لیے کمبل کو اپنے سامنے کیا۔ پرچھائیں کمبل سے ٹکرائی اور زوردار دھچکے کے سبب میں پشت کے بل گرا۔ یہی وقت تھا جب فخر کی ٹارچ کا روشن دائرہ حملہ آور جانور پر پڑا۔ بے شک وہ بندریا لومی تھی۔ جاماجی میں بھی وہ ہمیشہ لباس میں نظر آیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر کوئی فراک نما پیراہن تھا۔ میں نے تیزی سے اسے اپنے کمبل کے لپیٹے میں لینا چاہا۔ مگر پھر وہ بُری طرح مچلی۔ اس نے اپنے بالائی دھڑ کو آزاد کرا کے اپنے دانت میرے کندھے میں گاڑ دیے۔ اس کا انداز وحشیانہ تھا۔ اگر ان لمحوں میں، میں اس کے نچلے دھڑ کو چھوڑ دیتا تو وہ یقیناً اپنے پنجوں سے مجھے اُدھیڑ ڈالتی۔ وہ ایک درمیانے سائز کی بندریا تھی لیکن اس وقت اس کے جسم میں کسی خون آشام شکاری جانور کی سی طاقت محسوس ہوتی تھی۔ میرے کندھے سے درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ ان ساعتوں میں فخر نے بروقت ردِعمل دیا۔ میرا بریٹا پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پسٹل کے دستے کی دو کراری ضربیں لومی کی کھوپڑی پر لگائیں۔ پہلی ضرب پر تو وہ تڑپی لیکن دوسری ضرب پر ادھ موئی سی ہو کر میرے کندھے سے علیٰحدہ ہو گئی۔ فخر نے احتیاطاً ایک اور ضرب اسے رسید کی۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح تہ خانے کے گرد آلود فرش پر گر گئی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' فخر نے بے تابی سے پوچھا اور ٹارچ کی روشنی میرے کندھے پر ڈالی۔ اسے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ شاید اس بپھرے جانور نے میری گردن میں دانت گاڑے ہیں۔

قمیص پر خون کا چھوٹا سا داغ نمودار ہو گیا تھا۔ تاہم زخم گہرا نہیں تھا۔ ہم نے پھرتی کے ساتھ لومی کو کمبل میں لپیٹا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں نے دروازے سے کان لگائے۔ تہ خانے میں تھوڑی بہت آوازیں پیدا ہوئی تھیں لیکن یہ باہر تک نہیں پہنچی تھیں اور دروازے کی دوسری جانب خاموشی تھی..... لومی کو فخر نے اٹھا رکھا تھا۔ میں نے بغیر آواز پیدا کیے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ حسبِ توقع منظور وہاں موجود تھا۔

''سب ٹھیک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آہو جی، سب ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تب اس کی نگاہ فخر کے کندھے پر رکھے کمبل پر پڑی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے کسی بچے کو کمبل میں لپیٹ کر اٹھا رکھا ہے۔ منظور کی گول آنکھوں میں حیرت کی یلغار نظر آئی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بجلی ابھی تک غائب تھی۔ لومی سمیت اپنے کمرے تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

ہمارے پہنچنے تک پہلوان حشمت نے مالک کے بیٹے سے کہہ کر اپنا کمرا تبدیل کرا لیا تھا۔ پہلے کمرے کی کھڑکی ٹوٹ چکی تھی اور ٹی وی کے علاوہ فرنیچر بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔ یہ دوسرا کمرا بھی تقریباً پہلے جیسا ہی تھا۔ اس میں بھی تین بیڈ تھے تاہم کھڑکی میں لوہے کی گرل تھی۔ ہمارا مختصر سامان بھی اس دوسرے کمرے میں شفٹ ہو چکا تھا۔

ہم نے کمرا اندر سے بند کیا اور پردے برابر کر دیے۔ منظور واپس نیچے جا چکا تھا۔ میں نے اس کی جیب میں ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ڈالے تھے اور اسے مکمل رازداری کا پابند کیا تھا۔

ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں ہم نے کمبل کو کھولا اور لومی کا معائنہ کیا۔ فخر نے اسے جو دوسری چوٹ لگائی تھی اس کے سبب اس کی کنپٹی سے تھوڑا سا خون بھی رسا تھا۔ اس کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے وہ ہنس رہی ہے لیکن وہ بے ہوش تھی۔ اس نے ایک زرد پھولدار فراک اور سرخ نیکر پہن رکھی تھی۔ نیکر کے عقبی سوراخ میں سے اس کی لمبی دم باہر نکلی ہوئی تھی۔ لگ بھگ چالیس پاؤنڈ کی وہ ایک خوب صورت بندریا تھی۔ جاماجی کی لڑائی کے آخری راؤنڈ میں اس نے زبردست کارکردگی دکھائی تھی اور اپنے مالک خانساماں ازمیر طیب کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں ایک حیران کن کردار ادا کیا تھا لیکن اب وہ خود کسی کے چنگل میں تھی۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انسانوں کی طرح جانور بھی ٹراما سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ ''کنجیشن'' کے زیرِ اثر تھی اور ایک خونخوار جانور کا روپ دھار چکی تھی۔

پہلوان نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ''میں تو کہوت ہوں کہ اس کو دو چار چوٹیں اور لگاؤ، اور اس کی کھوپڑی توڑ کر کہیں پھینک دو اِسے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! اگر کھوپڑی توڑنی ہوتی تو پھر اسے پکڑنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔ یہ جانور ہمارے بہت کام آنے والا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''ابھی چند گھنٹوں میں پتا چل جائے گا آپ کو۔''

میں نے فخر کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اسی دوران میں پہلوان کی نگاہ میرے کندھے سے رسنے والے خون پر پڑی۔ وہ ایک دم زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں اسی بندریا نے دانت آزمائے ہیں۔ وہ جلدی سے نیچے گیا اور پسی ہوئی سرخ مرچیں لے آیا، بولا۔ ''جانور کے کاٹے کا فوراً علاج ہونا چاہیے سرخ مرچیں جراثیموں کو مارتی ہیں۔''

فخر نے ابھی تک اپنی مضروب کلائی دبا رکھی تھی، وہ بولا۔ ''پہلوان جی! آپ کو پہلے میری مرہم پٹی کرنی چاہیے..... کیونکہ یہ چوٹ بھی آپ کی لگائی ہوئی ہے۔''

اگست 2018ء کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور

ملک صفدر حیات کی تھانے داری

سنگین خاتمہ

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت کو متزلزل کرنے والے ضمیر فروش لوگوں کی عبرت انگیز داستان..... آخری صفحات پر **نشور ہادی** کا دلربا انداز

دھوکے باز

بعض اوقات حکمران ہی نہیں بلکہ قوم بھی دھوکے بازی کا مظاہرہ کر جاتی ہے..... ایک ایسی ہی قوم کی فطرت اور دھوکے بازی کی داستان..... ابتدائی صفحات پر **علی اختر** کی کاوش

رنگ آسمان

انداز دلبری کے رنگ اور سنگین حالات کا عجیب سنگم..... **اے آر راجپوت** کے قلم سے اگلا پڑاؤ

وقت

اپنے دامن میں بے شمار راز و نیاز چھپائے وقت کی دلفریب ادا..... **حسام بٹ** کے خیالات کی پرواز

اس کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، شاہ زین رضوان، محمد فاروق انجم، مظہر سلیم ہاشمی اور زبیر حسین کی سبق آموز کہانیاں

پہلوان جواب دینے کے بجائے تھوڑا سا خجل نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ دو گھنٹے پہلے جب لوسی پُراسرار طور پر ہمارے کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے رضوان پر حملہ کیا تو دھینگا مشتی کا سماں بن گیا۔ عالم گھبراہٹ میں پہلوان جی نے ٹوٹی ہوئی میز کا پایہ اس طرح گھمایا کہ وہ بندر یا کے بجائے فخر کی کلائی پر لگا اور اس کی ہڈی ٹوٹنے میں بس انیس بیس کی کسر رہ گئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے فخر کو دیکھا تو وہ کراہنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ اس چوٹ کے لگنے میں مجھ خاکسار کا ہی قصور ہے، نہ میں ہوائی چیزوں کے بارے میں پہلوان جی سے بحث کرتا، نہ ان کی طبع میں غصے کی پیداوار ہوتی اور نہ مجھے یہ سزا ملتی۔''

پہلوان نے بھنّا کر کہا۔ ''الٹا چور لنکا ڈھائے۔ میں نے تم دونوں کو بچانے کی کوشش کی اور تم مجھ پر الزام دھرت ہو کہ میں نے جان بوجھ کر مارا یہ تو وہی بات ہوئی ناں

جو تیر اُن کی طرف آیا، ہم نے سینے پر کھایا
جب ہم مر گئے تو انہوں نے بھنگڑا پایا۔''

..... شاید یہ بحث طول پکڑتی لیکن اسی دوران میں رضوان بھی اسپتال سے فارغ ہو کر ہوٹل پہنچ گیا۔ اس کی پسلیوں کو ڈھانپنے والے گوشت پر بارہ ٹانکے لگے تھے مگر وہ حوصلے میں تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرانی منجمد تھی۔ یہ حیرانی صرف رضوان کو ہی نہیں اس کے زخم کو ٹریٹ کرنے والے ڈاکٹرز کو بھی تھی۔ انہوں نے واضح طور پر بتایا تھا کہ یہ کسی جانور کی وحشت کا نتیجہ ہے لیکن جانور کیا تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکا تھا، چوکیدار اور رضوان کے جسم سے چند بال اٹھا کر لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج دیے گئے تھے۔

بندر یا لوسی کمبل کے اوپر بستر پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر پہلوان حشمت کا بلڈ پریشر مسلسل لو ہو رہا تھا۔ اسی تناؤ کو ختم کرنے کے لیے اس نے جائے نماز بچھائی اور نوافل پڑھنا شروع کر دیے۔ جب وہ رکوع میں گیا تو اسے بتایا گیا کہ اس نے مغرب کے بجائے مشرق کی طرف رخ کر رکھا ہے۔ نتیجے میں اس نے سلام پھیرا اور اپنا قبلہ درست کیا۔

جو کچھ ہم نے سوچ رکھا تھا، وہ دوپہر تک عملی شکل میں سامنے آ گیا۔ میری درخواست پر داؤد بھاؤ نے دو گھنٹے کے اندر اس ''VHF ریڈیو ٹرانسمیٹر'' کا انتظام کر دیا جو جنگلی جانوروں کی لوکیشن معلوم کرنے کے لیے ان کے جسم کے اندر لگایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک بالکل چھوٹی سی سرجری کی ضرورت ہوتی ہے۔ فخر شکاریات کا خاصا تجربہ رکھتا تھا اور ریڈیو ٹرانسمیٹر وغیرہ لگانے کا تجربہ بھی رکھتا تھا۔ ہم نے لوسی کی مشکیں اچھی طرح کس رکھی تھیں اور اس کی آواز دبانے کے لیے اس کے منہ پر چوڑی ٹیپ بھی چڑھا رکھی تھی۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر آ گیا تو فخر نے لوسی کو جسم سن کرنے والا انجکشن دیا۔ رضوان ٹی بھی ایک عرصہ تک ڈاکٹر ارم کا اسسٹنٹ رہا تھا اور سرجری کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر ٹرانسمیٹر لوسی کی گردن کے نیچے لگا کر اسٹچنگ کر دی۔ لوسی کے بال خاصے بڑے تھے۔ اسٹچنگ تقریباً چھپ کر رہ گئی۔ اب خصوصی توجہ کے بغیر اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ (جانور کے کاٹے کا انجکشن میں صبح سویرے ہی لگوا چکا تھا۔ اور ڈریسنگ بھی کروالی تھی)

پروگرام کے مطابق ہم نے شام تک لوسی کو اپنے کمرے کے اندر ہی رکھا۔ اس کی آنکھیں اور ناخ کلر کی تھیں۔ میں نے پہلے بھی اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھا تھا لیکن اب یہ اس کی آنکھیں نہیں لگتی تھیں اور نہ یہ اس کا چہرہ لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سے جیسے کوئی اور جھانکتا تھا۔ کسی اور کے خونی ارادے تھے جو اس کی آنکھوں میں للکارے مارتے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بڑی اچھی طرح بندھے ہوئے تھے مگر وہ پھر بھی گاہے بگاہے بے پناہ زور مارتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اپنی بندشیں توڑ ڈالے گی۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم نے لوسی کو اچھی طرح کینوس کے ایک بیگ میں بند کیا اور نیچے گاڑی میں لے آئے۔ ٹرانسمیٹر کے سگنل وصول کرنے والا انٹینا بھی ہمارے پاس موجود تھا اور بالکل درست کام کر رہا تھا۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم لاہور کے شمالی علاقے میں پہنچے اور منٹو پارک کے قریب ایک خالی سڑک پر لوسی کو آزاد کر دیا۔ اسے آزاد کرنے سے پہلے میں نے اپنا پسٹل بالکل تیار حالت میں کر لیا تھا، کیونکہ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ وہ پلٹ کر حملہ کر دے۔ کہنے کو تو وہ ایک درمیانے سائز کی مادہ بندر تھی لیکن اپنی خاص کیفیت کے زیرِ اثر اس میں کسی درندے جیسی طاقت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے وہ لمحے یاد تھے جب اس نے الماری کے خلا کے عقب سے نکل کر مجھ پر جست لگائی تھی۔ وزنی کمبل میرے سامنے تھا جس نے مجھے اس کے پنجوں سے محفوظ رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں دھکے کے سبب دور تک لڑھک گیا تھا۔

بہر طور اس موقع پر خیریت ہی گزری۔ جونہی ہم نے لوسی کی مشکیں کھول کر اسے آزاد کیا۔ اس نے اپنے چمکیلے

دانت نکالے، مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ پھر وہ تیزی سے مخالف سمت میں بھاگی اور ایک موٹر سائیکل سوار کے سامنے سے گزرتی ہوئی درختوں میں گم ہو گئی۔

''اگر اس کے گلے میں ریڈیو ٹرانسمیٹر نہ ہو تو ہم اس کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔'' فخر نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے کہا۔ ''اب کبھی ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے ٹرانسمیٹر کی رینج دس کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔''

فخر نے سگنل ریسیور آن کیا اور ہم نے لوسی کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک اسپارک کرتا ہوا نقطہ مسلسل لوسی کی لوکیشن کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یہ نقطہ مسلسل لاہور کے مضافاتی علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ فخر نے ''ایریل'' ایک ہاتھ میں تھام کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر نکال رکھا تھا اور اس کی نگاہیں اسپارک کرتے ہوئے نقطے پر تھیں۔

جلد ہی ہم شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر راوی کے پل پر پہنچے اور پھر پار نکل گئے۔ یہ جی ٹی روڈ تھی۔ یہاں ہمیں سگنل کا پیچھا کرنے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی کیونکہ سگنلز سے اندازہ ہوتا تھا کہ لوسی مین روڈ چھوڑ کر کسی ذیلی راستے پر مڑ گئی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ کسی سڑک پر ہی سفر کرتی۔ وہ جھاڑیوں اور گھنے درختوں سے گزر کر بھی اپنی منزل تک پہنچ سکتی تھی۔ یہ خیال ہمارے لیے بے حد سنسنی خیز تھا کہ ہم ایک اہم سراغ کی طرف جا رہے ہیں۔ اس بات کی امید اسّی نوے فیصد تک تھی کہ لوسی اسی مقام کی طرف جا رہی ہو گی جہاں ہاناوانی موجود تھی۔

قریباً پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد اسپارک کرتا ہوا نقطہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ لوسی اب کہیں رک گئی تھی اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ کیونکہ چھوٹی سڑکوں اور گھنے درختوں والے اس علاقے میں پہنچ کر ہمیں خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں لوسی کے ساتھ ہمارا فاصلہ بڑھ نہ جائے اور ہم اُسے کھو نہ دیں۔

ہم چار پانچ کلومیٹر مزید آگے گئے پھر رک گئے۔ ہمارے اندازے کے مطابق اب لوسی سے ہمارا فاصلہ دو کلو میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔

''کیا پروگرام ہے؟'' فخر نے مجھ سے پوچھا۔

پچھلی نشست سے پہلوان حشمت نے جواب دیا۔

''تم لوگ جانت ہو کہ میں ڈرپوک ناہیں ہوں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس باندری کو تم لوگ عام باندری نہ سمجھو۔ مجھے تو لگت ہے کہ اس پر ہوائی چیزوں کا قبضہ ہے۔ ایک عام بندر یا باندری میں اتنی طاقت ہو ہی ناہیں سکت ہے۔ تم لوگوں نے دیکھا جب ہم اس کو باندھ رہے تھے تو اس نے کس طرح ہاتھ مار کر پکی لکڑی کی کرسی کے ٹکڑے کر دیے تھے۔''

''تو ٹھیک ہے پہلوان جی۔ ہوائی چیزوں کو نکالنے کے لیے دو چار روحانی عاملوں کو یا کژک قسم کے جنات کو بلا لیتے ہیں۔'' فخر نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''حضرت ''جن پیر'' یعنی داؤد بھاؤ کے بارے میں جناب کا کیا خیال ہے۔ ان کے پاس بھی تو ٹکڑے قسم کے جنات موجود ہیں۔ ایک گاڑی میں پانچ چھ تو آ ہی جائیں گے۔ کافی ہوں گے ہمارے لیے۔''

وہ ذرا مزاحیہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ جنات سے اس کی مراد داؤد بھاؤ کے خطرناک کارندے ہی تھے۔ وہ یہاں پہنچ جاتے تو ہم زیادہ اعتماد سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ہاناوانی کسی عمارت میں ہوتی اور ہمیں اس جگہ کو گھیرنا پڑتا۔

میں نے فخر کی بات سے اتفاق کیا۔ داؤد بھاؤ کو کال ملائی اور ساری سچویشن سے آگاہ کیا۔ اس ڈرامائی سچویشن نے اسے بھی متحرک کر دیا۔ میں نے اس سے صرف پانچ چھ بندوں کی ڈیمانڈ کی تھی لیکن اس نے کہا کہ وہ دو گاڑیاں بھیج رہا ہے اور اگر ضرورت پڑی تو وہ خود بھی وہاں پہنچ جائے گا۔''

فخر بولا۔ ''لگتا ہے کہ محترم داؤد بھاؤ صاحب کو اب تھوڑا تھوڑا یقین ہونے لگا ہے کہ انیق کی موت میں سجاول سے کہیں زیادہ اسی خطرناک زنانی کا ہاتھ ہے۔''

''محسوس تو یہی ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سجاول کو بھی وہ اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔''

پہلوان حشمت نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنے یا نہ کرنے کا سوال تو تب پیدا ہووے گا جب سجاول اس شکنجے سے زندہ سلامت نکل آوے گا۔ سچ کہوت ہوں مجھے تو حالات زیادہ اچھے ناہیں لگ رہے۔''

''اگر حالات اچھے نہیں لگ رہے تھے تو آپ کو ہمارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' فخر نے کہا۔

وہ بولا۔ ''الٹے بانس کوتوال کو۔ ایک تو تمہارا ساتھ دے رہا ہوں۔ اوپر سے تم مذاق کرت ہو۔''

PAKBooks.site

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فخر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلوان کو واقعی غصہ آرہا تھا اور بات حقیقت تھی کہ پہلوان خود کو خطرے میں ڈال کر بھی دوسروں کی مدد کے لیے کمربستہ رہتا تھا۔

پہلوان نے سجاول کے حوالے سے بات کی تھی اور اس حوالے سے ایک بات میرے ذہن میں بھی مسلسل کچوکے لگا رہی تھی۔ خورسنہ کی طرح سجاول بھی ان لوگوں میں سے تھا جو میرے زندہ ہونے کے بارے میں جانتے تھے۔ اگر وہ انوکھی عورت اپنے بے مثل ٹرانس کے ذریعے سجاول پر حاوی ہو جاتی تو وہ نجانے کیا کچھ اس کے سامنے اُگل دیتا۔

فخر نے گاڑی کی نشست سے ٹیک لگائی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سجاول بھائی، کس دن نکلا تھا بیوی اور بچے کی تلاش میں؟''

''پندرہ تاریخ کو۔'' میں نے کہا۔

وہ انگلیوں پر حساب جوڑ کر بولا۔ ''مطلب ہے کہ آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہ کافی سے زیادہ ٹائم ہے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ سجاول اب تک مکمل طور پر ہاناوانی کے قبضے میں جا چکا ہوگا؟''

''بالکل ممکن ہے..... بلکہ..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے کسی مشن پر بھی روانہ کیا جا چکا ہو۔ ہم نے یہ بات خود اپنے کانوں سے سنی تھی کہ ہاناوانی کی پلاننگ بڑی دور کی ہے۔ وہ ابراہیم اور قسطینا وغیرہ کو اسی سجاول کے ذریعے مروانا چاہتی ہے جس نے ان کے کہنے پر رائے زل کا سر کاٹا تھا۔''

''خیر ہم قسطینا وغیرہ کو الرٹ تو کر ہی چکے ہیں۔ وہ ہاناوانی کے لیے ترنوالہ نہیں بنیں گے۔''

ہماری یہ گفتگو گاڑی کے اندر ہی ہو رہی تھی۔ ہم نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس وغیرہ بند کر دی تھیں اور اسے درختوں کے ایک جھنڈ میں یوں کھڑا کر رکھا تھا کہ کسی کی نگاہ آسانی سے اس پر نہ پڑ سکے۔ ہمیں داؤد بھاؤ کی طرف سے بھیجی جانے والی کمک کا انتظار تھا۔ ٹرانسمیٹر کے ریسیور پر نظر آنے والا نقطہ ایک ہی جگہ پر اسپارک کر رہا تھا۔

بیس پچیس منٹ بعد داؤد بھاؤ کے تجربہ کار شوٹر موقع پر پہنچ گئے۔ وہ دو گاڑیوں پر سوار تھے۔ ان میں سے اکثر نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ اب ہم گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر پارکنگ لائٹس کی مدھم روشنی میں آگے بڑھے۔ جلد ہی ہمیں ایک فیکٹری اور فیکٹری کے قریب ہی بنی ہوئی ایک خوب صورت کوٹھی نظر آئی۔ سگنل بتا رہے تھے کہ لوسی منٹو پارک کے قریب سے آزاد ہونے کے بعد اسی چار دیواری کے اندر پہنچی ہے۔ یہ کوٹھی درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ فیکٹری کی جانب چند روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوٹھی میں بھی اِکا دُکا بیرونی لائٹس آن تھیں۔ کسی وقت رکھوالی کے کسی کتے کی آواز آتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ ایسی خاموشیاں، طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

ہم نے گاڑیوں کے انجن بند کیے اور نیچے اتر آئے۔ پتا نہیں کیوں یہاں پہنچ کر میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ انیق اور باقر کو قتل کرنے والی، جاماجی کی شیطان صفت ساحرہ اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ داؤد کے ساتھی پوری طرح مسلح تھے۔ داؤد نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمارے لیے تین بلٹ پروف جیکٹس بھی بھیجی تھیں۔ اس کے تین چار اہم کارندوں نے بھی بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ میں نے ان کارندوں کے انچارج عاشق جٹ سے کہا۔ ''میں اور فخر اندر جائیں گے۔ تم لوگ کوٹھی کے چاروں طرف پھیل جاؤ۔ کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو پہلے اس کی ٹانگوں پر گولی مار کر گرانے کی کوشش کرو۔''

''آپ دونوں کا اندر جانا خطرناک تو نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ایک دو بندے اور ساتھ ہو جائیں۔'' عاشق بولا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے فخر کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلا کر تائید کی۔ مشورے کے بعد عاشق اور ٹونی باکسر نامی دو بندے ہمارے ساتھ آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ چھوٹی نال کی جدید امریکن رائفلیں ان کے پاس تھیں۔ انہوں نے اپنی شرٹس کے نیچے کمر کی طرف بھرے ہوئے پسٹل بھی لگا رکھے تھے۔ احتیاطاً ہم نے بھی جیکٹس پہن لیں۔ گو پہلوان حشمت کو پیچھے ہی رہنا تھا پھر بھی فخر نے ایک جیکٹ کھینچ تان کر اسے بھی پہنا دی۔ میرے پاس لمبے پھل کا ایک تیز دھار چھرا بھی تھا..... اور میں جانتا تھا کہ اس کی ضرورت پڑنے والی ہے۔

ہم چاروں احتیاط سے چلتے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ رکھوالی والے دو بیکل کتے کے شور میں دفعتاً اضافہ ہو گیا جو کچھ ہوا وہ اتنا اچانک تھا کہ ہماری پلاننگ آغاز میں ہی درہم برہم ہو گئی۔

تاریکی کے سبب ہمیں وہ سرچ لائٹس نظر نہیں آئی تھیں

جو باؤنڈری وال کے بالکل قریب درختوں پر نصب تھیں۔ یکا یک ہم چاروں تیز روشنی میں نہا گئے۔

ایک گرج دار آواز ابھری۔ ''خبردار، وہیں رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔''

میں نے ایک لحظہ ضائع کیے بغیر اپنی سیون ایم ایم رائفل سے دو سرچ لائٹس کو نشانہ بنایا۔ دھماکوں سے دو شعلے چمکے اور دو لائٹس تاریک ہو گئیں۔ تیسری لائٹ کو داؤد کے کارندے ٹونی باکسر نے نشانہ بنایا۔ اس کا پہلا فائر خطا گیا لیکن دوسرے نے سرچ لائٹ کا شیشہ چکنا چور کر دیا مگر اس سے پہلے ہی میں نے ٹونی کو زخمی ہو کر پختہ سڑک پر گرتے دیکھا۔

ہمارا کام ایک دم مشکل ہو گیا تھا لیکن اسے آسان بھی اس عمارت کے ایک پہریدار نے ہی کیا۔ تابڑ توڑ فائرنگ سے بدحواس ہو کر گیٹ کیپر نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ اس نے جونہی باہر جھانکا، میں تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔ فخر میرے عقب میں تھا۔ گیٹ کیپر کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر میں نے اسے فائر کرنے سے روک دیا اور اس کی رائفل چھینتا ہوا عمارت کے احاطے میں گھس گیا۔ یہ قریباً دو کینال کی کوٹھی تھی۔ پورچ میں کھڑی ایک دیوہیکل جیپ کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ ہاناوانی یہیں موجود ہوگی۔ بھوگلا کے جنگل میں کئی افراد کی جان لینے کے بعد جب ہاناوانی اور اس کے ساتھی فرار ہوئے تھے تو وہ دو جیپوں پر سوار تھے۔ ان میں سے ایک یہی تھی۔

میں، فخر اور عاشق گارڈینیا کی قدِ آدم باڑ کے پیچھے پیچھے بھاگتے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ایکا ایکی چھت سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ایک گولی سیدھی عاشق کے سینے میں لگی تھی لیکن وہ جیکٹ کی وجہ سے محفوظ رہا۔

''ہمیں کسی چیز کی اوٹ لینی چاہیے۔'' فخر نے کہا۔

''نہیں، وہ بلندی پر ہیں فخر..... بھاگتے جاؤ۔''

ہم جھک کر بھاگتے ہوئے برآمدے تک پہنچ گئے اور یہاں ستونوں کی آڑ لے لی۔ عقب سے ہم پر کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گیٹ کے آس پاس اگر ایک دو مزید بندے موجود تھے تو انہیں، ہمارے باہر موجود ساتھیوں نے سنبھال لیا ہے۔

یکا یک کوئی ایک گوشے سے نکل کر چیل کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں بروقت نیچے جھکا اور وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ وہ ایک ملائیشین تھا۔ میں نے اس کی کمر پر لات رسید کی اور وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کے کسی ساتھی نے بدحواسی میں اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بوچھاڑ کے بعد ٹھک ٹھک کی وہ مخصوص آواز آئی جو بتاتی ہے کہ آٹومیٹک رائفل کا میگزین خالی ہو چکا ہے۔ میں اور فخر ایک ساتھ لپکے اور ایک دیوار کے پیچھے چھپے اس ہٹے کٹے ملائیشین کو چھاپ لیا۔ وہ نشے میں تھا، گالیاں بک رہا تھا اور ملائی میں واویلا کر رہا تھا۔

ہم نے اس کے دونوں بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگائے اور اسے ڈھال کی طرح استعمال کرتے ہوئے عمارت کے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ ہم نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر بالکل تیار حالت میں رکھی ہوئی تھیں۔ عاشق عقب سے ہمیں کور دے رہا تھا۔ ہم اسی طرح دس پندرہ قدم آگے آ گئے۔ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔

فخر بولا۔ ''خاکسار کو ایسا لگ رہا ہے کہ ہم جتنی مزاحمت کی یہاں توقع کر رہے ہیں، اتنی ہے نہیں۔''

''کبھی کبھی خاکسار کے اندازے غلط بھی تو ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اس دفعہ نہیں۔'' پھر اس نے اپنے قبضے میں آئے ہوئے ملائیشین کو جھنجوڑ کر پوچھا۔ ''اور کتنے بندے ہیں یہاں۔'' فخر انگریزی میں بولا تھا۔

''نو..... نو..... اونلی ون فی میل سرونٹ۔'' ہٹا کٹا ملائیشین کراہتے ہوئے بولا۔ وہ تھوڑا بہت زور بھی مار رہا تھا اور شاید اس کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہو رہا تھا کہ وہ اتنا گرانڈیل ہونے کے باوجود خود کو فخر سے چھڑا کیوں نہیں پا رہا۔ وہ بے خبر تھا کہ یہ ایم ایم اے کے ایک منجھے ہوئے فائٹر کا ''ڈبل آرم لاک'' ہے۔ اس کو اس کا باپ اور دیگر رشتے دار مل کر بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔

جس اکلوتی ملازمہ کا ابھی ہٹے کٹے ملائیشین نے ذکر کیا تھا، وہ بھی چند سیکنڈ بعد ہانپتی کانپتی ہوئی ہمارے سامنے آ گئی۔ فخر چوکس انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً لوسی کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہ ابھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔

ملازمہ نے اپنا نام جمیلہ بتایا۔ وہ فائرنگ کی آوازیں سننے کے بعد تھر تھر کانپ رہی تھی اب ہٹے کٹے ملائیشین کو فخر کے شکنجے میں بے حال دیکھ کر اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم ہو گئی۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگی اور دہائی دینے لگی کہ وہ صرف ایک ملازمہ ہے۔ حکم کی بندی ہے۔

فخر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''اے حکم کی بندی! مالکن کہاں ہے تمہاری؟''

''مالکن..... بنی مالکن.....؟ عینک والی؟'' ملازمہ نے

Pdfbooks.Site

استفسار کیا۔

''ہاں وہی۔''

''وہ کچھ دیر پہلے تک وہاں اپنے کمرے میں تھیں..... پر اب نہیں ہیں۔ مم..... مجھے لگتا ہے کہ وہ..... گولیوں کی آوازیں سن کر..... کہیں نکل گئی ہیں۔''

''اس کا کھرا دکھاؤ۔'' میں نے گرج کر کہا۔

وہ ہمیں ایک کوریڈور میں سے گزار کر ایک کشادہ بیڈ روم میں لے آئی۔ کمرے کو دیکھ کر پتا چل جاتا تھا کہ کوئی بڑی افراتفری میں یہاں سے نکلا ہے۔ کمرے میں موجود کئی ایسی اشیا ہم نے پہچان لیں جن کا تعلق یقیناً ہانا وانی سے تھا۔ وہ عموماً گہنوں سے لدی رہتی تھی۔ اس کی ایک بیش قیمت طلائی مالا ہمیں سامنے بستر پر ہی پڑی نظر آ گئی۔ ایک اَدھ کھلی الماری میں سے ایک سیاہی مائل لبادہ جھانک رہا تھا۔ یہ بھی ہانا وانی کے مخصوص پہناووں میں سے ایک تھا۔

میں نے کہا۔ ''فخر، وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمارت میں ہی کہیں چھپی ہوئی ہو۔ ہمیں اسے ڈھونڈنا چاہیے۔''

عاشق جٹ نے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں اور انہیں کہا وہ پوری طرح چوکس رہیں اور کسی کو یہاں سے نکلنے نہ دیں اس کے علاوہ اس نے اپنے چار پانچ ساتھیوں کو اندر بھی بلا لیا تاکہ وہ ہانا وانی اور لوسی کی تلاش میں ہماری مدد کریں۔ یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اب ہمارے ریسیور پر ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سگنل نہیں آ رہے تھے۔ رکھوالی کا دیوہیکل کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ پھر میں نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ کُتّے نے اپنی زنجیر تڑالی تھی اور وحشت کے عالم میں سیدھا ہماری جانب آ رہا تھا۔ اس موقع پر عاشق نے اپنی حاضر دماغی اور نشانہ بازی کا پکا ثبوت فراہم کیا۔ اس کی سیون ایم ایم رائفل نے یکے بعد دیگرے دو سنگل فائر کیے اور چھوٹے گدھے جیسی جسامت والا کتا ہم سے فقط چند فٹ کی دوری پر گر کر تڑپنے لگا۔ وہ بہت کریہہ آواز میں چلّا رہا تھا۔

''پتا نہیں کہ یہ بھی کسی ٹرانس میں ہی ہو۔'' فخر نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کبھی کسی کُتّے کو اتنی رفتار سے اور اتنے خوفناک انداز میں حملہ آور ہوتے نہیں دیکھا۔''

''اور یہ دیکھو جی، یہ ٹھیک ٹھاک زنجیر بھی توڑی ہے اس نے۔'' عاشق جٹ نے کتے کی خون آلود زنجیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مزید وقت ضائع کیے بغیر ہم عمارت میں پھیل گئے اور بڑے محتاط انداز میں تلاش شروع کر دی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمارت سے ملحقہ فیکٹری میں کیمیکلز وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ اس رہائشی عمارت کے ایک پورشن میں بھی مختلف کیمیائی اشیا اسٹور کی گئی تھیں۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہیں اس عمارت میں کہیں سجاول سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن سجاول کس حال میں ہوگا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو میں اور فخر بُری طرح چونک گئے۔ ہماری رائفلیں جیسے خود بخود ہی جھک گئی تھیں۔ سامنے بستر پر یونس پمپ والا کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کی گردن پر سامنے کی طرف ماری گئی تھی اور اس کی کھوپڑی توڑ کر پیچھے سے نکل گئی تھی۔ وہ الٹا سیدھا پڑا تھا۔ بستر پر خون کے سیاہی مائل داغوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مرے ہوئے چودہ پندرہ گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ اسی بستر پر ہمیں کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور ایک آویزے کا بالائی حصہ بھی دکھائی دیا۔ یوں لگتا تھا کہ یونس نے جس طرح باقر کی دوست لڑکی کو نشانہ بنایا، اسی طرح وہ یہاں بھی کسی عورت سے زیادتی کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا پتا اسی عورت کا داؤ چل گیا ہو اور اس نے لاچار ہو کر باقر کے ہتھیار سے ہی اسے نشانہ بنا ڈالا ہو۔

یونس پمپ والا کے جسم پر ایک چادر تھی، میں نے یہ چادر اس کے سر تک کھینچ دی۔ اب سجاول کے حوالے سے میری پریشانی مزید بڑھ چکی تھی۔ اگر ہانا وانی اسے اپنے ساتھ... نہیں لے گئی تھی تو پھر ممکن تھا کہ وہ یہاں موجود ہوتا اور بری حالت میں ہوتا۔ عاشق جٹ کے ساتھیوں نے پوری عمارت کی لائٹس آن کر دی تھیں اور بڑے ماہرانہ انداز میں مختلف کمروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ عاشق کا ایک ساتھی تیزی سے ہمارے پاس پہنچا اور بولا۔ ''سر جی! ایک عورت ملی ہے۔ اس کو رسیوں سے باندھا ہوا ہے۔ بہت واویلا کر رہی ہے۔ لگتا ہے کہ اسے زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ بار بار یونس کا نام بھی لے رہی ہے اور اُسے بددعائیں دے رہی ہے۔''

ہم اس شخص کے ساتھ عمارت کے عقبی حصے کے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچے۔ ایک عورت کے ہاتھ پاؤں نائیلون کی رسی سے بندھے تھے اور وہ ایک چٹائی پر پڑی تھی۔ عورت کی عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن وہ اپنی اچھی

صحت اور متوازن جسم کی وجہ سے پینتیس سے زیادہ نہیں بلکہ کم ہی لگتی تھی۔ وہ شکل کی بھی اچھی تھی۔ اس کی پھول دار قمیص کندھوں سے پھٹی ہوئی تھی اور زیرِ جامہ کی جھلک نظر آتی تھی۔

''بی بی! کون ہو تم؟'' میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

ہمارے تیور اور ہمارے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو چکی تھی۔ تاہم اس نے میرے سوال کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس نے اپنا رونا دھونا جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہیجانی انداز میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اسی دوران میں عاشق جٹ ملازمہ جمیلہ کو کھینچ کر ہمارے پاس لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

جمیلہ روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بس اتنا پتا ہے کہ یہ اس کی بھابی ہے۔''

''کس کی بھابی ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''وہی..... جس کو گولی ماری ہے اِس نے..... وہ مر گیا ہے، اس کی لاش یہاں ہی کسی کمرے میں پڑی ہوگی لیکن مجھے پتا نہیں۔ یونس نام ہے اس کا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ ملازمہ جمیلہ اہم انکشاف کر رہی تھی۔ میں اور فخر اس ملازمہ کو لے کر کامن روم میں آ گئے۔ اسے صوفے پر بٹھایا اور پانی وغیرہ پلایا۔ اس دوران میں عمارت کے طول و عرض میں ہانا وانی اور سجاول وغیرہ کی تلاش جاری تھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا کہ وہ ہمیں یونس اور اس عورت کے بارے میں تفصیل سے بتائے۔

جمیلہ نامی اس عورت نے اپنے ہاتھ مستقل طور پر ہمارے سامنے جوڑ رکھے تھے، وہ بولی۔ ''مجھے بس اتنا پتا ہے کہ یونس اس عورت کو تین دن پہلے یہاں لے کر آیا تھا۔ اس عورت نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی بڑی بھابی ہے اور وہ اس کی بڑی عزت کرتا ہے لیکن پھر..... اسی یونس نے کل رات اپنی اس بھابی.....'' جمیلہ مزید کچھ نہ کہہ سکی اور آنکھوں پر دوپٹا رکھ کر سسکنے لگی۔

جو کچھ وہ کہنا چاہ رہی تھی، وہ اس کے کہنے سے پہلے ہی کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ چکا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ہانا وانی کی شیطانیت کی ایک اور زندہ مثال ہے جو ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ جن کو اپنا دشمن سمجھ رہی تھی، ان کو ایک دوسرے سے مروانے کی قسم اٹھائے بیٹھی تھی۔ آج اس نے سجاول کے نہایت قریبی ساتھی یونس کو اس کی اپنی ہی ایک عزیزہ کے ذریعے مروا دیا تھا۔ ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ یونس نے انوکھے ٹرانس کی حالت میں جس طرح باقر کا مرڈر کیا تھا اسی طرح وہ اپنی محترم بھابی کو پکڑ کر یہاں لایا تھا اور پھر اس کو زیادتی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ عورت یہ سب کچھ جھیل نہیں سکی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا دیور جو کچھ کر رہا ہے، کسی اور کی خواہش کے زیرِ اثر کر رہا ہے..... اس نے اسے شوٹ کر ڈالا تھا..... اور اب وہ نیم دیوانگی کی حالت میں مسلسل پتا نہیں کیا کیا بولتی جا رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یونس کو مارنے کے بعد اس نے خودکشی کی کوشش کی ہو اور اسے روکنے کے لیے اس کی مشکیں کس کے اسے یہاں چٹائی پر ڈال دیا گیا ہو (بعد ازاں ہمارا یہ اندازہ بھی بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ یونس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اپنی اولاد کا سا درجہ دیتی تھی۔ وہ یہ خوفناک صدمہ جھیل نہیں سکی تھی۔ اس نے یونس کے ریوالور سے ہی یونس کو گولی ماری اور پھر اسی سے اپنی جان لینے کی کوشش بھی کی)

عاشق جٹ رائفل بدست اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کوٹھی کا چپا چپا دیکھ لیا ہے جی۔ کسی بندے یا جناور کا کھوج نہیں ملا۔ بس پچھلے کمروں کی چھت پر ایک کھڈے (دڑبے) کے اندر دس پندرہ کبوتر اور دوسرے کھڈے کے اندر پندرہ وی چھوٹے طوطے ہیں۔ گولیاں چلنے کی وجہ سے ڈرے ہوئے ہیں اور شور مچاتے جا رہے ہیں۔''

ہم پلٹے اور کوریڈور سے گزر کر عمارت کے سامنے والے حصے میں آ گئے۔ گرانڈیل کُتّے کی خون آلود لاش کے پاس سے گزر کر سامنے والے صحن میں آئے۔ میں اور فخر ایک بار پھر اچھی طرح عمارت کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اگر باہر موجود افراد نے کسی کو فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا تو اس بات کا امکان موجود تھا کہ ہانا وانی یہیں کہیں روپوش ہو۔ کسی تہ خانے کی موجودگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلوان حشمت بھی اب اندر آ چکا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اس تلاش میں شریک ہو گیا۔ چھت پر پرندے مسلسل شور مچا رہے تھے۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ پرندوں کا یہ شور معمول سے ذرا ہٹ کر تھا۔

میں نے کہا۔ ''فخر! پرندے کچھ زیادہ ہی شور نہیں مچا رہے؟''

''لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔'' اس نے کہا پھر ذرا چونک کر بولا۔ ''کہیں ان کو کوئی جانور تو نظر نہیں آ رہا؟ بلّی وغیرہ؟''

PakiBooks.site

''بلّی ہوسکتی ہے..... اور کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے لومڑی؟'' فخر حیرت سے بولا۔

''ناممکن تو نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے تیزی سے چھت پر پہنچے۔ یہاں کئی تاریک اور نیم تاریک گوشے موجود تھے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ہم نے پوری چھت دیکھ لی۔ ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن پرندوں کا غیر معمولی شور جاری تھا۔

عاشق آگے بڑھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ڈربے کے اندر پھینکی۔ یہ رنگ دار پروں والے دو درجن سے زائد چھوٹے طوطے تھے جو اَب بھی بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شاید ڈربے کے اندر کوئی چیز چھپی ہوئی تھی۔ عاشق نے آہنی ڈربے کا جالی دار دروازہ تھوڑا سا کھولا تاکہ جان سکے کہ ان معصوم پرندوں کو کیا چیز وحشت زدہ کر رہی ہے۔ اس کے بعد جو منظر ہم نے دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ ''معصوم پرندے'' برق رفتاری سے عاشق پر جھپٹے۔ جیسے وہ خوشنما طوطے نہ ہوں کسی تاریک غار سے نکلنے والی خون آشام چمگادڑیں ہوں۔ مجھے یہی لگا جیسے پہلے ہلّے میں ہی انہوں نے عاشق کی آنکھیں زخمی کر ڈالی ہیں۔ عاشق بدحواسی میں پشت کے بل گرا پھر اٹھ کر بھاگا۔ خوشنما پرندے، شہد کی مشتعل مکھیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے تھے۔ یقیناً وہ اپنی تیز خم دار چونچوں سے اس کا گوشت نوچ رہے تھے۔ عاشق کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی وہ بُری طرح چلّا رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ان پرندوں کو خود سے جدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے رائفل سیدھی کی لیکن ٹریگر دبانا ممکن نہیں تھا۔ عاشق پہلے بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ پھر بدحواسی میں برساتی کی جانب لپکا۔ طوطے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ہم جیسے سکتہ زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچھ ہو گیا جو ہم نے سوچا نہ تھا۔ عاشق چھت کی ڈھائی تین فٹ اونچی منڈیر سے ٹکرایا اور الٹ کر نیچے پختہ فرش پر گرا۔ اس کی پکار..... جو اس کی آخری پکار تھی، بڑی دلدوز تھی۔

ہمارا سکتہ ٹوٹا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہم ایک نہایت انوکھی اور خوفناک صورتِ حال کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم سیڑھیوں کی طرف لپکے تیزی سے نیچے آئے اور خود کو کمروں میں بند کر لیا جس کمرے میں ہم بند ہوئے اس میں فخر اور پہلوان کے علاوہ داؤد بھاؤ کے دو ساتھی بھی تھے۔ تین چار دیگر افراد ایک ساتھ والے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

پہلوان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟''

فخر اور دیگر افراد بھی حیرت سے گنگ تھے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار فخر کی آنکھوں میں ہراس کی کیفیت دکھائی دی۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیا یہ سب بھی ہانا وانی کی وجہ سے ہے؟'' اس نے یہ فقرہ انگلش میں بولا تھا تاکہ پہلوان اور باقی دونوں بندے سمجھ نہ پائیں۔

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ہم جس طرح کی صورتِ حال کا شکار ہیں، کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔''

''یعنی..... یہ..... پرندے بھی ٹرانس میں؟''

''اگر لومی ٹرانس میں آسکتی ہے تو یہ کیوں نہیں.....؟''

ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ رنگین پروں والے وہ خوب صورت طوطے عمارت کے اندر پھڑ پھڑانے لگے۔ ان کی باریک آوازوں میں ایک ہیجان تھا۔ وہ دیواروں اور دروازوں سے ٹکرا رہے تھے۔ چکرا رہے تھے، گھوم رہے تھے۔

''اب کیا ہووے گا؟'' پہلوان کی آواز خوف سے ٹوٹنے لگی۔

''آپ گھبرائیں نہیں۔ کھڑکیوں پر جالیاں ہیں۔'' میں نے تسلی دی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں باہر والوں کو اطلاع دینی چاہیے کہ وہ خود کو گاڑیوں میں بند کر لیں۔'' فخر نے کہا۔

''میں فون کرتا ہوں جی۔'' داؤد بھاؤ کا ایک کوتاہ قد کارندہ بولا۔

اس نے فوراً فون کر کے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی ہے..... عاشق کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے ہم سب کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ وہ کافی بلندی سے نیچے گرا تھا۔ اس کے بچنے کے امکانات کم تھے۔ دانشور درست ہی کہتے ہیں، جو دشمن سامنے آ کر قابلِ فہم وار کرتا ہے اس کا خوف کم ہوتا ہے لیکن نادیدہ دشمن کے ''ناقابلِ فہم وار'' بے حد پریشان کن اور خطرناک ہوتے ہیں۔ پہلوان اور داؤد بھاؤ کے دونوں ساتھیوں کے چہرے خوف اور حیرت کی تصویر تھے، داؤد بھاؤ کے دونوں ساتھیوں کو ساری صورتِ حال کا علم نہیں تھا لیکن اتنی بات تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ یہاں کسی ایکی بندریا کی تلاش میں آئے ہیں جو دیوانے پن کا شکار ہے اور خونخوار ہو رہی ہے۔

اب انہوں نے معصوم نازک پرندوں کو بھی جان لیوا مخلوقوں کے روپ میں دیکھ لیا تھا۔ پہلوان کی طرح وہ دونوں بھی اسے ہوائی چیزوں اور آسیب کا کرشمہ سمجھ رہے تھے..... اور اب جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتے تھے لیکن نکلنا کہاں آسان تھا؟

عمارت کے عقبی کمروں کی طرف سے مسلسل کسی عورت کے رونے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''کون ہوسکتی ہے یہ؟'' فخر نے کہا۔

''ملازمہ جمیلہ، یا پھر وہی جو خود کو یونس کی بھابی بتاتی ہے۔''

''آواز نوجوان لڑکی کی نہیں لگتی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ وہی، یونس کی بھابی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ان آوازوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ صرف خوف کی وجہ سے چلّا رہی ہے۔ اگر وہ پرندوں کی زد میں آئی ہوتی تو پھر اس کی پکار کچھ اور طرح کی ہوتی۔''

اسی دوران میں دو تین چھناکے ہوئے اور شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں اس دوسرے کمرے کی طرف سے آئی تھیں جہاں داؤد بھاؤ کے باقی تین چار ساتھیوں نے خود کو بند کیا تھا۔

داؤد بھاؤ کے کوتاہ قد کارندے نے اپنے ان ساتھیوں سے فون پر رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں بھی کھڑکیوں میں جالیاں ہیں۔ شیشے ٹوٹنے کے باوجود وہ محفوظ ہیں۔ ہاں شروع میں ایک طوطا کسی طرح اندر گھس آیا تھا اسے انہوں نے مار ڈالا ہے۔

ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ ہمارے کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا، تین چار خوش رنگ طوطے، دیوانگی کے عالم میں جالی سے ٹکرانے لگے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' فخر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔''

''اگر یہ پرندے واقعی کسی ٹرانس میں ہیں تو ٹرانس کی شدت آہستہ آہستہ کم بھی تو ہوسکتی ہے۔'' فخر نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن یہ کام اتنی جلدی نہیں ہوگا۔ ہم نے انیق اور پولیس وغیرہ کو دیکھا ہی ہے۔ ہانا وانی سے دور ہو کر بھی وہ مسلسل اس کے اثر میں رہے ہیں۔''

''لیکن شاہ زیب، وہاں تو ٹیلی فونک رابطہ بھی اثر

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ اگست 2018ء
کی جھلکیاں

وردی، وعدہ اور وفا
مادرِ وطن کی خاطر اس نے دنیاوی خوشیوں کو
لات ماردی، جذبوں سے لبریز زندگی نامہ

پہلا سیاسی لوٹا
پاکستانی سیاست کا ایک دلچسپ
کردار جس کا لقب وشنام بنا

باپ بیٹا پوتا
فلم نگری کی تین شخصیات تین ستون
تین ادوار کا تذکرۂ خاص

قربانی
یوم آزادی پر اسے اپنا ٹوٹا دل، بچھڑا یار
اور ہنگامِ آزادی بہت یاد آتے تھے

اس کے علاوہ
طویل سرگزشت ''ناسور'' دلچسپ سفر کہانی
''شمشال سے ٹورنٹو'' اور بہت سے سچے
واقعات، سچ بیانیاں، سچے قصے وہ سب
کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔
آپ کو پڑھنا چاہیے۔ بس ایک بار ''سرگزشت''
پڑھ کر دیکھیں پھر آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے

PakBooks.Site

کرتا تھا۔"

"پھر بھی ان پرندوں کا جلد ہی نارمل حالت میں آجانا آسان نہیں لگتا۔ یہ کسی عام ہپناٹسٹ کا عام ٹرانس نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ جدا ہے۔" ہم دونوں انگلش میں بات کررہے تھے۔ پہلوان کو شاید اکادُکا الفاظ سمجھ میں آرہے ہوں مگر داؤد کے دونوں ساتھی ہونقوں کی طرح ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

فخر نے سراسیمگی کے عالم میں گہری سانس لی اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ انسانوں کی طرح جانور بھی ماہر ہپناٹسٹ کی سجیشن قبول کرتے ہیں......؟"

"بالکل ایسا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے بھی کچھ ہپناٹسٹ اتنی صلاحیت رکھتے تھے کہ اپنے ہاتھوں کے لمس اور اپنی آواز کے ذریعے مختلف خطرناک جانوروں کو مفلوج کردیتے تھے۔ اسے Tonic immobility کہا جاتا تھا۔ اور اب تو یہ شعبہ بہت آگے جاچکا ہے۔"

ہمارا دھیان بار بار عاشق کی طرف بھی جارہا تھا۔ چھت سے گرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، ابھی کچھ پتا نہیں تھا...... پہلوان نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک یقین نا ہیں آرہا کہ ایک پاس والے کمرے میں جیتا جاگتا یونس ایک لاش کی شکل میں پڑا ہے۔"

پہلوان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یونس کی موت بھی ہمارے لیے ایک شدید دھچکے سے کم نہیں تھی۔ وہ سجاول کا دوست اور جاں نثار ساتھی تھا۔ وہ سجاول کے ڈکیت گینگ سے بالکل علیحدہ تھا۔ اس کے ذریعۂ روزگار کے طور پر اس کے پیٹرول پمپس کا حوالہ دیا جاتا تھا۔ وہ ہاناوانی کے ہتھے چڑھا تھا اور چند ہی دن میں اس سے کیا کچھ سرزد ہوگیا تھا پھر اسحٰق ہی کی طرح اسے بھی ایک حسرتناک موت کو گلے لگانا پڑ گیا تھا۔ ہاناوانی نے اسے ذلت کے گڑھے میں گرا کر موت سے ہمکنار کیا تھا۔

☆☆☆

ہم قریباً تین گھنٹے تک اسی جگہ پر بند رہے اور صورتِ حال کے بہتر ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ پرندے ابھی تک عمارت میں موجود تھے اور یہاں وہاں چکرا رہے تھے۔ بے شک تین چار گھنٹے پہلے اس عمارت میں فائرنگ ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ابھی تک کوئی آؤٹ سائڈر اس عمارت کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا اور ان میں مقامی پولیس بھی شامل تھی۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا۔ اگر کوئی صورتِ حال جاننے کے لیے اس طرف آنکلتا تو عین ممکن تھا کہ یہ خونی پرندے اسے بھی خون میں نہلا دیتے۔ داؤد کے باقی ساتھی ابھی تک باہر موجود تھے اور دو گاڑیوں میں بند تھے۔ مشتعل پرندوں کی جھلک انہوں نے بھی دیکھی تھی لیکن وہ ابھی تک ان کے براہِ راست حملے سے محفوظ تھے۔ داؤد کا کارندہ ٹونی باکسر گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا اور اسے مرہم پٹی کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

اب رات کے قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ فیکٹری میں اور اس کے اردگرد بھی مکمل خاموشی تھی۔ فخر نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے کہ اب آوازیں نہیں آرہیں۔" اس کا اشارہ طوطوں کی آوازوں کی طرف تھا۔

مجھے بھی یہی محسوس ہورہا تھا کہ پرندے شاید کسی ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں یا پھر یہاں سے نکل گئے ہیں مگر باہر نکل کر دیکھنے میں خطرات تھے۔ یہ ایک ایسا دشمن تھا جس پر گولی وغیرہ بھی تقریباً بے اثر ہی تھی۔ داؤد بھاؤ کے کوتاہ قد ساتھی بنارس نے اپنے باہر موجود ساتھیوں سے فون پر رابطہ کیا۔ وہ لوگ اب اپنی بند گاڑیوں سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ پرندوں کے آثار اب نظر نہیں آرہے۔ ہم نے دس پندرہ منٹ مزید انتظار کیا۔ پھر میں اور فخر اس بند کمرے سے نکل آئے۔ ہم نے محتاط طریقے سے مختلف کمروں میں جھانکا۔ پرندے اب یقیناً یہاں نہیں تھے۔ ظاہر ہے پرندوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ گھات لگا کر کہیں بیٹھ جائیں اور اچانک حملہ کریں۔

مطمئن ہونے کے بعد ہم نے باقی افراد کو بھی گرین سگنل دیا اور وہ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے۔ سب سے پہلے ہم چھت سے گر کر زخمی ہونے والے تنومند عاشق جٹ کے پاس پہنچے۔ وہ مرچکا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ بلندی سے گر کر اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر طوطوں کی چونچوں کے بہت سے خونی نشان تھے۔ یہاں سے گوشت نوچ کر نکال لیا گیا تھا۔ ہم نے عاشق کی لاش کو اٹھا کر ایک چارپائی پر رکھا اور اس پر چادر ڈال دی۔

ہم دوسرے کمرے میں یونس کی لاش کے پاس پہنچے۔ اس کا بھی بُرا حال تھا۔ پرندوں نے عالمِ وحشت میں اس کے مردہ جسم کو بھی نوچا تھا۔ اس کی ناک ناپید تھی اور چہرہ پہچانا نہیں جارہا تھا۔ ہم نے اس پر بھی چادر ڈال دی۔

تھوڑے ہی فاصلے پر گرانڈیل کُتے کی لاش بھی

موجود تھی۔ تاہم یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ طوطوں نے اس کے مردہ جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ اسی طرح اپنے خون کے جمے ہوئے تالاب میں بے حرکت پڑا تھا۔ عاشق جٹ نے اپنی سیون ایم ایم سے جو دو عدد فائر کیے تھے ان میں سے ایک نے کُتے کی کھوپڑی توڑ ڈالی تھی۔

"یونس کی بھابی؟" فخر نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ عمارت کے عقبی حصے میں تھی۔ اب اس کی کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کوتاہ قامت بنارس نے کہا۔ "اور وہ ملازمہ جمیلہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

ہم مختلف کمروں اور راہداریوں میں جھانکتے ہوئے عقبی حصے میں پہنچے تو یونس کی خوبرو بھابی اور جمیلہ دونوں ہی نظر آگئیں۔ طوطوں نے جمیلہ کو بھی زخمی کیا تھا مگر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس کے ایک کندھے اور بازو پر چھوٹے چھوٹے کوئی ایک درجن زخم تھے۔ دونوں عورتیں ڈری سہمی ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھیں۔ وہ آہ و بکا کر کر کے اب نڈھال ہوچکی تھیں۔ اس کمرے کی دیوار گیر کھڑکی کے شیشے بھی جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اگر یہاں بھی جالی نہ ہوتی تو یہ دونوں عورتیں اذیت ناک موت کا شکار ہوچکی ہوتیں۔

ہمارے پہنچنے پر جمیلہ نے اندر سے دروازہ کھولا اور ہم نے ان دونوں کی خبر گیری کی...... یونس کی بھابی کی ذہنی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ایک بار پھر ماتم کناں ہوگئی۔ اس کے کچھ الفاظ سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں۔ اسے جیسے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ یونس نے اس کے ساتھ بدترین سلوک کرنے کی کوشش کی ہے...... اور اس نے اپنے ہاتھ سے اسے گولی ماردی ہے......

اسی اثنا میں پہلوان حشمت ہانپتا ہوا اندر آیا۔ اس کا چہرہ خوف اور دہشت کی تصویر تھا۔ اس نے کہا۔ "چھت کی طرف سے اب بھی پھڑپھڑانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ لگتا ہے پرندے ابھی یہیں پر ہیں۔"

داؤد کے ایک کارندے نے بھی وحشت زدہ انداز میں اس بات کی تصدیق کی۔ یہ بے حد الارمنگ صورتِ حال تھی لیکن سوچنے کی بات تھی کہ اگر خدانخواستہ یہ اطلاع درست ہے تو پھر ابھی تک ہم محفوظ کیوں ہیں۔ پرندوں کے چھت سے یہاں پہنچنے میں کون سی رکاوٹ تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ان کبوتروں کا خیال آیا جو طوطوں کے پاس ہی ایک دوسرے ڈربے میں بند تھے۔

فخر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر میں زندگی میں پہلی بار تھوڑا سا ہراس دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "فخر! میرا خیال ہے کہ پھڑپھڑانے کی جو آوازیں آرہی ہیں وہ طوطوں کی نہیں ہیں۔"

ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچے۔ میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ یہ کبوتر ہی تھے مگر ان کی حالت ناگفتہ تھی۔ وہ بھی اب جنون کی سی کیفیت میں تھے۔ دیوانہ وار ڈربے کی جالیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ جیسے کوئی جنگلی بِلّا ان کے ڈربے میں گھس گیا ہو اور وہ اس سے جان بچانا چاہ رہے ہوں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی "تڑپ پھڑک" میں خوف کے بجائے زبردست قسم کی جارحیت تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے ڈربا توڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی چونچیں زخمی تھیں اور کئی ایک کے پر جھڑ چکے تھے۔

فخر نے کہا۔ "یہ دیکھو شاہ زیب!" اس نے ٹارچ کی روشنی ڈربے کے ایک حصے پر پھینکی۔ وہاں سے چھوٹے سوراخوں والی جالی ڈھیلی ہوکر اکھڑنا شروع ہوگئی تھی۔ داؤد بھاؤ کے کارندے دہشت زدہ نظروں سے ان پرندوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ زینے اتر کر نیچے چلے گئے۔ پہلوان حشمت ویسے ہی اوپر نہیں آیا تھا۔ فخر بولا۔

"میرے خیال میں تو ان کو ماردینا چاہیے۔ یہ طوطوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔"

"لیکن کیسے ماریں؟"

"یہاں نیچے کیمیکلز میں، میں نے مائع "گبریلیک ایسڈ" دیکھی ہے۔ کافی زہریلی دوا ہے اس کا اسپرے چند سیکنڈ میں ان کو ختم کردے گا۔"

"تو پھر لے آؤ۔" میں نے خوب صورت کبوتروں کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

فخر نیچے سے اسپرے اور ماسک وغیرہ لے آیا۔ ہم سب نیچے آگئے اور فخر نے تھوڑی دیر اوپر رہ کر بدقسمت پرندوں کو ان کی اذیت سے نجات دلادی۔

یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ داؤد بھاؤ کے کارندے اب اپنے ساتھی عاشق جٹ کی لاش لے کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ تاہم وہ از خود ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ اسی دوران میں میرے نمبر پر داؤد بھاؤ کا فون آگیا۔ وہ یہاں کی صورتِ حال سے کافی حد تک باخبر تھا اور بہت حیران بھی۔ اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "شاہ زیب! یہ سب کیا ہورہا ہے۔ میری تو عقل خبط ہوگئی

PakiBooks.Site

ہے۔ کوئی بھی ان باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔''

''لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے داؤد بھاؤ۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ان تجربوں سے گزرنے سے پہلے مجھے بھی یقین نہیں تھا لیکن جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ بہت خطرناک عورت ہے۔ یہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہو چکی ہے جو مادہ بندر اس کے ساتھ تھی، اس کے سگنل آنا بھی بند ہو گئے ہیں۔ اب یا تو وہ ٹرانسمیٹر کی پہنچ سے باہر نکل گئی ہے یا ہو سکتا ہے کہ انہیں ٹرانسمیٹر کا پتا چل گیا ہو اور اسے بیکار کر دیا گیا ہو۔ مجھے عاشق کی موت کا بے حد دکھ ہے داؤد بھاؤ، لیکن اگر ہم مزید بڑے نقصانات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس منحوس عورت کو ڈھونڈنا پڑے گا۔''

داؤد بھاؤ نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں وہاں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں، پھر بات کرتے ہیں۔''

داؤد بھاؤ کے لب و لہجے سے لگتا تھا کہ اتیق کی موت کے حوالے سے اس نے سجاول کے خلاف جو رائے بنا رکھی تھی اب اس میں کمزوری آرہی ہے۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ ہمارے اردگرد بہت کچھ ایسا ہو رہا ہے جو معمول سے بہت ہٹ کر ہے اور پُراسرار ہے۔

میں نے ایک بار پھر عاشق کی موت پر داؤد بھاؤ سے دکھ کا اظہار کیا اور اس کو جلد از جلد یہاں پہنچنے کا کہا۔

اس دوران میں فخر ڈری سہمی جمیلہ سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا اور اس کے زخمی بازو کی مرہم پٹی بھی کر دی گئی تھی۔ جمیلہ نے بتایا تھا کہ فیکٹری دو ہفتے کے لیے بند ہے۔ فیکٹری کے مالک میاں کرامت علی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ گلگت اسکردو وغیرہ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی حاجی مراد جو صوم صلوٰۃ کا بہت پابند ہے یہیں کوٹھی پر تھا، لیکن پچھلے بدھ کو اچانک نجانے اسے کیا ہوا۔ اس نے شلوار قمیص اتار کر پینٹ قمیص پہن لی۔ ٹوپی اتار پھینکی، اگلی صبح جب جمیلہ نے اسے دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ وہ جس نے کبھی گانے بجانے کو اپنے کانوں تک نہیں پہنچنے دیا تھا، آڈیو سسٹم پر میوزک لگا کر سن رہا تھا اور تھرک بھی رہا تھا۔ رات کو جمیلہ نے اسے شراب پیتے اور ایک لڑکی سے چہلیں کرتے دیکھا تو اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ اس سے اگلے روز وہ لڑکی سمیت گھر سے غائب تھا۔ ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ کہیں نظر آیا تھا۔

جمیلہ یہاں کے حالات سے بے حد دہشت زدہ تھی۔ وہ یہاں پر خورسنہ اور اس کے بچے کی آمد سے بھی آگاہ تھی،

اس نے گلوگیر آواز میں بتایا۔ ''عینک والی نے اس عورت اور بچے کو ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ وہ عورت کو اس کے بچے کے سامنے ننگا کر کے اپنے ہاتھوں سے مارتی تھی اور پتا نہیں کیا کچھ پوچھتی تھی۔''

''پھر کہاں گئے وہ ماں بچہ؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''تین دن پہلے عینک والی نے انہیں چھوڑ دیا جی۔ یا پھر شاید کہیں بھیج دیا۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں جی۔''

''عورت اور بچے کے بعد کوئی اور بھی یہاں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آہو جی، اونچے لمبے قد والا ایک بندہ یہاں آیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ مار کھانے والی بی بی کا خاوند تھا۔ بڑا زور والا بندہ لگتا تھا وہ بھی۔ پر وہ پہلے دن کے بعد مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا پتا...... کہ...... اس کو بھی عینک والی نے مار ہی دیا ہو۔'' جمیلہ سسک پڑی۔ ''وہ عورت نہیں، مجھے تو کوئی جن بھوت لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ چھوٹے مالک (حاجی مراد) پر بھی اس نے کوئی ڈھاڈا قسم کا جادو ٹونا ہی کیا ہے۔ اللہ ماف کرے...... اللہ ماف کرے۔ کہاں جی وہ پنج وقت کے نمازی اور کہاں راتوں رات......'' وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

''تم نے اس لمبے چوڑے بندے کو آخری دفعہ کہاں دیکھا تھا؟'' فخر نے پوچھا۔

وہ اپنے منتشر ذہن کو یکسو کرتے ہوئے بولی۔ ''کوٹھی کے پچھے پاسے (دائیں جانب) جو دو تین کمرے ہیں وہ مہمانوں شمانوں کے لیے ہیں۔ وہ عینک والی اور اس کے فوجی (گارڈز) اس بندے کو لے کر اسی پاسے (طرف) جا رہے تھے۔ پھر میں نے نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں بھی عینک والی نے مارا پیٹا؟''

''نہیں جی، بس ایک دفعہ پولی سی سوٹی ماری تھی میری لت پر...... لیکن اس کے ایک فوجی نے میرے سر سے بندوق لگا کر مجھے بہت دھمکیاں دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے کوئی چوں بھی کی تو میری اور میرے بچوں کی لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں جی۔ اور یہ...... عینک والی...... تو مجھے بندہ بشر لگتی ہی نہیں ہے۔ یہ کوئی اور چیز ہے جی۔'' جمیلہ کی آواز لڑکھڑانے لگی اور چہرے پر ہلدی سے پھر گئی۔

وہ ڈری سہمی نگاہوں سے اردگرد دیکھنے لگی۔ جیسے اسے اب بھی اندیشہ ہو کہ وہ کسی طرف سے دیوار توڑ کر یا

پھاڑ کر نکل آئے گی۔

پہلوان حشمت کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ جیسے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ ماحول کے تناؤ کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ بے شک پہلوان ڈرا ہوا بھی تھا لیکن سانس کی تنگی والی بات کچھ اور نکلی۔ میں نے جب پوچھا کہ پہلوان چاچا خیریت تو ہے......؟ تو وہ بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ویسے تو شاید میں بچ جاؤں لیکن تمہاری یہ بلٹ پروف جیکٹ مجھے ضرور مار دے گی۔''

میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ پہلوان نے ابھی تک وہ بہت تنگ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ''آپ نے اسے اتار دینا تھا۔ اب تو کوئی ایسا خطرہ نہیں۔'' فخر نے کہا۔

''ایک دو بار اتارنے کی کوشش کی لیکن لگتا ہے کہ یہ میری جان لے کر ہی جائے گی۔'' پہلوان نے ہانپی آواز میں کہا۔

میں نے فخر کے ساتھ مل کر پہلوان کی جیکٹ اتارنے کی کوشش کی مگر اس کے ''بکل'' بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ فخر نے انگلش میں کہا۔ ''بلٹ پروف جیکٹ جان بچانے کے کام آتی ہے لیکن یہاں لگتا ہے کہ اس کا مصرف الٹا ہو جائے گا۔''

پہلوان نے بھنا کر کہا۔ ''دیکھو، میرے سامنے اس طرح انگریزی مت مارا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے غیر بلکہ دشمن سمجھتے ہو۔''

''سوری پہلوان جی...... ویری سوری۔'' فخر نے کہا۔

پہلوان نے آنکھیں دکھائیں۔ ''اوئے، پھر وہی انگریزی۔''

اسی دوران میں ہم جیکٹ کے ''بکل'' کھولنے میں کامیاب ہو گئے اور پہلوان کی جان میں جان آئی۔

داؤد بھاؤ کا کوتاہ قد کارندہ بنارس برآمدے میں موجود تھا۔ رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی۔ عاشق جٹ کی موت نے ہم سب کو دکھی کیا تھا مگر بنارس کچھ زیادہ ہی دکھی نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ اور اس کا ایک ساتھی بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگتے تھے جیسے انہیں ڈر ہو کہ اس چاندنی رات میں اچانک ہی کسی طرف سے پرندوں کی ٹولی نمودار ہو گی اور دوبارہ حملہ آور ہو جائے گی۔ اچانک میرے ذہن میں رضوان ٹی کا خیال آیا اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ پرندے یہاں پہلے بھی پہنچ چکے تھے۔ وہ کہاں گئے تھے؟ کہیں ایسا تو

نہیں تھا کہ وہ ہاناوانی کے کسی اور ٹارگٹ پر حملہ آور ہو جائیں۔ ہاناوانی کو رضوان کی لوکیشن بھی اچھی طرح معلوم تھی۔ رضوان چونکہ زخمی تھا اس لیے ہم اسے ہوٹل میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ وہ دوا کھا کر سویا ہوا تھا اسی لیے کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک اس سے ہمارا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔ تیسری چوتھی کال پر اس کی غنودگی بھری آواز میرے موبائل پر ابھری۔ ''جی شاہ زیب بھائی۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں حالات بڑے خراب ہو گئے ہیں رضوان۔''

''کیا ہوا جناب؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہاں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ اس کی بے پناہ حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ باتیں بہت سے لوگوں کو ہضم نہیں ہوں گی، ہمارا مذاق اُڑایا جائے گا۔''

''جو کچھ بھی ہے، ہم تو دیکھ رہے ہیں ناں، ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم پوری طرح چوکس ہو جاؤ۔''

رضوان کو فون کرنے کے بعد میں نے سجاول کے قریبی ساتھی چاچے فیض کو فون کیا اور اسے بھی لوسی اور پرندوں والے واقعات سے مختصراً آگاہ کیا۔ وہ ان واقعات کا تعلق ہوائی چیزوں سے جوڑنے لگا۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے مزید خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ وہ الرٹ ہو جائے اور وہ ہو گیا تھا۔ تاجور کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں اندیشے امنڈنا شروع ہو گئے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اب اس سے ملنا تو دور کی بات ہے، اس سے رابطہ بھی نہیں رکھوں گا مگر اب پھر مجھے لگ رہا تھا کہ اسے کسی طرح خطرات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بے شک دارج کے لاہور والے گھر میں وہ سخت سیکیورٹی میں تھی لیکن ہمیں جس طرح کے خطرات لاحق ہو گئے تھے ان میں عام قسم کی سیکیورٹی اور حفاظتی تدابیر ناکام تھیں۔ میں نے فوری طور پر یہ کیا کہ دارج کے میڈیکل اٹینڈنٹ سعید کھوکھر سے کال ملائی اور وقاص کی حیثیت سے بات کر کے اسے بتایا کہ ہمارے اردگرد کس طرح کے واقعات پیش آرہے ہیں۔ وہ بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''سعید! میری یہ اطلاع محترمہ

PakiBooks.Site

بیگم صاحبہ تک پہنچا دو اور انہیں بتاؤ کہ انہیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔'' بیگم صاحبہ سے میری مراد تاجور تھی۔

وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ ان باتوں پر یقین کرلیں گی؟''

''ان کو کرنا پڑے گا، ورنہ ان کا نقصان ہوسکتا ہے۔ ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مادہ بندر والا یا پرندوں والا واقعہ کل کے اخباروں میں بھی رپورٹ ہوجائے۔''

سعید سے بات کرکے تھوڑی سی تسلی تو ہوئی تاہم تاجور کا چہرہ مسلسل نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ مرحوم حاذق ذکری نے تاجور کے حوالے سے جو کچھ اپنے خط میں لکھا تھا وہ جیسے دل و دماغ پر نقش ہوکر رہ گیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا...... شاہ زیب بیٹا! جہاں تک میں اس لڑکی کو سمجھ سکا ہوں یہ تم سے بے انتہا پیار کرتی ہے...... یہ عشق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کی جڑیں اس خوبرو لڑکی کے اندر بہت گہرائی تک جاچکی ہیں۔ یہ کبھی تمہیں بتائے گی نہیں مگر تمہارے بغیر اگر اسے زندہ رہنا پڑا تو ایک مسلسل عذاب سے کم نہیں ہوگا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اسے جلد سے جلد اپنالو۔ اگر خدانخواستہ اس لڑکی کی زندگی کسی اور کی زندگی سے نتھی ہوگئی تو پھر واپسی تقریباً ناممکن ہوجائے گی۔

ہاں یہی کچھ لکھا تھا حاذق ذکری صاحب نے...... اور اب اس کی زندگی ایک بیمار لاغر لیکن نہایت کرخت شخص سے نتھی ہوچکی تھی۔ میں نے اس خبیث کی تنہائیوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ وہ دہری شخصیت کا مالک تھا۔ دوسروں کے سامنے تو تاجور کو احترام سے آپ...... آیئے...... اور بیٹھیے جیسے الفاظ سے پکارتا تھا مگر خلوت میں اس کی مٹی پلید کرکے رکھ دیتا تھا۔ وہ فی الحال ازدواجی تعلق کے لائق نہیں تھا اور شاید اس بات کا رنج و غم بھی اس کے رویّے کو بدترین بنا رہا تھا۔

فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''شاہ زیب! ابھی جمیلہ نے مہمان خانے کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اسے بھی دیکھ لینا چاہیے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پہلوان حشمت ایک بار پھر واش روم میں چلا گیا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید وضو کررہا تھا۔ وہ نماز روزے کا ایسا پابند نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ اب ہوجائے گا۔

ہم نے جمیلہ کو ساتھ لیا اور رہائشی حصے سے نکل کر مہمان خانے کی طرف بڑھے۔ کبوتروں کو تلف کرنے کے لیے فخر نے جو کیمیکل استعمال کیا تھا اس کی ہلکی سی بُو ابھی تک آرہی تھی۔ چاندنی اس سنسان کوٹھی کے در و دیوار کو آسیب زدہ لُک LOOK دے رہی تھی۔ ہم مہمان خانے والے پورشن میں داخل ہوئے۔ ''رائفل بدست بنارس'' ہمارے ساتھ تھا۔ ہم خود بھی پوری طرح الرٹ تھے (حالانکہ داؤد کے کارندے اس مہمان خانے کا ایک سرسری جائزہ پہلے لے چکے تھے اور انہیں یہاں کچھ نہیں ملا تھا) مہمان خانے میں جھاڑ پونچھ نہیں کی گئی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ جگہ دو تین ماہ سے بالکل استعمال نہیں ہوئی۔ چلتے ہوئے ایک جگہ اچانک مجھے اپنے قدموں کی چاپ بدلی ہوئی محسوس ہوئی، میں رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' فخر نے چونک کر پوچھا۔

میں نے قالین پر تین چار دفعہ پاؤں مارا۔ گو بہت معمولی سا فرق تھا لیکن آواز میں فرق موجود تھا۔

''یہاں کچھ ہے؟'' میں نے ڈری سہمی جمیلہ سے پوچھا۔

''نہیں صیب جی...... مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ سہمی آواز میں بولی۔ اس نے اپنے ہاتھ مستقل طور پر جوڑ رکھے تھے۔

میں نے بنارس کو اشارہ کیا۔ اس نے کمرے کے اس حصے سے قالین اٹھایا۔ ہم نے غور سے دیکھا اور بے طرح چونک گئے۔ فرش کی ٹائیلوں میں تقریباً تین فٹ ضرب فٹ کا ایک ٹکڑا مختلف نظر آتا تھا۔ یہ کسی تہ خانے کا داخلی راستہ تھا۔

فخر نے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ خلا کو ڈھانپنے والا جدید ''کور'' ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ''لگتا ہے کہ یہ الیکٹرک پاور سے حرکت کرتا ہے۔'' فخر بولا۔

ہم نے کمرے میں موجود بجلی کے تقریباً سارے بٹن آزما کر دیکھے۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ خفیہ بٹنوں کی تلاش بھی کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ ایک ریموٹ کنٹرول ایک الماری کی اندرونی دراز سے برآمد ہوا۔ میں نے یونہی آزمائشی طور پر اس کے مختلف بٹن دبائے۔ اس پر ایک سرخ لائٹ اسپارک کرنے لگی۔

اچانک فرش کا وہ حصہ بغیر آواز پیدا کیے اپنی جگہ سے سلائڈ کرگیا۔ اس سلائڈنگ کے ساتھ ہی ایک لائٹ بھی خودبخود آن ہوگئی۔ ہمیں زینے دکھائی دیے۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس جگہ کو گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دیواروں کے ساتھ بہت سے کارٹن پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ جگہ خالی ہے۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

بنارس بولا۔ ''میں آگے جاتا ہوں سرجی۔''

''نہیں۔ پہلے ہی بہت نقصان ہوگیا ہے تم لوگوں کا۔'' میں نے اسے منع کیا۔

میں اور فخر آگے پیچھے زینوں پر اترے۔ (میں نے بلٹ پروف اتاری ہوئی تھی لیکن اسے دوبارہ پہننا پڑا) ہمارے ہاتھوں میں سیون ایم ایم رائفلیں بالکل تیار حالت میں تھیں۔ یہ کافی بڑا بیسمنٹ تھا۔ اس میں کوریڈورز اور کئی بڑے کمرے تھے۔ چونکہ اس سے گودام کا کام بھی لیا جاتا تھا اس لیے یہاں ''وینٹی لیشن'' کا بھی مناسب انتظام موجود تھا۔ تاہم یہ انتظام اس طرح سے کیا گیا تھا کہ باہر سے بیسمنٹ کی موجودگی کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔

''کوئی ہے؟'' میں نے آواز لگائی۔

جواب میں جو آواز سنائی دی، اس نے ہمیں ہلا دیا۔ ''کون؟ یہ کون ہے؟'' یہ سجاول کی آواز تھی۔ ہم دیوانہ وار آواز کی طرف لپکے۔

سیڑھیوں سے بس پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر وہ ایک کمرے میں موجود تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ایک لمبی زنجیر سے باندھ کر ایک بھاری بھرکم ڈبل بیڈ سے منسلک کردی گئی تھی۔ ہم نے اسے جس حالت میں دیکھا، اس نے ہمیں لرزا دیا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم اور چہرے پر کئی گہرے نشانات نظر آرہے تھے لیکن سب سے تکلیف دہ منظر سجاول کی آنکھوں کا تھا...... اس کی آنکھوں کی جگہ دو گھاؤ تھے۔ شاید ایک گھاؤ میں تھوڑی بہت انفیکشن بھی تھی۔ اس پر کوئی سفید مرہم لگایا گیا تھا۔

میں تڑپ کر آگے بڑھا اور سجاول کے دونوں کندھے تھام لیے۔ ''سجاول! یہ کیا ہوا سجاول؟''

مجھے لگا کہ سجاول نے میری آواز سنی ہی نہیں اور اگر سنی ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے مجھے ٹٹولا۔ ''شاہ زیب۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک دلدوز کراہ نکلی۔

''اوہ گاڈ! یہ کیا ہوا تمہارے ساتھ۔'' میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوگیا۔ میرا گلا رندھ گیا۔ میری نگاہیں سجاول کی آنکھوں کے بےنور حلقوں پر تھیں۔

فخر نے کمرے کی لائٹس آن کردیں۔ وہ سجاول جس کے رعب سے ایک خلقت کانپتی تھی، لاچاری کی تصویر بنا سامنے تھا۔ یقیناً اسے بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔

فخر نے گلوگیر آواز میں سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب! مجھے لگ رہا ہے کہ سجاول صاحب سن بھی نہیں پا رہے۔''

غالباً فخر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ سجاول تہ خانے کی سیڑھیوں سے فقط پندرہ بیس قدم کی دوری پر اس کمرے میں موجود تھا۔ جب ہم تہ خانے کے داخلی راستے کے فرش کو ٹھونک بجا رہے تھے اور اسے کھول رہے تھے۔ سجاول کو اس کی آواز آجانا چاہیے تھی، مگر اس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ ہم نے اس کے بالکل پاس پہنچ کر آواز لگائی تھی۔

میں نے منہ اس کے ایک کان سے لگایا۔ سجاول! میں شاہ زیب ہوں، میری آواز سن رہے ہو ناں؟'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

وہ زخمی آواز میں بولا۔ ''ہاں...... تھوڑی...... بہت تھوڑی۔''

''سجاول، کیا ہوا تمہارے کانوں کو اور تمہاری آنکھوں کو؟'' میں کربناک انداز میں چلایا۔

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... یہ ایسا ہی ہونا تھا۔''

''یہ ہاناوانی ہے ناں، میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ موت کو ترس ترس کر مرے گی۔'' اپنے لہجے کی بے پناہ تپش خود مجھے بھی محسوس ہورہی تھی۔

سجاول نے ٹٹول کر میرے دونوں کندھے تھام لیے۔ انہیں ہولے سے دبایا پھر بولا۔ ''اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ؟''

''فخر زماں ہے، پہلوان حشمت ہے اور داؤد بھاؤ کے بندے ہیں۔''

''کس کے بندے ہیں؟''

''داؤد بھاؤ کے۔'' میں نے سجاول کے دائیں کان سے منہ لگا کر زور سے کہا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس اسی کان سے وہ تھوڑا بہت سن سکتا ہے۔

''ہاناوانی کہاں ہے؟'' سجاول نے ٹھہری آواز میں پوچھا۔

''یہاں سے بھاگ گئی ہے حرامزادی۔ لیکن زیادہ دیر نہیں بھاگنے دوں گا۔ اس نے بہت سے قرضے چڑھا دیے ہیں ہمارے اوپر۔ اب اس مال زادی کو حساب دینا پڑے گا۔'' میں نے نہایت جذباتی اور حتمی لہجے میں کہا۔

''خورسنہ اور ذیشان؟'' سجاول نے پوچھا۔

''وہ بالکل خیریت سے ہیں سجاول۔ لیکن...... لیکن یہ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟ تمہاری آنکھیں...... مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔''

PakiBooks.site

سجاول نے جیسے کراہ کر دیوار سے اپنی پشت ٹکائی اور افسردہ لہجے میں بولا۔ ''وہ بہت بُری اور کمینی عورت ہے..... لیکن..... میری آنکھوں..... اور میرے کانوں کے ساتھ اس نے کچھ نہیں کیا۔''

''تو کس نے کیا ہے؟'' میں نے سجاول کے کان سے منہ لگا کر بلند آواز میں پوچھا۔

''تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

ایک دم میرے سر میں تیز جھماکا سا ہوا۔ میں ششدر نظروں سے سجاول کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ پھر کئی لمحے بعد میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''سجاول! سچ بتانا..... کہیں تم نے..... خود ہی تو.....؟''

میرا فقرہ ادھورا تھا لیکن سجاول کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ ایک کربناک توقف کے بعد اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

جو کچھ سجاول بتا رہا تھا، وہ میں نے سمجھ لیا تھا اور شاید فخر نے بھی۔ اور یہ اتنا تکلیف دہ تھا کہ پل بھر میں میرے جسم کے ہر مسام نے پسینہ اُگل دیا..... یہ ناقابلِ یقین بات تھی لیکن ہو چکی تھی۔ سجاول نے خود کو ہاناوانی کے انوکھے، خطرناک ٹرانس سے بچانے کے لیے اپنی بصارت اور سماعت قربان کر دی تھی۔ اس کے ''کانوں'' کے بارے میں تو ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اپنی ''آنکھوں'' سے وہ یقیناً محروم ہو چکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ زہریلی عورت اس کی آنکھوں اور کانوں کے راستے ہی اس کے اندر گھسے گی، اور اس نے یہ دونوں راستے مسدود کر ڈالے تھے۔

اگلے آٹھ، دس منٹ میں سجاول نے غم ناک لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ اس نے ہاناوانی کے جبر کا شکار ہونے اور اس کے اشاروں پر ناچنے کے بجائے دو روز پہلے وہی کچھ کیا جو اس جیسے بہادر شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک غیور اور محبت کرنے والے شوہر کی طرح خورسنہ اور اس کے بچے کو تو ہاناوانی کے پنجے سے آزاد کرا لیا تھا۔ اب وہ جانتا تھا کہ ہاناوانی اپنی نگاہوں کے طلسم کے ذریعے اسے کس طرح بے دست و پا کرنے والی ہے..... اور کس طرح اس کی شیطانی صلاحیتوں کے سامنے اس کی برداشت جواب دینے والی ہے۔ اس نے گودام میں موجود ایک تیز ایسڈ اپنی آنکھوں میں ٹپکا لیا تھا، اس نے سخت اذیت جھیلی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ اس سے اگلے روز اسے یہ خیال گزرا کہ کہیں صرف آواز کے ذریعے ہی ہاناوانی اسے اپنے قبضے میں نہ کر لے۔ ایک پاس کی الماری میں وہ ''سلیکون'' کی ایک بڑی ٹیوب بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر خاصی مقدار میں ''سلیکون'' اپنے دونوں کانوں میں ٹپکا لیا جو اندر تک چلا گیا اور اسے باہر کی آوازیں تقریباً بند ہو گئیں۔

اس صورتِ حال پر ہاناوانی طیش اور بوکھلاہٹ میں ناچ کر رہ گئی تھی۔ وہ خورسنہ اور ذیشان پر بھی دوبارہ چڑھائی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ اب لالہ موسیٰ میں سخت حفاظتی انتظام میں تھے۔ یہ وہ دردناک حالات تھے جن میں سجاول یہاں لاہور کی اس مضافاتی کوٹھی میں ''کالا شاہ کاکو'' کے قریب موجود تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سجاول نے یہاں ہاناوانی کے چنگل میں پھنسنے کے فوراً بعد ہی اپنی آنکھوں اور اپنی سماعت کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے خورسنہ کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے تین دن پہلے مجھے بتایا تھا کہ اسے اور بچے کو یہاں سے نکالتے وقت سجاول اسے پہلی بار جذباتی دکھائی دیا تھا۔ اس نے ذیشان کے ماتھے کو چوما اور پھر رات کو جب وہ اتفاقاً جاگی تو اس نے سجاول کو ایک ٹک اپنی طرف دیکھتے پایا۔ اس موقع پر میاں بیوی میں جو مکالمہ ہوا، وہ بھی خورسنہ نے بتایا تھا۔ خورسنہ نے کہا تھا۔ ''سجاول ایسے کیا دیکھ رہے ہیں میری طرف؟''

سجاول نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ ''بھئی آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔''

ہاں آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی تو ہوتی ہیں اور دیکھ کر سجاول نے ان سے جتنا دیکھنا تھا، وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک پیدائشی جنگجو اور نڈر تھا..... اور آج اس نے ایک شوہر اور ایک باپ کی حیثیت سے بھی اپنی بے خوفی اور اپنی ''کم منٹ'' کو ثابت کیا تھا۔

میری آنکھوں میں انگارے سے بھر گئے۔ ''ہاناوانی..... ہاناوانی.....'' میرے سینے میں ایک شور برپا تھا۔ ہاناوانی کی آواز فضاؤں میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جیسے کہہ رہی تھی..... میں آ گئی ہوں۔ تم سب میرے ہو..... اور تم مجھے روک نہیں سکتے — میں تمہیں چن چن کر ماروں گی.....

خونریزی اور بربریت کے خلاف صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

شاطر

اعتزاز سلیم وصلی

اچانک زندگی میں کوئی واقعہ ایسا رونما ہوتا ہے کہ انسان اخلاقیات کی ٹھنڈی چھاؤں سے اٹھ کر جرائم کی دنیا کی کڑی تپش میں آ کھڑا ہوتا ہے... نام نہاد اور بظاہر مہذب نظر آنے والے لوگوں کے بھیس میں مقید ضمیر فروش کی گھناؤنی اور سیاہی زدہ سنگین کاریاں... شکار کرنے والے شاطروں کا کھیل...

اس فرشتہ صفت کی کہانی جسے حالات و وقت نے مجرم بنا دیا.....

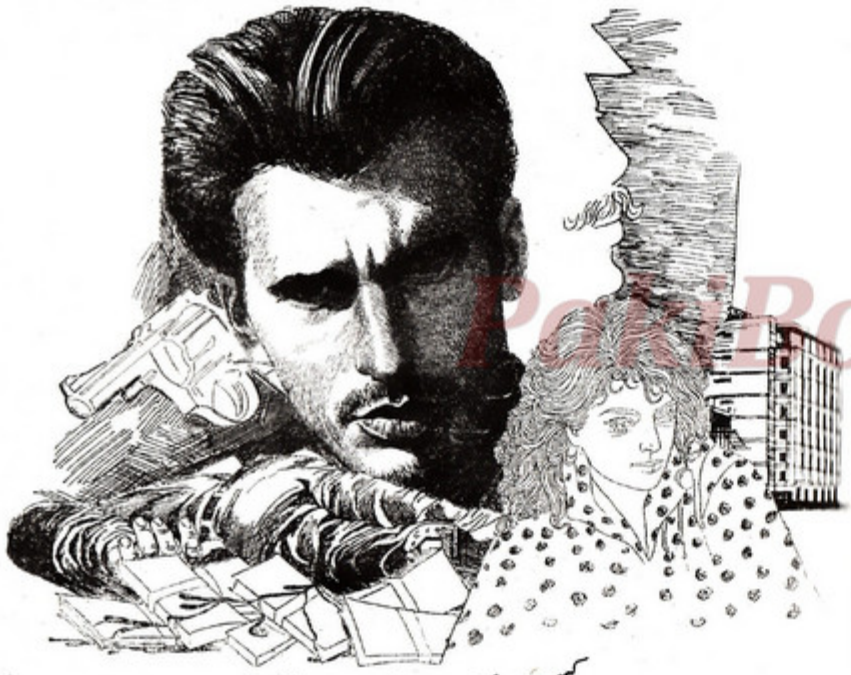

کبھی آپ صبح سویرے نیند سے اس حالت میں اٹھیں کہ آپ کے پیر ایک مضبوط رسی سے بندھے ہوں اور رسی گول چکر کھا کر بیڈ کے نیچے سے ہوتے ہوئے آپ کے کندھے اور چھاتی کے ساتھ ساتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کو لپیٹ میں لیے ہوئے ہو۔ منہ میں ایک عدد کپڑا ہو جس کی وجہ سے آپ کسی گونگے کی طرح ''اُوں اُوں'' تو کر سکتے ہیں مگر کبھی بول کر اپنی بات کا مطلب نہیں سمجھا سکتے تو یقیناً آپ کچھ اچھا محسوس نہیں کریں گے۔ ملک کا مشہور ترین سرجن

PakiBooks.site

حماد رضا بھی کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ نیند سے بیدار ہوتا اس کا دماغ ابھی تک تمام تر صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا اور اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔

''کک...... کیا ہوا ہے میرے ساتھ......'' اس نے خود سے پوچھا۔ اس نے گزر جانے والی رات کے بارے میں سوچا۔ شراب کی زیادتی کے باعث وہ روڈ پر اپنی گاڑی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ...... ابھرتی ہوئی خوبصورت ماڈل ناجیہ تھی جواب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس فلیٹ میں وہ بندھا پڑا تھا یہ حال ہی میں تعمیر ہونے والی عمارت میں تھا۔ جو اس نے ناجیہ کو اس کی برتھ ڈے کے موقع پر گفٹ کیا تھا۔ گھر سے باہر تنہائی کے لمحات کو خوبصورت بنانے کے لیے وہ دونوں اسی فلیٹ کو استعمال کرتے تھے۔ ''کیا یہ سب میرے ساتھ ناجیہ نے کیا ہے؟'' دل و دماغ اس بات کو ماننے سے انکار کر رہے تھے مگر حالات یہی بتاتے تھے۔ اس نے خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دماغ تھوڑا پُرسکون ہوا تو اس نے اپنی حالت پر دوبارہ غور کیا جو کہ قابلِ رحم تھی۔ اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی جو کچھ دن پہلے ہی پینٹ کی گئی تھی۔ سفید رنگ اور بڑے بڑے حروف میں وہاں یہ لکھا نظر آ رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب اُمید ہے آپ خود کو چھڑانے کی تمام کوششوں کے بعد یہ لائن پڑھ رہے ہوں گے۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا۔ نہ تاوان نہ کچھ اور۔ بس ایک بات آپ کے علم میں لانی تھی کہ آپ جس بیڈ پر بندھے ہوئے ہیں اس کے نیچے ایک عدد ٹائم بم فکس ہے جس پر چوبیس گھنٹے کا وقت سیٹ کیا ہوا ہے۔ اس بم کے ساتھ ایک ڈوری منسلک ہے جو فلیٹ کے دروازے کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ جیسے ہی کوئی دروازہ کھولے گا بم دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اُمید ہے آپ کے بوجھ سے دھرتی آزاد ہو جائے گی۔ خود کو کیسے بچانا ہے یہ آپ خود سوچیں۔ بیسٹ آف لک۔''

حماد کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اگر یہ مذاق تھا تو بہت بھیانک تھا لیکن اگر حقیقت تھی تو...... اس کے آگے سوچنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہاں سے آزاد ہونا ناممکن لگ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک سیاہ رنگ کی باریک ڈوری لاک کے ساتھ فکس تھی اور دروازے کو لاک لگا ہوا تھا جو کہ باہر سے لگایا گیا تھا۔ اس لاک کو باہر سے توڑا جاتا تو بھی ڈوری بم سے نکل جاتی اور بم بلاسٹ ہو جاتا۔ حماد کے پاس چوبیس گھنٹے تھے۔ اس نے اپنے گناہوں کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ موت سامنے ہو تو بندے کو خدا ضرور یاد آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حماد کے دماغ میں دشمنوں کی ایک لسٹ بننا شروع ہو گئی جو اس کے ساتھ ایسی حرکت کر سکتے تھے۔ ناجیہ ایسا منصوبہ نہیں بنا سکتی تھی۔ یہ کسی نے ذہانت سے جال بچھایا تھا جس کو توڑنا ناممکن لگ رہا تھا۔ ''کون کر سکتا ہے میرے ساتھ ایسا؟'' یہی سوال بار بار اس کے دماغ پر دستک دے رہی تھی مگر مجرم تک پہنچنے والا دروازہ ہنوز بند تھا۔ اس نے تھک کر اپنا بندھا ہوا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنے کیے ہوئے گناہوں پر معافی مانگنے لگا جن کی ایک لمبی لسٹ اس کے دماغ کے کمپیوٹر میں گردش کر رہی تھی۔

☆☆☆

فلیٹ سے تقریباً ستر کلو میٹر فاصلے پر جنگل کے شروع میں بنا ہوا وہ کمرا جو کئی سال سے ویران پڑا تھا، آج آباد تھا۔ یہ ایک دولت مند شکاری نے تعمیر کروایا تھا جو کبھی کبھی شکار سے تھک کر آنے کے بعد یہاں قیام کرتا تھا۔ یہ زمین گورنمنٹ کی ملکیت تھی مگر امیر لوگوں کے لیے گورنمنٹ کی ایسی زمینیں استعمال کرنا آسان تھا۔ کمرے میں ایک عدد چارپائی موجود تھی جس پر ناجیہ بندھی پڑی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی رات کو کیا ہوا تھا۔ وہ اور حماد شراب کے نشے میں سڑک پر ہی رک گئے تھے۔ حماد ہوش میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک کسی کی آمد ہوئی۔ اس کے بعد ناجیہ کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ تھوڑے وقفے کے بعد کسی گاڑی یا ٹرکوں کا شور اس بات کے گواہ تھے کہ سڑک قریب ہی ہے۔ ناجیہ، حماد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ''کہیں اس نے تو میرے ساتھ یہ نہیں کیا؟'' دماغ نے فوراً انکار کیا۔ وہ حماد کی گرل فرینڈ تھی۔ حماد ایسا کیوں کرتا اس کے ساتھ۔ وہ انہی سوچوں میں تھی کہ کمرے کا دروازہ چرچرایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے حلیے میں کچھ ایسی بات تھی جس کی وجہ سے ناجیہ چونک گئی۔ اس کی چال ڈھال عام نوجوانوں کے برعکس تھی۔ ''ہمیں چلنا ہے۔'' اس کی آواز بھی عجیب تھی۔ ناجیہ کے دماغ میں ہلچل ہوئی۔ اس نے کپڑا ناجیہ کے منہ سے نکال دیا۔ چند گہری سانسیں لینے کے بعد ناجیہ نے کہا۔

''کہاں؟ اور مجھے اس طرح کیوں باندھا ہے، کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟''

''تمہارے سوالات کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتا اور ہاں تمہارے ہاتھ پیر کھول رہا ہوں، کسی قسم کی چالاکی کی تو میں تمہیں ایک گولی سے نہیں ماروں گا۔'' اس نے ریوالور دکھا کر پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا۔ ''بلکہ اس خنجر سے تمہاری بوٹی بوٹی الگ کر کے جنگل میں پھینکوں گا پھر تمہارا باپ زاہد احمد بھی تمہارے ٹکڑے اکٹھے نہیں کر سکتا۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے ناجیہ کو لرزہ دیا۔

''تم کون ہو؟''

''میں وہ ہوں جو اگلے چوبیس گھنٹے میں تمہیں اور حماد کو موت کے منہ میں پہنچاؤں گا اور تمہارے باپ کو بتاؤں گا کہ رشتوں کے ختم ہونے کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔'' وہ غرایا۔

''کیا بگاڑا ہے پاپا نے تمہارا؟''

''ابھی بہت وقت ہے، صرف دس منٹ گزرے ہیں۔ کل صبح نو بجے تک ہم ساتھ ساتھ ہوں گے، تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا، ابھی میرے ساتھ چلو۔'' وہ اسے بازو سے پکڑ کر باہر لایا۔ وہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے ناجیہ کو گاڑی میں دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایک جگہ رکے۔ ''یہ لو۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا۔ ''اس میں صرف حماد کی ماں کا نمبر سیو ہے، کال کرو اسے اور کہو کہ حماد تمہارے پاس ہے اور شام تک تمہیں پانچ کروڑ روپے چاہئیں ورنہ تم حماد کو مار دو گی۔'' اس نے ناجیہ کو سمجھایا۔

''مگر وہ میری آواز پہچان جائیں گی۔''

''تو کیا ہوا؟ جو کہا ہے وہ کرو۔'' ناجیہ نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے حماد کی ماں کی آواز سنائی دیتے ہی وہ بولی۔

''حماد میرے پاس ہے، آج شام تک پانچ کروڑ روپے کا بندوبست کر لیں ورنہ میں اس کی جان لے لوں گی۔ شام کو دوبارہ کال کروں گی تب تک پیسے تیار ہوں، اگلی کال کا انتظار کریں۔'' دوسری طرف شاید مہناز بیگم سکتے میں تھیں۔ ان کی آواز سنائی نہیں دی۔ ساتھ بیٹھے نوجوان نے ناجیہ کے ہاتھ سے سیل پکڑ لیا۔

''بس اتنا بہت ہے۔'' نجانے کیوں ناجیہ کو محسوس ہوا یہ کال صرف حماد کے اغوا کی اطلاع کے لیے کروائی گئی ہے۔ پیسے مانگنا صرف ایک بہانہ تھا۔ سوال پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں ہوئی۔ واپسی کا سفر بھی اسی تیزی سے ہوا۔ راستے میں ناجیہ نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''تت...... تمہارا نام؟'' نوجوان مسکرایا اور جواب دیا۔

''نام اور پہچان تو تمہارے باپ نے چھین لی۔'' اس کی مسکراہٹ میں چھپا درد ناجیہ نے محسوس کیا۔ ''فرید نام ہے میرا۔'' اس کی شکل و صورت بہت پیاری تھی۔ نقوش میں زنانہ پن تھا اور ہونٹ بالکل لڑکیوں جیسے تھے۔ چال ڈھال اگر مردوں جیسی ہوتی تو کوئی بھی لڑکی اس پر فدا ہو سکتی تھی۔ وہ ناجیہ کو واپس اسی کمرے میں لے آیا۔ چارپائی پر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونستے ہوئے بولا۔ ''رات کو شراب زیادہ پی لی تھی تم نے، اس لیے یہ چوبیس گھنٹے بھوکے گزار لینا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''میری بیٹی ایسا کیسے کر سکتی ہے؟'' زاہد احمد چلّائے۔

''کیا ہے اس نے ایسا، مجھے کال کی ہے، آواز اسی کی تھی۔'' مہناز بیگم اس سے بلند آواز میں چلائیں۔ ''میرا بیٹا اس کے پاس ہے۔ میں جانتی تھی وہ حرافہ ہے، مردوں کے سامنے اپنے جسم کی نمائش کر کے انہیں دیوانہ بناتی ہے، میرا بیٹا بھی پھنس گیا اس کے جال میں...... میں کہاں سے لاؤں پانچ کروڑ......'' وہ بیٹھ کر رونے لگیں۔

''مذاق کر رہے ہوں گے دونوں، میں ڈھونڈتا ہوں انہیں۔'' حماد انہی کے اسپتال میں جاب کرتا تھا۔ زاہد احمد بھی ڈاکٹر تھے اور ناجیہ ان کی بیٹی تھی۔ مہناز نے ابھی ابھی کال کر کے انہیں بلایا تھا۔ انہوں نے حماد کا نمبر ملایا۔ وہ بند جا رہا تھا۔ ناجیہ کا نمبر بھی بند تھا۔ ''کہاں گئے یہ دونوں۔'' آدھے گھنٹے میں انہوں نے حماد اور ناجیہ کے تمام دوستوں سے رابطہ کیا۔ ناجیہ کی دوست ثنا نے انہیں بتایا۔

''وہ دونوں رات کو میری برتھ ڈے پارٹی میں تھے، حماد نے شراب زیادہ پی لی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ یہاں سے چلے گئے تھے۔'' زاہد احمد نے پولیس سے رابطہ کیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پندرہ منٹ بعد انسپکٹر حمید ان کے سامنے تھا۔ زاہد احمد سے تفصیل جاننے کے بعد اس نے گہری سانس لی۔

''ممکن ہے نشے میں کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو، میں پتا کرواتا ہوں۔'' شہر میں اس رات صرف ایک کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں ڈرائیور اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ مہناز بیگم ٹہل رہی تھیں۔

''میں پانچ کروڑ دے دوں گی اس حرافہ کو، میرے بیٹے کو چھوڑ دے وہ، زاہد احمد تم بھی شامل ہو میرے بیٹے کے

PakiBooks.Site

اغوا میں۔"

"زبان سنبھال کر بات کریں مہناز، حماد بیٹوں کی طرح عزیز ہے مجھے۔ اس لیے برداشت کر رہا ہوں آپ کو۔" زاہد احمد نے درشت لہجے میں جواب دیا۔

"ایک تو آپ کی بیٹی نے میرے بیٹے کو اغوا کرلیا اور میں زبان سنبھال کر بات کروں؟ واہ! نکل جائیں میرے گھر سے۔" مہناز چلّائیں۔ غصے کی شدت سے وہ پاگل ہو رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں، حماد مل جائے پھر میں آپ سے اس رویے کی وضاحت لوں گا۔" زاہد احمد تیزی سے باہر نکل گئے۔ حمید جو اب تک خاموش تھا' مہناز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔" اس نے مہناز سے سیل فون لیا۔ "کال کس نمبر سے آئی تھی؟" مہناز کے بتانے پر اس نے نمبر نوٹ کیا۔

"انسپکٹر صاحب میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے، میں پیسوں کا بندوبست کرتی ہوں۔" ان کی بات سن کر حمید نے سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد حمید کو کال موصول ہوئی۔

"ہاں حسن، میں ایک نمبر لکھوا رہا ہوں اس کی لوکیشن ٹریس کرو، چیک کرو آخری کال کس جگہ سے کی گئی ہے اور ہاں سم کس کے نام پہ رجسٹر ہے اس کا ایڈریس بھی۔ جلدی، تمہارے پاس بس پندرہ منٹ ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ حسن محکمے کا سب سے محنتی بندہ تھا۔ حسن کی صلاحیتوں پر اسے پورا بھروسا تھا۔ حمید اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ اسی دوران مہناز کی آمد ہوئی۔

"حماد کے اکاؤنٹ میں کافی رقم ہے باقی میں قرض لے کر شام تک پوری کرلوں گی۔"

"حماد کی کسی سے دشمنی؟ کوئی ایسا بندہ جو اس کے اور ناجیہ کے تعلق کے خلاف ہو؟" حمید نے پوچھا۔

"ناجیہ جیسی لڑکیاں پتا نہیں کہاں کہاں منہ کالا کرتی ہیں، اس کے کئی یار ہوں گے، کیا خبر کون اس تعلق کے خلاف ہو۔" ان کے لہجے میں نفرت تھی۔ کل تک جس ناجیہ کو وہ بہو کے روپ میں دیکھ رہی تھیں آج وہ بازاری لڑکیوں سے بھی بُری لگ رہی تھی۔

"کسی پہ شک؟ کوئی ایک نام جو ایسا خطرناک کام کر سکے؟" وہ انہیں بہ غور دیکھ رہا تھا۔

"نہیں، کوئی ایسا نام نہیں آرہا میرے دماغ میں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سکون سے بیٹھ کر سوچیں تب تک میں ضروری کرلوں۔" حمید باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسن کی موصول ہوئی۔

"سر، لوکیشن شہر سے باہر مراد آباد گاؤں کے پاس ہے۔ اس سے تھوڑا پیچھے جائیں تو ایک جنگل بھی پاس ہے۔ سم ایک بوڑھی عورت کی ملکیت ہے جو تین ماہ پہلے مر چکی ہے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"ہمم..... اس کا مطلب ناجیہ کو استعمال کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ اتنی ذہانت سے منصوبہ نہیں بنا سکتی، تم ایسا کرو اس کے متعلق تمام تفصیل لو اور اس کے دوستوں اور دشمنوں کی ایک پوری لسٹ تیار کرو، جلدی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، میں ذرا مراد آباد اور اس کے اردگرد کا علاقہ چیک کرلوں۔" وہ حسن کو ہدایات دیتا ہوا باہر آگیا۔ اتنی دیر میں گیارہ بج چکے تھے۔

☆☆☆

زاہد احمد اپنے شاندار بنگلے کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ان کی ایس پی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے ناجیہ کو جلد ڈھونڈنے کا وعدہ کیا تھا۔ "کون کر سکتا ہے ایسا میرے ساتھ؟" وہ بڑبڑائے۔ اسی وقت چوکیدار نے اطلاع دی۔

"سر، گیٹ پر ایک لڑکا آیا ہے، کہتا ہے آپ کے لیے کوئی ضروری پیغام ہے۔"

"کون ہے؟ نام پوچھو اس کا۔"

"شیراز نام بتایا ہے، کالج کا طالب علم لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اندر بھیج دو تلاشی لے کر اور ساتھ میں ایک سیکیورٹی گارڈ بھی بھیجنا۔" انہوں نے ہدایت دی۔ ان کا دماغ الجھ گیا تھا۔ "کون ہو سکتا ہے؟" پانچ منٹ بعد شیراز اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

"سلام سر، یہ آپ کے لیے ایک شخص نے دیا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ زاہد کو تھمایا۔

"کس نے دیا ہے؟"

"پتا نہیں کون تھا، چہرہ چھپایا ہوا تھا اس نے، مجھے پکڑا کر آپ کے گھر کا ایڈریس دیا اور دو سو روپے معاوضہ بھی دیا۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو سو روپے نکالے اور زاہد کو دکھائے۔ زاہد نے لفافہ کھولا۔ اس میں ٹائپ شدہ خط نکلا۔

"اُمید ہے خط وقت پر تمہارے پاس پہنچ گیا ہوگا۔

میں کون ہوں یہ جاننا ضروری نہیں۔ میں کیا چاہتا ہوں وہ میں بتا دیتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے وہ ہے تمہاری تباہی۔ ناجیہ اور حماد اس وقت میرے پاس ہیں، کل ٹھیک نو بجے دونوں مارے جائیں گے۔ تمہارے پاس تقریباً بیس گھنٹے کا وقت ہے، دولت ہے، پاور ہے تو اتنا کرلو کہ بچا لو دونوں کو۔" زاہد کے جسم سے پسینا چھوٹ پڑا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھے اور شیراز کے کندھے تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کون تھا وہ؟ کدھر گیا؟ بتاؤ مجھے۔" شیراز پہلے ہی خوفزدہ تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"مم..... مجھے نہیں پتا سر، میں قسم کھاتا ہوں مجھے نہیں پتا۔" زاہد کو اس کی حالت پر رحم آگیا۔

"اسے باہر چھوڑ آؤ۔" انہوں نے سیکیورٹی گارڈ کو اشارہ کیا۔ شیراز نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور باہر نکلنے سے پہلے آئندہ کسی اجنبی پر بھروسا کرنے کی توبہ کر لی۔ اس کے جاتے ہی زاہد نے حمید کا نمبر ملایا۔ حمید کی آواز سنتے ہی وہ بولے۔ "مجھے خط ملا ہے، اس نے ناجیہ اور حماد دونوں کو اغوا کر رکھا ہے، وہ دونوں کو مار دے گا۔"

"کون مار دے گا؟" حمید کے منہ سے نکلا۔

"وہی جس نے انہیں اغوا کیا ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔

"میں نے کال کی لوکیشن ٹریس کی ہے ادھر جا رہا ہوں، آپ فکر نہ کریں جلد اس تک پہنچ جائیں گے۔"

"وہ کوئی مطالبہ نہیں کر رہا بس انہیں مارنا چاہتا ہے۔ پلیز میری بیٹی کو بچا لیں۔" زاہد احمد رو پڑے۔ ناجیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے ناجیہ کو لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس کی کوئی ایسی فرمائش نہ تھی جو زاہد احمد نے پوری نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ بخوشی ماڈلنگ جیسے شعبے میں جانے کی اجازت دے دی۔ آج اس کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ بے بس تھے۔ کال بند کرتے ہی وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ پولیس سے زیادہ تیز کام کون کر سکتا ہے؟ کوئی ایسا شخص تھا جسے وہ بھول رہے تھے جو سب سے زیادہ چالاک تھا۔ اچانک ان کے دماغ میں نام آیا۔ "طاہر خان۔" ہاں، وہ ایسا شخص تھا جو پولیس سے زیادہ تیزی سے مجرم تک پہنچ جاتا۔ طاہر خان ملک کے مشہور ترین بزنس مین پرویز خان کا خاص آدمی تھا۔ خطرناک اور چالاک۔ ہر غیر قانونی کام آسانی سے کر لیتا تھا۔ پرویز، زاہد احمد کا دوست تھا اور دونوں ایک کام میں پارٹنر بھی تھے۔ انہوں نے پرویز کا نمبر ملایا۔

"آہا، ڈاکٹر صاحب، بڑے دنوں بعد یاد کیا غریب کو۔" اس کی چہکتی آواز سنائی دی۔

"ایک کام ہے تم سے پرویز۔"

"کیوں، کوئی نیا مال آیا ہے کیا؟ ویسے کافی دن ہو گئے ہیں اب تو اور بھی کافی لوگ پوچھنے لگے ہیں۔"

"نہیں، مجھے طاہر کی ضرورت ہے ایک کام کے سلسلے میں۔" وہ ابھی پرویز خان کو ناجیہ کے اغوا کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے تھے۔

"ٹھیک ہے، میں بھیج دیتا ہوں۔" پرویز شاید مصروف تھا اس لیے بات زیادہ لمبی نہیں کی۔ انہوں نے گہری سانس لی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیبل پر پڑی کاپی پنسل اٹھائی اور ایک لسٹ بنانے لگے۔ بارہ بج چکے تھے۔

☆☆☆

حمید کو گاؤں کی لوکیشن کے پاس سے کوئی سراغ نہیں ملا۔ کال کسی ویران جگہ سے کی گئی تھی۔ اس نے پولیس پارٹی کے ساتھ اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ اسی دوران حسن کی کال موصول ہوئی۔

"سر، یہ حماد کی شخصیت میں بہت سی چیزیں مشکوک ہیں، اس کے دشمنوں کی ایک لمبی لسٹ بن جائے گی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک پڑا۔

"سر یہ زاہد احمد اور حماد دونوں بہت بدنام ہیں۔ یہ غیر قانونی آپریشن کرتے ہیں۔ سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ پچھلے دنوں اٹھارہ سے بیس سال کے لڑکوں کے اغوا کے سلسلے میں بھی ان دونوں کا ہاتھ تھا۔" حسن نے تفصیل بتائی۔

"اوہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تمہیں یہ اطلاعات کیسے ملیں اور یہ دونوں اب تک آزاد کیوں گھوم رہے ہیں؟"

"ثبوت اور گواہ نہیں، ان کے پاس پیسے کی طاقت ہے اور زاہد احمد کا کئی سیاست دانوں کے ساتھ یارانہ ہے۔"

"کوئی ایسا دشمن جو یہ خطرناک کام کر سکے؟"

"کوئی ایک نام لینا بہت مشکل ہے۔" اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

"تم ان سب کو تلاش کرو جن کا انہوں نے آپریشن کیا ہے، حماد کی تلاش میں کر رہا ہوں۔" اس نے حسن کو مزید ہدایات دیں اور کال بند کردی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔ وہ ابھی مکمل

PakiBooks Site

اندھیرے میں تھا اور وقت دھیرے دھیرے سرکتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے حماد کی گاڑی ملی تھی۔ ہر چیز کو غور سے دیکھنے کے بعد بھی اسے کوئی ایسا سراغ نہ ملا جس سے مجرم کا سراغ لگ سکتا۔ اس نے سڑک کے کنارے پر سونے والے فقیروں سے پوچھ گچھ کی۔

''ہم رات کو یہاں نہیں تھے۔'' ان سب کا مشترکہ جواب سامنے آیا۔

''کیوں؟ کسی اور جگہ سوتے ہو؟''

''نہیں صاحب، رات ہم کھانا کھانے چلے گئے تھے ظہیر صاحب کے۔ پاس ہی ان کا بنگلا ہے وہاں پر فنکشن بھی تھا ان کے بیٹے کی شادی کا۔'' ایک نے جواب دیا۔

''ہاں جی بہت بڑا فنکشن تھا، ناچنے گانے والے بھی شامل تھے۔'' دوسرے نے اضافہ کیا۔

''ناچنے گانے والی لڑکیاں؟'' اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''نہیں جی، ہیجڑے تھے۔'' فقیر کا جواب سن کر اس کے ذہن میں جھما کا ہوا۔ اس نے حسن کو کال ملائی۔

''حماد اور زاہد احمد کس قسم کا آپریشن کرتے تھے؟'' حسن کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے پوچھا۔

''سر، تفصیل نہیں پتا مگر سنا ہے خوبصورت لڑکوں کو آپریشن کے ذریعے خواجہ سرا بنا کر شوقین لوگوں کو پیش کرتے تھے۔''

''اوہ نو...... تم جلدی یہاں پہنچو۔'' اس نے ایڈریس سمجھایا۔ ''مجھے لگتا ہے مجرم رات کو یہاں آس پاس تھا۔'' اس نے کہا اور تیزی سے ظہیر احمد کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گیٹ کے باہر اطلاعی گھنٹی بجانے کے بعد اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔

''یس۔'' تھوڑی دیر بعد نفیس چشمہ پہنے ایک نرم لہجے والے شخص کی آمد ہوئی۔

''انسپکٹر حمید۔'' حمید نے اپنا کارڈ دکھایا۔

''میں ظہیر احمد۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ''کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟''

''ایک رات پہلے یہاں شادی کے فنکشن میں خواجہ سرا شریک تھے؟'' وہ سیدھا موضوع پر آگیا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔

''ہاں، میرے بیٹے کی شادی میں اس کے کچھ دوستوں نے بلوائے تھے، کیوں خیریت تو ہے ناں؟'' ظہیر احمد نے پوچھا۔

''جی خیریت ہے، مجھے ان کی تفصیل درکار ہے، آپ اپنے بیٹے کو بلائیں ذرا۔''

ظہیر نے اسے کمرے میں بٹھایا اور خود بیٹے کو بلانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں باپ بیٹا اس کے سامنے تھے۔

''جی میرا نام کمال ہے۔'' ظہیر کے بیٹے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''مجھے خواجہ سرا کے گروپ کے بارے میں پوچھنا ہے، کہاں سے لائے گئے تھے اور کون لایا تھا؟'' حمید نے پوچھا۔

''میرا دوست ہے شہباز، وہ لایا تھا انہیں۔ میں بلاتا ہوں اسے۔'' کمال نے موبائل نکال کر شہباز کو کال کی اور گھر آنے کو کہا۔ اسی دوران ایک ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آگیا جسے حمید نے ''شکریہ'' کہہ کر منہ سے لگالیا۔

''خیریت تو ہے سر؟ کوئی واردات کی انہوں نے؟'' کمال نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی شک کے دائرے میں ہیں ایک اغوا کیس کے سلسلے میں اسی لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔'' حمید نے گول مول جواب دیا۔ پانچ منٹ بعد شہباز کی آمد ہوئی۔ اس کی چال ڈھال کچھ الگ تھی۔ حرکات میں عجیب سا زنانہ پن تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بھی قریب بیٹھ گیا۔ حمید نے اپنا تعارف کروایا اور سوال دہرایا۔ ''مجھے خواجہ سراؤں کے بارے میں تفصیل پوچھنی ہے جنہیں تم ناچ گانے کے لیے لائے تھے؟''

''میں شہر سے ہی لایا تھا انہیں، پورا گروپ تھا ان کا۔'' اس نے تمام تفصیل حمید کو بتائی۔ ''ٹوٹل پانچ تھے وہ۔'' اور ساتھ ہی ان کا ایڈریس بھی لکھوا دیا۔ حمید ان کا شکریہ ادا کر کے باہر آگیا۔ حسن بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

''ہمیں خواجہ سراؤں کے ایک گروپ سے ملنا ہے۔'' اس نے مختصر الفاظ میں حسن کو بتایا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر شہر چلے آئے، ایک بج چکا تھا۔

☆☆☆

ناجیہ بے بس چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ بھوک اور پیاس سے اس کا بُرا حال تھا۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی۔ ایک بار پھر فرید کی آمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور برگر تھا۔

''میں نے سوچا کچھ ترس کھاؤں تم پر اس لیے فیصلہ بدل لیا۔ کھاؤ یہ۔'' ناجیہ کے ہاتھ پیر کھولنے کے بعد اس نے برگر اور پانی کی بوتل اسے پکڑائی۔ وہ ندیدوں کی طرح کھانے لگی۔ پیٹ بھرنے کے بعد اس نے فرید کی طرف دیکھا۔ وہ کسی خیال میں گم نظر آتا تھا۔ ناجیہ نے کچھ سوچا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ آزاد تھی۔ اس نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ اچانک وہ اٹھی۔ اس نے پوری قوت سے فرید کو دھکا دیا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی مگر باہر نکلنے سے پہلے فرید نے اسے پکڑ لیا تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا تھا۔ ناجیہ نے اپنے دانت اس کی کلائی پر گاڑ دیے۔ فرید نے خود کو چھڑایا اور پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ الٹ کر چارپائی پر گر گئی۔ ناجیہ کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا فرید اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ وہ اس پر سوار ہو گیا۔ اس کی سانسوں کی گرمی ناجیہ کو اپنے چہرے پر محسوس ہوئی۔ وہ جانوروں کی طرح غرایا۔ اس کے ہاتھ ناجیہ کے پورے جسم پر گردش کر رہے تھے۔ ناجیہ نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے صدیوں سے بھوکے شیر کے ہاتھ شکار لگ گیا ہو۔ اس کے ہونٹ ناجیہ کے چہرے سے ٹکرائے۔ وہ بہت خوبصورت اور نازک ہونٹ تھے مگر آج ان میں وحشت بھری ہوئی تھی۔ اچانک جیسے فرید کا جسم سرد پڑ گیا ہو۔ وہ جھٹکے سے اٹھا اور اپنا ہاتھ زور سے دیوار پر مارا۔

''کچھ نہیں بگاڑ سکتا میں تمہارا۔ کچھ نہیں۔'' وہ چلایا۔ جذبات کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ اس نے ناجیہ کے پاس پڑی پانی کی بوتل اٹھائی اور بچا ہوا پانی ایک سانس میں پی گیا۔ دھیرے دھیرے وہ پُرسکون ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نرم لہجے میں ناجیہ سے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' ناجیہ چپ چاپ چل پڑی۔ اس نے مزاحمت کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اس بار کار میں ان کا سفر پہلے سے زیادہ لمبا تھا۔ مراد آباد سے تقریباً پچیس کلومیٹر آگے ایک اور گاؤں میں گاڑی روک کر فرید نے جیب سے سیل فون نکالا۔

''حماد کی ماں کا نمبر ملا رہا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ناجیہ کو تمام تفصیل سمجھا دی۔

مہناز بیگم کی آواز سنائی دیتے ہی ناجیہ بولنا شروع ہو گئی۔ ''پانچ کروڑ کی رقم لے کر ٹھیک رات نو بجے محمود پلازا کے باہر بنی پارکنگ میں آجائیں۔ اگلی ہدایات آپ کو وہاں ملیں گی۔''

ناجیہ اس بات سے بے خبر تھی کہ مہناز نے پیغام ریکارڈ کر لیا ہے۔ اس نے کال کاٹ دی۔ وہ ابھی تک الجھن کا شکار تھی۔ فرید کا رویہ اس کے ساتھ عجیب تھا۔ کچھ

دیر پہلے ہونے والے واقعے کے بعد ناجیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی عزت محفوظ رہے گی۔ واپسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔ کار سے اتار کر وہ اسے اسی کمرے میں واپس لے آیا۔

''مجھے لگتا ہے تاوان کی رقم مانگنا صرف ایک بہانہ ہے؟'' نجانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی جو اس نے فرید کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نظریں ملا کر یہ کہہ دیا تھا۔

''تمہیں کیوں لگتا ہے ایسا؟'' وہ مسکرایا۔

''پتا نہیں کیوں، میرا دل کہتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا دل غلط کہتا ہے، مجھے برباد کرنا ہے تم سب کو، پیسے بھی لوں گا اور جان بھی۔''

ناجیہ کا جسم کانپ اٹھا۔ کچھ ایسی ہی سفاکیت تھی اس کے لہجے میں۔ ''تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''

''بتاؤں گا تمہیں، بہت جلد بتاؤں گا۔ سُن کر یقین بھی نہیں کرو گی کہ تمہارے باپ کا اصل چہرہ کتنا بدصورت ہے۔ کتنے لوگوں کی زندگی اجاڑ چکا ہے وہ۔'' وہ نفرت سے بولا۔

''میرے پاپا ایسے نہیں ہیں، وہ کسی کا نقصان نہیں کرتے نہ انہیں ضرورت ہے۔'' وہ فرید سے الجھ پڑی۔

''کہا ناں یقین نہیں کرو گی، کبھی سوچنا کہ ایک سرکاری ڈاکٹر کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی کہ آج وہ شہر کے سب سے مہنگے اسپتال کا مالک ہے۔ سوچنا کہ اس کے مختلف شہروں میں مختلف ناموں سے بینک اکاؤنٹ کیوں ہیں؟ اور یہ بھی سوچنا کہ اس کے خلاف پولیس کیوں نہیں جاتی۔'' آخری بات کہتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔ ''تم لوگ شراب پی کر، موج مستی کر کے سونے والے لوگ ہو، زندگی کی تلخ حقیقتوں کے بارے میں سوچنا بھی۔ پتا چل جائے گا تمہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ناجیہ کو باندھ دیا۔ ایک بار پھر وہ بے بس ہو چکی تھی۔ فرید کی کلائی پر بندھی گھڑی تین بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر خان، زاہد احمد کے سامنے بیٹھا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتے قد کے ساتھ مضبوط جسم کے مالک طاہر کا چہرہ اس بات کا گواہ تھا کہ اس نے کس قسم کی زندگی گزاری ہے۔ زاہد احمد نے اسے تمام تفصیل بتا دی تھی۔

''جس نمبر سے مہناز کو کال موصول ہوئی تھی اسے

PakiBooks.site

ٹریس کیا گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں کرلیا گیا ہے مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ مراد آباد کے پاس ہی کہیں سے کال کی گئی ہے مگر اردگرد کہیں ناجیہ یا مجرم کا سراغ نہیں ملا۔'' زاہد احمد نے حمید سے لی گئی تمام تفصیلات اسے بتادیں۔

''ہمم..... اس کاروبار میں آپ کی دشمنی ہے کسی سے؟''

''تم تو جانتے ہو طاہر، ہمارا کام ایسا ہے کہ ہزار دشمن اور ہزار دوست مگر ایسا کوئی دشمن نہیں جو سیدھا ہماری عزت پر ہاتھ ڈالے۔'' وہ طاہر کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

''میرا ایک سوال اور ہے، پارٹی میں شرکت کرنے کے بعد ناجیہ اور حماد اس راستے پر کیوں سفر کر رہے تھے جہاں نہ ناجیہ کا گھر آتا ہے نہ حماد کا۔ حماد ڈیفنس میں رہتا ہے اور ناجیہ یہاں۔''

زاہد احمد چونک پڑے۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے نشے کی زیادتی کے باعث رستہ بھول گئے ہوں۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، ثنا نے جو تفصیل بتائی ہے اس کے مطابق حماد زیادہ نشے میں تھا ناجیہ نہیں۔ وہ رستہ بھول سکتا تھا مگر ناجیہ تو بتا سکتی تھی۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اس علاقے میں جارہا ہوں وہاں جاکر پوچھ گچھ کرتا ہوں سب سے۔''

''دھیان رکھنا، حمید سخت پولیس آفیسر ہے، اپنے کام میں دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتا۔'' انہوں نے سمجھایا۔

''فکر نہ کریں زاہد صاحب۔ مجھے تجربہ ہے ایسے کاموں کا۔'' وہ ہاتھ ملا کر باہر چل دیا۔ باہر اس کی بائیک کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہواؤں سے باتیں کررہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس جگہ موجود تھا جہاں حماد اور ناجیہ کو اغوا کیا گیا تھا۔ اس نے اردگرد موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کی۔ اس کے سیل فون میں حماد کی تصویر تھی۔ وہ دکھا کر کچھ لوگوں سے پوچھا مگر اکثر بے خبر تھے۔ وہ کسی خیال کے تحت آگے چلا آیا۔ وہاں ایک نئی بننے والی عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہونے ہی لگا تھا کہ گیٹ پر کھڑے سیکیورٹی گارڈ نے اسے روک لیا۔

''کیا بات ہے؟''

''مجھے ایک دوست کی تلاش ہے شاید اس عمارت میں آیا ہو۔'' اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ ہی جیب سے موبائل نکال کر تصویر اس کے سامنے کردی۔ ''یہ میرا دوست ہے، کہیں دیکھا ہے آپ نے؟''

''ارے ہاں..... یہ اور ان کے ساتھ ایک میڈم اکثر فلیٹ پر آتے رہتے ہیں۔'' طاہر چونک پڑا۔

''کون سا فلیٹ؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم پر یہ آتے ضرور ہیں، آپ اندر جا کر تلاش کرلیں۔'' سیکیورٹی گارڈ نے اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا سیکنڈ فلور کی جانب بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فلیٹس کی ایک قطار کے کونے پر موجود تھا۔ اسی دوران ایک عورت باہر جانے کے لیے نکلی۔ اس نے اسے روک لیا۔

''یہاں ناجیہ میڈم کا فلیٹ کون سا ہے؟'' عورت نے اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔

''وہ سامنے۔''

طاہر تیز قدم اٹھاتا فلیٹ کی جانب بڑھا۔ یہ دیکھ کر وہ مایوس ہوگیا کہ فلیٹ لاک پڑا تھا۔ اس نے زاہد احمد کو کال ملائی۔ ''حماد اور ناجیہ نے ایک فلیٹ خرید رکھا تھا۔ یہ نئی بننے والی عمارت ہے، جہاں سے اغوا ہوئے ہیں وہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ فلیٹ آج لاک پڑا ہے۔''

''اوہ، میں بے خبر تھا اس بات سے۔ تم بہت تیز جارہے ہو، امید ہے جلد ان تک پہنچ جاؤ گے۔'' زاہد احمد سے بات کرنے کے بعد وہ کچھ سوچتے ہوئے وہاں سے واپس مڑ گیا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ ایک کامیابی نے اس کا حوصلہ بلند کردیا تھا مگر وہ بے خبر تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آرہا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں پتلی پتلی گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر اور گھروں میں استعمال ہونے والا پانی کھڑا تھا۔ حمید نے کار بستی کے باہر روکی اور حسن کو لے کر شہباز کے دیے گئے ایڈریس پر رک گیا۔ حسن نے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے باجی۔'' خواجہ سرا کے مخصوص انداز میں پوچھے گئے اس سوال کا جواب حمید نے سخت لہجے میں دیا۔

''پولیس، دروازہ کھولو۔''

''ہائے، پولیس اور یہاں؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟'' یہ شاید گروتھا جو میک اپ کے بغیر اپنی اصلی شکل کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ''بادشاہو خیر تو ہے ناں؟'' یہ وہی لہجہ تھا جو انہیں باقی دنیا سے الگ کرتا تھا۔

''ہاں، کل رات ظہیر احمد کی کوٹھی پر جو گروپ گیا تھا ان سب کو بلاؤ۔'' حمید نے حکم دیا۔ وہ زیادہ دیر نہیں کرنا

چاہتا تھا۔

''انہوں نے کیا کر دیا جی؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''جو کہا ہے وہ کرو، زیادہ سوال جواب مت کرو۔'' اس بار حسن نے سخت لہجے میں کہا۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو جی، نرما..... وہ جنہیں کل شہباز لے گیا تھا ان کو بلا ذرا۔'' اس نے آواز لگائی۔ ''بڑا اچھا بچہ ہے شہباز، جہاں کام ہو ہمیں لے جاتا ہے۔'' وہ عادت سے مجبور تھا اس لیے بولتا چلا گیا۔

حسن کوئی سخت جواب دینا چاہتا تھا مگر حمید نے اشارے سے منع کردیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے چار خواجہ سرا موجود تھے۔

''یہ چار گئی تھیں۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔ حمید چونک گیا۔

''نہیں، وہاں پانچ گئے تھے، شہباز نے بتایا مجھے۔'' حمید نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہ صاحب نہ، میری طبیعت خراب تھی اس دن، بس یہی چار گئی تھیں۔'' گرو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''فنکشن میں شرکت کے بعد کہاں گئے تھے یہ؟''

''یہیں واپس آگئے تھے۔ انہوں نے کہاں جانا ہے؟'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

حمید کچھ دیر اور پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اسے محسوس ہوا یہ بے قصور تھے۔ وہ حسن کو لے کر باہر آگیا۔ ''اگر یہ چار تھے تو فنکشن میں پانچواں کون تھا جس کا شہباز نے بتایا ہے؟'' اس نے حسن کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ ''اور اگر وہاں ٹوٹل چار خواجہ سرا تھے تو کیا شہباز جھوٹ بول رہا ہے؟ شہباز کیوں جھوٹ بول رہا ہے؟'' ان دونوں کے ذہن میں یہ سوال گردش کررہا تھا۔

''شہباز کو اٹھا لیں سر؟'' حسن نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، یہ بے قصور لگتے ہیں، شہباز نے ہی کوئی چکر چلایا ہے۔'' اس کے علاوہ ان دونوں کے پاس کوئی سراغ نہ تھا۔ اس لیے وہ شہباز کو ٹریس کررہے تھے۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب شہباز ان کے سامنے پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔

''ہاں جی شہباز صاحب، جھوٹ کیوں بولا؟ اور اس غلط بیانی کا تمہیں کیا فائدہ ہوا؟'' حسن اس کے سر پر کھڑا تھا۔ حمید کا سوال سن کر اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

چھوٹا سا اشتہار

ایک سوڈالر بچایئے

ہیرے کی انگوٹھی: قیمت سو ڈالر

تین انگوٹھیاں: قیمت صرف دو سو ڈالر۔

خیال

''گزشتہ رات جب تم گھر آئے، کلاک کا گھنٹا دو بجا رہا تھا۔''

''نہیں ڈارلنگ، اس وقت دس بج رہے تھے۔ میں نے دو پر گھنٹے کو بجنے سے روک دیا تھا کہ تم جاگ نہ جاؤ۔''

''مم..... میں نے سب سچ بتایا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی؟'' اس کا لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

''نہ جی نہ، ہمارے پاس وقت نہیں اس لیے حسن اسے لے جاؤ اور سب سچ پوچھ کر آؤ۔'' حمید کا لہجہ روایتی پولیس والوں جیسا تھا۔ شہباز اٹھنے ہی لگا تھا کہ حسن کا ہاتھ گھوما۔ درد سے زیادہ ذلت کے احساس نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ وہ ویسے بھی نرم و نازک لڑکیوں جیسا تھا۔

''میں بتاتا ہوں سر۔'' اس نے ہاتھ کھڑے کیے۔ ''مجھے اس نے منع کیا تھا کسی کو بتانے سے۔ وہ بھی میرے ساتھ فنکشن میں آیا تھا۔ خواجہ سرا تھا وہ۔ بہت خوبصورت۔'' اس نے مکمل حلیہ بیان کیا۔ ''میرے ساتھ بیٹھا رہا تھا، ناچ گانا نہیں کیا تھا اس نے بس باتیں کی تھیں۔ فنکشن ختم ہونے سے پہلے غائب ہوگیا تھا، میں نے بہت ڈھونڈا نہیں ملا۔'' اس کی باتوں میں سچائی تھی۔

''نام کیا بتایا تھا اس نے؟'' حمید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اب بھی نمی موجود تھی۔

''فری۔''

''ہمم، تم جاسکتے ہو اور اگلے کچھ دن ہمیں اطلاع دیے بغیر اگر شہر سے بھاگنے کی کوشش کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے انگلی اٹھا کر شہباز کو وارننگ دی۔

PakiBooks.site

شہباز نے جلدی جلدی ہاں میں سر ہلایا اور تیزی سے پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

''اب یہ نیا کردار فرحی کون ہے؟'' حسن، حمید کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اصل مجرم، فنکشن میں بن بلائے جانے کا مطلب یہی تھا کہ فری وہاں وقت گزارنا چاہتا تھا، پوری پلاننگ تھی اس کی۔ اب ہمارے پاس کوئی نشان نہیں اس کا سوائے حلیے کے جسے اتنے کم وقت میں ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔'' اس نے حقیقت بیان کی۔

''پانچ کروڑ مانگے ہیں اس نے مہناز بیگم سے۔ لینے تو آئے گا۔'' حسن نے نکتہ اٹھایا۔

''ہاں یہ بات تو میرے دماغ سے نکل گئی۔'' وہ کھڑا ہوا۔ ''مہناز بیگم سے ملنا پڑے گا۔''

اس بار حمید اکیلا تھا۔ مہناز بیگم بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ لپک کر پاس آئیں۔

''کال آئی تھی اس حرافہ کی۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے ناجیہ کی شان میں چند مزید ''کلمات'' کہے اور دوبارہ مطلب کی بات پر آگئیں۔ ''پیسے لے کر محمود پلازا کے سامنے موجود پارکنگ میں آنے کا کہا ہے اس نے۔'' انہوں نے اپنا سیل نکالا اور ناجیہ کی کال کی ریکارڈنگ سنا دی۔ حمید نے بار بار پلے کر کے سنی۔

''مجھے لگتا ہے ناجیہ کو مجبور کر کے یہ الفاظ کہلائے جا رہے ہیں۔'' اس نے درست نتیجہ نکالا۔ ''تو آپ تیار ہیں؟ پیسے ہیں یا جعلی نوٹوں کا بندوبست کروں؟''

''نہیں، میرے اکلوتے بیٹے کی زندگی کا معاملہ ہے، میں رسک نہیں لے سکتی، پیسے ہیں میرے پاس۔'' وہ اندر گئیں اور ایک بھاری بیگ اٹھا لائیں۔ ''کچھ اپنے اور اس کے بینک اکاؤنٹ سے حاصل کیے ہیں باقی کی رقم قرض لی ہے۔'' حمید کو ان سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ ایک ماں تھیں اور بے بس تھیں۔

''میں کوشش کروں گا مجرم کو گرفتار کر سکوں۔''

''پلیز، آپ اگر جائیں تو اسے کسی قسم کا شک مت ہونے دینا۔ حماد اس کے پاس ہے اور وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' انہوں نے منت بھرے لہجے میں حمید سے کہا۔

''ہم پوری احتیاط کریں گے آپ بے فکر رہیں۔'' حمید نے انہیں تسلی دی۔ سات بجنے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔

☆☆☆

زندگی کتنی خوبصورت ہوتی ہے، یہ سوال ہر قسم کی پریشانی سے آزاد ایک کالج کے طالب علم سے پوچھا جائے تو یقیناً وہ اپنی زندگی کی مثال دے گا۔ صبح اٹھا۔ کالج گیا، لیکچر اٹینڈ کیے، دوستوں کے ساتھ سیر کی۔ بازار میں آوارہ گردی کی اور پھر گھر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ فرید خان کے لیے بھی زندگی بہار کی طرح تھی۔ ہر سمت پھول کھلتے تھے۔ شمشیر خان اور رضیہ نے اسے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں جن کی خاندان کی روایت کے مطابق جلد شادی کر دی گئی تھی۔ باپ کا کپڑے کا کاروبار تھا اور خوب چلتا تھا۔ فرید ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ پڑھائی کی زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ اے گریڈ حاصل کرتا یا سی، سنبھالنا تو اسے باپ کا کاروبار ہی تھا۔ سیکنڈ ایئر کے فائنل ایگزامز میں دو ماہ باقی تھے۔ لائبریری میں بیٹھا فرید ضروری نوٹس بنانے میں مصروف تھا جب اس کے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ کالج میں سیل فون استعمال کرنے پر سختی سے پابندی تھی مگر اکثر اسٹوڈنٹس چھپا کر لے آتے تھے۔ فرید نے سب کی نظروں سے بچا کر سیل فون نکالا اور میسج پڑھنے لگا۔

''فرید؟''

میسج میں بس یہی ایک لفظ لکھا تھا۔ ''جی..... آپ کون؟'' اس نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ میسج ٹون بجی۔

''میں ندا۔''

فرید ہنس پڑا۔ اس طرح کی شرارتیں وہ اور اس کے دوست اکثر ایک دوسرے کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ لڑکی بن کر فیس بک یا سیل فون پر میسج کر کے ایک دوسرے کو تنگ کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ فرید پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ میسج ٹون بار بار بجتی رہی مگر اس نے توجہ نہیں دی۔ کالج سے چھٹی کے بعد جب وہ اور تمام دوست مل کر باہر نکلے تو اس نے سب سے باری باری پوچھا۔

''ندا کون ہے تم لوگوں میں سے؟'' سب نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ اب بھی مذاق سمجھ رہا تھا مگر شام کو جب وہ گھر بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اس کے نمبر پر کال آنے لگی۔ اس نے نمبر دیکھا۔ یہ صبح والا ندا کا نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''آپ میسج کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟'' فرید خاموش ہو گیا۔ یہ کوئی لڑکی ہی تھی جس کی آواز بہت خوبصورت تھی۔

''میں آپ کو نہیں جانتا۔''

''پر میں تو جانتی ہوں ناں۔'' ندا ہنسی۔

''میں لڑکیوں سے بات نہیں کرتا۔'' اس نے صاف جواب دیا۔

''اتنا خوبصورت اور پیارا لڑکا۔ لڑکیوں سے بات نہیں کرتا، میں نہیں مانتی۔'' وہ جان بوجھ کر بات لمبی کر رہی تھی۔ اس کی بات سچ تھی۔ فرید کے نقوش بہت پیارے تھے۔ اس کے ہونٹ کسی لڑکی کی طرح نازک اور رنگ گورا تھا۔ فرید نے تنگ آ کر کال بند کر دی۔ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرنیٹ ڈیٹا آن کیا ہی تھا کہ واٹس ایپ پر ڈھیروں میسج آنے لگے۔ یہ ندا ہی تھی۔ اس نے اپنی آٹھ دس تصویریں اسے بھیجی ہوئی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ بیس بائیس سال کی عمر میں بھرپور جوانی اور بھرا ہوا جسم دیکھ کر فرید کا دل پھسل گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس سے نگاہ ہٹانا بھول گیا تھا۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک اور میسج شو ہوا۔ ''کیسی ہوں میں؟''

''بہت خوبصورت۔'' ہاتھوں نے بے خودی میں ٹائپ کیا تھا یہ میسج۔

''تم سے زیادہ نہیں۔'' بے باکی کے ساتھ ایک اور میسج سامنے آیا۔ فرید خاموش ہو گیا۔ وہ شرمیلی طبیعت کا لڑکا تھا۔ لڑکیوں سے اسے جھجک آتی تھی لیکن ندا نے چند دنوں میں ہی اس کی جھجک دور کر دی تھی۔ کال پر لمبی لمبی بات اور سارا دن واٹس ایپ پر چیٹنگ کے بعد فرید کے دل میں اس سے ملنے کا خیال آنے لگا۔ فرید عمر کے اس حصے میں تھا جب نسوانیت اپنی طرف بے پناہ کشش سے کھینچتی ہے۔ خاص طور پر انٹرنیٹ کے اس دور میں جب نوجوان نسل اخلاق سے گری ہوئی تصویریں اور فلمیں دیکھ کر خود کو تباہ کر رہی ہے۔ ایسا ہی کچھ کیا تھا ندا نے اس کے ساتھ۔ فرید اس سے ملنے کی خواہش کرتا مگر ایک ہی جواب ملتا۔ ''ابھی وہ وقت دور ہے جب ہم ملیں گے۔'' ادھر شمشیر اور رضیہ اس کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس کی بات اپنی کزن کے ساتھ طے تھی۔

☆☆☆

طاہر کو دیر سے احساس ہوا کوئی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک گاڑی کافی دیر سے اس کے پیچھے پیچھے گھوم رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر بائیک ویرانے کی طرف موڑ لی۔ یہ سڑک جنگل کے پاس سے گزرتی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ کہیں سنسان جگہ پر اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً دس کلو میٹر دور آ کر اس نے بائیک روک دی اور کار کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کار اس کے قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان اُترا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' اس نے طاہر کی طرف دیکھا۔

''مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔ میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟'' طاہر نے اسے گھورا۔

وہ پریشان نظر آنے لگا۔ ''دراصل میں نے کچھ بتانا ہے آپ کو، میں نے دیکھا تھا اسے، وہ اس لڑکی اور مرد کو فلیٹ سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔''

طاہر چونک گیا۔ ''کون؟''

''میں نہیں جانتا اسے، جس فلیٹ کے دروازے پر آپ کھڑے تھے اسی فلیٹ سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔'' نوجوان اس کے قریب آ گیا۔

طاہر الجھن کا شکار نظر آنے لگا۔ ''پر تم کون ہو؟''

''میں وہی ہوں جس نے انہیں اغوا کیا تھا۔'' اس سے پہلے کہ وہ پوری بات سمجھتا، نوجوان کے ہاتھ میں خنجر نظر آنے لگا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے خنجر گھمایا۔ طاہر اچھل کر ایک سائڈ پر ہو گیا۔ پیٹ پر کیا جانے والا یہ وار خالی گیا تھا۔ طاہر نے لات گھمائی مگر نوجوان کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور طاہر سے تھوڑے فاصلے پر جا کر خنجر مہارت سے اس کی طرف پھینکا۔ اس بار نشانہ درست لگا تھا۔ اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ ایک کند دھا درد کی شدت سے بیکار ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے نوجوان اس پر پل پڑا۔

''میں جانتا ہوں تجھے، اس کمینے زاہد نے بھیجا ہو گا؟''

طاہر نے مزاحمت کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نوجوان نے چند منٹ میں ہی اسے بے بس کر دیا تھا۔ کندھے میں سے خنجر نکال کر اس نے طاہر کی ران میں گھسا دیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخوں سے ویرانہ گونج رہا تھا۔ وہ کار کی طرف گیا اور ایک رسی لے کر واپس آیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد نوجوان نے اسی کا سیل فون نکالا اور زاہد کا نمبر ملایا۔

''ہاں طاہر..... کچھ سراغ ملا؟''

''ہاں مل گیا ہے سراغ، مجرم نے طاہر کو مار کر سڑک پر پھینک دیا ہے، کچھ سانسیں باقی ہیں بچا لو آ کر اسے اور ہاں ناجیہ کی عزت پہلے محفوظ تھی مگر تمہاری اس حرکت کے بعد نہیں رہی۔'' نوجوان جو کہ فرید تھا، نے کال بند کر دی۔ اس نے

PakiBooks.Site

طاہر کو گھسیٹنا شروع کر دیا۔ کچھ دور جا کر کچی نہر میں اسے پھینک کر وہ واپس اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ وہ سیدھا اس کمرے کی طرف گیا جہاں ناجیہ قید تھی۔ اس کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔ اسے دیکھ کر ناجیہ کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ اس نے ناجیہ کو دوبارہ کھول دیا اور پاس بیٹھ گیا۔

''ساڑھے آٹھ بجے ہم یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تاوان کی رقم لینے جانا ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔ ناجیہ خاموشی سے اس کے لباس پر موجود خون کو دیکھ رہی تھی۔

''اسے مت دیکھو، تمہارے باپ کا بھیجا گیا ایک آدمی میرے ہاتھوں زخمی ہوا ہے بلکہ شاید مر چکا ہو اب تک۔'' وہ چپ رہی۔

''اب نہیں پوچھو گی کیوں کر رہا ہوں میں ایسا؟'' وہ اس کے لہجے کی نقل اتارنے لگا۔

''تم بتاتے جو نہیں۔'' اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

''سننا چاہو گی۔ ابھی کچھ وقت ہے میرے پاس، بتا دیتا ہوں۔'' دھیرے دھیرے اس کا لہجہ نم ہونے لگا۔ آنکھوں میں بھی نمی دکھائی دینے لگی۔ ماضی کی یادیں جو ہر رات اسے تڑپاتی تھیں، الفاظ میں بدل کر ناجیہ کے کانوں تک پہنچنے لگیں اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی جو کچھ دیر پہلے ایک شخص کو سفاکی سے مار کر آیا تھا۔

☆☆☆

شمشیر خان نے اسے اپنے پاس بٹھایا تھا۔ ''فرید مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے؟''

''جی ابو۔'' اس نے سیل فون کی اسکرین سے نگاہ ہٹائے بغیر کہا۔

''اس کو رکھ دو پانچ منٹ، یہ کیا ہر وقت نظریں اسی پر جمی ہوتی ہیں۔'' باپ کے سخت لہجے سے گھبرا کر اس نے جلدی سے سیل نیچے رکھ دیا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارے امتحان ہو گئے ہیں، اب ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے اطلاع دی۔

''مم مگر ابو میں تو پڑھنا چاہتا ہوں ابھی۔''

''تو شادی کے بعد کون سا سارے کالج بند ہو جاتے ہیں، لے لینا ایڈمیشن، تیری ماں بوڑھی ہوتی جا رہی ہے اس سے کوئی کام نہیں ہوتا، ایک لڑکی کی ضرورت ہے اس گھر کو۔'' شمشیر نے سمجھایا۔ ''ویسے بھی تمہاری عمر کے خاندان کے تمام نوجوان شادی شدہ ہیں۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے زبان سے تو کہہ دیا مگر دل کی حالت صرف وہ جانتا تھا۔ شمشیر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔ اس شام ندا سے جب فون پر بات ہوئی تو اس نے باپ کی خواہش اسے بتائی۔

''میں تمہارے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہمارا ملنا مشکل ہے فرید، تم سمجھ جاؤ اس بات کو۔'' ندا نے حقیقت بتائی۔

''مجھے نہیں پتا کیا مشکل ہے اور کیا نہیں، میں بس تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔'' وہی بے وقوفی کی باتیں تھیں جو آج کل جدید محبت میں سننے کو ملتی ہیں۔

''ٹھیک ہے تم کل آؤ مجھ سے ملنے۔'' اس کی بات سن کے فرید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔

''کل کس وقت؟ کہاں؟'' وہ بے صبری سے بولا۔

ندا نے مکمل پتا سمجھایا اور تاکید کی۔ ''اکیلے آنا اور کسی کو بھی خبر نہ ہو کہ تم کہاں جا رہے ہو۔''

اس نے وعدہ کر لیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے بہت مشکل سے گزرے۔ ہر لمحہ اس کی نظریں گھڑی کی طرف دیکھتی رہیں۔ شام ہوتے ہی وہ دوست سے ملنے کا بہانہ بنا کر ندا کے بتائے ہوئے پتے کی طرف چل دیا۔ جس محلے میں وہ رہتا تھا ندا کا گھر اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ فرید کے پاس بائیک تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ اس گھر کے سامنے موجود تھا۔ ندا اس وقت گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ دستک کے جواب میں ندا کی آواز سنائی دی۔ ''فرید؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے موجود ندا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے آئی۔ وہ حقیقت میں زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ لباس جدید فیشن کے مطابق تھا جس میں جسم کا انگ انگ نمایاں ہو رہا تھا۔ فرید کو اندر بٹھا کر وہ چائے لے آئی۔

''صرف آدھا گھنٹا ہے ہمارے پاس۔ پھر ابو آ جائیں گے۔'' فرید کو چائے کا کپ پکڑا کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ انہیں باتیں کرتے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک فرید کو ایسا لگا جیسے اس کا سر گھوم رہا ہے۔ اس نے سر تھامنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی اس کے ہاتھ بے جان ہو کر نیچے لٹک گئے اور وہ صوفے پر ہی بے ہوش ہو آ گیا۔ آخری چیز جو اس نے دیکھی تھی وہ ندا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پُراسرار اور سفاک مسکراہٹ۔ اسے خبر نہیں

تھی کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو کوئی شخص اس پر جھکا ہوا تھا۔ یہ زاہد احمد کا چہرہ تھا۔

''اس بار تو بڑا زبردست مال لایا ہے عابد۔'' فرید کے کانوں سے آواز ٹکرائی۔

''اس پر ندا کی نگاہ پڑی تھی، پیارا بچہ ہے کافی دام ملیں گے اس کے۔''

فرید نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری کی وجہ سے اٹھ نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مخصوص دوا کھلائی گئی ہو۔ ''پپ پانی۔'' وہ ہکلایا۔

''پانی دو اسے۔'' عابد نے کسی کو اشارہ کیا۔ ایک بوڑھے نوکر نے پانی کا گلاس اسے پکڑایا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے زاہد احمد کی طرف دیکھا۔

''جنت میں، وہ سامنے کھڑا فرشتہ انکل تمہیں لایا ہے۔'' اس کی بات سن کا عابد کا قہقہہ گونجا۔

''عابد میں حماد کو تیار رکھوں گا، آج باقی دو کے ساتھ اس کا کام بھی پورا کر دیتے ہیں۔'' زاہد مزید ہدایت دے کر چلا گیا۔

عابد اس کے قریب آیا اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''دل تو کر رہا ہے تجھے اپنے پاس رکھ لوں مگر زاہد صاحب کو تم پسند آ گئے ہو۔''

وہ اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر کمزوری کی وجہ سے ہٹا نہ سکا۔ اگلے دو دن وہ بے ہوش رہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے ماں باپ پر کیا گزر رہی ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ تمام باتوں سے بے خبر تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ انوکھا ہو چکا تھا۔ حواس بحال ہوئے تو اسے خبر ہوئی۔ اس کی زندگی برباد ہو چکی تھی۔ وہ مرد نہیں رہا تھا۔ اسے مخصوص قسم کی ادویات کا استعمال کروایا جانے لگا۔ تقریباً دو ماہ وہ اس گھر میں رہا۔ اس کی تمام مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ وہ نہ روتا تھا نہ ہنستا تھا۔ بس خاموش بیٹھا اردگرد دیکھتا رہتا۔ وہ اب واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک دن زاہد احمد اس سے ملنے آئے۔

''اب تم نے اپنے اندر ہونے والی تبدیلی قبول کر لی ہو گی، کل تمہارے کچھ گاہک آ رہے ہیں تھوڑا تیار ہو کر بیٹھنا۔''

وہ خاموش رہا۔ زاہد کے جانے کے بعد ندا اندر آئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''آؤ میری جان، تمہیں تیار کرواؤں۔'' اس نے پیار سے فرید کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ ندا اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے بالکل کسی لڑکی کی طرح تیار کروایا تھا اسے۔ فرید کو اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس شام فرید بک گیا۔ کوئی بزنس مین تھا جسے اپنے غیر ملکی مہمان کے لیے ایسے ہی ایک ہیجڑے کی تلاش تھی۔ فرید کسی کٹھ پتلی کی طرح ان کے اشاروں پر عمل کرتا رہا۔ ایک ماہ بعد وہ دوبارہ ندا اور عابد کے گھر پہنچ گیا۔ اس بار اس نے دیکھا۔ وہاں مزید اس جیسے نوجوان لائے گئے تھے۔ فرید کے اندر غصے کی ایک لہر اٹھی۔ پہلی بار اس نے بدلہ لینے کا سوچا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک رات کچن سے چھری اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔ رات کو جب سب سو چکے تھے۔ وہ اٹھا اور چپکے سے باہر آ گیا۔ اس نے دیکھا۔ باہر چوکیدار موجود تھا۔ نئے آنے والے لڑکوں کے کمرے کا دروازہ لاک کیا گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا۔ عابد اور ندا اس سے زیادہ خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے اس لیے اسے آزاد چھوڑا ہوا تھا۔ وہ چپکے سے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے وہ لاک نہیں تھا۔ وہ دونوں شراب کے نشے میں چور اور لباس کی قید سے آزاد بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ کئی دنوں سے اس کے اندر پلنے والی نفرت ابل پڑی۔ اس نے چھری سیدھی عابد کے دل میں گھسا دی۔ وار اتنی شدت سے کیا گیا تھا کہ عابد تڑپ کر فوراً ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا گرم خون فرید کے چہرے پر آن پڑا۔ اس کا دوسرا شکار ندا بنی۔ اب کی بار اس نے زیادہ سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہاں ندا ہی تھی جس نے اس کی زندگی اجاڑی تھی۔ ندا کی دونوں آنکھیں اور خوبصورت چہرہ چھری کا نشانہ بنا اور پے در پے وار کر کے فرید نے اسے ہلنے کا موقع نہیں دیا۔ دس منٹ بعد جب وہ کمرے سے نکلا تو وہاں دو لاشیں پڑی تھیں۔ فرید کو دراز سے ایک پسٹل مل گیا تھا۔ باپ نے چھوٹی سی عمر میں ہی اسے اسلحے کا استعمال سکھایا ہوا تھا۔ وہ اس کمرے کی جانب بڑھا جہاں نئے آنے والے نوجوان قید تھے۔ چابیاں عابد کے کمرے سے مل چکی تھیں۔ دروازہ کھول کر اس نے مختصر الفاظ میں سب کو صورتِ حال بتائی اور اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ وہ سب ڈرے ہوئے تھے مگر اسے دیکھ کر ہمت پکڑ رہے تھے۔ ان سب نے مل کر چوکیدار پر قابو پا لیا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔

PakiBooks.site

زندگی کے اگلے چار سال فرید نے مختلف شہروں میں گزار کر مختلف کام کیے۔ ایک سال وہ ناچنے والے خواجہ سراؤں کے گروپ میں بھی رہا۔ اس نے پیسے اکٹھے کیے اور ایک ایک پائی جوڑی۔ اس کی زندگی کا مقصد بس بدلہ تھا۔ چار سال کے بعد اس نے یہ پلان بنایا تھا جس پر وہ کامیابی سے عمل کر رہا تھا۔

☆☆☆

ناجیہ نے گہری سانس لی۔ ''تم قانونی راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔''

''قانونی راستہ۔'' وہ ہنسا۔ ''میڈم، میں دو انسانوں کا قاتل تھا اور جن لوگوں سے لڑنا تھا وہ اس ملک کے بااثر لوگ تھے، قانون کہاں میری مدد کرتا؟''

''تم یہ سب کر لو گے تو کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں، پر مجھے اپنا بدلہ پورا کرنا ہے۔''

''تمہاری دشمنی مجھ سے نہیں، پاپا سے ہے پھر میں کیوں نشانہ بنی اس انتقام کا؟''

وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

''اچھا، اب پاپا کو پتا چلے کہ تم میرے مجرم ہو اور وہ تمہارے ماں باپ سے میرا بدلہ لیں تو کیا جائز ہوگا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

''میں بحث نہیں کرنا چاہتا، نو بجنے والے ہیں آؤ میرے ساتھ۔'' دونوں چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھے۔ محمود پلازا سے تقریباً تین کلومیٹر پیچھے گاڑی روک کر اس نے ناجیہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ''کوئی ہوشیاری مت دکھانا ورنہ ایک گولی کافی ہوگی اور میرا نشانہ بھی اچھا ہے۔''

ناجیہ نے سر ہلا دیا۔ تھوڑا آگے آ کر اس نے سیل فون نکالا اور مہناز بیگم کا نمبر ملا کر ناجیہ کو دیا۔ ''اسے کہو، پیسے محمود پلازا کی پارکنگ میں کھڑی اس گاڑی کے اندر رکھ دے اور خود چلی جائے، کل حماد مل جائے گا اسے۔'' اس نے گاڑی کا نمبر بتایا۔ ناجیہ نے کال ملا کر مہناز کو ہدایت دی اور کال بند کر دی۔ انہیں وہاں کھڑے تقریباً بیس منٹ ہو گئے۔ فرید کچھ سوچ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی الجھن کا شکار ہے۔

''کتنی دیر اور یہاں رکنا ہے؟'' وہ تھک کر نیچے بیٹھ گئی۔

''بس دس منٹ اور۔'' اس نے جواب دیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد ان کے قریب ایک بائیک آ کر رکی۔ نیا آنے والا شخص ناجیہ کے لیے اجنبی تھا۔

''ہاں کیا بنا؟'' فرید نے اس سے پوچھا۔

''پولیس موجود ہے وہاں، پلازا کے بالکل سامنے سادہ کپڑوں میں اور وہ چھت سے بھی نگرانی کر رہے ہیں۔'' آنے والے شخص نے تفصیل بتائی۔

''تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

''نہیں، دیکھ بھی لیتے تو میں ان کے لیے اجنبی ہوں۔''

''ہم.....'' فرید اردگرد دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنے والے شخص کو مخاطب کیا۔ ''جولی تم ایک کام کرو۔'' اور پھر اس نے جولی کو تمام پلان سمجھا دیا۔ وہ کچھ بولے بغیر سر ہلاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جولی کام کا آدمی تھا۔ وہ اس کے ساتھ دوسرے شہر میں کام کر چکا تھا۔ وہ بھی خواجہ سرا تھا۔ بیس منٹ بعد اچانک فرید نے کھڑے کھڑے ہاتھ گھمایا اور ناجیہ کے سر پر پستل کا وار کیا۔ وہ چند سیکنڈ میں ارگرد کی دنیا سے بے خبر ہو گئی۔ وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور ناجیہ کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور گاڑی لاک کر دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے سیل پر جولی کی کال آئی۔ ''کام ہو گیا۔'' اس نے بس یہی الفاظ بولے تھے۔ فرید حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

حمید کو خطرے کا احساس دیر سے ہوا۔ وہ اور حسن گیٹ کے باہر سادہ کپڑوں میں موجود تھے۔ ''شاہنواز سے رابطہ کرو، دکھائی نہیں دے رہا۔'' اس نے حسن سے کہا مگر شاہنواز کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ شاہنواز چھت پر نگرانی کر رہا تھا۔

''تم یہیں ٹھہرو میں اس کا پتا کرتا ہوں۔'' وہ گیٹ کھول کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چھت پر موجود تھا جہاں شاہنواز کے سر پر کسی نے اینٹ مار کے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس نے شاہنواز کو ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اچانک اس کی نگاہ نیچے پارکنگ پر پڑی جہاں سے تاوان کی رقم والی گاڑی پارکنگ سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔ اس بار اس کی دوڑ نیچے کی طرف لگی جہاں گیٹ پر حسن بے ہوش پڑا تھا۔ حمید سر پکڑ کر رہ گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اتنا چالاک ہوگا یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

☆☆☆

کوئی ایسا شخص جسے اپنی زندگی کے ختم ہونے کا وقت معلوم ہو اور وہ وقت بھی بس کچھ گھنٹے دور ہو، اس کی کیا حالت ہوگی، یہ حماد کو آج پتا چلا تھا۔ اس نے غیر قانونی آپریشن کر کے، لوگوں کی زندگیاں اجاڑ کر کروڑوں روپے کمائے تھے مگر آج وہ روپے بھی اس کی جان نہیں بچا سکتے تھے۔ اس نے اپنی پوری طاقت صرف کی مگر رسی نہ ٹوٹی اور نہ ہی اس کے ہاتھ اور پیر آزاد ہوئے۔ سامنے لگے وال کلاک پر رات کے دو بج چکے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور ایسے میں صرف حماد کے حرکت کرنے کی وجہ سے ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ آخر تھک کر اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ دو، تین، چار اور صرف چار گھنٹے بعد بم پھٹ جاتا اور حماد کا قصہ ختم ہو جانا تھا... مگر کھیل ابھی باقی تھا۔

☆☆☆

حمید اور حسن پولیس اسٹیشن میں موجود صورتِ حال پر غور کر رہے تھے۔ صبح کے چھ بج چکے تھے۔ زاہد احمد کے مطابق اغوا کار ٹھیک نو بجے حماد اور ناجیہ کو مار دے گا۔ یعنی ان کے پاس صرف تین گھنٹے باقی تھے۔

''سر اب کیا کیا جائے؟''

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی، ایک شخص اتنا تیز کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں تین مختلف جگہوں پر پایا جائے۔'' حمید کی سوچ ابھی تک محمود پلازا میں اٹکی ہوئی تھی۔ ''دیکھو، شاہنواز صرف پانچ منٹ کے لیے غائب ہوا اسی دوران تم پر وار ہوا اور گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ صاف مطلب ہے کہ بندہ ایک نہیں ایک سے زیادہ تھے۔'' وہ جلد درست نتیجے پر پہنچ گیا۔ ''ایک یقیناً ہماری نگرانی کر رہا تھا ورنہ اسے کیسے پتا کہ ہم تین ہیں اور سادہ کپڑوں میں ہیں، اصل مجرم جب تک اکیلا تھا تب تک محفوظ تھا لیکن اب اس کے ساتھ ایک اور بندہ شامل ہو گیا ہے، اسے ٹریس کرنا آسان رہے گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے پلازا میں لگے سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ درکار ہے وہ تم لے آؤ تب تک میں زاہد احمد سے ملاقات کر لوں۔'' اسی دوران کال موصول ہوئی۔ شہر سے باہر جنگل کے ساتھ بہنے والی نہر سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ اس نے حسن کو ضروری ہدایت دی اور خود قتل کی جگہ پہنچ گیا جہاں اس سے پہلے پولیس کی ایک پارٹی موجود تھی۔ لاش کو دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے زخمی کرنے کے بعد باندھ کر نہر میں پھینکا گیا تھا اور ڈوبنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ کرائم سین کے دو آدمی اردگرد سے ثبوت اکٹھے کر رہے تھے۔ حمید کو مردہ شخص کی شکل جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ جلد اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ طاہر خان تھا۔ ملک کے مشہور ترین بزنس مین پرویز خان کا خاص آدمی، ہر قانونی اور غیر قانونی کام میں اس کا ساتھی۔ ''خس کم جہاں پاک۔'' وہ بڑبڑایا۔ اس کی چھٹی حس اس قتل کو بھی حماد اور ناجیہ کے اغوا سے ملا رہی تھی۔ جب وہ واپس پولیس اسٹیشن پہنچا تو حسن سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ لا چکا تھا۔

''سر آپ کا اندازہ درست تھا یہ دو آدمی ہی تھے اس کے علاوہ کار کا نمبر بھی دکھائی دے رہا ہے، ریکارڈنگ میں جب یہ گیٹ کے سامنے سے نکلی تھی۔'' اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر حمید کے سامنے رکھا۔ تھوڑی دیر وہ اسی پر غور کرتے رہے۔

''اس بندے کو پکڑنا دوسرے کی نسبت آسان ہوگا، تم تلاش کرواسے۔'' اس نے ہدایت دی۔

وہ ''یس سر۔'' کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ حمید کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ان کے پاس صرف ایک گھنٹا باقی تھا۔ اسی دوران ایک شخص کی آمد ہوئی۔ وہ سیلوٹ کر کے حمید کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''کیا خبر ہے؟''

''سر ناجیہ کو اس نے جس جگہ رکھا ہوا ہے وہ دیکھ لی میں نے، اس وقت ناجیہ اکیلی ہے، ہم اسے چھڑا سکتے ہیں، میں اس کا ٹھکانا بھی دیکھ لیتا مگر شاید اسے اپنے تعاقب کا اندازہ ہو گیا تھا۔''

حمید نے سر ہلایا۔ تاوان کی رقم وصول کرنے کے لیے مجرم ان کو دھوکا تو دے چکا تھا مگر حمید کے جال میں پھنس گیا تھا۔ حمید کا ایک خاص آدمی پارکنگ میں ہی چھپا ہوا تھا۔ جس نے اس کا ٹھکانا دیکھ لیا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس پارٹی ناجیہ کو بازیاب کرانے روانہ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''زاہد احمد؟'' زاہد نے جیسے ہی کال ریسیو کی، ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''جی، آپ کون؟'' زاہد نے پوچھا۔

''یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں، یہ بتا دیتا ہوں ٹھیک آدھے گھنٹے بعد تمہاری بیٹی ناجیہ اور اس کا یار حماد مرنے والے ہیں۔ نو بجتے ہی بم پھٹ جائے گا لیکن

PakBooks.site

تمہارے پاس چانس ہے، بچالو انہیں، ایک پتا نوٹ کرو۔''

زاہد کا جسم سُن رہ گیا۔ وہ تیزی سے اس کا بتایا ہوا پتا نوٹ کرنے لگا۔ یہ حماد کے فلیٹ کا پتا تھا۔

''اور ہاں، انسپکٹر حمید یا کسی بھی دوسرے پولیس والے سے رابطہ کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ورنہ حماد اور ناجیہ کا وقت سے پہلے وہی حال ہوگا جو میں نے طاہر خان کا کیا تھا۔'' اس کے ساتھ اس کی ہنسی سنائی دی۔ کال بند ہوتے ہی زاہد تیزی سے روانہ ہوا۔ اس سے پہلے وہ جیب میں پسٹل رکھنا نہیں بھولا۔ اس کے پاس صرف تیس منٹ تھے۔ کار میں بیٹھ کر مطلوبہ ایڈریس کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اس کی اسپیڈ غیر معمولی تھی۔ گیٹ پر گاڑی روک کر وہ تقریباً بھاگتا ہوا فلیٹ کی جانب بڑھا۔ اس کے پاس چند منٹ ہی باقی تھے۔ فلیٹ کا دروازہ لاک تھا۔ اس نے جیب سے پسٹل نکالا اور لاک پر فائر کیا۔ اگلا منٹ اس فلیٹ پر بہت بھاری تھا اور زوردار دھماکے کے ساتھ اس کی چھت زمین پر آگری۔ اردگرد کے فلیٹس کو بھی کافی نقصان پہنچا مگر اس فلیٹ کے ساتھ ساتھ شہر کی دو شخصیات بھی ملبے تلے دب گئیں۔ شاید زندہ دفن ہونے سے پہلے انہیں اپنے گناہوں کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

ناجیہ پولیس اسٹیشن میں بیٹھی اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔ اس کا دھیان بار بار بھٹک جاتا تھا۔ ابھی اس کے باپ کو مرے صرف دو دن ہوئے تھے۔ فرید کی تحویل میں گزارے چوبیس گھنٹے جیسے اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر پولیس کو ناجیہ تک پہنچایا تھا۔ اس کی دشمنی زاہد احمد سے تھی اور وہ اس نے پوری کی تھی۔ بیان ریکارڈ کروانے کے بعد جب وہ باہر نکلی تو حمید اس کے ساتھ آیا تھا۔

''وہ ابھی تک آزاد ہے، تمہیں یا مہناز بیگم کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''نہیں، اس نے اپنا بدلہ لے لیا ہے اب نہیں کہے گا کچھ کسی کو بھی۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''نہیں ملے گا، بہت چالاک ہے۔ ہر منٹ اس نے سوچ رکھا ہوتا ہے کہاں جائے گا کیا کرے گا، اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکی تھی کہ فرید سے محبت کرے یا نفرت۔ عجیب شخص تھا وہ۔ اپنی محرومی چھپائے اپنی ذہانت کی طاقت سے سب کو ہرانے والا۔

''مجرم کتنا ہی چالاک ہو کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے، اس نے بھی کی ہوگی کہیں نہ کہیں۔'' حمید مسکرایا۔

''بیسٹ آف لک۔'' ناجیہ یہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھی اور چلی گئی۔ حمید کچھ سوچتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

سیاہ چشمہ لگائے، منہ پر دھول سے بچنے والا ماسک لگا کر وہ ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ ٹیکسی میں بیٹھے وہ ہنس رہا تھا۔ پانچ کروڑ میں سے کئی اخراجات اور جولی کا حصہ نکال کر باقی کی ساری رقم وہ بیرونِ ملک بھیج چکا تھا جو اس کے بینک اکاؤنٹ میں محفوظ تھی۔ اس سے پہلے وہ ماں باپ کا پتا کر کے آیا تھا جو اس کے انتظار میں تھک کر قبرستان جا بسے تھے۔ گھنٹوں ان کی قبر پر رونے کے بعد اسے سکون آیا تھا۔ انگلینڈ، گوروں کا دیس اس کا منتظر تھا جہاں وہ نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ ائرپورٹ کے باہر ٹیکسی رکی۔ جیسے ہی وہ باہر آیا قریب سے آواز سنائی دی۔

''ویلکم جناب ویلکم، آخر میں آپ تک پہنچ ہی گیا۔''

وہ اس طرف گھوما۔ سامنے حمید کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''میں چند منٹ اور لیٹ ہو جاتا تو شاید مجھے ہمیشہ افسوس رہتا کہ جس کے پیچھے اتنی بھاگ دوڑ کی وہی ہاتھ سے نکل گیا۔''

وہ اس کے پاس آیا۔ اس نے اردگرد دیکھا۔ کم از کم پانچ پولیس اہلکار اسے گھیرے کھڑے تھے۔ اس نے ہاتھ کھڑے کر لیے۔ ''جب تک تم اکیلے تھے بہت محفوظ تھے مگر جولی کو ملا کر تم نے بہت بڑی غلطی کی۔'' حمید کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ اس کے قریب آیا۔

''تم جولی تک کیسے پہنچے؟''

''جو نوٹ تم نے مہناز بیگم سے حاصل کیے تھے ان کے نمبرز میرے پاس محفوظ ہیں، جولی میاں نے جیسے ہی استعمال کیے، پکڑا گیا۔'' اس نے ایک جانب پولیس وین کی طرف اشارہ کیا جہاں حسن کے ساتھ گاڑی میں جولی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ فرید اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے ہاتھ سے جولی کی طرف اشارہ کیا۔ حمید کا دھیان چند سیکنڈ کے لیے ادھر ہوا۔ فرید تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے حمید کے ہاتھ میں پکڑا ریوالور چھینا اور اپنی کنپٹی پر رکھ کے مسکرایا۔

''موت میرا مقدر ہے مگر مجھے قید قبول نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی..... قصہ ختم ہو چکا تھا۔

ہرجائی

مظہر سلیم ہاشمی

کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں... زمین پر زبردستی بنائے گئے جوڑے کبھی پنپ نہیں پاتے... ایک ایسے ہی شخص کی کہانی جو اپنی بیوی سے خوش نہیں تھا... نئی محبوبہ کی محبت شدت اختیار کرتی جارہی تھی... لیکن حالات کی سختیاں اس کے فیصلے کے درمیان حائل ہو رہی تھیں...

ہنگامۂ دل کا فسانہ اور کاتبِ تقدیر کا انوکھا فیصلہ

بلال انور نے بے چینی سے اپنی کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا..... لفٹ ابھی پچیسویں سے چوبیسویں منزل آئی تھی۔ دروازہ کھلنے پر تین مزید افراد سوار ہو گئے اور اسے جگہ بنانے کے لیے اپنی جگہ سے سرکنا پڑا۔ لفٹ میں بجنے والی ہلکی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس نے ایک بار پھر اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بارہ بج کر چھ منٹ ہو رہے تھے۔ لنچ کے لیے اس کے پاس صرف ایک گھنٹے کا وقت تھا اور اپنے پُرکیف لمحات لفٹ میں برباد

PakiBooks.Site

ہوتے دیکھ کر اس کی بے چینی سوا ہوتی جا رہی تھی۔
چھٹی منزل پر لفٹ ایک بار پھر رکی تو آنے والے ہجوم کو راستہ دینے کے لیے بلال بالکل دیوار سے لگ گیا۔ تیز پرفیوم کی مہک میں ڈوبی...... موٹی خاتون کا لمس اس کو کافی ناگوار گزر رہا تھا لیکن آنے والے پل کی خوش نمائی کا سوچ کر اس نے یہ سب برداشت کرنے کا فیصلہ کیا...... اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔
آخرکار جب لفٹ لابی میں رکی تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ چکردار دروازوں سے نکلتے ہوئے یہ کیفیت دوچند ہوگئی۔ سڑک پر نکل کر اس نے چند گہری سانسیں لیں تا کہ طبیعت بحال کر سکے۔ شہر کی آلودہ لیکن لیڈیز پرفیوم سے عاری فضا میں اس کی حالت فوراً بہتر ہوگئی۔ اس نے ایک نگاہ غلط اپنے آفس کی عمارت پر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ایک جانب چل پڑا۔
پینتیس سالہ بلال نہایت خوش پوش اور خوش شکل مرد تھا جس کو نوجوان لڑکیاں بھی پسندیدگی سے دیکھتی تھیں۔ اس تیس منزلہ قدیم عمارت میں وہ کافی عرصہ سے اسٹاک بروکر کا کام کر رہا تھا۔ پاکستان سے نیویارک آباد ہونے کے پیچھے ایک طویل جدوجہد شامل تھی لیکن پچھلے دس سال سے اپنی امریکن بیوی اینا کے ساتھ وہ خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔
حسبِ معمول اسے ریسٹورنٹ پہنچنے میں محض پانچ منٹ ہی لگے...... جہاں وہ اپنی چاہت سے ملاقات کا متمنی تھا۔ بدھ کے روز سب آفس ورکرز کی آمد کے باعث تقریباً ہر ٹیبل پُر ہو چکی تھی۔ پُر ہجوم ریسٹورنٹ میں اس نے متلاشی نظروں سے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ابھی اس کی رش میں تلاش جاری ہی تھی کہ ایک ملتے بازو نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔ اس کے حسنِ جہاں سوز کو دیکھ کر بے ساختہ ایک سرد آہ اس کے حلق سے خارج ہوگئی اور وہ مختلف میزوں کے گرد دوڑتے ویٹرز سے بچتا بچاتا اس تک پہنچ ہی گیا۔ اپنا اوور کوٹ اس نے اتار کر کرسی کی پشت پر پھیلا دیا۔ اس کی ایک ایک بات سے عجلت آمیزی عیاں تھی۔
''شکر ہے میں وقت پر پہنچ گیا......'' بیٹھتے ہی وہ اس کے خوبصورت ہاتھوں کو تھام چکا تھا۔ ''تم ہمیشہ کی طرح بہت پیاری لگ رہی ہو دانیہ......''
سیاہ سنہرے لبادے میں ملبوس وہ واقعی حسن کا شاہکار لگ رہی تھی۔ شانوں تک آتے اس کے بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے جو اس کی دلکشی میں اضافے کا سبب بن رہے تھے۔
''مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم آگئے...... مجھے تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔'' اس کے بولنے کے انداز میں ایک ادا تھی۔
''میں خود تمہاری یاد میں تڑپ رہا تھا......'' وہ کسی نوجوان عاشق کے مانند بولا۔ ''یہ ہفتہ تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔''
''ہم اس ویک اینڈ مل سکتے ہیں......'' دانیہ نے معنی خیز انداز میں سرگوشی کی۔
بلال نے اس کی بات کا جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک سیاہ ایپرن والی وردی میں ملبوس ادھیڑ عمر ویٹر نے مداخلت کر دی۔
''آپ کیا لینا پسند کریں گے جناب......؟''
''دو اسپیشل سیزر سیلڈ لے آؤ......'' دانیہ نے مینیو دیکھے بغیر کہا اور ویٹر اپنے ہاتھ میں پکڑا مینیو کارڈ لے کر چلا گیا۔
''مجھے نہیں لگتا کہ جمعے کے دن تک ملاقات کا کوئی اور موقع بن پائے گا...... اس اختتامِ ہفتہ پر شاید میری ساس رہنے کو آجائے...... وہ آگئی تو اینا اس کو شاپنگ کے لیے لے کر ضرور جائے گی۔ اس کا مطلب یہ کہ ہمیں ہفتے والے دن...... ہی وقت میسر ہو پائے گا......''
''کاش تمہاری جان چھوٹ جائے اُس دن...... مجھے واقعی تمہاری ضرورت ہے بلال......'' جذبات سے معمور اس کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ آگئی تھی۔
''یہ بہت زیادتی ہے دانیہ...... قسمت کی ستم ظریفی ہے...... کاش تم مجھ سے دس سال قبل ملی ہوتیں تو میں اس عورت سے شادی نہ کرتا...... آخر قدرت نے میرے حصے میں تمہارے بجائے اُسے کیوں لکھ دیا؟ تم سیانی تھیں...... اس سے پہلے کہ تمہارا کزن تمہاری زندگی برباد کر دیتا تم نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا...... کاش میں نے بھی اپنی بیوی سے پہلے ہی علیحدگی اختیار کر لی ہوتی...... تم سے مل کر جو خوشی مجھے ملتی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہوتا تھا...... لیکن اب سب بدل گیا ہے...... تمہارے بنا جیسے میری راتیں ہی نہیں کٹتی ہیں...... وائے افسوس کہ ہمیں یوں چوروں کی طرح میل ملاقات کرنا پڑتی ہے۔'' بلال نے توقف کیا...... ابھی وہ اپنی جذباتی تقریر پھر سے جاری کرنے ہی والا تھا کہ ویٹر آرڈر لے کر آگیا۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور کانٹا اٹھاتے ہوئے دانیہ کی جانب دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔
''دانیہ...... تم رو رہی ہو؟''
''مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے بلال...... لیکن میں بھی خود پر قابو نہیں رکھ پاتی ہوں...... تمہاری چاہت نے مجھے جکڑ کر رکھ دیا ہے...... جتنا تم مجھے چاہتے ہو شاید میں تم سے اس سے زیادہ محبت کرتی ہوں لیکن ہمارا ملاپ اس سے بڑھ کر ہونا ناممکن ہو چکا ہے۔'' اس نے اپنے پرس سے رومال نکال کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
بلال اس کی باتوں پر کٹ کے رہ گیا۔
''دیر ہو رہی بلال...... لنچ کے بعد ہمیں اپنے اپنے آفس واپس بھی جانا ہے۔ ایک ساتھ جو محدود پل ہمیں ملتے ہیں اُن میں یہ اذیت ناک باتیں نہ کیا کرو بلکہ جتنی خوشیاں چن سکتے...... چن لیا کرو۔ ٹھیک ہے؟''
بلال کے چہرے پر ایک زخمی مسکراہٹ ابھری اور اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھانا شروع کر دیا۔
وقت جیسے پَر لگا کے اُڑنے لگا اور وہ کھانے کے دوران خوش گپیاں کرتے رہے۔ اپنی محبتوں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے میں ہی مگن رہے۔ کھانے کے بعد ویٹر بل لایا تو بلال نے اپنے بٹوے سے کچھ نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھ دیے۔ جدائی کے لمحے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے چہرے پر بیک وقت خوشی اور اداسی کے تاثرات تھے...... جہاں دانیہ سے ملنے کی خوشی تھی وہیں اس سے بچھڑنے کا غم بھی دل میں عجب احساس جگا رہا تھا۔
اپنا کوٹ اٹھانے کے لیے وہ مڑا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور وہ تیزی سے مڑ کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دانیہ جو اپنی جیکٹ کی زپ بند کر رہی تھی، اس حرکت پر چونکے بنا نہ رہ سکی۔
''کیا ہوا؟ کوئی بھوت دیکھ لیا کیا؟'' وہ اس کے زرد ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔
بلال مزید آگے کی جانب جھک گیا اور سرگوشی کی۔ میرے بالکل پیچھے دائیں جانب والی ٹیبل کی طرف دیکھو، جو کونے میں ہے...... ریسٹورنٹ کی دوسری طرف...... کیا تمہیں وہ نظر آئی؟''
''کون؟'' دانیہ کے لہجے میں اُلجھن تھی۔
''اینا وہاں بیٹھی ہے...... میری بیوی اینا...... اتنی دور سے پہلے تو مجھے بالکل شک نہیں ہوا...... لیکن جب وہ مڑ کے اس جانب دیکھ رہی تھی تو مجھے اس کی جھلک نظر آگئی۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ اینا ہی ہے۔'' وہ تیزی سے بولا۔
''پکی بات ہے؟'' دانیہ کی آواز میں لرزش سی تھی۔
''ہاں پکی بات ہے...... ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے لیکن علیحدہ علیحدہ......'' یہ کہہ کر وہ ریسٹورنٹ کی عقبی سمت چلا گیا جہاں سے اسے ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنے آفس واپس پہنچنا تھا۔ دانیہ بھی تھوڑی دیر مزید بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ وہ اینا کو بلال کی نشاندہی کے باوجود نہیں دیکھ پائی تھی۔

☆☆☆

اینا سے شادی پیپر میرج ہی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انسیت، محبت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ بلال اپنا سب کچھ تیاگ کر پاکستان سے امریکا آیا تھا اور واپس نہ جانے کی یہی شرط تھی کہ وہ گرین کارڈ کے لیے شادی کر لے۔ رشتے ناتے، ماں باپ کو پسِ پشت ڈال کر اس نے ذاتی کامیابی کو مقدم جانا تھا۔
اینا اس سے عمر میں آٹھ سال بڑی تھی...... عمروں کا یہ تفاوت اس وقت تو نظرانداز ہوگیا تھا لیکن اب وہ عجیب جوڑا لگتے تھے۔ وہ کبھی بھی اس چیز پر دھیان نہ دیتا لیکن بچوں کی پیدائش سے انکار پر وہ اینا کی جانب سے دل میں گرہ ڈال بیٹھا...... محبت تو اب بھی تھی لیکن خاندان آگے بڑھانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی اس نے صبر کر لیا تھا کہ جیسا دیس ویسا بھیس......
مگر اچانک ہی دانیہ جیسی قتالۂ عالم نے اس کی پُرسکون دنیا کے تالاب میں ایسا پتھر مارا تھا کہ ہلچل نے دل و دماغ کو ہلا ڈالا تھا۔ وہ بطور کلائنٹ پہلی بار ملی تھی اور اس پاکستانی نژاد حسینہ پر وہ پہلی نظر میں ہی فریفتہ ہوگیا تھا۔ انگریزی کے علاوہ اردو میں بات چیت کرنے کی آزادی نے ان کو میل ملاقات میں آسانی تو فراہم کی ہی تھی لیکن ذہنی ہم آہنگی نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔
آٹھ ماہ قبل ہونے والی کاروباری ملاقاتیں کب عشق و محبت میں بدلی تھیں، اس کا احساس دونوں کو نہیں ہوا تھا۔ بلال کو جب تک پتا چلا تب تک وہ گھٹنوں گھٹنوں دانیہ کی چاہت کے دریا میں ڈوب چکا تھا۔ دوسری جانب بھی آگ برابر کی لگی ہوئی تھی۔ دانیہ فیملی کے دباؤ پر پنجاب سے اپنے کزن سے شادی تو کر آئی تھی لیکن دونوں الگ ہی دنیاؤں کے باسی ثابت ہوئے...... علیحدگی اس کا ہی فیصلہ تھا اور امریکن معاشرے کے تحت وہ خود پر جبر کر کے نہیں رہ سکتی تھی

اس لیے بات طلاق پر ہی منتج ہوئی۔

پانچ سال ''بھرپور'' طریقے سے زندگی انجوائے کرنے کے بعد اُسے اب کسی عاشق کے بجائے مضبوط مرد کی ضرورت تھی جو اس کا ہاتھ تھام کر زندگی بھر کے لیے گھر بسا سکے۔ بلال اس کا آئیڈیل تھا بس کمی تھی تو ایک کہ...... وہ شادی شدہ تھا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے وہ بڑے عرصے سے سوچ رہی تھی لیکن کوئی قابل عمل صورتِ حال نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں شہر سے ذرا ہٹ کر بنے ایک ہائی وے موٹیل کے کمرے میں موجود تھے جہاں کسی جان پہچان والے کی نظر میں آنے کا امکان نہیں تھا۔ بستر کی شکنیں اور ان کی کم لباسی اس بات کو بیان کر رہی تھی کہ کچھ دیر قبل ان کی کیا مصروفیت رہی ہے۔

''جب تم گھر پہنچے تھے تو تمہاری بیوی نے تم سے کچھ کہا؟'' مغربی معاشرے کی پروردہ دانیہ نے بکھری سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اتنا ڈر گئی تھی کہ پھر تمہیں کوئی فون میسج ہی نہیں کیا...... آج تمہارا میسج آیا تو یہاں چلی آئی۔''

''نہیں...... کچھ نہیں کہا اُس نے...... ایک لفظ تک نہیں بولی وہ مجھ سے اس بارے میں......'' بلال جامے میں آتے ہوئے بولا۔ ان کی محبت ہر حد عبور کر چکی تھی اور ان کی ایسی ملاقاتیں اکثر ہوٹل کے کمروں میں ہی ہوتی تھیں۔

''میرے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ اس دن اتفاق سے ریسٹورنٹ پر کھانا کھانے آئی تھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اسے مجھ پر شک ہو گیا ہے اور وہ اسی کی تصدیق کے لیے میرا پیچھا کر رہی ہے......'' بلال نے دانیہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی ہم دونوں کی محبت میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے...... اس دیوار کو اب گر جانا چاہیے......''

''میں سمجھی نہیں...... تم کہنا کیا چاہتے ہو بلال؟''

''میں اپنی بیوی کو قتل کر دینا چاہتا ہوں......'' بلال نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

دانیہ بھونچکا رہ گئی۔ ''قتل...... بلال کیا کہہ رہے ہو؟'' اس کی آواز میں کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

''ہاں...... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں......'' بلال سرسراتے لہجے میں بولا۔ طلاق کی صورت میں مجھے اس کو اتنا کچھ دینا پڑے گا کہ میں خود قلاش ہو جاؤں گا...... کیا تم ایک مفلس کے ساتھ گزارہ کر لوگی؟''

''کیا...... لیکن یہ سب کیسے ممکن ہے؟'' دانیہ جیسے کسی خواب سے جاگی، اگرچہ وہ خود بھی کماتی تھی لیکن بلال اس کے مقابلے میں کہیں بہتر کماتا تھا اور اس پر بے دریغ خرچ کرنے سے بھی کبھی نہیں رکا تھا۔

''میں نہیں جانتا...... لیکن اس کے غیاب سے قبل ہمارا مستقل میل جول برقرار رہنا ناممکنات میں سے ہے۔'' بلال نے رسان سے جواب دیا۔

''بلال...... دیکھو جتنی محبت تم مجھ سے کرتے ہو، اتنی ہی میں بھی تم سے کرتی ہوں لیکن کسی کو اس طرح راستے سے ہٹا دینے کا کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔'' بات کے آغاز میں دانیہ کے لہجے میں لرزش تھی لیکن اب وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کر رہی تھی۔ ''تم اخبار نہیں پڑھتے یا ٹی وی نہیں دیکھتے...... یہ پاکستان نہیں ہے کہ کوئی قتل کر لے اور بچ جائے...... یہاں کی پولیس قبر تک قاتلوں کا پیچھا کرتی ہے۔ میں اس سازش کا بالکل بھی حصہ بننے کو تیار نہیں ہوں...... تمہیں بھی یہی کہوں گی کہ اپنی بیوی کو قتل کرنے سے باز رہو...... ہمارا گزارہ ایسے ہی چل جائے گا جیسے اب چل رہا ہے۔''

''نہیں......'' بلال نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''تم جیسی خوبصورت عورت کیسے تنہا رہ سکتی ہے؟ کل کو تمہیں کوئی ایسا مل گیا جو بھرپور توجہ اور محبت کے ساتھ وقت بھی دے تو تم میری منتظر تو نہیں بیٹھی رہوگی...... تمہیں کھو دینے کا تصور ہی میرے لیے روح فرسا ہے...... اور تمہیں پانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''تم...... تم قاتل بن جاؤ گے......'' وہ ایک بار پھر ہکلائی۔ ''میں ایک قاتل کے ساتھ کیسے تعلق رکھ سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں سارے جہاں کے خدشات اتر آئے تھے۔

''جیسے اب رہ رہی ہو......'' بلال نے اس کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

دانیہ اس کے انداز سے خائف ہو گئی تھی لیکن اس بات کا اظہار بہ زبانِ خاموشی ہی کر سکی۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ بالکل خاموش تھی جبکہ بلال اپنے ذہن میں کوئی کھچڑی پکانے میں اتنا مصروف تھا کہ اس کے بدلے تیوروں پر دھیان ہی نہ دے سکا۔

☆☆☆

پچھلے پانچ دن سے دانیہ سے ملاقات کی کوئی سبیل نہیں بن پائی تھی۔ اپنے آفس کے پاس والے ریسٹورنٹ

میں وہ اسے بلانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا جبکہ شام کو باہر نکلنے کا اس کے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا۔ یہ دوری اس کے اعصاب کو چٹخا رہی تھی...... اینا کو قتل کرنے کا ارادہ مزید پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ جمعے کی دوپہر اس نے دانیہ کو ٹیکسٹ کیا تا کہ ویک اینڈ کو ہونے والی ملاقات کے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

''بہت بہت معذرت بلال...... کیونکہ باس نے آج ایک ہنگامی میٹنگ رکھ دی ہے شکاگو میں...... اس ویک اینڈ ہم اُدھر مصروف رہیں گے...... شاید تم سے بات بھی نہ ہو پائے...... اپنا خیال رکھنا اور دماغ میں کوئی الٹا سیدھا خیال نہ آنے دینا...... ہم پیر کے روز ملیں گے...... موآ......'' دانیہ نے وائس میسج کے ذریعے جواب اور ایک بوسہ بھیجا تھا جو کہ بلال کے لیے ناکافی تھا چنانچہ اس نے فون میز پر ہی پٹخ دیا۔

ویک اینڈ برباد ہونے کا اُسے شدید رنج تھا۔ گھر پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر اینا بھی چونک اٹھی۔

''تمہیں کیا ہو گیا؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''کچھ نہیں...... بس ذرا سر میں درد ہے......'' بلال نے بہانہ بنایا۔

''میں کافی بنا دیتی ہوں...... تم ریسٹ کرو...... سر درد فوراً چلا جائے گا۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور کچن کی جانب چلی گئی۔

اس کا وزن بڑھ رہا تھا اور جینز کے علاوہ شرٹ سے بھی اس کا مٹاپا عیاں ہو رہا تھا۔ بلال نے ناگواری سے اس کو دیکھا۔

''میرا سر درد تو تم ہو...... اور تم آسانی سے کہاں ختم ہونے والی ہو...... کاش تم دانیہ جیسی خوبصورت ہوتیں......'' وہ اس کے سراپا کا موازنہ دانیہ سے کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا...... اور اس کی سوچ نے کچھ مثبت نتیجہ نہیں نکالا تھا۔ دیسی حُسن کے جلوے ولایتی گوری میم پر حاوی ہو چلے تھے۔

''دانیہ مان جائے گی...... وہ بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے...... وہ جان جائے گی کہ یہ سب کچھ میں نے اس کی محبت میں مجبور ہو کر کیا ہے......''

وہ رات اپنی تمام تر سیاہی کے ساتھ صرف شہر میں ہی نہیں اس کے دل میں بھی اتری تھی۔ اپنی ساس کو فون کر کے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اور اینا تفریح کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہیں اور واپسی پر ہی اب بات ہو سکے گی۔ اینا ان باتوں سے بے خبر سو رہی تھی۔ ہلکی سانسوں کے ساتھ اس کے وقتاً فوقتاً ابھرنے والے خراٹے کمرے کی خاموشی میں ہلچل مچاتے اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ نیند کی گولیوں کی ڈوز کافی میں ملا کر دینے کے بعد اس کی جانب سے مزاحمت کا کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔

تکیہ رکھ کر جب اس نے اس کی سانسیں ختم کیں تب بھی دانیہ کا تصور اس پر غالب تھا......

''لو یہ کام بھی ہو گیا...... اب دانیہ اور مجھے ایک ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا......'' اس نے لاش کو کمبل میں لپیٹنے کے بعد گیراج میں کھڑی گاڑی میں منتقل کرتے ہوئے سوچا۔

گاڑی کی ڈکی میں لاش رکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کے دماغ میں سوچ ابھری۔

''اسے میں دفن کہاں کروں گا؟ ہاں...... بلیو ماؤنٹین ایریا کے ساتھ والا جنگل ہی اس کام کے لیے مناسب رہے گا۔'' وہ خود کلامی کر رہا تھا۔

پھاوڑا لے کر وہ گاڑی پر پندرہ میل سے زائد کا فاصلہ طے کر کے جنگل میں پہنچا۔ ایک محفوظ جگہ دیکھ کر اس نے کھدائی شروع کر دی۔ اس کام میں تین گھنٹے صرف ہو گئے لیکن وہ ایک چارفٹ گہری قبر کھودنے میں کامیاب رہا۔ اینا کی لاش دفن کرنے کے بعد اس نے اس قطعۂ زمین کو برابر کر دیا۔

''اب قیامت تک اس کی لاش کو کوئی نہیں ڈھونڈ سکے گا......'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

گاڑی چلاتے ہوئے صبح کاذب سے قبل ہی اپنے گھر پہنچ کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ تھکن سے چور ہو کر اسے بڑی گہری نیند آئی تھی اور چند لمحوں میں ہی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

نیند کی دیوی روٹھ چکی تھی...... پچھلی دو راتوں سے وہ مسلسل جاگ رہا تھا اور اس کی ذہنی حالت تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ شراب نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن اس کی بیوی باقاعدگی سے شغل کرتی تھی...... کبھی کبھی وہ بھی ساتھ دے دیتا تھا۔ اس وقت طعام گاہ میں بکھری خالی بوتلیں اس بات کی گواہ تھیں کہ اپنے کشیدہ اعصاب کو سکون پہنچانے کی غرض سے وہ اینا کے ذخیرے پر ہاتھ صاف کر چکا ہے۔

ایش ٹرے میں ختم ہو جانے والی سگریٹ کو بجھاتے ہی نئی سگریٹ سلگا لی تھی۔ ہاتھوں کی لرزش بے پناہ تھی لیکن

اس نے کسی طرح دانیہ کا نمبر ایک بار پھر سے ملا لیا۔

''میں دانیہ صدیقی اس وقت دستیاب نہیں...... اپنا پیغام بیپ کے بعد ریکارڈ کرا دیں......'' کال سیدھی دانیہ کے وائس باکس میں چلی گئی تھی۔ پچھلے دو دن سے رابطہ کرنے پر وہ یہی آواز سن پا رہا تھا۔

کوئی پیغام ریکارڈ کیے بغیر اس نے فون میز پر پٹخ دیا۔

جلد بازی میں وہ قتل جیسے جرم کا ارتکاب تو کر بیٹھا تھا لیکن پیشہ ور قاتل نہ ہونے کے سبب اس وقت شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ بار بار وہ خود کو صحیح ثابت کرنے کے جواز تراش رہا تھا لیکن خود اس کا ذہن ہی اس صورتِ حال کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ اوپر سے دانیہ سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

''وہ یقیناً میری محبت کو سمجھ جائے گی...... وہ اتنی کٹھور نہیں کہ مجھے اتنی معمولی سی بات پر دھتکار دے......'' کوئی بیسویں بار اس نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

اس نے ایک آخری کوشش کی کہ دانیہ سے رابطہ ہو جائے...... اور پھر سے اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''میں دانیہ صدیقی اس وقت دستیاب نہیں...... اپنا پیغام بیپ کے بعد ریکارڈ کرا دیں......'' ایک بار پھر وہی آواز سن کر وہ طیش میں آ گیا لیکن اس بار اس نے جذبات پر قابو پا لیا۔

''دانیہ...... اگر تم واپس آ گئی ہو تو مجھ سے آج لنچ پر ملنا...... ہمارے مخصوص ریسٹورنٹ میں، میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' اس نے پیغام ریکارڈ کر کے فون ڈائننگ ٹیبل پر ہی رکھا اور نہانے کے لیے چلا گیا۔

کافی دیر ٹھنڈے پانی کی پھوار خود پر ڈالنے کے بعد وہ اپنے حواس میں واپس آیا۔ پینے پلانے کا اثر بھی بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ تلخ کافی کے گھونٹ تھکن کو یقیناً دور کر دیتے۔ کچن میں آ کر اس نے سیاہ کافی تیار کی اور چسکیاں لیتا ڈائننگ ٹیبل پر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

اسمارٹ فون کی چھوٹی سی جلتی بجھتی ایل ای ڈی لائٹ سے اُسے اندازہ ہوا کہ کوئی پیغام آیا ہوا ہے۔ فون کا لاک کھول کر اس نے چیک کیا تو دانیہ کا صوتی پیغام آیا ہوا تھا۔

''ہاں میں واپس آ گئی ہوں...... لیکن آج دوپہر کو لنچ کے لیے ملنا ناممکن ہے...... میرے باس نے شکاگو والی میٹنگ کی تفصیلی رپورٹ طلب کر لی ہے جو کہ شام چار بجے تک جاری رہے گی...... مجھے رات کو کال کرنا اگر تمہیں اپنی بیوی سے بچ نکلنے کا موقع مل جائے...... اور یہ اتنے سارے خالی وائس میسج کیوں بھیجے ہیں تم نے؟'' آخری بات کہتے ہوئے اس کا لہجہ شوخ سے سوالیہ ہو گیا تھا۔

''ملو گی تو بتاؤں گا...... اب تو موقع ہی موقع ہے......'' بلال نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری بریکنگ نیوز رات تک تو انتظار کر ہی سکتی ہے...... اُف کیا تاثرات ہوں گے دانیہ کے جب میں اسے بتاؤں گا کہ ہمیں یک جان دو قالب ہونے سے روکنے والی شخصیت منوں مٹی تلے جا چکی ہے......'' ایک بار پھر خود کلامی کرنے کے بعد وہ اپنی جاب پر چلا گیا۔

دانیہ کی طرف سے ایک مثبت پیغام نے اس کے اندر جیسے نئی توانائی بھر دی تھی۔ کھانے کے وقفے میں وہ اپنے مخصوص ریسٹورنٹ پہنچا اور اپنی پسندیدہ سیزر سلاد کا آرڈر کر دیا۔ کھانا چنے جانے کا انتظار کرتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانا شروع کر دی۔ باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کی ایک ٹیم بھی وہاں خوش گپیوں میں مشغول تھی...... ان کے ساتھ والی میز کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''نہیں......'' بے ساختہ اس کے حلق سے کراہ سی نکل گئی اور وہ کھڑا ہو گیا۔ ''یہ ناممکن ہے......'' وہ یہ کہتا ہوا اسی میز کی جانب بڑھ گیا جس پر اسے ایک خاتون نظر آئی تھی۔ وہ اس کے سامنے جا کر رک گیا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' خاتون نے اس بُری طرح دیکھے جانے پر جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

آنکھوں میں بے یقینی لیے کافی دیر سے اُسے دیکھتا وہ یہ آواز سن کے بالکل ہی بدک گیا۔

''تم یہاں نہیں ہو سکتی ہو......'' وہ اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چلایا...... میں تمہیں قتل کر چکا ہوں......'' شدتِ جذبات سے وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

کھانا کھاتی خاتون اس چنگھاڑتے شخص سے بُری طرح خوفزدہ ہو گئی۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟'' وہ اپنے سنہرے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز بھی کافی بلند ہو گئی تھی لیکن چہرے سے پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔

کچھ لوگ اس ہلچل پر اپنی میزوں سے اٹھ کر اُن دونوں کی جانب آ گئے۔

''تم مر چکی ہو...... میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے دفن کیا ہے...... تم فوراً اپنی قبر میں دفع ہو جاؤ......'' وہ چلاتے ہوئے اس کی جانب بڑھا جیسے ابھی اسے بھی زندہ گاڑ دے گا۔

خاتون بُری طرح چیخنے لگی۔ فوراً ہی قریبی میز پر موجود کھلاڑیوں میں سے چند نے بلال کو دبوچ لیا اور زمین سے لگا کر بے بس کر دیا۔ وہ بُری طرح مچل رہا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے...... یہ کوئی بدروح ہے جو مرنے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی...... اسے اپنی قبر میں واپس جانا ہو گا...... یہ مر چکی ہے...... چھوڑ دو مجھے......'' بلال اپنی رو میں ڈوبا بری طرح چیخ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہی سائرن کی آواز ماحول کی سنگینی کو بڑھانے لگی...... کسی نے پولیس ایمرجنسی پر کال کر دی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک سفید دیواروں والا کمرا تھا جہاں دیواروں پر دماغ کی مختلف اشکال موجود تھیں۔ آفس کے انداز میں سجے اس کمرے میں ایک جانب کاؤنسلنگ کے لیے کاؤچ بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر ذاکر سعید انڈین نژاد تھا اور دماغی امراض کے اس اسپتال میں بطور جونیئر کنسلٹنٹ کام کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ ایک مریض خاتون سے بات چیت میں مصروف تھا۔ مریض سے زیادہ وہ اس حسین خاتون کو اہمیت دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ زہد شکن حُسن کی مالک تھی۔

''دیکھیں مس صدیقی...... عدالت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ بلال معاشرے کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے...... اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے آزاد چھوڑا جا سکے...... وہ یہاں اس ذہنی امراض کے اس شفا خانے میں ہی کوئی بہتری حاصل کر سکتا ورنہ نہیں......''

''لیکن کوئی بہتری کی گنجائش تو ہو گی......'' دانیہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ''وہ مجھے تو پہچان ہی لیتا ہے۔''

''ہاں یہ حیرت کی بات ہے کہ ان سے محض ورک ریلیشن ہونے کے باوجود وہ آپ کو نہ صرف پہچان لیتا ہے بلکہ نام بھی لے لیتا ہے۔۔۔ ورنہ دیگر اوقات میں تو بس یہی تکرار جاری رہتی ہے کہ میں نے اسے مار دیا...... اسے کہو اب میرا پیچھا چھوڑ دے...... وہ مر چکی ہے...... میں نے اسے مار ڈالا...... اسے اس کی قبر میں واپس ڈال دو......'' ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تفصیل بیان کی۔

''بس جانے کیوں اسے میرا نام یاد رہ گیا......'' وہ تاسف سے بولی۔

''اس کی بیوی کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے...... پولیس کو شک ہے کہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد ہی ایسی حالت ہوئی ہے...... جبکہ اپنے علم کے مطابق میرا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد اس نے بے تحاشا نشہ آور اشیا کا استعمال کیا اور دباؤ کا شکار ہو کر اس کی ذہنی رو الٹ گئی......''

''لیکن ایک قتل کر دینے والا شخص کیسے اس طرح کے احساسِ شرمندگی میں مبتلا ہو سکتا ہے؟'' دانیہ حیران تھی۔

''شاید نہ ہوتا لیکن اس کے ساتھ واقعی انہونی ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں...... بلال کا ٹکراؤ اپنا کی کسی ایسی ہی ہم شکل سے ہو گیا جو کہ اُس سے غیر معمولی مشابہت رکھتی تھی۔ اس وجہ سے ہی وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا...... ویسے اب بھی یہ ٹھیک ہو بھی گیا تو سزا سے نہیں بچ پائے گا۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں تیقن بھرا ہوا تھا۔

اس نے ایک بھرپور نظر دانیہ کے سراپا پر ڈالی تھی اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ پیشہ ورانہ تقاضوں کی مجبوری کے تحت وہ اس سے نمبر بھی نہیں مانگ سکتا تھا اور نہ کانٹیکٹ فائل سے لے کر رابطہ کر سکتا تھا اس لیے ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''اوہ...... صحیح...... اور اس کے ٹھیک ہونے کے چانسز کتنے ہیں؟'' دانیہ نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی کی عدم موجودگی اور خود میں دلچسپی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''دس فیصد سے بھی کم......'' ڈاکٹر کا جواب پہلے سے تیار تھا...... وہ اس بات پر سر ہی ہلا کر رہ گئی کیونکہ کرنے کے لیے کوئی بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

''اچھا...... میں اب چلتی ہوں...... مریض کی حالت میں کوئی تبدیلی آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا...... اور پلیز اس ماحول سے ہٹ کر اگر ہم کہیں مل سکیں تو مجھے خوشی ہو گی۔'' دانیہ نے اپنا کارڈ اسے دیتے ہوئے اجازت طلب کی۔

پرکھنے کا کام پورا ہو چکا تھا، ڈاکٹر اُس کے معیار پر پورا اترا تھا اس لیے اُس کی مسکراہٹ نہایت دلفریب ہو گئی تھی۔

''ضرور...... کیوں نہیں......؟'' ڈاکٹر ذاکر نے پُرمسرت انداز میں کہا، اُس کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔

ایک پاگل اس فتنۂ حُسن کے لیے ہوش و خرد سے عاری ہو چکا تھا اور دوسرا دیوانہ بننے جا رہا تھا۔

وہ ایک ادا سے چلتے ہوئے باہر نکل گئی۔

PakiBooks.site

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

قسط نمبر: 52

PakiBooks.Site

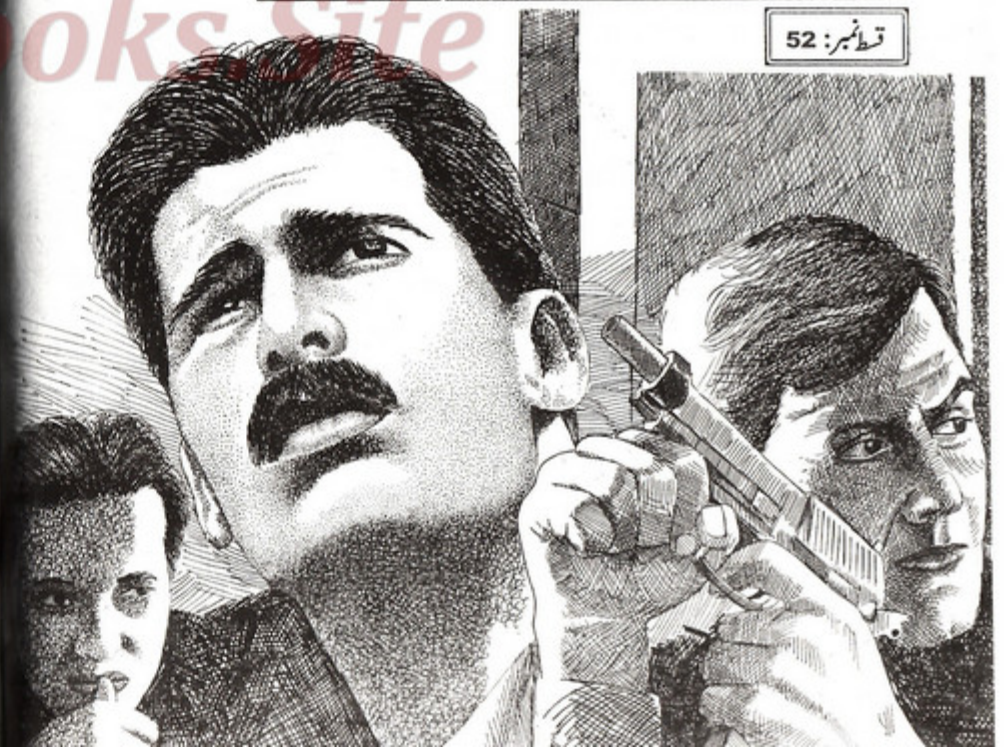

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، شفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مصر اور بورڈ آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڑیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹمسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوسک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈز وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

ار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچ کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہ تیغ کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین اسے مل جاتی ہے ...... وہ دونوں شہزی کو مصر لے جانا چاہتے ہیں مگر شہزی راضی نہیں ہوتا۔ وہ ایک بار پھر توہارا کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے روڈلف مارا جاتا ہے۔ اب یاسمین کی ذمے داری شہزی کے سر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اب...... شاید کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

بھیانک اور یقینی موت، اٹل تھی۔ بس...... اِک ذرا پلک جھپکنے کی ہی تو دیر تھی۔ اس کے بعد اتھاہ تاریکی اور پھر مکمل فنا۔

ہم سب جیسے پل کے پل ایک دوسرے کی موجودگی کو بھی بھول چکے تھے۔ ہماری پھیلی ہوئی آنکھیں سامنے ونڈ اسکرین پر جمی مخالف سمت سے آتے ہوئے ایک دوسرے دیوزاد مسافر طیارے کو تک رہی تھیں۔

بقول گزشتہ کو پائلٹ کے فضا میں روٹ سے بھٹک جانے کے بعد دور مخالف سمت سے نظر آتا طیارہ، پہلے نقطے کی شکل میں اور پھر لمحوں میں اتنا قریب آجاتا ہے کہ جہاز کو رخ بدلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

اور واقعی یہ سڑک نہیں تھی کہ فوری طور پر راستہ بدل لیا جائے۔ لیکن فضا میں ایسا ہونے کا مطلب ایک خوفناک تصادم تھا اور ہم شاید اسی امر کے ''ہونے'' کے منتظر رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رکھتے تھے۔

میرا تو جیسے دل ہی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ہم سب کی زبانیں گنگ ہوچکی تھیں۔ یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب یقین آتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ معجزے بھی وہی پیدا کرتا ہے، چاہے تو موت کی وادیوں میں گرتے ہوؤں کو یکلخت بچالے یا زندگی کی گود میں ہنسی خوشی کھیلتے کو یکایک موت کی آغوش میں دھکیل دے۔

ہمارے طیارے میں پہلے ہی حالات دگرگوں تھے یوں ہم اپنے بچاؤ کا راستہ کھو چکے تھے، لیکن سامنے سے آنے والا طیارہ چونکہ اپنے طے شدہ فضائی روٹ پر تھا، شاید یہی ایک بہانہ تقدیر کو مقصود تھا کہ اس کے پائلٹ نے یقیناً اپنے ریڈار میں پہلے ہی سے ہمارے طیارے کو نقطے کی صورت میں دیکھتے ہی اپنے اور ہمارے بچاؤ کی بھی تدبیر کرنے کی اپنی سی کوشش کرلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مخالف سمت سے آتا ہوا طیارہ قریب آتے آتے بھی عمودی رخ پر ہونے لگا تھا اور ہمارے گویا سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

بے اختیار ہمارے سینوں میں اٹکی ہوئی سانسیں طائرِ قیدی کی طرح پھڑپھڑا کر نکلی تھیں۔ ہم سب موت کے منہ سے بال بال بچے تھے۔ چند ثانیے تو سکتے کی سی کیفیات سے دوچار رہے تھے۔

میں کو پائلٹ کا دھکا لگنے سے ابھی تک کاک پٹ کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

حالات سنبھلتے ہی کوہارا نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگادی۔ میں اس حملے کے لیے تیار تھا۔ فوراً اپنی جگہ چھوڑی، کوہارا اپنے گینڈے جیسے جسم کے زور پر دیوار سے ٹکرایا تو میں نے سنبھل کر لات چلادی، جو اس کی کمر پر لگی۔

وہ کسی وحشی سانڈ کی طرح پلٹا، اور اپنے بھاری جثے کے باوجود اچھلا اور مجھ پر آرہا۔ میں نے اسے اپنے توانا بدن کی طاقت سے سنبھالنے کی کوشش چاہی تھی مگر شاید میرا ایک پاؤں کسی شے سے رپٹا۔ ہم دونوں ہی نیچے گرے۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے طیارہ ڈول رہا ہو یاسمین پھر حلق کے بل چلائی۔ کاک پٹ کے دروازے کی مخصوص بپ بجنے لگی۔ کوئی باہر سے اندر آنا چاہ رہا تھا۔

''نخ...... خدا کے لیے لڑائی چھوڑو...... اس طیارے کی فکر کرو، ہم ابھی تک سخت خطرے میں ہیں۔''

اس بات نے مجھے ہی نہیں کوہارا کو بھی چونکا دیا۔ ہم دونوں بغیر ایک دوسرے سے دست و گریباں کیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

طیارہ واقعی بُری طرح ڈول رہا تھا۔ میرے چہرے پر سوالیہ نشان نے ایک جال سا بُن دیا۔ یہی حالت کوہارا کی تھی۔

دونوں پائلٹ بے سدھ تھے جبکہ کو پائلٹ تو مجھے ختم ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کوہارا کی طوفانی ضرب نے اسے کرسی سمیت اکھاڑ پھینکا تھا اور وہ غریب اب بھی کرسی سے بندھا کاک پٹ کے فرش پر عجیب انداز میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ یاسمین اسے سنبھالنے کی کوشش میں تھی اور ہم سے بھی مخاطب تھی۔

کیپٹن بھی کوہارا کی ایک ضرب کا نشانہ بننے کے بعد پینل پر اپنا سر دیے ہوئے تھا اور اب لڑھک کر گر چکا تھا۔

''کوہارا......! اس وقت ہم سب کی بقا سب سے اہم معاملہ ہے۔ اس کیپٹن کو ہوش میں لاؤ۔'' میں نے خوفناک نظروں سے کوہارا کی طرف دیکھ کر کہا۔

یہ بڑے سنسنی خیز اور اعصاب شکن لمحات تھے۔ کاک پٹ کی بپ مسلسل گونج رہی تھی۔

''میرا ساتھی اندر آنا چاہتا ہے۔'' کوہارا نے اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''اسے باہر ہی رہنے دو اور کیپٹن کو ہوش میں لاؤ۔'' میں نے تحکمانہ کہا مگر کوہارا بھی اڑ گیا۔

''ہرگز نہیں، میرا ساتھی اندر آئے گا۔'' اس کی ہٹ دھرمی پر میرے اندر کا ابال فزوں تر ہونے لگا۔ ٹھیک اسی

کاک پٹ کے اندر اسپیکر پر کسی اٹینڈنٹ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''جہاز کی چھت میں سوراخ ہوگیا ہے۔ کچھ کرو......''

یہ شاید کوئی فلائٹ اٹینڈنٹ یا کریو تھا۔ ہم سب ہک دک رہ گئے۔

''سوراخ کیسے ہوگیا؟'' کوہارا ہونقوں کی طرح ...کا سا بڑبڑایا۔ اس کے دماغ میں عقل نام کی کوئی شے نہ تھی۔ اسے صرف بے گناہوں کا خون بہانا آتا تھا جبکہ میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارے اوپر سے گزرنے والے طیارے کا کوئی نچلا ...ہوا حصہ ہمارے طیارے کی چھت پر دراڑ ڈالتا گزرا ہو۔ ممکن ہے اس طیارے کو بھی اسی طرح کی ''ایمرجنسی'' کی صورتِ حال پیش آگئی ہو۔

یہاں خطرات کی بھرمار تھی۔ ریڈار اور روٹ میپ پر کو پائلٹ ایک اسکرین دکھا چکا تھا جس پر سرخ لکیروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا، ادھر ہی کمپاس بھی شو کر رہا تھا، مگر اب ...کا وہ حصہ اس دھما چوکڑی میں ناکارہ ہوچکا تھا۔

بعین اسی طرح ایندھن کی فضا میں ری فلنگ بھی ایک ...ک مگر ایک انوکھا تجربہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ ...بیلی کاپٹر سے تو یہ سب بہ آسانی ممکن ہوسکتا تھا، کیونکہ ...ہوا میں معلق بھی ہوسکتے تھے مگر دو ایک ساتھ تیز رفتار پرواز کرتے جہازوں میں یہ عمل نسبتاً مشکل اور ''رسکی'' ہوتا ہے۔ ...اس میں ہوا کے تیز ترین دباؤ کا دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں مستعمل ہونے والے ٹیکنیکل لوازمات بھی اسی ساخت اور مخصوص انداز کے ہوتے تھے۔ یعنی بند جالی دار باسکٹ، ...ایک کارتی نما ایریل جو ہوا کے دباؤ کو بس ایک حد تک ہی برداشت کرتے ہوئے اس قدر جھول جاتا تھا کہ وہ اونچا ہوکے ...ے جہاز کے مطلوبہ حصے تک پہنچا رہتا تھا، اگرچہ احتیاط کے پیشِ نظر ''باسکٹ سوار'' پیراشوٹ باندھے ہوتا ہے۔ کوہارا کی ضد کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اس نے یقیناً یہ عمل دیکھ رکھا تھا۔ تاہم میرے لیے یہ پہلی بار ہوا تھا۔

بہرکیف اس اطلاع نے ہمیں ایک بار پھر ایک ...ے کو بھلادیا۔

''دروازہ کھول دو...... ہمیں باہر جاکر صورتِ حالات کا جائزہ لینا پڑے گا۔'' کوہارا نے چلّا کر کہا۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے یاسمین کو ہدایت کی۔ ''یاسمین! تم کیپٹن کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو تاکہ یہ طیارے کا کنٹرول سنبھال سکے۔'' اس کے بعد میں کوہارا کی طرف جلتی سلگتی نظروں سے گھور کر مخاطب ہوا۔

''چلو...... صورتِ حال اپنی آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے۔ تاکہ کیپٹن کو آکر بتاسکیں اس بارے میں......''

میری بات پر کوہارا نے حرکت کی لیکن آگے بڑھنے کی نہیں، اس نے پھرتی سے قریب پڑی اپنی گن اٹھالی۔ میرا دماغ پھر بھنا گیا۔

''کوہارا......! تم اب اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ......''

''بکواس بند کرو اپنی......'' وہ دہاڑ کر بولا۔ ''دروازہ کھولو اور میرے ساتھی کو اندر آنے دو، اور یہاں سے کوئی بھی باہر نہیں جائے گا۔'' اس نے گن مجھ پر تان لی تھی۔

اس کی دھمکی پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ پھر اس نے یاسمین سے تحکمانہ درشتی سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ یاسمین اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور کمبلر گن سمیت اندر داخل ہوا۔

یہاں کا منظر دیکھ کر پہلے تو وہ بُری طرح چونکا، اسے یہاں ہونے والی زبردست گڑبڑ کا اندازہ ہوا۔ پھر جب اس نے کوہارا کو ہم پر گن تانے دیکھا تو اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو ہم اسپیکر پر سن چکے تھے۔

''تم نے خود جاکر جائزہ لیا، آخر ہوا کیا ہے؟'' کوہارا نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواب میں کمبلر نے نفی میں سرہلا دیا۔

''تو پھر جاؤ اور عملے کے کسی آدمی کو ساتھ لے جاکر دیکھو اور آکر جلدی بتاؤ۔''

جہاز اس بار بُری طرح ڈولا۔ ہم سب کے قدم اکھڑ گئے اور ایک دوسرے پر جاگرے۔ ایک لمحہ کو یوں لگا جیسے طیارہ نیچے کی طرف جارہا ہو۔ یاسمین کی چیخ ابھری۔ میں سنبھالا لیتے ہوئے اٹھا۔ کوہارا بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنی گن اٹھانے کے چکر میں تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور کوئی پروا کیے بغیر کیپٹن کو ہوش میں لانے کی تگ و دو شروع کردی۔

کوہارا اپنی گن سنبھال کر خاموش کھڑا رہا۔ کمبلر ہنوز اس کے حکم کا منتظر تھا۔ یاسمین ان کی منت سماجت کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ نوجوان کو پائلٹ مرچکا تھا۔ مجھے اس کی موت کا دکھ تھا۔ وہ کوہارا کی روایتی بربریت کا شکار ہوچکا تھا۔

کیپٹن کو ہوش آیا تو میں نے اسے مختصر ترین لفظوں میں ساری صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور طیارہ کنٹرول کرنے کا کہا۔ وہ اپنا سر جھٹکتا ہوا اٹھا اور ایک نفرت انگیز نظر کوہارا پر ڈالی پھر اپنی سیٹ پر آگیا۔

PakiBooks.site

''طیارے کی چھت میں کوئی بیرونی نقص پیدا ہو گیا ہے۔فوراً عملے کے انجینئرز کو مطلع کرو۔'' وہ بولا۔

''انہیں اب تک تو پتا چل جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ حرکت میں بھی آچکے ہوں گے۔''

''لیکن میرا خرابی کی کنڈیشن سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ میں اسی انداز کے ایفرٹس لے سکوں۔'' کیپٹن بولا۔ میری بات صحیح ثابت ہوئی تھی۔

''سن لیا تم نے، مجھے خود جانا پڑے گا۔'' میں نے دانت پیس کر کوہارا کی طرف گھور کر کہا۔

''ہاں! مگر یاد رکھنا کوئی چالاکی تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔یہ ایرانی شہزادی میرے قبضے میں ہے، یہ مت بھولنا۔'' وہ کمینے پن سے مسکرا کر بولا۔

''تم دونوں کی لڑائی نے پہلے ہی ہمیں خطرات سے دوچار کر رکھا ہے۔ فار گاڈ سیک، اب چھوڑو یہ سب اور طیارے کو بچانے کی سوچو۔ہم سب کی جانیں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔'' کیپٹن نے چیخ کر کہا۔

میں نے کوہارا کو کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ ہمارے جاتے وقت اس نے اپنے ساتھی کو ہدایت کی تھی کہ عملے کے کسی فرد کو فرسٹ ایڈ کے لیے اندر بھیج دے۔

کمبلر بھی کوہارا کے اشارے پر مسافر کمپارٹمنٹ میں آ گیا اور گن تانے وہیں کھڑا رہا۔ تاہم اس نے کوہارا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے عملے کے ایک فرد کو فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ کاک پٹ میں جانے کا حکم دیا۔

ادھر مسافروں کے چہرے خوف سے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ یہاں ہواؤں کا دباؤ میں نے محسوس کیا جو طیارے کی اوپری منزل سے آرہی تھی اور وہاں کے مسافر نیچے آگئے تھے۔یہاں کافی رش لگ گیا تھا۔

عملے کے چند ارکین کے ساتھ میں اوپری منزل میں آیا تو دیکھا طیارے کی چھت ایک لمبی سی لکیر کی طرح تھوڑا پچکی ہوئی تھی۔ یقیناً اوپر سے گزرنے والے طیارے کی کوئی رگڑ لگی تھی۔ اس موٹی اور چوڑی لکیر میں ایک جانب باریک سا سوراخ ہو گیا تھا۔ مجھے صورتِ حال اتنی نازک نہیں لگی البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ زیادہ دیر تک یہ لکیر باریک نہیں رہے گی۔ہوا کے مسلسل دباؤ کے باعث یہ ایک بڑے شگاف کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔

میں نیچے کاک پٹ میں آگیا۔ کوہارا، یاسمین کے قریب کھڑا اس سے بے ہودہ گوئی میں مصروف تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی۔

میں نے جلتی نظروں سے کوہارا کو گھورا۔ وہ تاؤ دلانے والے انداز میں مسکرایا۔ خطرے میں ہونے کے باوجود بدبخت مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس طرح کے دشمن میرے لیے ہمیشہ سے ہی بڑے سخت کوش ثابت ہوئے تھے جو خطرات میں بھی مسکراتے ہوں۔

میں نے کیپٹن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں چلے گا، ہمیں کسی نہ کسی ائرپورٹ پر لینڈ کرنا پڑے گا۔

''بڈھے! موبارغہ کا صحرا اب یہاں سے کتنی دور رہ گیا ہے؟''

''ہم راستہ بھٹک چکے ہیں۔ کمپاس کام نہیں کر رہا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کسی بھی قریبی ملک کے ائرپورٹ سے رابطہ ہوتے ہی ہمیں وہاں لینڈ کر جانا چاہیے۔''

کوہارا کو کیپٹن کی بات پر پھر طیش آگیا۔ اس نے غضب ناک انداز میں حلق سے غراہٹ بلند کرتے ہوئے دوبارہ اس کی کھوپڑی پر اپنی گن کا آہنی کندہ رسید کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر رک گیا۔ وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''بڈھے! زیادہ چالاکی مت دکھاؤ۔ اس طیارے کو موبارغہ کے مقام پر ہی اتارنا ہوگا، ورنہ پھر سب اپنی موت کا انتظار کرو۔''

حقیقت یہ تھی کہ وہ کیپٹن کوہارا کی کوئی بات تسلیم نہیں کر رہا تھا مگر بعد میں کوہارا ہی کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ اسی باعث کوہارا اب اس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں کھڑوسوں کے درمیان پھر کوئی بحث چھڑتی، میں نے کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیپٹن! تم اس شخص کو نہیں جانتے۔'' میرا اشارہ کوہارا کی طرف تھا۔ ''یہ تمہاری کوئی بات تسلیم نہیں کرے گا اور میں اس کی فطرت جانتا ہوں۔ یہ اپنے ساتھ کئی بے گناہوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہے، اس کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ ہم پہلے ہی لڑائی اور بحث میں اپنا وقت برباد کر کے خطرات بڑھا رہے ہیں۔ تم بھی اب اپنی ہٹ دھرمی سے باز آجاؤ اور طیارے کو موبارغہ میں ایمرجنسی لینڈنگ کے لیے تیار کرو۔ یہی ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔''

میری بات پر کیپٹن کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ مجھے لگا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ایک فضول سی کوشش میں لگا ہوا تھا اور ہمیں بلف کرنے کی سعی میں مصروفِ کار بھی۔ یوں بھی وہ اب تک کوہارا کے خطرناک عزائم اور اس کی ذہنیت کا اندازہ لگا ہی چکا تھا۔ وہ ہولے سے بولا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔

''ہاہا...... ہاہا...... گڈ...... شہزی! تم میرے سب سے زیادہ ذہین اور عقل مند دشمن ہو۔'' کوہارا نے اپنی کامیابی پر ایک بدمست قہقہہ لگایا۔ فتح کی خوشی سے اس کا سرخ ہوتا چہرہ مزید مکروہ ہو جاتا تھا۔

''کاش! تم زندہ رہو اور میرے مقابلے میں آتے رہو۔ میرے عظیم دشمن۔ بدھا سے میری یہی دعا ہے۔''

میں نے اس کی فضول گوئی کا کوئی جواب نہیں دیا اور کیپٹن کی طرف تکتا رہا۔

میرے سمجھانے پر وہ اپنے ''کام'' میں منہمک ہو چکا تھا۔

کافی دیر تک وہ پینل سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اسی لمحے یوں محسوس ہوا جیسے طیارہ اپنی سمت بدل رہا ہو۔ اس کا بیلنس اگرچہ ابھی تک آؤٹ تھا مگر کیپٹن اسے سنبھالے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ ہم موبارغہ پہنچنے والے ہیں۔

کوہارا نے خوشی اور فتح کے جوش تلے ایک نعرہ بلند کیا۔ یاسمین میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ طیارہ اپنی پرواز ''شتم پشتم'' جاری رکھے ہوئے تھا۔

☆☆☆

طیارے کی جہازی سائز ونڈ اسکرین کے پار شفق رنگ بادل چمکے تھے۔ آسمان دھوپ کی شدت سے چمک رہا تھا۔ طیارہ اپنا رخ بدل رہا تھا۔ شکر تھا کہ کیپٹن کو میری بات سمجھ آگئی تھی اور وہ اب اپنی ہٹ دھرمی سے باز آگیا تھا۔

شاید اب تک کی خوں ریزی اور موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچنے کے سبب وہ بھی کسی چالاکی کے بغیر کوہارا کے احکامات ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''طیارہ بدستور اپنی بلندی گھٹا رہا ہے۔'' خاصی دیر کی خاموشی کے بعد کاک پٹ کی دھڑکتی فضا میں کیپٹن کی آواز ابھری۔

''لگتا ہے تھوڑی دیر بعد تھروٹل کام کرنا چھوڑ دے گا۔'' میرا چہرہ فق ہو گیا۔ طیارہ مسلسل ایمرجنسی کی حالت میں تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

''کیپٹن! تم خود ہی کوئی فیصلہ کر کے جہاز کو کسی کھلے میدان میں کریش لینڈنگ کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہو؟'' میں نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

''میری دسترس میں ایسا کوئی میدان یا مقام نہیں ہے جہاں میں اس طرح کی کوشش کر سکوں۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر فکر و تشویش کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

''ہم اس وقت کس مقام پر ہیں؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ کوہارا خاموش تھا۔ تاہم ہماری گفتگو کو غور سے سن رہا تھا۔

''بحرۂ احمر کے قریب قریب ہیں۔'' کیپٹن نے جواب دیا تو کوہارا نے فوراً کہا۔

''ہم اپنی منزل کے قریب ہیں۔ اسے پار کر کے جنوب مغرب کی سمت اسّی ڈگری کا زاویہ بناؤ اور طیارے کو ایمرجنسی لینڈنگ کی پوزیشن میں لے آؤ۔''

کوہارا کو ایسی ٹیکنیکل اصطلاح میں فضائی روٹ کا اظہار کرتے دیکھ کر سوائے میرے کسی کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیپٹن نے کوئی تاثر نہیں لیا تھا۔ میری سمجھ میں یہی آسکا کہ کوہارا کا یہ پلان پہلے سے ہی مربوط تھا۔ لہٰذا بحرۂ احمر کا سن کر اسے یہ اصطلاح پہلے سے ازبر تھی یا کرائی گئی تھی۔ یقینی طور پر اسے بریف کیا گیا تھا پہلے سے......

''میں کوشش کرتا ہوں، خدا کرے کہ طیارہ بحرۂ احمر سے بہ خیریت گزر جائے۔''

''بحیرۂ احمر کوئی اتنا بڑا سمندر نہیں ہے بڈھے بگلے!......'' کوہارا یک بار پھر طیش میں آگیا۔ ''اس کا پاٹ زیادہ بڑا نہیں۔''

کیپٹن نے اسے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ تاہم اس نے فوراً اٹھ کر مسافروں تک یہ اعلان پہنچا دیا کہ وہ سیٹ بیلٹ سمیت پھولی ہوئی حفاظتی جیکٹیں جسموں سے باندھ لیں وغیرہ۔

یہ ہدایات دینے کے بعد اس نے ہم سے بھی یہی کہا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ یہاں بیٹھنے کے لیے صرف ایک ہی سیٹ بچی تھی۔ دوسری اکھڑ چکی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں مسافروں کے کمپارٹمنٹ میں جا کر سیٹیں سنبھالنا ہوں گی۔''

''میں اپنے پاپا کے سوئٹ میں جانا چاہوں گی۔ وہ حفاظتی اقدامات کرنے سے معذور ہیں۔'' یاسمین نے اچانک گھبرے تفکر سے کہا۔

''کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔'' کوہارا نے اس کی طرف گھور کر کہا۔ ''میں عملے کے کسی آدمی کو ہدایت کر دیتا ہوں، اس بڈھے کھڑوس کی فکر نہ کرو، وہ میرے لیے بھی اہم ہے۔''

PakiBooks.Site

یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کو یہ حکم دینے کا کہا اور اسے سوئٹ نمبر وغیرہ بتا دیا۔

کیپٹن تلخی سے بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ عملہ حرکت میں آچکا ہوگا۔ وہ.....''

''شٹ اپ!'' کوہارا نے اسے جھڑک دیا۔ ''وہ آدمی میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس وقت سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔'' ناچار کیپٹن نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر کوہارا نے اس سے مائیک لے لیا اور خود بھی اپنے ساتھی کمبلر کو حکم دیا کہ وہ یہ کام اپنی نظروں کے سامنے کروائے اور خود بھی وہیں جا کر بیٹھ جائے۔

اس کے بعد وہ کیپٹن سے درشت لہجے میں بولا۔

''کتنی دیر میں کریش لینڈنگ متوقع ہے؟''

''اگلا نصف گھنٹا اہم ہے۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے کیپٹن! مگر یاد رکھنا کسی بھی قسم کی چالاکی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔''

''میرے ساتھ کسی ایک کو یہاں رہنا ہوگا۔'' کیپٹن نے اچانک کہا۔ ''میں اکیلا طیارہ اس طرح لینڈ نہیں کر سکتا۔ اسے سنبھالنے کے لیے مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہوگی۔''

''لیکن ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں کیپٹن؟'' میں نے تفکر سے کہا۔ ''ہم میں سے کسی کو بھی اس کا تجربہ نہیں ہے۔''

''تجربے کا مطلب تجربے سے ہی نکلتا ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''فقط میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا اور بس۔''

''ٹھیک ہے پھر میں رک جاتا ہوں مگر سیٹ؟'' میں نے کہا۔

''یہاں بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ تھروٹل کے اس دوسرے حصے کو مضبوطی سے پکڑ لو۔''

میں اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ مجھے یاسمین کی فکر ہو رہی تھی۔ کوہارا میری بے چینی بھانپ کر معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''اس شہزادی کی فکر نہ کرو، میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر بٹھاؤں گا اور تم یہاں پورے اطمینان سے کیپٹن کی ہدایات پر عمل کرو۔ لیکن یاد رکھنا شہزی! اگر تم نے اس بڈھے بگلے کے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش چاہی تو.....'' اس نے تہدیدانہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور یاسمین کو بازو سے پکڑ کر کاک پٹ سے باہر نکل گیا۔

ادھر میں غصے اور بے بسی کے مارے دانت پیستا رہ گیا۔ تاہم کیپٹن کی ہدایت پر میں اس کے ساتھ والی ایک نسبتاً چھوٹی اضافی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ سیٹ بیلٹ منسلک تھی وہ میں نے اپنے گرد باندھ لی۔

''میں پہلے تمہیں اس کا ساتھی سمجھا تھا، مگر اب یقین ہو چکا ہے کہ تم اس کے ساتھی نہیں ہو۔'' کیپٹن بولا۔

''شکر ہے تمہیں یقین تو آیا۔'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''تم نے اس موذی پر قابو پانے کے لیے اپنی جان تک لڑا دی۔'' کیپٹن متاثر کن لہجے میں بولا تو میں نے اس کی توجہ ڈولتے طیارے کی طرف مبذول کروائی۔

''یہ بہت مشکل مرحلہ ہے اور میرے لیے کڑا امتحان بھی لیکن میں آج ایسے تجربے سے دوسری بار گزر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''جہاز کا پرائمری کنٹرول اب تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ لہٰذا جیسے میں کہتا جاؤں وہی کرتے جانا۔ طیارہ اب مزید بلندی اختیار کرنے سے انکاری ہو چکا ہے۔''

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ سامنے نظریں جما دیں۔ میری نظروں کے سامنے اب فضا بسیط کا پُرہیبت منظر تھا۔ کاک پٹ میں یوں ایک منجھے ہوئے پائلٹ کے ساتھ ''کو پائلٹ'' کے فرائض انجام دینا میرے جیسے ''کورے'' آدمی کے لیے نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا مگر بقول کیپٹن، کے تجربے سے تجربے کا ہی مطلب نکلتا ہے۔ تاہم میں اتنا کوئی خاص ''ٹیکنیکل'' کام نہیں تھا۔ بس اس کی ہدایت کے مطابق تھروٹل کو کنٹرول کرنا اور بعد کی ہدایات کے مطابق اسے مخصوص زاویوں سے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کرنا تھا۔ ساتھ ہی ایک بٹن کے بارے میں کیپٹن نے مجھے بتا رکھا تھا کہ جیسے ہی وہ مجھے بولے، میں وہ بٹن دبا دوں۔

طیارہ اب واضح طور پر اپنی بلندیاں گھٹا رہا تھا۔ پچیس ہزار..... بیس ہزار..... پندرہ..... دس..... پانچ.....

جہاز کی بڑی سی ونڈ اسکرین کے پار میری نظریں اس زمین کو چھونے لگی تھیں اور تب ہی میں نے نیچے سرخی مائل دیکھی۔

''یہ کیا ہے کیپٹن؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ریڈ سی (بحرِ احمر) ہے۔ خدا کرے اس پر سے بہ خیریت گزر جائیں۔''

''یہ سرخی مائل.....'' میرے منہ سے حیرت زدہ انداز میں برآمد ہوا۔

''یہ اپنے ساحل میں اُگے ہوئے سرخ مونگا نباتات کی وجہ سے سرخ نظر آتا ہے، ورنہ اس کا پانی سر

لوں ہے۔'' کیپٹن نے بتایا۔

جہاز نیچے ہوتا جا رہا تھا۔

''تھروٹل آہستہ آہستہ اوپر کرو اور بلندی بتانے والے ڈائل پر نگاہ کر رکھ کر بتاؤ۔'' کیپٹن نے کہا۔ وہ بھی اپنے کام میں مصروف تھا۔

میں نے تھروٹل کو اس کی ہدایت کے مطابق ذرا اوپر کیا اور بلندی بتانے والے آلے کی طرف دیکھا۔

''طیارہ چند فٹ بلند ہو کے دوبارہ پہلے سے زیادہ نیچے جا رہا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، اب تم اپنے بائیں ہاتھ والی یوک اسٹک کو پلز کے بائیں جانب گھماؤ، وہاں ڈگری بتانے والے ڈائل پر نگاہ رکھو، جیسے ہی چالیس کی ڈگری پر سوئی لرزے اسٹک وہیں تک گھمائے رکھو اور جیسے ہی جہاز زمین کی سطح کو چھوئے پرائمری کنٹرول سسٹم کے آٹو پائلٹ کا بٹن دبا دینا۔'' میں نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''اور ہاں، جھٹکوں کی صورت میں تمہیں یہ کام فوری طور پر کرنا ہوگا۔''

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ خود کلامیہ بڑبڑایا۔

''خدا کرے ریڈ سی کو ہم خیریت سے عبور کر جائیں۔''

جہاز نے رخ بدلنا شروع کر دیا تھا۔

ساتھ ہی میری نظریں بھی سامنے نیچے زمین کی سطح کو لمحہ بہ لمحہ اوپر اٹھتے دیکھ رہی تھیں۔

بحرِ احمر کا چوڑا پاٹ قریب آتا جا رہا تھا۔ میرا دل یکایک سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ جوں جوں جہاز نیچے جا رہا تھا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آہنی دیوزاد پرندہ ہمارے قابو سے باہر ہونے لگا ہو۔ ایک پل کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے طیارہ بحرِ احمر کے پانیوں میں ڈوب کر تباہ ہو جائے گا۔

''کک..... کیپٹن! طیارہ نیچے کی طرف چلا جا رہا ہے۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تم اسٹک کو اس طرف گھما کر تھروٹل پورا اٹھا دو۔'' کیپٹن نے ہدایات دی۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ طیارہ پھر بھی مجھے قابو سے باہر لگا، وہ بدمست ہاتھی کی طرح بس نیچے ہی بیٹھے جا رہا تھا۔ پانی کی سطح قریب آتی جا رہی تھی۔ ایسے میں اپنے حواسوں پر قابو پانا میرے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ ایک پل کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی ساری کوششیں ترک کر کے بے حس و حرکت ہو کے بیٹھا رہوں گا اور صرف اپنی موت کا انتظار کروں گا۔

''آٹو پائلٹ کا بٹن دباؤ جلدی۔'' کیپٹن چیخا۔ میں نے بٹن دبا دیا۔ تب ہی میں نے جہاز کو تھوڑا عمودی اٹھتے محسوس کیا۔ کیپٹن بھی اپنی ہی ماہرانہ تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

طیارے کے اگلے حصے کو میں نے، جو پہلے نیچے کی طرف تھا، تھوڑا اوپر کو اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ جیسے بحرِ احمر کی سطح کو چھوتے ہوئے اوپر اٹھا تھا۔ یہاں مجھے بس پاس کچھ چھوٹے بڑے بحری جہاز دکھائی دیے تھے، مجھے یقین تھا۔ اگر اس سے کوئی جہاز سامنے آجاتا تو ہمارا طیارہ بہ آسانی اس کے مستولوں سے ٹکرا جاتا۔

''پرائمری سسٹم کے آٹو پائلٹ کا بٹن دبا دو۔ سسٹم رسپانس دے رہا ہے۔'' کیپٹن کی چیختی آواز میری شل ہوتی سماعتوں سے ٹکرائی جبکہ خود میرے ہاتھ تھروٹل اور ٹوائے ٹائپ کی سائڈ اسٹک پر کانپ رہے تھے، تاہم میں نے اپنے مخل پڑتے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے وہی کیا۔

طیارہ اوپر اٹھ رہا تھا، میری نظریں پینل کے جلتے بجھتے ننھے منّے بلبوں سے پھسلتی ہوئی بلندی بتانے والے ڈائل پر پڑیں۔ طیارہ صرف ایک ہزار کی بلندی سے بتدریج اوپر اٹھ رہا تھا۔

''ڈیڑھ ہزار..... دو ہزار..... ڈھائی ہزار.....''

''ہوشیار.....! جہاز کسی وقت بھی نیچے جا سکتا ہے۔'' کیپٹن چلّایا۔ میرے اعصاب شل ہونے لگے۔ اب مجھے نیچے چھوٹے بڑے مکانات کے خاکے نظر آ رہے تھے۔

نصف سے بھی کم گھنٹے تک یہی صورتِ حال رہی۔ پھر کچھ وقت اسی طرح ''اوپر نیچے'' ہوتے بیت گیا۔ میں نے دیکھا بلندی پھر گھٹنے لگی تھی۔

''کیپٹن بلندی گھٹ رہی ہے۔''

''اتنی ہی رہنے دو، میں طیارے کو لینڈنگ گیئر میں ڈال چکا ہوں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔ مطلوبہ میدان سامنے ہے۔'' وہ بولا۔

میں نے دیکھا۔ دھوپ کی روشنی میں نیچے ریت کا سمندر نظر آیا۔ اس کے ذرات چمک رہے تھے۔ یہ سراب اگرچہ ریت کا میدان تھا، مگر دکھتا ایسے ہی تھا جیسے سمندر ہلکورے لے رہا ہو، ریت کی سطح پر گرم ہوائیں لہریں پیدا کر رہی ہوں۔

''سائڈ اسٹک سے ہاتھ ہٹا لو اور تھروٹل چھوڑتے جاؤ، جلدی۔ آگے نکل گئے تو آبادی میں جا گھسیں گے۔'' تھوڑی دیر بعد کیپٹن نے چیخ کر کہا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اس وقت طیارے میں بیٹھے

Pak Books Site

سارے مسافر خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔ انہیں خدا یاد آرہا ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں آنکھیں بند کیے دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔

کیپٹن کا ایک ہاتھ کسی اسٹک کو دبوچے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ انتہائی تیزی کے ساتھ مختلف بٹنوں پر متحرک تھا۔

دفعتاً طیارے کو جھٹکا لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی سیٹ سے اُڑ کر کاک پٹ کی چھت یا کسی دیوار سے جاٹکراؤں گا۔ طیارہ اٹھا اور پھر جھکا، میری پھیلی ہوئی آنکھوں کے سامنے حدِ نگاہ ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔

''مضبوطی سے بیٹھو، فیصلہ کن گھڑیاں...... سر پر ہیں۔''

کیپٹن چیخا۔ میرے حواس ابھی چھوٹتے محسوس ہوتے تو کبھی یوں لگتا جیسے بالکل ہی مختل ہوگئے ہوں۔

طیارے کو دوسرا جھٹکا لگا اور پھر تیسرا۔ اب وہ ریت پر پھسلا جارہا تھا۔ طوفانی جھٹکے مجھے اور کیپٹن کو یوں بُری طرح ہلا رہے تھے، جیسے ابھی ہم دونوں اپنی سیٹوں سے اچھل کر ونڈ اسکرین سے جاٹکرائیں گے۔

اب ہمیں اُڑتے ہوئے ریت کے طوفان کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ طیارہ گھومے جارہا تھا اور پھر سیدھا ہو جاتا۔ وہ ریت کے سمندر پر رگڑتا، اور پھسلتا جارہا تھا اور میں کانپتے ہوئے دل سے اس بدمست دیو کے بہ خیریت رک جانے کی دعائیں مانگتا رہا۔

''کیپٹن! جہاز پھسلا جارہا ہے۔'' میں چیخا۔

کیپٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا اب معاملہ تقدیر پر چھوڑا جاچکا تھا۔ طیارہ زمین سے لگ چکا تھا اور اب شاید ہمارا ''کام'' ختم تھا۔ ماسوائے خود کو طوفانی جھٹکوں سے بچانے کے اور یہی ہم کررہے تھے۔

معاً ایک اور زبردست جھٹکا لگا، میری بیلٹ ٹوٹ گئی، میں کرسی سے اچھلا اور ونڈ اسکرین سے میرا سر ٹکرایا، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

مجھے نہیں پتا کہ میں کب تک بے ہوش پڑا رہا تھا اور کس حال میں رہا تھا، کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہولے ہولے اوپر نیچے ہو رہا تھا، یوں جیسے کسی تختے پر پڑا جھول رہا ہوں۔ ایسی ہی نیم بے ہوشی کی سی حالت میں کسمسایا تو نیچے آرہا اور دھپ کی آواز سے ریت پر گرا۔ ایک لمحے کو تو میرا دل ہی ہول گیا تھا کہ نجانے کہاں گرنے لگا ہوں۔ شاید اسی باعث میرے حواس، ایک دم تنے ہوئے اعصاب کی وجہ سے جلد ہی بحال ہوگئے۔ دماغ البتہ کچھ لمحے سناٹے کی سی کیفیات میں رہا۔

اس کے بعد سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ کوہارا کی کینہ پروری اور اس کے کرتوت...... طیارے کی تباہی اور پھر کریش لینڈنگ۔ میری سماعتیں بیدار ہوئیں تو جیسے ہر سُو آہ و فغاں سی سنائی دیتی محسوس ہوئیں۔ دھواں، کہیں شعلے...... اور رونا چیخنا تھا۔ آہیں تھیں، سسکیاں اور ہلکی سی شائیں شائیں کرتی نامانوس سی آوازیں۔

حواس بحال ہوتے ہی عقل و خرد سے یارانہ ہوا تو محسوسات جاگے۔ سب سے پہلے بادِ سموم کے تھپیڑوں سے زخمی اور خراش زدہ چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہونے لگا۔ خراش زدہ بدن میں درد جاگا اور سب سے زیادہ درد مجھے اپنی گردن کی داہنی جانب، اسی طرف سر کے ایک حصے میں اور پھر بائیں ٹانگ میں ہوا۔ اس قدر کہ میں ذرا ہلا تو بے اختیار کراہ کررہ گیا۔

ریت گرم تھی۔ حدِ نگاہ ریگزار گویا اس وقت جہنم زار کا منظر پیش کررہا تھا۔ بڑا ہولناک منظر دیکھنے میں اس وقت آیا جب میں نے لیٹے لیٹے پہلو کے بل پر ایک ذرا ارد گرد نگاہیں دوڑائیں۔

طیارے کا ملبا، اس کے ٹکڑے اور جانے کیا کیا الا بلا۔ آڑے ترچھے پڑے لوگ، ایسا لگا جیسے طیارے نے کریش لینڈنگ نہیں کی ہو بلکہ فضا میں ہی تباہ ہوکے بکھر گیا تھا اور اس کے ٹکڑے زمین پر پھیل گئے تھے۔ اگرچہ میں نے...... بلکہ میں نے کیا اس کیپٹن نے اپنی سی پیشہ ورانہ مہارت کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے طیارے کو تباہی سے بچانے کی کوشش چاہی ہوگی کہ کم سے کم تباہی کا سامنا ہو اور جانیں بھی بچ جائیں۔

میں نے بہ مشکل تمام خود کو سیدھا کیا اور ریت پر بیٹھا رہ گیا۔ میں دراصل کسی زیادہ بلندی سے نیچے نہیں گرا تھا بلکہ وہ طیارے کا اگلا حصہ تھا جو ٹوٹا ہوا تھا اور ٹوٹ کر خاصا نیچے کی طرف جھک آیا تھا، میں اسی کے آخری سرے پر اٹکا رہ گیا تھا اور نیچے آرہا تھا۔

میری آنکھیں جب پوری طرح دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے چہار سُو حدِ نگاہ تک ریت اور اس پر بنے چھوٹے بڑے ٹیلے دکھائی دیے۔ گویا یہاں سے وہاں تک ایک تپتا سلگتا ریگ زار پھیلا ہوا تھا۔

میں نے ملبے کی سمت دیکھا۔ جہاز کا اگلا حصہ ٹوٹ کر الگ ہوگیا تھا اور کسی قدر ریت میں دھنس چکا تھا۔

البتہ درمیان کا حصہ جو نسبتاً بڑا تھا، اس سے ذرا پرے

جا گھسا تھا اور اس کے ٹوٹے ہوئے حصے سے سیٹیں اور ان پر آڑے ترچھے لوگ کراہتے پڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ اوپر سے نیچے گرم ریت پر گرے ہوئے تھے۔ دم والا حصہ درمیانی حصے سے ٹوٹا ہوا تو نظر آتا تھا مگر الگ نہیں ہوا تھا۔ وہاں بھی یہی حالت تھی۔

''شش..... شہزی.....''

اچانک میری سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ میں چونکا۔ یہ یاسمین کی کراہتی ہوئی آواز تھی۔

میں نے فوراً آواز کی سمت گردن گھمائی، میرے اردگرد عجیب سماں تھا، میں نے ایک بار پھر سر کو دو تین بار ہلکے سے جھٹکے دیے، درد بڑھا اور میں کراہا۔

پھر دوبارہ آواز کی سمت دیکھا، اس طرف جہاز کا درمیانی حصہ قدرے ریت میں گڑا پڑا تھا۔

ایک طرف مجھے کیپٹن بھی بے سدھ ریت پر پڑا نظر آیا، کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کافی سے زیادہ تو چلتے پھرتے بھی نظر آرہے تھے، میری متلاشی نظریں تو کوہارا کو بھی تلاشتی پھر رہی تھیں۔

جس طرف سے یاسمین کی آواز آئی تھی، وہاں معمولی سا شور بھی ہو رہا تھا، رونے اور سسکیوں کی آوازیں، کچھ غصیلی آوازیں بھی آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو زدوکوب کیا جارہا ہو۔ میں چونک سا گیا۔

اس کے بعد میں ہمت کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، گرم ہواؤں کے تھپیڑے اور تیز دھوپ کی تمازت، ریت کے ذروں سے انعکاس ہو کے انی کی طرح جسم اور آنکھوں میں چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔

اچانک میں نے ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا، چند مسافروں نے کوہارا کے ساتھی گمبلر کو دبوچ رکھا تھا اور اسے بری طرح پیٹ رہے تھے، اگرچہ خود ان کی اپنی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی، مگر غیظ جنوں اور نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ اسے کچا چبا ڈالنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے، معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے یہی ہولناک منظر میرے لیے کافی تھا۔ وہ اپنا غصہ نکال رہے تھے۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میں بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو مسافروں کا یہ جوان ٹولا میرے ساتھ بھی یہی حشر کرتا، اگرچہ میں پہلے ہی طیارے میں اپنے بارے میں گلوخلاصی کے طور پر کئی تاویلیں اور اپنی کوہارا اینڈ کمپنی سے لاتعلقی کے اظہار کے سلسلے میں مختصر ''تقریر'' کر چکا تھا۔

گمبلر چونکہ کوہارا کا ساتھی تھا اسی لیے میں نے اسے بچانے کی مطلق ضرورت نہیں سمجھی تھی، البتہ مجھے یاسمین کی چیخ نے ضرور بے چین کر دیا تھا، میری متلاشی نظریں ریت کے غبار آلود بگولوں اور دھوئیں کے بادلوں میں اسے ہی پا لینے کی کوشش میں تھیں۔

مشتعل ٹولے نے گمبلر کو..... نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا تھا، جو شے بھی ان کے ہاتھ لگتی تھی، اس کی ہر ضرب وہ بلا اس تمیز کہ وہ کہاں اس کے پڑ رہی تھی، وہ اسے ٹھوکے جارہے تھے، ایک کچھ زیادہ ہی دل جلے مشتعل اور ادھار کھائے مسافر نے تو کوئی سخت سی سلاخ جیسی شے گمبلر کی ایک آنکھ میں گھونپ دی، میں نے گمبلر کے حلق سے شدید اذیت تلے ..... دل دہلا دینے والی چیخ پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مگر اس مغلوب الغضب مسافر کا ابھی طیش کہاں کم ہونے والا تھا، اس نے اسی طرح اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دی۔

گمبلر کی ہیئت کذائی اب تو کافی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں پھوٹ چکی تھی۔ بلکہ ڈیلیں پھٹ چکے تھے، ان سے بھل بھل خون بہے رہا تھا۔ ناک اور منہ تو پچکا دیا گیا تھا، اب اس کا پیٹ پھاڑا جارہا تھا۔ اسے اذیتیں دے کر ہلاک کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔ ورنہ ان کے پاس گمبلر سے چھینی ہوئی گن بھی تھی مگر وہ اسے ویسی ہی اذیتیں دینا چاہتے تھے جیسا کہ اس نے انہیں دے رکھی تھیں۔ تب ہی ایک مشتعل مسافر نے اسی کی گن اٹھا کر اس پر تان لی اور ٹریگر دباتا چلا گیا اور اس وقت تک دباتا چلا گیا جب تک کہ گمبلر کا مضروب وجود خون میں پوری طرح تر نہیں ہو گیا۔ عقدہ کھلا کہ اس مسافر کے ایک قریبی عزیز کو گمبلر نے طیارے میں گولی مار کے بڑی بیدردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ جب اس کی گن سے خالی ''ٹرچ..... ٹرچ'' کی مخصوص آواز آنا شروع ہوئی تو اس کا غصہ کم ہوا۔ اس نے گن ایک طرف پھینک دی۔ مجھے اس کے جوش غضب ناکی اور بے وقوفی پر غصہ آیا۔ یہ گن کام میں لائی جاسکتی تھی، کیونکہ کوہارا کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کب اور کہاں سے کسی خوابیدہ درندے کی طرح بیدار ہو کر سامنے آجاتا۔

تب ہی یاسمین کی کہیں قریب سے دوبارہ چیخ سنائی دی۔ میں چونکا۔ سمت کا اندازہ لگانے میں مجھے کچھ دیر لگی تھی مگر میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

جہاز کے ایک بڑے سے آڑے ترچھے ہوئے حصے کے پیچھے مجھے چار پانچ افراد برآمد ہوتے دکھائی دیے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ بھی ایسے ہی ''دل جلے'' مسافروں کا مشتعل ٹولا تھا۔ وہ یاسمین کو بیدردی سے گھسیٹ کر

اس طرف لا رہے تھے جہاں ان کے اور بھی انہی جیسے ساتھی گمبلر کا حشر نشر کیے ہوئے تھے۔

یاسمین کی حالت بڑی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ وہ پہلے ہی نڈھال سی تھی۔ اس کے کپڑے بھی کافی حد تک تار تار نظر آتے تھے۔

یاسمین کو ان درندوں کے نرغے میں دیکھ کر میرا اندر چیخ اٹھا۔ کون لگتی تھی یاسمین میری.....؟ بس ایک ذرا چند دنوں کا تو ساتھ رہا تھا میرا اور اس کا۔

دیکھا جاتا تو وہ بھی اس روز منقطع ہو گیا تھا جب میں اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر اسے الوداع کہہ آیا تھا اور کیلی فورنیا کا ٹکٹ کٹا کر امریکا روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن تقدیر کو پتا نہیں اور کیا منظور و مقصود تھا کہ میرا اور یاسمین کا سامنا دوبارہ ہوا۔ اس کے بعد یہ دوسری غیر متوقع ملاقات..... کے بعد کچھ دور رہتی گھڑیوں نے ایک بار پھر ہمیں یکجا کیا تو کچھ لامحالہ طور پر ہی سہی، میں یاسمین کے لیے اپنے اندر کچھ ایسے جذبات محسوس کرنے لگا تھا جسے شاید عام فہم میں مانوس اجنبیت کا نام دیا جاتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب طیارے میں رذیل کوہارا نے اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش چاہی اور میں درانہ وار اس سے جا بھڑا تھا۔

لہٰذا میں اب یاسمین کا بھی گمبلر جیسا حشر ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پل کے پل ایک جوش کی لہر سی میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی اور میں اپنے درد و زخم بھلا کر یاسمین کو ان وحشی ٹولے سے بچانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر یہاں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا ضروری تھا۔

میں ایک طرف کو رینگ گیا۔

''ہاہا..... ہاہا..... لے آؤ اس کو بھی، لیکن پہلے اسے اس کے ساتھی کا حشر کھلی آنکھوں سے دکھا دو، تاکہ یہ اس تصور سے ہی کانپ اٹھے کہ اب اس کا بھی برا حشر کیا جانے والا ہے۔''

''نہیں، اسے مارنا نہیں ہوگا، پہلے ہم سب اس کے ساتھ وحشی جانوروں جیسا سلوک کریں گے جس طرح اس کے ساتھیوں نے ہمارے ساتھ کر رکھا تھا۔''

''ہاں! ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

''لیکن ان کے باقی دو ساتھی کدھر ہیں؟ وہ سرغنہ اور اس کا نائب لمبا چوڑا جسے شہزی پکار اجارہا تھا؟''

یاسمین کو دبوچے ہوئے مشتعل ٹولے کی یہ ساری آوازیں میری سماعتوں میں پڑ رہی تھیں۔ یہ کوئی ماہر تو کیا عام سے لڑاکا بدمعاش بھی نہیں تھے۔ میں ان پر قابو پا سکتا تھا۔ مگر تعداد میں زیادہ اور اس وقت جوشِ غیظ و جنوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں جہاز کے ہی ایک بڑے ملبے کی آڑ لیتا ہوا دوسری جانب سے گھوم کر اس طرف کو چھپتے چھپاتے بڑھنے لگا جہاں یاسمین کو اس مشتعل ٹولے نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ میری راہ میں اور بھی کئی مسافر آئے تھے جو ادھر ادھر گرے پڑے آہیں بھر رہے تھے۔ ایک نے مدد کے لیے میری ٹانگ بھی کھینچنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ چھڑا کر آگے سرک گیا تھا۔ یہاں اب کون کس کی مدد کر سکتا تھا؟ جب تک کہ کہیں اور سے مدد نہ آتی۔ مگر جس کو مدد کی زیادہ ضرورت تھی، اس کی جان اور عزت دونوں خطرے میں تھیں، کوہارا بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

میں محتاط روی سے چلتا ہوا ان کے سر پر جا پہنچا اور انہیں للکار دیا۔

''اے..... اے..... یہ کیا کر رہے ہو تم.....؟ چھوڑ دو اس لڑکی کو۔''

یہ کہتے ہی میں فوراً مشتعل مسافروں کے اس ٹولے کی جانب لپکا جنہوں نے یاسمین کو زدوکوب کر رکھا تھا۔ وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی حالت بھی ابتر ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہروں کی وحشت اور غضب ناکی میں یکلخت اضافہ ہو گیا۔

''یہی ہے ان کا سرغنہ..... پکڑو اسے..... اسی کی وجہ سے ہم برباد ہوئے ہیں۔'' ایک مسافر نے مارے طیش کے چلا کر کہا۔ میں سمجھ گیا معاملہ کیا تھا۔ یہ چار پانچ بچے کھچے مسافر تھے۔ وہ میری جانب جارحانہ انداز میں لپکے۔

''خبردار.....! وہیں رک جاؤ۔'' میں نے بھی غضب ناک انداز میں چلا کر کہا۔ مگر اس مشتعل ٹولے نے جیسے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ انہوں نے یاسمین کو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسرے مشتعل ٹولے نے گمبلر کو بری طرح مار مار کر ادھ موا کر ڈالا تھا۔

مجھے اپنی فکر لاحق ہونے لگی۔ ایک خیال تیزی سے میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ..... کیا کوہارا کا بھی انہوں نے یہی حشر کیا تھا۔

وہ ٹولا مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے..... چند ایک کو گھونسے لاتیں رسید کر دیں وہ دور جا پڑے۔ کچھ نے میرے زخموں پر گرم ریت مٹھی میں بھر کر پھینک دی، میں درد و اذیت سے چلایا۔ وہ مجھے ابھی تک کوہارا کا ساتھی سمجھے ہوئے تھے۔

یاسمین چیخنے لگی۔ اس کی اپنی حالت بھی ابتر تھی مگر وہ بے چاری مجھے اس مشتعل ٹولے کی مار سے بچانے کے لیے گرتی پڑتی ان کی جانب لپکی تھی۔

PakiBookSite

"مت مارو اسے..... ہم بے قصور ہیں۔" کہتی ہوئی وہ ان سے جا بھڑی۔ دو مسافروں نے اسے دبوچ لیا اور اٹھا کر پرے پھینک دیا۔

اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ کئی لوگ اذیت سے چیخے اور پھر انہیں ریت پر گرتے دیکھا۔

معاً میری بھٹکی ہوئی نظروں نے ایک طرف گن لیے کھڑے کوہارا کو کھڑے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر بھی خراشیں نظر آرہی تھیں۔ میری داغی ہوئی گولی سے اس کی ٹانگ میں "لنگ" بھی محسوس ہوتا تھا۔ پھوٹی ہوئی ایک آنکھ کا فلیپ اتر کر کہیں گر چکا تھا۔ جہاں سے اب اس کی ایک آنکھ مچی ہوئی سی بڑی مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔

"خبردار.....! اب جو کسی نے حرکت کی..... ورنہ سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔" کوہارا حلق کے بل دہاڑا۔ باقی مسافر خوف زدہ ہو گئے اور ادھر اُدھر چھپنے لگے۔

"شہزی.....! یاسمین کو سنبھالو....." اس نے مجھ سے تحکمانہ کہا۔ میں فوراً یاسمین کی جانب لپکا، وہ ریت پر اوندھے منہ پڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ان دونوں مشتعل مسافروں نے اسے دور دھکا دیا تھا۔

"یاسمین.....! تت..... تم ٹھیک ہو ناں.....؟" میں اس پر جھکتے ہوئے بولا اور اسے سنبھالنے لگا۔ اس کے گھنے ریشمی بال جو کبھی گھٹاؤں کی سی بہار دکھاتے تھے، اب کسی سوکھے پیڑ کی جٹاؤں کے سے نظر آتے تھے۔ اس کی قدرتی کاجل لیے ہوئی آنکھیں جو مدھ بھری ہوتی تھیں اب وہاں اجاڑ ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے نازک سے نرم ہونٹ سوکھ کر پپڑیاں جمے ہو رہے تھے۔

"شہزی! تم جاؤ اور پروفیسر کو ڈھونڈ کر یہاں لے آؤ جلدی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" کوہارا نے چیخ کر مجھے حکم دیا۔

"کوہارا.....! اس وقت ہم سب مصیبت میں ہیں اور....." کوہارا نے ایک دہاڑ مار کے میری بات کاٹ دی اور بولا۔

"باقی سارے جائیں جہنم میں..... مجھے صرف اپنے اور اپنے مقصد سے غرض ہے۔ یوں بھی ہم ان کے درمیان رہے تو یہ ہمارے ساتھ کمبلر جیسا حشر کردیں گے، جاؤ۔"

ناچار مجھے اس بدذات کا حکم ماننا پڑا۔ میں ایک محتاط اندازے سے..... جہاز کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا اور اس کے کھلے حصے سے اندر داخل ہو گیا۔ بعض مسافر مجھ سے مدد کی فریاد کر رہے تھے، مجھے ان پر ترس آنے لگا، ان میں بچے بوڑھے اور عورتیں سبھی شامل تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ میں خود اس ہائی جیکر کوہارا کے نرغے میں ہوں، لیکن فکر مت کرو یہاں بہت جلد امدادی ٹیمیں پہنچ جائیں گی۔

یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ کریو اور جہاز کا عملہ بھی ابتر حالت میں تھا۔ جہاز کی باڈی اور چھت تہس نہس ہو چکی تھی۔ پتا نہیں وہ بوڑھا پروفیسر جمشید زندہ بھی تھا یا نہیں۔

تاہم میں اندرونی ٹوٹے پھوٹے حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں اس کا سوئٹ تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا ادھڑی ہوئی راہداری کے فرش پر جمشید حمیدی اوندھے منہ پڑا تھا، میں فوراً اس کی سمت بڑھا اور اسے سنبھالا۔ اسے بھی سر اور پیشانی میں چوٹیں آئی تھیں۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کی سانسیں بحال دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

اس کے بعد میں نے اس کے بے سدھ وجود کو اٹھایا اور پلٹا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے سامنے اسی مشتعل مسافروں کے ٹولے کے چار افراد کوریڈور میں راستہ روکے کھڑے تھے جن سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرا ٹاکرا ہو چکا تھا لیکن میں ان کے ساتھ کیپٹن کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"ہم معافی چاہتے ہیں لیکن تم ہی وہ واحد آدمی ہو جو ہمیں اس مصیبت سے نکالنے کی تدبیر کر سکتے ہو۔" ان چاروں میں سے ایک نے کہا۔ ان کے تیور مجھے اب کچھ بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"ہاں! مسٹر شہزی! یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم ہی اسے سبق سکھا سکتے ہو، ہم تمہاری مدد کو تیار ہیں۔" کیپٹن نے بھی اسی لہجے میں کہا تو میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"شکر ہے خدا کا کہ تم لوگوں کو عقل آ گئی۔ میں واقعی اب بھی اس موذی کو جہنم رسید کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو کہ اس خبیث نے..... میری ساتھی لڑکی کو نرغے میں لے رکھا ہے، پہلے بھی میں اس کو سبق سکھا چکا ہوں۔ بس! تم لوگ میرا ساتھ دو، میں اب بھی اسے قابو کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ بری طرح پھنس چکا ہے اور اکیلا بھی ہو چکا ہے۔"

"ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" ان چاروں کے علاوہ وہاں قابلِ رحم حالت میں موجود دیگر مسافروں کے ساتھ عملے نے بھی بہ یک زبان ہو کر کہا اور میرا حوصلہ بلند ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے پھر آؤ میرے ساتھ اور دیگر ساتھی بھی جو نسبتاً بہتر حالت میں ہیں، اس موذی پر قابو پانے کی کوشش

کرتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ ہو گئے مگر میں نے انہیں ابھی کوہارا سے دور دور رہنے کی تاکید کی اور پروفیسر جمشید کو کندھوں پر اٹھائے واپس پلٹا۔

کوہارا نے یاسمین کو دبوچ رکھا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، کوہارا کی ایک ٹانگ میں میری چلائی ہوئی گولی سے "لنگ" آ چکا تھا مگر باوجود اس کے وہ تنا کھڑا تھا۔ میرے کندھوں پر پروفیسر جمشید کو لدا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ لیکن میں نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ کوہارا اپنے ساتھیوں اور اب کمبلر کی ہلاکت کے بعد فکرمند بھی نظر آنے لگا تھا، وجہ یہی تھی کہ وہ اب اکیلا ہو چکا تھا اور جہاں طیارے نے کریش لینڈنگ کی تھی، وہ اس کا "مطلوبہ" مقام بھی نہ تھا۔

"تم اس بڈھے کو اسی طرح اپنے کندھوں پر لادے رکھو، ہم چاروں اسی وقت یہاں سے پیدل کوچ کریں گے۔" کوہارا نے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو کوہارا.....!" میں نے اسے تنبیہ کرنا چاہی۔ "نہ تم اس مقام سے واقف ہو نہ ہی ہم۔ اس لق ودق صحرا میں بھٹک جانے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں کم از کم یہاں تباہ شدہ طیارے کی چھاؤں تو حاصل ہے ناں.....؟ ہو سکتا ہے کسی قافلے کا یہاں سے گزر ہو تو وہ ہماری مدد کرے۔"

میں نے دانستہ امدادی ٹیم کا ذکر نہیں کیا تھا اس کے سامنے۔ کیونکہ وہ ایک مجرم تھا اور اس کا چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا۔

امدادی ٹیم کے ذکر پر وہ بدک جاتا، کیا خبر اسے بھی اس بات کا خدشہ ہو۔ تاہم میں اسے اسی طرح بہلا سکتا تھا تاکہ اس موذی پر قابو پانے کا کوئی موقع ہاتھ آ سکے۔

میں نے دیکھا کوہارا میری بات سن کر کچھ سوچتا بن گیا اور اس نے یاسمین کی پشت سے گن کی نال لگائے رکھتے ہوئے دور نزدیک ایک نظر ڈالی۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے مزید کہا۔

"طیارہ مکمل تباہ نہیں ہوا ہے۔ ابھی اس میں کافی سارا راشن پانی موجود ہے۔ اگر صحرا میں بھٹک گئے تو گرم تپتی ریت پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے، ہم چاروں۔"

"ہمم..... ٹھیک ہے، کچھ سوچتے ہیں۔" بالآخر کوہارا نے کہا۔ "مگر ہم چاروں جہاز کے اس حصے تک محدود رہیں گے۔" اس نے اگلے اور نسبتاً چھوٹے حصے کی طرف اشارہ کر کے تحکمانہ کہا۔

"اور اگر تمہارے سمیت کسی نے ذرا بھی چالاکی چلنے کی کوشش چاہی تو سب سے پہلے یہ ایرانی شہزادی گولیوں کا نشانہ بنے گی۔ میں نے ابھی تک اپنے سر سے کفن نہیں اتارا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔ تم فکر نہیں کرو اس کی۔" میں نے کہا۔

"زیادہ چالاک گیدڑ بننے کی کوشش مت کرو شہزی!" وہ مجھے اپنی اکلوتی آنکھ کی خونخوار نظر سے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہاری مکاری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی بھول میں مت رہنا۔ بس! یہی ایک بات میری یاد رکھنا۔ میں ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا اور یہ شہزادی میرے ساتھ سائے کی طرح چپکی رہے گی۔"

"کوہارا.....! میں نے اب تک تمہارے خلاف تب ہی مزاحمت کی ہے جب تم سب کو ہلاکت میں ڈالنے لگتے۔ ورنہ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں خود کو ابھی تک تمہارے سامنے بے بس ہی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے چالاکی چلتے ہوئے اپنے لہجے اور آواز میں بے بسی سمو دی۔

"ہمم..... یہی تمہارے لیے اور ان دونوں باپ بیٹیوں کے لیے بہتر ہوگا۔ چلو..... اب جو میں نے کہا ہے وہی کرو اور سارے مسافروں سے کہہ دو کہ وہ جہاز کے پچھلے حصے تک ہی محدود رہیں۔" اس نے تحکمانہ کہا اور میں نے اس کا پیغام ان تک پہنچا دیا۔

میں مسافروں سے وعدہ کر چکا تھا کہ میں اس موذی کو ختم کر کے رہوں گا۔ اس لیے ابھی میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔ سب..... ان سب نے میری ہدایت پر سر ہلا دیے۔ عملے اور کیپٹن سمیت مشتعل افراد کے ٹولے سے تعلق رکھنے والے مسافروں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ کافی سے زیادہ تو پچھلے حصے میں ہی تھے، باقی بھی وہاں سرک گئے۔

لیکن مجھے ان مشتعل مسافروں سے "خیر" کی توقع کم ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ کوہارا پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ دورانِ پرواز اور بات تھی۔ سب کو طیارے کی تباہی کا خطرہ تھا۔ کوہارا اور اس کا ساتھی بھی اسلحہ بدست تھے۔ پھر دورانِ پرواز بھی طیارے میں غیر یقینی صورتِ حال تھی۔ لیکن اب..... ایسا کچھ نہیں تھا۔ کوہارا تنہا تھا بے شک اس کے پاس گن تھی۔ مشتعل ٹولا اس کے ساتھی کمبلر کی طرح کوہارا کا بھی حشر نشر کرنے کے لیے بے چین تھا۔

ایسی صورت میں یاسمین اور میرے لیے خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ کوہارا بلاد یر سب سے پہلے ہم دونوں کو ہی گولیوں کا نشانہ بناتا۔ بعد میں اس کا مسافروں کے ہاتھوں جو حشر ہوتا۔

PakBooks.Site

جیسا کہ مذکور ہو چکا، طیارے کا ملبا...... تقریباً نصف حد تک ایک جانب کو جھک کر ریت میں گڑ چکا تھا۔ اسی لیے ہمیں اس پر چڑھنے اترنے میں کچھ آسانی پیش آرہی تھی۔

میں فکر مند بھی تھا اور ایک حد تک خوش بھی کہ کوہارا جیسا محتاط آدمی میری چالاکی کے پھندے میں آچکا تھا۔ مجھے اب موقع کی تلاش تھی مگر یہ میری خام خیالی تھی۔

شاطر کوہارا نے بھی شاید اس ''خطرے'' کو محسوس کر لیا تھا، جس کا اس نے ایسا بندوبست کیا کہ میں خود ششدر رہ گیا۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی خطرناک اور رسکی عمل تھا مگر کوہارا جیسے سنگ دل انسان سے یہ بعید رکھنا معمولی ہی بات ہوتی۔

اس نے طیارے کے دونوں طرف کے فیول ٹینک (بشمول ایکسٹرا فیول ٹینک) کھول دیے تھے اور فیول ریت پر گرنا شروع ہو گیا تھا۔ لوگ طیارے کے اس بڑے حصے کی ٹوٹی پھوٹی کھڑکیوں سے حیرت و تشویش بھری نظروں سے جھانک کر... کوہارا کا یہ مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ تب کوہارا نے انہیں خبردار کرتے ہوئے کہا۔

''گیم...... اب بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر میں نے کسی کو بھی طیارے کے اس حصے سے باہر نکلتے دیکھا، میں فیول پر برسٹ چلا دوں گا۔ پھر تم جانتے ہو کہ ہر طرف آگ پھیل جائے گی اور جہاز کا یہ حصہ پل بھر میں جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔''

مسافر دہشت زدہ سے ہو گئے۔ میں نے کوہارا سے یہ خطرناک عمل روکنے کا کہا اور اسے سمجھانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ مسافر اور ہم سب اب بھی اس کا کہا ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر خدانخواستہ ذرا سی چنگاری بھی فیول پر پڑی تو آتشی عفریت سب کو نگل جائے گا مگر میرا کوہارا کو سمجھانا عبث ہی ثابت ہوا۔

طیارے کے دیگر مسافر (مشتعل ٹولے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا) کپتان اور عملہ مجھ پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ میری مدد کو بھی تیار تھے لیکن مجھے ان سے صرف اسی قدر مدد کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ بپا کریں، باقی کوہارا کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی تھا۔ یاسمین کو اس نے میرے پاؤں کی زنجیر بنا رکھا تھا۔

جب بہت سا فیول ریت پر گر کر طیارے کے اس حصے کے گرد پھیل گیا تو کوہارا نے فیول ٹینک بند کر دیا۔ میں اس کی چالاکی سمجھ گیا، وہ آئندہ بھی مسافروں کو اپنی جگہ تک محدود اور محبوس رکھنے کے لیے یہی عمل وقفے وقفے سے دہرانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، کیونکہ ظاہر ہے باہر گرا ہوا فیول زیادہ دیر تک وہ افادیت نہیں رکھ سکتا تھا جو کوہارا کو حسبِ ضرورت درکار تھی۔

اس کے بعد ہم چاروں طیارے کے اگلے حصے میں آئے تو کوہارا نے اگلا حکم صادر کر دیا۔ اس نے یاسمین سے کہا کہ وہ میرے دونوں ہاتھوں کو پشت کی سمت باندھ دے۔ اسے چھوڑ کر اس نے اس کے باپ کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ جسے اب ہوش آ گیا تھا اور وہ بہت تشویش زدہ اور پریشان نظر آرہا تھا۔

یہ میرے لیے بڑی مشکل صورتِ حال تھی۔ میں اندر ہی اندر اس بدبخت کوہارا کی چالاکی پر تلملا کر رہ گیا۔

کوہارا نے مجھے دوسری جانب منہ کر کے کھڑے ہونے کا حکم دیا، میری رگوں میں سنسنی دوڑ گئی۔

میں اس کے خلاف جارحانہ قدم اٹھانے کا سوچنے لگا تھا، مگر میں یہ سوچتا ہی رہ گیا، کوہارا جیسے مکار اور شاطر لومڑ نے مجھے کوئی ذرا سا بھی ایسا موقع نہ دیا کہ میں اس پر اچانک حملے کا منصوبہ بناتا۔ اس بدبخت نے ایک تو اپنے اور میرے درمیان اتنا فاصلہ کر رکھا تھا کہ مجھے اس تک پہنچنے کے لیے چند ثانیوں کا وقت درکار ہوتا۔ جبکہ ایسی کسی کوشش میں وہ صرف ایک لمحے کے اندر ہی فائر کھول دیتا۔

اس نے اگرچہ پروفیسر جمشید حمیدی کو ہی گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا، جبکہ حقیقت یہی تھی کہ ہم تینوں ہی اس کی گن کی زد میں تھے۔ کیونکہ ایک طرح سے ہم تینوں ہی اس کے شکار تھے۔ پھر اس کے ہاتھ میں پستول نہیں ایک ایسی گن تھی جو برسٹ فائر کرتی تھی۔

یاسمین رسی تھامے اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے قریب آئی تو اس نے شاید میرے بشرے اور آنکھوں سے...... جوش اور غیظ ناکی کی چمک بھانپ لی تھی۔ اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ کر مجھے... بزبان خاموشی تسلی رکھنے کا اشارہ کیا تھا کہ میں ابھی ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کروں جو ہم سب کو ہلاکت میں ڈال دیتی۔

میں نے اس کے تاثرات پڑھ کر بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھری۔

یاسمین میرے قریب آ گئی۔ اس کی سانسیں شاید تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس کا تموج پورے بدن کو مرتعش کیے ہوئے تھا۔ حتیٰ کہ اس کی بے ترتیب سانسوں کی بازگشت مجھے اپنے قریب بالکل قریب سنائی دینے لگی۔

''دشش...... شہزی! خدا کے لیے ابھی نہیں۔'' اس نے میرے کان کے بالکل قریب ہو کر سرگوشی کی جواباً میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

میں یاسمین کے ہاتھ تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ ان میں غضب کی کپکپی طاری ہو گی اور یہی نہیں اس کا... پورا وجود اسی طرح لرزہ براندام ہو گا۔ یہ عقدہ بھی اس وقت کھلا جب اس کے ہاتھ اور انگلیاں میرے دونوں ہاتھوں سے ٹکرائیں۔ وہ بلا کی مرتعش تھیں۔

''یاد رکھنا شہزادی! میں خود آگے بڑھ کر ان جکڑ بندوں کی تصدیق کروں گا۔'' اچانک مجھے عقب سے کوہارا کی دہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ایسا نہ ہو کہ تم کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو اور اس کی سزا تمہیں اور تمہارے بڈھے باپ کو بھگتنی پڑ جائے۔''

اس کے ساتھ ہی اس مردود نے تاؤ دلانے والے انداز میں قہقہہ بھی لگا دیا۔

میرے اندر کا جوالا مکھی ایک بار پھر مجھے بے قابو کرنے لگا۔ عجب وقت آن پڑا تھا کہ میں کوہارا پر ابھی تک غلبہ پانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ مجھ پر کسی عفریت کی طرح حاوی ہوا جا رہا تھا۔ شاید اس میں کچھ ایسے حالات کا بھی دخل تھا کہ کاش! ایک موقع مجھے مل جاتا اور میں اس مردود کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

''دشش...... شہزی! مم...... مجھے معاف کر دینا۔'' اس کی غم زدہ اور سسکیوں بھری سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم اپنا کام نمٹاؤ جلدی......'' میں نے ہولے سے کہا۔

یاسمین نے جیسے تیسے اپنا ''کام'' نمٹایا اور جب وہ سیدھی ہوئی تو میرے کان [illegible] میں اس کی سسکی ٹکرائی تھی، کیا شک تھا اس میں کہ اس نے یہ کٹھن کام اپنے دل پر جبر و صبر کی بھاری سل رکھ کر نمٹایا تھا۔

اس کے بعد کوہارا نے بھی اپنی تسلی کر لی اور ایک قہقہہ اُگلتے ہوئے بولا۔ ''واہ...... کیا منظر ہے، ایک محبوبہ اپنے محبوب کے ہاتھ خود ہی باندھ کر اسے مذبحہ خانے بھیج رہی ہے۔''

کوہارا کو میرے اور یاسمین کے بارے میں شدید قسم کی غلط فہمی ہو رہی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری طرف سے تو خیر کیا ہوتی خود یاسمین کی طرف سے بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ روڈلف کے توسط سے وہ پہلے ہی میرے معاملہ دل سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔

''اب بتا...... کیا راز و نیاز کر رہی تھی تو اپنے یار کے ساتھ...... بول۔'' اچانک کوہارا کی غراتی ہوئی آواز کے ساتھ ہی یاسمین کی کراہ سنائی دی، میں مشتعل انداز میں پلٹا۔ میری لہو رنگ آنکھوں میں کوہارا کا مکروہ چہرہ تھا۔ اس رذیل نے یاسمین کو بالوں سے جکڑ کر اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی جا لگی تھی۔

''چھوڑ دو میری پھول سی بیٹی کو ظالم! خدا سے ڈرو...... مولائے کریم تمہیں غرق کرے۔''

مجھے یاسمین کے باپ کی درد بھری آواز سنائی دی۔ وہ اس کے قریب لڑھکنے کے انداز میں آ گیا تھا۔ کوہارا نے بڑی بیدردی سے پروفیسر جمشید حمیدی کو ایک ٹانگ مار کے خود سے پرے دھکیلا۔ یاسمین چیخ رہی تھی۔ میں بے بس تھا۔

کوہارا نے بڑی مکاری سے سارے مسافروں کو ایک جگہ محدود رہنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ اب بات اور تھی۔ جب تک طیارہ آسمان کی وسعتوں پر پرواز کر رہا تھا تو مسافر کچھ کرنے سے قاصر تھے، کیونکہ وہ فضاؤں کے رحم و کرم پر تھے، پھر دہشت بھی ان پر طاری رہی تھی۔ مگر اب سب زمین پر تھے اور ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ پھر کوہارا جیسے مردود آدمی پر بُری طرح ادھار کھائے بھی بیٹھے تھے، وہ اب یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔

اگرچہ بے شک کوہارا نے ایک خطرناک چال چلتے ہوئے انہیں محدود تو کر دیا تھا مگر بات پھر وہی تھی جو اول الذکر تھی۔ تاہم شاطر کوہارا نے بھی اسی خدشے کو محسوس کر رکھا تھا اس لیے اس مردود نے یاسمین کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ مشتعل مسافروں کا ٹولا کوہارا جیسے بے رحم مردود آدمی کا برا حشر کرنے کے ساتھ ساتھ یاسمین کی پروا بھی کرے گا اور یہی تشویش میرے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر کی طرح سرایت کرتی جا رہی تھی۔ کوہارا ابلا دیر یاسمین سمیت زیادہ سے زیادہ چند مسافروں کو ہلاک کر سکتا تھا، اس کے بعد اس کا بھیانک انجام یقینی ہوتا۔

''کوہارا......! میں نے تمہاری ساری باتیں مان لی ہیں۔ اب تم مزید کوئی خون ریزی پھیلانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ یاسمین کو چھوڑ دو۔'' میں نے کوہارا کو سلگتی نظروں سے گھور کر کہا۔ وہ میری بات پر ہنسا اور بولا۔

''میرا نام سے جی کوہارا ہے...... میں ایک اکیلا سب پر بھاری ہوں۔ ماسٹر لولوش کی نادیدہ قوتیں میری دستِ راست ہیں۔''

''اتنا غرور مت کرو کوہارا......'' میں نے اس کے ہنستے ہوئے مکروہ چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب حالات اور ہیں، مسافر اب تمہارے رحم و کرم پر نہیں رہے، وہ تمہارا خون پینے کے لیے بے چین بیٹھے ہیں۔ اپنے ساتھی کمبلر کا تم نے دیکھا کیا حشر کیا انہوں نے، وہ تو میری جان کے بھی

PakiBooks.Site

دشمن ہو گئے تھے تمہاری وجہ سے۔"

"تو پھر کیا کروں میں شہزی ڈیئر؟" وہ پھر طنزیہ ہنسی سے بولا۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ بدبخت ابھی تک بے حد پُراعتماد نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو وہ خود بھی اپنے سارے ساتھیوں کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد تنہا اور غیر محفوظ سا ہو گیا تھا مگر ہنوز وہ اب فقط اپنے اکیلے کے بل بوتے پر اسی طرح کھڑا تھا۔

مجھے یہ سب سوچ کر خفت ہوئی تھی کہ میں ابھی تک اس حرام زادے پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

"چلو اب اپنی بکواس بند کرو تم۔" وہ درشتی سے بولا اور یاسمین کو چھوڑ کر اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہونا چاہیے، ساتھ ہی مجھے ایک اور بھی بندوبست کرنا ہے۔ تھوڑا فیول اور گرانا ہوگا مجھے۔"

پھر وہ یاسمین کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم میرے ساتھ چلو۔" اس کے بعد اس نے گھوم کر ایک طرف دیوار سے لگے بیٹھے پروفیسر جمشید کی طرف گھور کر دھمکاتے ہوئے کہا۔

"او...... بڈھے! یاد رکھنا، میں ابھی اِدھر ہی ہوں، شہزی کے ہاتھ کھولنے یا اور کوئی چالاکی کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں، تمہاری پھول سی پیاری بیٹی ابھی میرے ساتھ ہے۔" کہتے ہوئے اس نے میری جانب بھی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

ایک قیامت خیز طوفان کے گزر چکنے کے بعد کچھ گھڑیاں ہمیں ایسی میسر آئی تھیں کہ کچھ خاموشی اور سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔ سکون اس لیے کہ مجھے امدادی ٹیم کے پہنچنے کی پوری امید تھی۔ یہی امید اس تباہ حال طیارے کے بدنصیب مسافروں کو بھی رہی ہوگی۔

وقت گزرتا رہا۔ تھوڑا بہت جو تھا، وہ ہم نے زہر مار کیا۔ شام سر پر آ گئی۔ کوہارا تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھلے دروازے...... والے حصے کی طرف چلا جاتا تھا، ارد گرد ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ واپس پلٹ آتا۔ یکا یک مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ جیسے قیامت کی رہی سہی گھڑیاں بھی زہریلے سنپولوں کی طرح غیر محسوس انداز میں سرکتی ہوئی ہمارے قریب آنے لگی ہوں۔

میں جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا، اس طرف ایک کھڑکی باہر صحرا کا منظر پیش کرتی تھی۔ میں نے دیکھا۔ لق و دق صحرا پر شام کا پُرہیبت منظر بکھرنے لگا تھا۔ آسمان ڈھلتے سورج کی الوداعی کرنوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ دور ریتیلے ٹیلوں کے افق پار سورج جیسے دھنسا جا رہا تھا۔ آسمان نارنجی اور کہیں تاریکی کے ملے جلے رنگوں میں عجیب منظر پیش کرتا دکھائی دیا۔ پورا صحرا ایک عجیب سے سناٹے میں مستغرق سا محسوس ہوتا تھا۔

ہم چاروں ایک دوسرے سے فاصلہ رکھے بیٹھے تھے۔ یہ کوہارا کا حکم تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یاسمین یا پروفیسر جمشید کے میرے ساتھ ساتھ بیٹھنے سے وہ میرے ہاتھوں ...کی رسی نہ کھول ڈالتے۔

میری نظریں گاہے بگاہے اس منحوس سے جی کوہارا کے چہرے کا بھی جائزہ لے رہی تھیں، تاثرات سے مجھے لگا تھا کہ جیسے وہ اندر ہی اندر کوئی آئندہ کی پیش قدمی مرتب کر رہا ہو۔

جب شام ڈھل گئی اور رات نے صحرا پر اپنا خوابیدہ پڑاؤ ڈالا تو ٹھنڈ سی محسوس ہونے لگی۔ صحرا کا مزاج بھی عجیب ہوتا ہے۔ دن میں باپ جیسی شفقت کے جیسا گرم جوش تو رات میں ممتا بھری ماں کی گود کی طرح ٹھنڈا۔ صحرا کے مغربی ٹیلوں سے طباق چاند ابھر کر تاروں کے ٹمٹماتے جھنڈ کے درمیان ضوفشاں ہونے لگا تھا۔ ہر سُو ریت پر ایک طلسماتی سی چاندنی بکھر گئی تھی۔

"ہم اب چلیں گے۔" اچانک کوہارا نے ایک نیا حکم صادر کر دیا۔

"کیا مطلب؟ ہم کہاں جا سکتے ہیں اس ٹھٹھرتی رات میں......؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا۔

"یہ رات ہی تو ہماری پناہ گاہ ہے۔" کوہارا معنی خیز لہجے میں مسکرا کر بولا۔ "مجھے امید ہے کہ یہاں قریب میں کوئی آبادی مل جائے گی۔ ممکن ہے اونٹ کی سواری بھی۔"

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"موبارغہ۔"

"وہاں جانے کا مقصد؟" میں نے بظاہر بے دلی سے پوچھا۔

"وہی میری اصل منزل ہے۔ جہاں میرے ساتھی بے چینی سے میرے منتظر ہیں۔" وہ فخر سے بولا۔ "افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔"

"یہ رابطہ ممکن ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کی کمزوری بھانپتے ہی کہا۔

"وہ کیسے؟" اس نے میری طرف قدرے چونک کر دیکھا۔

"کاک پٹ کا جائزہ لینا پڑے گا کہ وہ کس حد تک بچا

ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کا وائرلیس اینڈ ریڈیو سسٹم درست ہے تو کام بن سکتا ہے۔"

"اوہو...... " وہ چونکا۔ "یہ تو تم نے ایسی بات بتائی ہے جو مجھے پہلے ہی سوچ لینی چاہیے تھی۔"

"تمہاری عقل صرف انسانی لہو بہانے تک ہی محدود رہتی ہے۔ فوراً کاک پٹ کا جائزہ لو اور اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلاؤ، ورنہ یہ جلے بھنے بیٹھے مسافر موقع ملتے ہی ہم چاروں کی تکّا بوٹی کر ڈالیں گے۔"

میں نے دانستہ اسے کچھ ایسا تاثر دیا کہ جیسے میں بھی مسافروں سے ڈرا ہوا اور خوف زدہ ہوں۔ حسبِ توقع میری بات پر اس نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا اور اسی انداز میں بولا۔

"ہاہا...... ہاہا...... میرا عظیم دشمن ڈر گیا......! ڈرنے کی بات نہیں، یہ صورتِ حال ہی ایسی ہے، تم نے دیکھا نہیں کس قدر یہ لوگ ہم پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ایک ذرا موقع ملنے کی دیر ہے انہیں، کمبلر کا کیا حشر کیا انہوں نے۔" میں نے بدستور اپنی "پالیسی" جاری رکھی۔ وہ حظ اٹھانے والے انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔

"چچ...... چچ...... بڑے بُرے پھنسے شہزی تم تو...... میں تمہیں اِدھر ہی ان کے پاس چھوڑ جاؤں گا...... یہ تم سے میرا حساب کتاب کر لیں گے، کمبلر بھی ان کے ہاتھوں مر گیا اور اب تم بھی...... اس کے بعد...... میرا نام اور میری شکل بھی انہیں کسی کو بتانے کے لیے یاد نہیں رہے گی، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امدادی ٹیمیں کسی وقت بھی یہاں پہنچنے والی ہیں۔"

"تت...... تم ایسا نہیں کر سکتے...... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" میں نے سخت مگر اپنے لہجے میں دانستہ خوف سموتے ہوئے کہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یاسمین سے تحکمانہ درشتی سے بولا۔

"تم مسافروں والے حصے میں جاؤ اور عملے کو کہو کہ چند ضروری سامان بستر وغیرہ صرف دو افراد کے ہاتھ یہاں بھجوا دے فوراً۔"

"اسے وہاں مت بھیجو کوہارا......!" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

کوہارا نے سنسناتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر کہتا رہا۔

"مسافر اسے دبوچ لیں گے، اسے ان سے جان کا خطرہ ہے۔" کوہارا ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا اور اِدھر میرا ذہن بھی تیزی سے کام کرنے لگا۔

نوکر

افسانہ نگار نے نوکر کو کاغذ جلاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"کیوں رمضو! میرے کام کے کاغذ تو نہیں جلا دیے؟"

نوکر نے کہا: "حضور۔ احمق نہیں ہوں صرف لکھے ہوئے بیکار کاغذ جلائے ہیں۔ کام کے سادے کاغذ ویسے ہی چھوڑ دیے ہیں۔"

حل طلب

پہلا دوست: "یار آدھی رات کو آنکھ کھل جائے اور گھڑی بند ہو، تو وقت کس طرح معلوم کیا جائے؟"

دوسرا دوست: "یہ کون سی مشکل بات ہے؟ زور زور سے گانا شروع کر دو۔ چند ہی لمحوں میں کسی کی گرجتی برستی آواز سنائی دے گی۔ کیا ہے جی؟ یہ آخر رات کے ڈھائی بجے راگ الاپنے کی کیا تک ہے؟"

جتوئی سے چودھری محمد سرفراز کا مشورہ

دیانت

انگریزوں کی دیانت داری مشہور ہے۔ ایک انگریز اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ راستے میں اچانک وہ اٹھا اور خطرے کی زنجیر کھینچ دی۔ ٹرین فوراً رک گئی۔ گارڈ دوڑا دوڑا آیا اور پوچھا۔

"آپ نے زنجیر کھینچی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"مگر کیوں؟"

انگریز نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میرا بیٹا اسی لمحے تین سال کا ہو گیا ہے۔ اب مجھ پر واجب ہے کہ اس کے ٹکٹ کے پیسے ادا کر دوں۔"

کراچی سے نہال خرم کی دیانت داری

"میں چلی جاؤں گی شہزی! کوئی مسئلہ نہیں۔" اچانک یاسمین کی بات نے کوہارا ہی کو نہیں بلکہ مجھے بھی چونکا دیا۔ کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ وہ مجھ سے تضحیک آمیز انداز میں بولا۔

"یہ تم سے زیادہ بہادر ہے۔ ٹھیک ہے جاؤ تم......"

"یاسمین! تم اندر داخل ہونے کی کوشش مت کرنا۔

PakiBooks.Site

باہر ہی سے کھڑے ہو کر اس کا حکم پہنچا دینا۔'' میں نے اس سے کہا۔ اس نے میری طرف پھیکی سی مسکراہٹ سے دیکھا اور تب ہی مجھے اس کی کشادہ آنکھوں میں ایک عجیب سے تاثر کی جھلک محسوس ہوئی۔ وہ تاثر ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو.....

''مجھے جانے دو شہزی!''

میں جانتا تھا کہ یاسمین کے دل میں بھی کوہارا کے خلاف نفرت و انتقام کا وہی جوالہ مکھی بھڑک رہا تھا جو میرے اندر تھا۔ کوہارا اس کے منگیتر جہاد کا قاتل تھا اور یاسمین اسے نہیں بھولی تھی لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟

یاسمین جہاز کے کھلے حصے سے نیچے اُتر گئی۔ کوہارا کو تسلی تھی کہ وہ کہیں نہیں بھاگ سکتی لیکن مجھے اس کی فکر ہو رہی تھی، ایک ہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا کہ ''وہ کیا کرنے والی تھی؟'' جبکہ اس نے مجھے ''کچھ کرنے'' سے منع کر دیا تھا۔

''اور سنو..... شہزادی! اس بڈھے کیپٹن کو بھی اپنے ساتھ یہاں لے آنا۔ اس سے ذرا وائرلیس اور ریڈیو سسٹم کی مدد لینا ہے۔'' کوہارا نے آخر میں یاسمین سے کہا۔

وہ ایک نگاہ پھر مجھ پر ڈالتے ہوئے جہاز کے حصے سے نیچے اتر گئی اور باہر تاریکی میں غائب ہو گئی۔ باہر صحرا میں..... جہاں ہر سو ہو کا عالم طاری تھا، یاسمین کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لوگوں نے مقدور بھر کوشش سے کچھ روشنیاں کر رکھی تھیں۔ ہمارے حصے میں بھی چند ایک بتیاں کوہارا نے روشن کر دی تھیں۔

کوہارا یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور اس سے پہلے وہ موبارغہ نامی کسی علاقے میں موجود اپنے گماشتوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر ایک بار اس کے ساتھی یہاں پہنچ جاتے تو یہ بات کوہارا جیسے درندہ صفت کا ہمت و حوصلہ بڑھانے کا سبب ہوتا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ طیارے کے اس حصے کو نیچے گرے ہوئے فیول پر برسٹ چلا کر آگ میں جھونک سکتا تھا۔

اندشوں بھرا یہ وقت بھاری سِل کی طرح دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ کافی دیر بیت گئی یاسمین یا اور کوئی اس طرف نہیں آیا تو کوہارا کو فکر ہوئی۔

وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کر طیارے کے کھلے حصے والے دروازے کی جانب بڑھا اور باہر جھانکنے لگا۔ تب ہی اس نے رات کے پُرہول سناٹے میں ایک ہوائی برسٹ فائر کیا۔ گولیاں چلنے کی بھیانک تڑتڑاہٹ خاموش صحرا میں ابھری اور اسرار بھرے سکوت میں ہلچل مچ گئی۔

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں کوہارا نے کسی کو بربریت کا نشانہ تو نہیں بنا ڈالا مگر ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے وہیں کھڑے کھڑے چلا کر کہا۔

''میرے حکم کی تعمیل کرو فوراً..... ورنہ اس بار فیول ٹینک کے قریب پھیلے ہوئے پیٹرول پر برسٹ چلا دوں گا۔''

یہاں وہ طیارے کے دوسرے حصے میں محبوس مسافروں کو یہ دھمکی دینے میں مصروف تھا اور وہاں میری نظریں یونہی کھڑکی سے پار پھیلی ہوئی مدھم سی چاندنی پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے میں بُری طرح ٹھٹکا۔

مجھے ریت پر چند سائے رینگتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی سخت اشیا گویا ہتھیار کے طور پر تھمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بے اختیار میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

جو کام مجھے کرنا چاہیے تھا، وہ کوئی اور کر رہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی خود کو کوہارا کے سامنے اس قدر بے بس نہیں پایا تھا۔ بلکہ کئی مواقع پر تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے آزاد تھے مگر دونوں ہی مجبور بھی۔

میری نظریں ان متحرک سایوں پر جمی رہیں۔ وہ حرکت کرتے اور تاریکی کی یا کسی آڑ میں غائب ہو جاتے۔ اندازہ کر سکتا تھا میں کہ یہ اسی مشعل مسافروں کے ٹولے سے تعلق رکھنے والے ہو سکتے تھے۔ ان کی جرات اور عزم اپنی جگہ لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اگر یہ ناکام ہو جاتے تو اپنے ساتھ کئی لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتے تھے۔ کیونکہ کوہارا پر... ناکام حملے کے نتائج کتنے بھیانک نکلا کرتے تھے، یہ مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا!

میں دل ہی میں ان کی ''مہم جوئی'' کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا اور ساتھ ہی جب میں نے ایک غیر ارادی عمل کے تحت اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں پر زور آزمائی کرنا چاہی تو دفعتاً ایک جھماکا میرے ذہن ہوا۔

کوہارا..... اپنے کہنے کے مطابق ان بندشوں کی تسلی نہیں کر سکا تھا اس لیے کہ جب اس نے یاسمین کو دبوچنا چاہا تھا تو اس کا باپ پروفیسر جمشید اپنی بیٹی یاسمین کو اس شیطان کی گرفت میں دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا تھا اور اس کی جانب بڑھا تھا۔ جس پر کوہارا نے طیش میں آ کر اس بے چارے بوڑھے شخص کو پرے دھکا دے دیا تھا، یوں آپا دھاپی میں کوہارا یہ تسلی کرنا بھول گیا تھا کہ یاسمین نے میرے ہاتھوں کے جکڑ بند کس قدر ''مضبوطی'' سے بند کیے تھے۔ یوں اس ''آپا دھاپی'' میں میرا بھی چند لمحات تک اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ اب جو توجہ دی تو سنسنی کی ایک لہر... میرے

یتیم

ایک دوست نے قمر لیے کی دعوت کی۔ دسترخوان پر بیٹھے تو پہلے شوربے میں تیرتے صرف دو انڈے نظر آئے۔ قمر لیے جل بھن گئے۔ معلوم ہوتا تو ہرگز دعوت قبول نہ کرتے۔ انہوں نے طنزیہ لہجے میں میزبان سے پوچھا۔

''ان انڈوں کے والدین کہاں ہیں؟''

''یہ بے چارے یتیم و یسیر تھے!'' میزبان نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

کراچی سے نہال خرم کا تعاون

پورے وجود میں دوڑ گئی۔

''آخر دیکھا تو جائے کہ یاسمین نے کوئی کسر چھوڑی تھی یا اس پر کوہارا کا خوف کچھ زیادہ ہی غالب رہا تھا۔'' میرے ذہن میں ابھرا لیکن جب میں نے یہ کوشش چاہی تو بندشیں مجھے اسی طرح ہی مضبوط محسوس ہوئیں جیسی کہ ہونی چاہیے تھیں۔

مایوسی کی لہر سی دل و دماغ میں اٹھنے کے باوجود میں نے ایک فطری ردِعمل کے تحت ذرا مزید ''زور آزمائی'' کی تو دنگ رہ گیا۔ صرف تھوڑی سی کوشش سے مجھے جکڑ بندوں کے حلقے ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ یہی مایوسی کی لہر یکا یک مسرت میں بدل گئی، میں جلد بازی سے میں کام نہیں لینا چاہتا تھا۔

اسی اثنا میں کوہارا چیخنے چلانے کے بعد دوبارہ غصے سے بھنا تا ہوا پلٹا۔ میں نے بازوؤں کی حرکات ایک دم روک دیں۔ وہ اپنی ستونوں جیسی دونوں ٹانگیں پھیلائے میری طرف خون ناک نظروں سے گھورتا رہا۔ میرے دل کو دھڑکا لگا کہیں اس بدبخت کو کچھ یاد تو نہیں آ گیا۔ لہٰذا میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے جلدی سے کہا۔

''کیا ہوا.....؟ تمہارے حکم کی ابھی تک تعمیل نہیں ہوئی؟''

''تمہاری حرافہ لگتا ہے کسی اور چکر میں ہے۔'' وہ مارے طیش کے منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا غرا کر بولا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ باہر ہی کھڑے ہو کر میرا یہ حکم پہنچائے۔ وہ کتیا اندر چلی گئی ہے، کسی سے ساز باز.....'' اس کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ اسی وقت میں نے اس کے عقب میں دو سائے تیزی سے حرکت کرتے دیکھے۔

وہ شاید اس کے رخ پھیرنے کے ہی منتظر تھے اور کب سے گھات لگائے اسی مقصد کے لیے بیٹھے تھے۔ ایک نے کسی ٹھوس سلاخ دار شے سے کوہارا کے عقب سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر زور سے ضرب لگانا چاہی تو شاید جوشِ غیظ تلے یا پھر دبے ہوئے کسی انجانے خوف و اندیشے کے سبب اس کا پاؤں رپٹا، یوں وار سر کے بجائے کوہارا کے ایک کندھے پر پڑا۔

میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ گینڈے جیسی جسامت والے کوہارا پر اس کا بس اسی قدر... اثر ہوا کہ اس نے چوٹ کھا کے پلٹنا چاہا تو دوسرے سائے نے اپنے پہلے ساتھی کی بہ نسبت ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے کوہارا کی پیشانی پر راڈ رسید کر دی۔ کیونکہ تب تک کوہارا ان کی طرف پھرتی سے پلٹ چکا تھا۔

دوسرے کی راڈ کی ضرب نے بھی بس اس حد تک ہی کام کیا تھا کہ کوہارا کی چوڑی پیشانی پر خون کی لکیر بہا دی تھی۔ اس کے بعد کوہارا کی گن نے آتشی قہقہہ اگلا تھا اور دونوں حملہ آوروں..... کے جسم چھلنی ہو کر گر پڑے۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

''اب میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔'' وحشیانہ انداز میں غرایا۔ کوہارا کا خون آلود چہرہ اس سے مزید بھیانک اور خونخوار محسوس ہوا۔

اس درندے کے جارحانہ عزم بھانپتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب وہ کون سی قیامت ڈھانے والا ہے لیکن..... وہ مجھے اور پروفیسر جمشید کو یہاں اکیلا چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ ہماری جانب پلٹا، ایک نگاہ قریب دیوار سے لگے بیٹھے پروفیسر جمشید پر ڈالی اور دوسری مجھ پر۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی اور جس کی نال سے دھوئیں کی لکیر سی فضا میں تحلیل ہوتی نظر آئی۔ میرا دل یکبارگی لرزا تھا، میں اس کے کام کا نہ رہا تھا۔ جو تھے انہیں اس نے زندہ رکھا ہوا تھا یعنی پروفیسر اور یاسمین۔

تب ہی کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پر میں نے ایک سفاکانہ مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔ ''شہزی! تم میرے لیے اب ایک اضافی بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہے۔ اپنے عظیم دشمن کو یوں بے بسی کے انداز میں ہلاک کرنے پر مجھے دکھ تو ہو گا مگر مجھے یہ اہم کام بھی سرانجام دینا ہی پڑے گا۔ ماسٹر لولوڈش کا تو تم خیر بال بھی بیکا نہیں کر سکے سوائے اپنا ہی سر پٹخنے کے..... خیر، مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' بڑے خوں ناک انداز میں یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دھواں اگلتی گن کی نال کا رخ میری جانب اٹھا دیا۔

میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ موت..... یقینی موت..... کی جھلک کیا ہوتی ہے، اس کا مجھے آج احساس ہو رہا تھا۔ خود

PakiBooks.site

میں ہنوز رسن بستہ اور بے بس تھا، ایسی بے بسی کی موت کا تو میں نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔

تب ہی میں نے کوہارا کی موٹی انگلی کو ٹریگر پر یک دم حرکت کرتے دیکھا۔

☆☆☆

''ٹرچ...... ٹرچ...... ٹرچ......'' اس مخصوص طرز کی آواز نے جہاں کوہارا کے چہرے کا رنگ پھیکا کر ڈالا تھا وہیں میرے اندر زندگی کی مسرتیں جگا دی تھیں۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے...... جتنا بڑا نام اتنا بڑا آسرا...... میں ہنس پڑا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حالات کی شوریدہ سری میں اچانک کچھ ایسی انہونیاں اور اتفاقات شاید انسان کے دماغ کو کبھی کبھی تھوڑا ''خلل زدہ'' کر ہی ڈالتے ہیں۔

''ہاہا...... ہاہا...... کوہارا...... ! تمہارا کھیل اب ختم ہو گیا۔''

کوہارا کی حالت پتلی ہونے لگی بلکہ وہ باؤلا سا ہونے لگا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی گن کو دو تین بار الٹا پلٹا اور پھر بے بسی اور طیش تلے اس نے اسے ایک جانب اچھال دیا۔ ایسے میں اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف نمایاں ہونے لگا کہ وہ اپنے تیزی سے کام کرتے ذہن سے کچھ سوچ رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ بدکا۔ اس نے کاک پٹ کا رخ کیا۔

میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ وہ ایک دم سے کاک پٹ میں کیا کرنے گھسا تھا؟ اس سوال پر غور کرنے کے بجائے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں کو کھولنا ضروری سمجھا۔

یاسمین نے اپنے تئیں کافی ''رعایت'' برتی تھی۔ میں اس سے استفادہ کرنے لگا۔ چند ثانیوں بعد ہی میں نے جب کوہارا کو کاک پٹ سے برآمد ہوتے دیکھا تو چونک پڑا۔ اب مجھے اس کے یوں حرکت میں آنے کا سبب معلوم ہو گیا جو اس کے ایک ہاتھ میں پستول کی صورت نظر آرہا تھا۔ میرے ہی نہیں شاید کوہارا کے ذہن سے بھی یہ پستول محو ہو گیا تھا۔ جس کا اچانک خیال آنے کی وجہ شاید یہی تھی کہ کوہارا تہی دست ہو گیا تھا۔ یہ وہی پستول تھا جو کاک پٹ میں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر جا گرا تھا اور اسی پستول سے میں نے کوہارا کا دایاں بازو زخمی کیا تھا۔

اگرچہ یہ بھی اس کے لیے ناکافی تھا کیونکہ اس میں بھی چند ہی گولیاں بچی ہوں گی جبکہ میرے لیے تو اس وقت ایک ہی گولی کافی تھی۔ کوہارا نے اسی لیے شاید فوری طور پر یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر یاسمین کے بغیر وہ نہیں جا سکتا تھا۔ پروفیسر جمشید کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے اس کی بیٹی یاسمین، کوہارا کے لیے ایک ''بٹن'' کا کام کرتی تھی۔

میں ایک بار پھر فوری موت کی زد میں تھا۔ کوہارا...... اب پستول ہاتھ میں تھامے اس کی نال کا رخ میری جانب کیے ہوئے تھا۔ میری یک ٹک نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ موت مجھ سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ اس کی انگلی ٹریگر پر ایک ذرا جنبش کی دوری پر تھی جبکہ ادھر میں اپنے ہاتھوں کی بندشیں بھی پوری طرح نہ کھول پایا تھا۔

''کوہارا...... !'' اچانک ایک آواز پر ہم دونوں ہی چونک اٹھے اور بیک وقت گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں یاسمین کھڑی تھی۔ اس کے ہمراہ دو آدمی جو عملے کے ہی تھے، ایک وہی کیپٹن تھا۔ اسے یاسمین نے ہی پکارا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ ہینڈ کیریز تھے ہوئے تھے جو انہوں نے فرش پر رکھے تھے۔ ان میں ایک میرا بھی تھا۔

''تم نے اگر شہزی کو ہلاک کیا تو میں بھی خودکشی کر لوں گی۔ پھر تم جانتے ہی ہو کہ...... میرا باپ میرے مرنے کے بعد تمہیں کبھی بھی اس خفیہ مقبرے تک نہیں پہنچائے گا جہاں تم جانا چاہتے ہو۔''

یاسمین کی اس دھمکی نے کوہارا جیسے درندہ صفت شخص کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہوئیں اور پھر ایک دم وہ مکروہ انداز میں ہنسا۔

''بہت یارانہ ہے آپس میں تم دونوں کا...... خوب...... شہزی تمہیں مبارک ہو لیکن مجھے اس اہرام تک پہنچنا ہو گا...... ورنہ میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ آخر میں غصے سے غرایا۔ اس کے انداز سے مجھے بے بسی سی جھلکتی محسوس ہونے لگی تھی۔

''لیکن تم کہاں مر گئی تھیں؟'' وہ اسے گھور کر طیش زدہ لہجے میں بولا۔ ''مجھ پر ابھی تھوڑی دیر پہلے دو افراد نے دھوکے سے حملہ کیا تھا۔ میں نے انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ اب میں اس کا بدلہ باقی مسافروں سے ضرور لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ انہیں ایک طرف دھکا دیتے ہوئے جنونی انداز میں نکاسی کے راستے کی جانب بڑھا۔ میں حلق کے بل چلایا۔

''اس درندے کو روکو...... یہ مسافروں والے حصے کو آگ میں جھونکنے کے لیے جا رہا ہے۔''

کوہارا...... ابھی سامنے ہی تھا۔ کیپٹن یا اس کے دو ساتھیوں کو کوہارا کو روکنے کی جرات نہ ہو سکی لیکن یاسمین نے کوہارا سے ہاتھ جوڑ کر التجا کر ڈالی۔ ''نہیں کوہارا...... ! خدا کے لیے نہیں۔ یہ بے چارے سب بے گناہ ہیں۔''

''ہٹ جا میرے راستے سے کتیا! یہ سارے تیرے اور شہزی ہی کے کہنے پر ایسا کرتے ہیں، اب انہیں پتا چلنا چاہیے کہ میں کیا شے ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے یاسمین کو ایک طرف دھکا دیا تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ مجھے دیکھ کر کوہارا وہیں رک گیا اور مجھ پر پستول تان لیا۔

''تم اب کوئی حرکت نہیں کرو گے۔'' میں رک گیا مگر اسے بھیانک ظلم کرنے سے باز رکھنے کی کوشش میں بولا۔

''دیکھو کوہارا...... ! آگ لگنے کی صورت میں مسافروں میں تمہارے خلاف مزید نفرت بڑھے گی۔ سب کا تو آگ میں جل مرنا ممکن نہیں ہو گا، اور جو باقی بچیں گے وہ تمہاری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ تمہارے پاس صرف ایک پستول ہے اور اس میں بھی پتا نہیں کتنی گولیاں بچی ہوں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم مزید کوئی ابتری پھیلانے کے بجائے اپنے آئندہ کے پروگرام پر عمل کرو۔''

کوہارا کو میری بات میں شاید وزن محسوس ہوا۔ وہ بھناتے ہوئے انداز میں واپس پلٹا۔ اکلوتی نگاہ سے یاسمین اور کیپٹن کی طرف دیکھا، اس کے دونوں ساتھیوں نے سامان اٹھا رکھا تھا۔ اس نے سامان انہیں وہیں رکھنے کا حکم دیا اور عملے کے دو افراد کو واپس اپنے حصے میں جانے کا کہا۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر اس بار کسی نے مہم جوئی دکھانے کی کوشش چاہی تو صرف ایک گولی طیارے کے اس حصے میں آگ بھڑکانے کے لیے کافی ہو گی۔

کیپٹن کو کوہارا نے کوئی فریکوئنسی یا رابطے کا نمبر بتایا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ کیپٹن بھی ایک ہٹیلا آدمی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے کوہارا کا کہا نہیں مانے گا اور حسب عادت بچر مچر سے کام لے گا۔

وہ دونوں کاک پٹ میں مصروف تھے اور یاسمین کو بھی کوہارا نے اپنے ہمراہ رکھا ہوا تھا۔ میں اکیلا تھا اور اب میرے پاس بہت مہلت تھی۔ میں نے تھوڑی مزید زور آزمائی کے بعد اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھول ڈالیں۔

کوہارا کو نہیں معلوم تھا کہ میں آزاد ہو چکا ہوں۔ پستول اس کے پاس تھا اور میں نہتا تھا۔ جلد بازی خطرے کا سبب بن سکتی تھی۔ میں اسی طرح فرش پر بیٹھا رہا۔ مکار کوہارا نے کاک پٹ کا دروازہ دانستہ کھلا رکھا تھا اور وہاں سے گاہے بگاہے وہ

اقوال مس زریں

☆ باس وہ شخص ہے جو اس روز دفتر میں جلدی پہنچتا ہے جب تم اتفاق سے کچھ لیٹ ہو جاتے ہو اور اس روز دیر میں آتا ہے، جب تم حسبِ معمول وقت مقررہ پر دفتر میں پائے جاتے ہو۔ اور اس روز بالکل ہی نہیں آتا جب تم منے اور منی کی کتابوں کے لیے کچھ رقم ایڈوانس لینا چاہتے ہو۔

☆ شادی اس رسم کا نام ہے جس میں تمہاری ساری جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے اور باقی ساری زندگی بیوی کا قرض ادا کرتے گزر جاتی ہے۔

☆ ایک زمانہ تھا جب گناہ کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے جب گناہ کو احساسِ برتری یا احساسِ کمتری کے خوب صورت نام سے معنون کیا جاتا ہے۔

☆ ایک چھوٹے سے کمرے میں بند، اس دیوزاد کتے کا نام امریکا ہے جو پیار سے دُم ہلاتا ہے تو دو چار چاہنے والوں کو کرسی کے نیچے پھینک دیتا ہے۔

☆ لڑکی کی زندگی میں وہ دور بہترین ہوتا ہے جب اس کا عاشق اس کے پاس بیٹھ کر محبت بھرے انداز میں اسے اپنی خوبیاں بتاتا ہے۔

☆ شادی کے بعد کوئی انسان ایسا نہیں دیکھا گیا جس نے مکمل طور پر اپنا کنٹرول نہ کھو دیا ہو۔

☆ اسے علم ہی نہیں تھا کہ کتنا زبردست حادثہ ہوا ہے اور جب علم ہوا تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔

☆ بے چاری فلم ایکٹرس کا شوہر بڑا تبدیلی پسند واقع ہوا ہے۔ ایک مہینہ قبل وہ اس کی پوجا کرتی تھی اور ایک ماہ بعد وہ اس کے منہ پر تھوکنے تک کی روادار نہیں ہے۔

☆ پہلے کوئی کتا کسی انسان کو کاٹ لیتا تھا تو خبر بن جاتی تھی، پھر انسان کتوں کو کاٹنے لگے تو خبریں بننے لگیں۔ اب دونوں کو کاٹا جا رہا ہے لیکن خبر نہیں بن پاتی۔

درابن کلاں سے مرحا گل کا تعاون

مجھ پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کا شاید اپنے ساتھیوں سے رابطہ ہو گیا تھا اور وہ کانوں میں ہیڈ فون چڑھائے کسی سے باتیں کرنے میں... مصروف تھا اور میری جانب بھی تکے جا رہا تھا۔

یاسمین اور کیپٹن کو اس نے ایک طرف کھڑا رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ کیپٹن نے شاید سوچا ہو کہ اچھا ہو اس کے ساتھی آجائیں اور اس مصیبت (کوہارا) کو لے کر یہاں سے جلد دفعان ہو جائیں یا پھر وہ بھی اس کی دھونس دھمکی سے مجبور ہو گیا ہو، بہرحال کوہارا کا کام ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بات میرے اور یاسمین سمیت اس کے باپ کے حق میں نہیں جاتی تھی۔ مجھے رسن بستہ حالت میں ہونے کے باوجود وہ مجھ پر اپنی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ اب ایسا نہیں تھا، میں اپنے ہاتھوں کے جکڑ بند کھول چکا تھا لیکن اب بھی اسی طرح دونوں ہاتھ پیچھے کیے دیوار سے لگا بیٹھا تھا کہ جیسے وہ بندھے ہوئے ہوں۔

کوہارا کو میں جلتی سلگتی نظروں سے کسی سے جوش بھرے انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب بھی کچھ کرنے سے قاصر رہا تو میرے اندر جھنجھلاہٹ اور جوش غیظ کا شدید طوفان سا اٹھا۔ مگر میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتا رہا اسی طرح، کیونکہ جانتا تھا کہ اب ''گیم'' میرے ہاتھوں میں آنے والی ہے۔

اسی وقت چار افراد کو میں نے کود کر اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے راڈ اور اسی طرح کی دوسری اشیا تھیں۔ میرا دل انہیں دیکھ کر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کوہارا اندر ایسے رخ پر تھا کہ وہ انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

یہ چاروں مشتعل ٹولے سے تعلق رکھنے والے افراد تھے، مجھے ان پر غصہ آیا۔ حالانکہ میں انہیں سمجھا کر بھی آیا تھا، پھر ان کے دو اور بے گناہ ساتھی اسی طرح کی مہم جوئی میں کوہارا کے ہاتھوں بڑی سفاکی سے ہلاک ہوئے تھے۔ مگر ان کا غیظ اور جوشِ نفرت تھا کہ کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ عملے کے ان دونوں آدمیوں نے کوہارا کی بے بسی کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا ہو.....

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری طرف لپکے۔

''کہاں ہے وہ درندہ.....؟'' ایک نے چلا کر پوچھا۔

کوہارا بدکا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میری نظروں نے ایک بار پھر خوں ریز منظر دیکھا۔ کوہارا نے عقب سے کاک پٹ کے اندر ہی کھڑے کھڑے اپنے پستول سے اس پر گولی چلا دی۔ وہ چیخ مار کے گرا۔

اس کے باقی ساتھیوں کو صورتِ حال اور کوہارا کی ''پوزیشن'' کا اندازہ ہوا۔ وہ اسی طرف جوش میں لپکے۔ کوہارا نے دوسرا فائر داغا۔ ایک اور گرا۔

تو میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ باقی دونوں حملہ آوروں نے جو شے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی وہ اندر اس پر زور سے پھینکی۔ جو کوہارا کے کہنی لگی۔ اس کی ہلکی کراہ برآمد ہوئی۔ ان دونوں کے حوصلے بلند ہوئے۔

مجھے یاسمین کی فکر ہو رہی تھی۔ کاک پٹ کے اندر داخل ہونے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔ دونوں حملہ آور درانہ وار اندر داخل ہوئے۔ پھر پستول چلنے کا دھماکا سنائی دیا۔ اور چیخ نے میرا اندر دکھ سے بھر دیا۔ کس طرح سر سے کفن باندھے ہوئے تھے یہ حملہ آور..... جو یقیناً عام سے مسافر ہی تھے مگر اپنی بقا کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگا دی تھی اور میں ادھر مصلحتوں میں... پڑا رہا تھا جو ظاہر ہے میری مجبوری بھی تھی۔

لیکن یہی نہیں پھر تو جیسے ایک طوفان بپا ہو گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اور بھی لاتعداد مسافر کسی بدمست جانوروں کے ریوڑ کی طرح اندر داخل ہوئے اور کاک پٹ میں گھس گئے۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ دو ایک نے مجھے بھی دبوچنے کی کوشش چاہی تھی مگر میں اپنا آپ چھڑا گیا تھا۔

ایک ہنگامہ جیسے طوفانِ بدتمیزی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، وہ پوری طرح بپا ہو چکا تھا۔ میں نے چلا کر یاسمین کو آواز دی، وہ اپنے بوڑھے باپ کو سنبھالتی ہوئی گرتی پڑتی باہر آئی اور میں انہیں لے کر مشتعل مسافروں کے ریوڑ کو چیرتا ہوا بڑی مشکلوں سے نیچے اترا۔

ہم نے اپنے ہینڈ کیری اٹھا لیے تھے۔ ان میں ہمارے ضروری کاغذات موجود تھے۔ اگرچہ میں اپنی خود احتیاطی کے تحت ضروری کاغذات وغیرہ کو ایک چرمی پاؤچ میں بیلٹ کے ذریعے اپنے جسم سے ہی باندھے رکھتا تھا۔

یہاں ہر طرف لوگ پھیل گئے تھے۔ کوہارا کی بے بسی کی داستان عملے کے ان دو افراد کو وہاں سنانے کی دیر تھی اور یہ غدر مچ گیا تھا۔ چند نے اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر کوہارا پر ٹوٹ پڑنے کا موقع بالآخر نکال ہی لیا تھا۔

کوہارا سے واقعی اپنی بے بسی کے اعتراف کا اظہار کر کے غلطی ہوئی تھی۔

میں نے کوہارا پر لعنت بھیج کر کہ وہ ان کے ہاتھوں اپنے کمبلر جیسے ساتھی کے عبرت ناک اور لرزہ خیز انجام سے دوچار ہوتا ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے، میں چھپتا چھپاتا یاسمین اور پروفیسر جمشید کے ساتھ اپنی الگ راہ پر ہو

''مسافر تو پاپا اس درندے کی وجہ سے پہلے ہی خوف زدہ تھے، اس رذیل کوہارا نے ان پر اپنی دہشت ہی کچھ ایسی بٹھا رکھی تھی۔ ہمت صرف ان لوگوں نے پکڑی تھی جن کے بھائی اور باپ کو کوہارا کے ساتھی کمبلر نے ہلاک کیا تھا۔ پھر انہوں نے چند دوسروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا کچھ لوگ ایسا قدم اٹھانے کے لیے انہیں روک رہے تھے اور چند بضد تھے۔ آخر میں طیارے کے اس حصے کو آگ لگانے والی دھمکی نے لٹے پٹے بُرے حال مسافروں کی رہی سہی ہمت بھی توڑ ڈالی، لیکن جو بھرے بیٹھے تھے وہ آخر تک موقع کی تاک میں رہے اور جب عملے کے ان دو آدمیوں نے آ کر کوہارا کی پریشانی اور بے بسی کے علاوہ یہ بتایا کہ وہ اب اپنے ساتھیوں کو یہاں بلانا چاہ رہا ہے تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں خوف تھا کہ کہیں ان کے ساتھی انہیں دوبارہ قیدی نہ بنا لیں۔''

''تم نے صحیح کہا یاسمین!'' میں جوان دونوں باپ بیٹی کی باتوں کو غور سے سُن رہا تھا، اس کی تائید میں بولا۔

''اور یہ بات کسی قدر درست بھی ہے کہ کوہارا کے ساتھیوں کی آمد ہم سب کی موت یا اذیتوں میں مزید اضافہ کر سکتی تھی۔''

''اب یہ باتیں چھوڑو، ظلم کی وہ سیاہ رات سمجھو تمام ہوئی۔'' پروفیسر جمشید ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''خدا کرے کہیں قریب میں کوئی آبادی نظر آجائے۔''

''صبح ہونے سے پہلے ہم یہاں سے نہیں ہل سکتے۔'' یاسمین بولی۔ ''تاریکی اور اندھیرے میں ہم راستہ بھٹک سکتے ہیں۔''

میں نے یاسمین کی بات پر پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''جو مسافر پہلے ہی راستہ بھٹک چکے ہوں وہ بے چارے اور کیا راستہ بھٹکیں گے؟''

''تمہاری بات بھی صحیح ہے نوجوان!'' پروفیسر جمشید پہلی بار مسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں جتنی جلد ہو سکے یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔''

''یہی کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' میں نے فوراً اس کی تائید میں لقمہ دیا۔ ''کوہارا اپنے ساتھیوں کو مطلع کر چکا ہے۔ وہ بہت چالاک اور چابک دست آدمی ہے۔ نجانے اس کے ساتھی یہاں سے کتنی دور ہیں۔'' پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں نے پروفیسر جمشید سے پوچھا۔

''انکل جمشید! آپ تو پہلے بھی مصر آتے جاتے رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں موبارغہ کا علاقہ یہاں سے کتنی دوری پر ہوگا؟ کیونکہ کوہارا اسی مقام پر کیپٹن کو طیارہ لینڈ کرنے کا حکم لیا۔

☆☆☆

ایک بڑا بوجھ سر سے اُتر گیا۔ ہم تینوں تاریک صحرا میں کافی دور تک چلتے رہے۔ پھر ایک ٹیلے کے پاس آ کر تھک کے بیٹھ گئے۔ ایسی حالت میں یہ مختصر سا سامان بھی بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے یاسمین کو مشورہ دیا کہ اپنے ہینڈ کیری میں سے ضروری کاغذات وغیرہ نکال کر سنبھال لے اور باقی سامان ادھر ہی چھوڑ دے، پتا نہیں ہمیں یہاں صحرا میں اور کتنا اور کہاں بھٹکنا پڑے۔ دونوں باپ بیٹی کو میری بات نامناسب نہیں لگی۔ ان میں سفری کاغذات کے علاوہ بالخصوص پروفیسر جمشید حمیدی کے مرتب کیے ہوئے نقشہ جات بھی تھے۔ ایک دو چادریں سی بھی یاسمین نے نکال لی تھیں۔ یہ سب انہوں نے نکال کر سنبھال لیے اور یوں ہم نے ہینڈ کیریز سے نجات حاصل کر لی۔

اس وقت ہماری سانسیں بُری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ مسافر اب آزاد تھے۔ وہ ہمارے بھی دشمن ہو سکتے تھے۔ اگرچہ زیادہ تر ہم پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ تاہم کسی پر بھروسا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اب ماحول ہی ایسا ہنگامے والا بن گیا تھا۔

رات نصف پہر میں تھی اور ہم تباہ شدہ طیارے سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ امید یہی تھی کہ مسافروں کا کوئی مشتعل ٹولا یہاں نہیں آ سکتا تھا۔

''اُف میرے خدا.....! کس قدر بُرے حالات کا ہم شکار ہوئے ہیں۔'' یاسمین کی سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے کہا پھر اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''پاپا! آپ ٹھیک ہیں نا.....؟''

''میں ٹھیک ہوں بیٹا!'' وہ بولے۔ ''شکر کرو خدا کا کہ جان بچ گئی، لیکن اب یہ دعا کرو کہ وہ خونی درندہ عبرت ناک انجام کو پہنچ جائے اور اس موذی سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔''

''وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوگا پاپا!'' یاسمین بولی۔ ''اس مردود نے مزید مسافروں کو بھی جان سے مار ڈالا ہے تو اب وہ ان کے نرغے سے کہاں بچ سکے گا؟ اس کا تو پستول بھی خالی ہو گیا تھا۔''

''سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر یہی ہمت یہ سارے لوگ مل کر پہلے کر لیتے تو.....'' کہتے ہوئے پروفیسر جمشید نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یاسمین نے جواب میں کہا۔

PakBooks.site

دیے ہوئے تھا۔‘‘

میری بات پر پروفیسر جمشید بولا۔ ’’سوبار غد درحقیقت قاہرہ کا ایک مضافاتی قصبہ ہے جو اپنے اندر کافی وسیع و عریض رقبہ رکھتا ہے، زیادہ تر خشک اور سخت زمین پر مشتمل ہے۔ کیونکہ یہ دریائے نیل سے بہت دور ہے۔ بے آب و گیاہ صحرا اور بنجر، چٹیل میدان اس کے وہ حصے ہیں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔‘‘

’’دوسرے لفظوں میں یہ علاقہ بدنام زمانہ لٹیروں اور صحرائی رہزنوں کی خفیہ کمین گاہوں کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔‘‘ یاسمین نے بھی بتایا۔ وہ بھی اپنے باپ اور منگیتر حماد کے ساتھ مصر آتی جاتی رہتی تھی۔

’’تو کیا ہم اس وقت مصر کی سرزمین پر ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا تو یاسمین قدرے حیرت سے میرا چہرہ تکتے ہوئے بولی۔

’’کیا تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہو پایا؟‘‘

’’یہ بات تو نہیں۔ لیکن میں شاید یہ جاننا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ ہم قاہرہ یا مصر کی کسی بڑی شہری آبادی سے کتنی دوری کے فاصلے پر ہیں؟‘‘

میں نے دیکھا کہ میرے سوال پر یاسمین بھی مستفسرانہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ میری طرح شاید اسے بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

پروفیسر جمشید نے چہار اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ پھر انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’جب تک کسی قریبی آبادی پہنچ کر یہ نہیں پتا چلے گا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں، یہ بتانا ناممکن ہے۔‘‘ تھوڑے توقف سے چند سانسیں لینے کے بعد وہ آسمان کی طرف تکنے لگے۔ وہ شاید ستاروں کی چال دیکھ رہے تھے یا کسی مخصوص ستارے کے رخ کو جانچنے کی کوشش میں تھے۔ میں اور یاسمین خاموشی سے ان کی طرف تکتے رہے۔

’’ایک غیر محتاط اندازے کے تحت اگر ہم جنوب مشرق کی سمت چلتے رہیں تو کسی آبادی تک ڈیڑھ سے دو گھنٹے میں پہنچ سکتے ہیں۔‘‘

’’اگر وہ آبادی نہ ملی تو......؟‘‘ بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ جس پر پروفیسر جمشید کے بوڑھے چہرے پر میں نے مسکراہٹ کے آثار دیکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سوال ہی بچکانا تھا۔

وہ بولے۔ ’’مسٹر شہزی! اُمید پر دنیا قائم ہے۔ آبادی نہیں ملی تو بھٹک جانے امکان زیادہ ہوگا۔ تم اور یاسمین بیٹی فیصلہ کرلو، آگے بڑھنا ہے یا ادھر ہی بیٹھ کر امدادِ غیبی کا منتظر رہنا ہے؟‘‘

’’میرا خیال ہے، حرکت میں برکت ہے۔ ہمیں اپنے قدم ضرور آگے بڑھانے چاہئیں۔‘‘ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

’’شاباش بیٹے! اللہ پر بھروسا رکھنے والے کبھی ناامید نہیں ہوتے، اس نے جہاں ہمیں اتنی مصیبتوں سے بچایا ہے، وہ آگے بھی ہماری رہنمائی فرمائے گا۔‘‘

’’بے شک۔‘‘ اس بار میرے اور یاسمین کے منہ سے بیک وقت نکلا اور ہم یونہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

اس گمنام صحرا میں ہمارا پیدل سفر شروع ہوگیا۔

پروفیسر جمشید کو کبھی میں سہارا دیتا تو کبھی یاسمین۔ ہم کبھی چلتے کبھی رکتے، بدستور آگے بڑھتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ صحرائی ٹیلوں کا سلسلہ بتدریج موقوف ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں نے پروفیسر جمشید کو ایک مقام پر رکتے دیکھا۔

میں اور یاسمین یہی سمجھے شاید وہ تھک گئے ہیں اور تھوڑی دیر ستانے کے لیے رکنا چاہتے ہیں لیکن وہ رک کر ایک بار پھر سر اٹھا کر تاروں بھرے آسمان کی طرف تکنے لگے۔ اس کے بعد ہمیں ایک ہاتھ سے وہیں ٹھہرے رہنے کا کہتے ہوئے پہلے جنوب کی سمت چند قدم گئے، پھر شمال اور اسی طرح باقی دو سمتوں تک وہ چند قدموں تک جھکے جھکے ریت پر... کچھ دیکھتے رہے۔ پھر... واپس آکر ایک گہری سانس لے کر بولے۔

’’خدا کا شکر ہے کہ ہم کسی آبادی کی طرف درست سمت سفر کر رہے ہیں۔‘‘

ان کی بات گویا مژدہ جانفزا ثابت ہوئی۔

’’بچو! اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ کہتے ہوئے وہ ایک ٹیلے کی ڈھلان پر پشت رکھے لیٹ گیا۔ میں اور یاسمین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ کسی جواں سال شہزادے کی طرح اپنا چمکتا مکھڑا لیے پورا چاند ستاروں کے جھرمٹ میں ایسا ہی دکھتا تھا جیسے اس کے گرد چاندی جیسے چہروں والی کنیزوں نے گھیراؤ کر رکھا ہو۔ دور نزدیک ایک سحر انگیز خاموشی اور رات کا اسرار بھرا سناٹا طاری تھا۔ ہلکی سی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔

میں نے دیکھا، یاسمین نے اپنا چہرہ موڑا اور ٹیلے کے دوسری طرف جا کر نیم دراز ہوگئی۔ عجیب بے سروسامانی کی حالت میں تھے ہم تینوں۔ یاسمین کا حسن تو کسی کمھلائے

ہوئے پھول کی طرح ہو چلا تھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے مسل اور پھٹ چکے تھے۔ اس میں کوہارا کے ساتھ دھینگا مشتی کا بھی دخل تھا اور ناسا عدو پُردرد حالات کا بھی...... وہ بہت مایوس اور غم زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

پتا نہیں پھر کیا ہوا کہ میرے اپنے قدم بھی کشاں کشاں اس کی جانب اٹھتے چلے گئے۔ میں اس کے قریب جا کر ریتیلی ڈھلان پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ مدھم مدھم سی چاندنی میں اس کی کشادہ آنکھیں مجھے بھیگی بھیگی سی لگیں۔ ان میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ تھی۔ اس کے نرم لبوں پر بھیدوں بھری سی تھرتھراہٹ تھی۔ جیسے کچھ بے ربط الفاظ اڈنے کا حوصلہ پانا چاہتے ہوں۔

’’شہزی...... ! زندگی کبھی کبھی اتنی دکھی کیوں ہو جاتی ہے؟‘‘ بالآخر اس کے لبوں سے نکلا۔ ’’ہم...... مجھے تو حماد کی موت کا غم کرنے کا بھی وقت نہیں ملا...... بس! ایک تسلی ہے کہ میرا اور میرے پاپا کا مقصد نیک ہے اور......‘‘

بوجھل بوجھل سے انداز میں وہ اتنا کہہ کر ذرا رکی، ایک ذرا سر گھما کر میری طرف دیکھا، خود میری نظریں بھی اس کے دکھ زدہ چہرے پر مرکوز رہیں۔ پھر جیسے اس نے اپنا ادھورا جملہ مکمل کیا۔

’’اور...... میری دوسری تسلی تم ہو...... شہزی......!‘‘

’’میں تمہارے دکھ کا اندازہ کر سکتا ہوں یاسمین......!‘‘ میں نے ہولے سے کہا۔ ’’بے شک ڈاکٹر حماد تمہارے اور پروفیسر صاحب کے اس نیک مشن میں ابتدا سے ہی ساتھ رہے۔ وہ بہت بہادر، باہمت اور ثابت قدم رہے۔‘‘

’’حماد کی اس کے علاوہ بھی اور ایک خصوصیت تھی۔‘‘ وہ مجھ سے نگاہیں ہٹا کر تاروں بھرے آسمان کی روشن وسعتوں کی طرف تکتے ہوئے بولی۔

’’اچھا......! وہ کیا......؟‘‘ میں نے یونہی ہلکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

’’وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا۔‘‘ اس کے منہ سے نکلا۔

’’اور تم......؟‘‘ بے اختیار میرے بھی ہونٹوں سے برآمد ہوا پھر مجھے لگا جیسے میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ اس پر یاسمین نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولی۔

’’عام طور پر محبت کا جواب محبت ہی ہوتا ہے شہزی! بالخصوص اس وقت جب معاملہ مرد اور عورت کے درمیان کا ہو۔ انسیت، اپنائیت، محبت کے جزو کہلاتے ہیں، مگر اصل محبت کا جزو صرف محبت ہی ہوتا ہے۔ یعنی پیار۔‘‘

بہت عجیب لہجہ تھا اس کا اور باتیں بھی ایک رخ سے پُرمعنی اور دوسرے رخ پر الجھی الجھی۔

وہ یہ سب کہہ کر آسمان سے نگاہیں ہٹا کر میری جانب دیکھنے لگی۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر میرے لبوں پر یونہی مسکراہٹ کھیل گئی۔

’’شہزی! زندگی اور حیات کا فرق معلوم ہے تمہیں؟‘‘ اس نے بڑے عجیب سے انداز میں پوچھا۔ سوال بھی اس کا کچھ ایسا ہی تھا۔

’’شاید نہیں۔‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کسی خاص ’’کیفیت‘‘ میں مبتلا محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھی اسے بولنے کا موقع دے رہا تھا کہ غم خاروخس کے مانند بہہ جانے کا بہانہ تلاش رہے تھے تو ایسا ہی سہی۔

’’شہزی! زندگی وہ ہوتی ہے جو ہم گزارتے ہیں جو فانی ہے مگر حیات، زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ امر ہوتی ہے۔ محبت اور اپنائیت کا بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔ اپنائیت زندگی ہے اور محبت حیات۔‘‘

وہ جیسے مجھے کسی طلسم میں غلطاں محسوس ہونے لگی۔ حسب سابق اس کی باتوں کا مفہوم آسان بھی تھا اور ایک رخ سے ناسمجھ میں آنے والا بھی...... مجھے یوں لگا جیسے تاروں بھری چاندنی میں نہائے ہوئے اس صحرا کا طلسم سا اس پر طاری ہونے لگا ہے۔

’’ہم...... ٹھیک کہا تم نے......‘‘ میں نے رواروی میں کہا۔ میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اچانک جیسے اس طلسماتی چاندنی میں نہائے ہوئے صحرا میں کوئی کمھلایا ہوا گلاب کھل اٹھا ہو۔ وہ میری بات سن کر بے اختیار مسکرا دی۔ مسکراہٹ کی تہ میں چھپے غم کی تلچھٹ عجیب بہار دکھاتی تھی۔

’’شکر ہے، تم مسکرائیں تو......‘‘

’’شہزی! تمہیں میری باتیں سمجھ آ رہی ہیں؟‘‘ اس کے عجیب سے اندازِ تکلم پر میں چونکا۔

’’کیا مطلب؟ میں سب سمجھ رہا ہوں۔‘‘

’’تم کچھ نہیں سمجھ رہے۔‘‘ بڑے ہی عجیب سے لہجے میں یہ کہتے ہوئے وہ ذرا میرے قریب کھسک آئی اور ڈھلان پر پشت کے بل دراز ہوگئی۔

میں دل میں اس کی آخری بات پر مسکرایا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں زہرہ بانو، سوشیلا، چندرکلا، سوزن اور بلیک کوئین جیسی کتنی ہی عورتوں کی سنگت میں رہا تھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا بلکہ پی رہا تھا اور میں یاسمین کی ساری اور بظاہر الجھی ہوئی باتوں کا مطلب بھی سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں خود ان

PakiBooks.Site

جذبات کو ہوا ہی نہیں دینا چاہتا تھا جن سے بے نام تعلقات کا استوار ہونا قرار پاتا ہو۔

میں پہلے ہی جانے کتنے ہی افراد کی دوریوں اور آشنائی کے عذاب ناک لمحوں سے گزر چکا تھا۔ عابدہ کی تو بات الگ تھی، مگر زہرہ بانو اور خاص طور پر سوشیلا مجھے کہاں بھولتی تھیں؟ تاہم مجھے یہ اعتراف تھا کہ عابدہ کے بعد اگر مجھے جس لڑکی نے متاثر کیا تھا تو وہ سوشیلا ہی تھی۔

انڈیمان کے جزیرے میں ہم دونوں کی جن کرب انداز میں دوریاں ہوئی تھیں، وہ کٹیلے لمحات میں کہاں بھولا تھا۔ یہ زندگی ہے، حیات کا ایک سمندر ہے۔ جہاں کتنے ہی جوار بھاٹے آتے ہیں۔ شکر تھا کہ میرا دامن آلودہ نہیں ہوا تھا۔ دوستی، ساتھ اور سنگت اپنی جگہ اور یوں..... یہی کچھ یہاں ہونے جارہا تھا۔

اس لیے میں دانستہ انجان بنا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یاسمین بھی ان نرم و نازک ساتھیوں کی طرح میری جدائی کے کرب کو اپنے سینے میں دبائے اپنی آئندہ کی زندگی کو نامعلوم سی غمنا کیوں میں بتادے۔

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو میں بھی چپ ہو رہا۔ نرم اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں نے میری آنکھوں کے پپوٹوں کو نیند تلے دبا دیا۔ میں سو گیا۔

☆☆☆

آنکھ ہلکے شور پر کھلی تھی۔

جاگتے سے پہلا احساس کسی کے وجود کی نرماہٹ اور گداز پن کا ہوا تھا، دیکھا تو یاسمین میرے ساتھ لگی بڑی گہری اور پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کا سر میرے سینے پر جیسے ٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ میرے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ سکیڑ کر اس کا گھٹنا میری بائیں ران پر رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی میری نیم غنودہ سی دھندلاتی آنکھوں نے کچھ اونچی نیچی قامت کے ہیولے دیکھے جو ہمارے گرد جمع تھے۔ میں نے آہستگی سے پہلے اپنے پہلو پر رکھے ہوئے یاسمین کا گھٹنا ہٹایا، پھر اس کا ہاتھ اور اس کے بعد سر تو وہ جاگ پڑی۔ جیسے اس کا کوئی سپنا ٹوٹ گیا ہو۔ جس میں وہ کھو کر گہری اور پُرسکون نیند سو چکی تھی۔

میں نے اپنی نیم خوابیدہ آنکھوں کو ہاتھوں سے مسلا اور دیکھنے کے کچھ قابل ہوا تو چونکا۔ وہ کھلے ڈلے اور ہلکے سے خیالے لباسوں میں ملفوف مقامی باشندے ہی لگتے تھے۔ ان کے ساتھ اونٹ بھی تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہیں یہ کوئی صحرائی لٹیرے تو نہیں تھے؟ مگر ان کی عمومی انداز کی وضع قطع میرے اس خدشے کی نفی کر رہی تھی۔ یاسمین بھی قدرے خوف زدہ سی ہو کر میرے قریب میرے قریب کھسک آئی تھی۔

سپیدۂ سحر دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اب بھی کھلے آسمان میں کہیں دور قریب چند تارے اپنی ماند پڑتی چمک دار آنکھوں کو جھپک رہے تھے۔ تاہم نورِ سحر چہار اطراف پھیل چکا تھا۔

یہ لوگ تعداد میں زیادہ بھی نہیں تھے۔ چار پانچ ہی ہوں گے۔ تین اونٹ تھے۔ ان پر ہودے کسے ہوئے تھے۔ دو عمر رسیدہ مرد عورت، ایک جوان لڑکی اور لڑکا تھا، لڑکی کی گود میں بچہ تھا، جبکہ آخری مرد درمیانی عمر کا تھا۔ یہ سب دراز قامت اور دبلے پتلے تھے، البتہ درمیانی عمر والا ٹھگنے قد کا اور خوب گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی تھا۔ ان کے رنگ کالے تھے۔

اسی وقت ایک آواز ابھری۔ اس آواز نے انہیں مخاطب کر کے کچھ کہا تھا۔ میں اور یاسمین کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ پروفیسر جمشید تھے۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔ وہ ان سے مخاطب تھا۔ لہجہ اور بولی مصری عربی تھا۔ وہ بھی اس سے بات کرنے لگے۔ ماحول دوستانہ محسوس کر کے میں نے اطمینان کی سانس لی تھی کہ یہ لوگ بہرحال لٹیرے وغیرہ نہیں تھے۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے اونٹوں کو مخصوص انداز میں ''ہشکارے'' مارتے ہوئے بٹھا رہے تھے۔ درمیانی عمر والا شخص خاموش کھڑا ہماری طرف عجیب عجیب سی نظروں سے تکے جا رہا تھا، جبکہ باقی شاید ہمارے لیے اونٹوں پر سوار ہونے کا بندوبست کر رہے تھے۔

''یہ لوگ ایک قریبی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، یہ ہماری مدد کریں گے۔'' پروفیسر جمشید نے مسرت بھرے انداز میں بتایا۔

یہ خوشی کی بات تھی کہ ہم اس لق ودق اور بے آب و گیاہ صحرا میں بھٹکنے کے عذاب سے بچ گئے تھے۔ ہم تیار تھے۔ پروفیسر جمشید نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہمارا جہاز صحرا میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ ایسا کچھ ہائی جیکروں کی وجہ سے ہوا تھا۔

ہم لوگ اونٹوں پر سوار ہوئے تو انہوں نے اسے بڑھا دیا۔

آبادی زیادہ دور نہ تھی۔ پروفیسر جمشید کا غیر محتاط سا اندازہ درست ثابت ہوا تھا اور ہم بھٹکنے سے بچ گئے تھے۔

مزید نصف گھنٹے بعد میں ہمیں دور سے کسی نخلستان کے آثار دکھائی دیے۔ وہ کھجور کے جھنڈ تھے۔ کسی نخلِ امید کی

طرح ہمارا مختصر قافلہ جب کھجوروں کے اس جھنڈ کے نزدیک پہنچا تو مٹی اور کہیں پختہ اور نیم پختہ مکانوں کے آثار، گلیاں اور پگڈنڈی نما راستے بھی نظر آنے لگے۔

صبح کے آثار پھیلتے ہی یہاں بھی زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی تھی۔ ہمیں دیکھ لوگ باگ قریب آنے لگے اور حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔

ہم اونٹوں سے اُتر چکے تھے۔ اونٹ ریت پر بیٹھ کر جگالی کرنے میں مصروف تھے۔

وہاں چند اور لوگوں سے انہوں نے بات چیت کی، وہ شاید انہیں ہمارے بارے میں ہی بتا رہے تھے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بھی ہم سے ہاتھ ملائے۔ وہ ٹھگنا شخص جو ہم سے کسی بھی میزبانی طرز کی گرم جوشی کے اظہار سے کتراتا دکھائی دیتا تھا، جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اپنی فطرت میں غبی اور بغضی ہوتے ہیں، میں ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ ایسے لوگ خود اپنی ذاتی زندگی میں ''صفر'' ہوتے ہیں، سکون ان کے دلوں سے ہی نہیں، روح تک سے بھی فرو ہو چکا ہوتا ہے۔

باقی سب لوگ ہم سے بہت اچھی طرح پیش آ رہے تھے۔ ہمیں انہوں نے ایک الگ سے گھر میں پناہ دی، جو زیادہ بڑا تو نہ تھا مگر ان حالات میں یہ بھی کسی نعمت سے کیا کم تھا۔ شاید کسی وجہ سے ایک عرصے سے بند پڑا ہونے کے سبب خاصا بوسیدہ اور گرد آلودہ ہو رہا تھا۔

بستی کے چند لوگوں نے جیسے تیسے اس کی صفائی کی، جب تک ہمیں کسی اور مکان کے کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں ہمیں کھانے پینے کو جو کچھ دیا گیا تھا، اس میں ٹھنڈا شفاف پانی، بھیڑ کا گوشت، دودھ اور قہوہ پینے کو دیا گیا۔ بھیڑ کا گوشت ہم نے خمیری روٹیوں کے ساتھ کھایا تھا جو تنور میں تازہ لگائی گئی تھیں۔ اسی مکان میں ہمارے نہانے دھونے کا بھی بندوبست تھا۔ ہمیں صاف ستھرا لباس بھی دیا گیا۔ جو عربی اسٹائل کا لمبے چغے جیسا تھا۔ یاسمین خانم بھی نہا دھو کر خاصی نکھری نکھری دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے اور گداز شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بھی عرب خواتین کا لباس پہن لیا تھا، آنکھوں کی شفافیت اور چمک لوٹ آئی تھی۔ تراشیدہ لب پر دوبارہ گلاب کھلنے لگے تھے اور اس پر من موہنی سی مسکراہٹ جیسے ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔ صحرا میں اس کا ملکوتی حسن جیسے نکھر آیا تھا۔

آرام کرنے کے لیے ہمیں اول الذکر مکان میں لایا گیا۔ اس کے دو ہی کچی کوٹھری نما کمرے تھے۔ جن کی چھتیں بہت نیچی تھیں۔ ہر کمرے میں دو روشن دان تھے۔ صحن تنگ تھا۔ ہم تین افراد کے لیے کافی تھا۔

ہماری نیند شاید ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہم نے بھوکے اور پیاسے ہونے کے سبب کھا بھی کچھ زیادہ لیا تھا۔ اس لیے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

گرمی کے احساس پر ہم خود ہی جاگنے پر مجبور ہو گئے۔ تاہم گھٹن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہم بھی اپنے آپ کو کچھ تازہ دم محسوس کرنے لگے تھے۔ حالات دگرگوں کو کچھ ٹھہراؤ نصیب ہوا تو ہم کچھ سوچنے سمجھنے اور آئندہ کا لائحۂ عمل سوچنے کے قابل ہوئے اور ایک کمرے میں فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ اس پر بستر لگا ہوا تھا۔

''انکل! اب تو آپ کو ان سے بہت کچھ معلوم ہو گیا ہو گا؟'' میں نے گفتگو کی ابتدا پروفیسر جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کی تو وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولے۔

''بہت اچھی طرح..... ہم قاہرہ سے اس وقت تین سو کلومیٹر کی دوری پر ایک ''فیائی'' نامی بستی میں موجود ہیں۔''

''اگلی منزل یقیناً ہماری قاہرہ ہو گی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب میں کہا۔

''قاہرہ تو ہمارا پہنچنا یوں بھی ضروری ہے۔ ہمیں وہاں اپنے سفارت خانے سے رابطہ کرنا ہو گا اور سارے حالات سے انہیں آگاہ کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ ہماری مدد کر سکیں۔''

''پھر تو یقیناً ہمیں پولیس وغیرہ کی تفتیش سے بھی گزرنا پڑے گا پاپا؟'' یاسمین نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے اپنے باپ سے پوچھا، اس سوال کی وجہ میں سمجھ رہا تھا اسی لیے میں نے بھی پروفیسر کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز رہنے دیں۔ وہ بھی شاید اس کا مطلب سمجھ گئے..... کیونکہ میں نے ان کے بشرے پر ایک پُرمتانت سی تفکیر کا تاثر ابھرتے محسوس کیا تھا۔ وہ مجھ پر ایک نظر ڈال کے بولے۔

''قوانین کے مطابق ہمیں ان مراحل سے گزرنا تو پڑے گا، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تفتیش طویل بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ معاملہ صرف طیارے کی تباہی کا ہی نہیں ہے۔ ہائی جیکنگ کا بھی ہے اور ہائی جیکنگ بھی کیسی جس دوران خوں ریزی کا بازار بھی گرم رہا۔ یہ بھی چھوڑو تو شہزی کے حوالے سے ہمارا معاملہ بھی اس سے زیادہ گمبھیر نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس رزیل کو ہمارا کے حوالے سے ہمارا ہائی جیکرز سے بالواسطہ و بلاواسطہ، ساتھی ہونے کا الزام نتھی ہو چکا ہے۔''

Pak Books Site

پروفیسر جمشید کی توجیہہ بھرپور اور ناقابلِ بحث تھی جس کا مجھے بھی اندازہ تھا۔ میری تشویش بڑھنے لگی۔

''لل..... لیکن پاپا! شہزی تو خود کو ہارا کے زیرِ عتاب رہا ہے اور ہم بھی تو..... پھر کتنے ہی مسافر ہیں جو اس بات کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔'' یاسمین نے کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں بیٹی! کہ تفتیش و تحقیق کا یہ عمل جب تک چلتا رہے گا، ہم ایک دائرے میں ہی مقید رہیں گے، غیر معینہ مدت تک..... اور غیر یقینی حالات کی تلوار پھر بھی ہمارے سروں پر لٹکتی رہے گی۔''

''آپ کے خیال میں ہمیں پھر کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے رائے طلب انداز میں اس سے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے بولے۔

''بیٹا! غلط مت سمجھنا، قاہرہ میں اور اس کے علاوہ بھی ایک بین الاقوامی اسکالرز کی حیثیت سے میری اپنی ذاتی پوزیشن اتنی مضبوط ہے کہ میں اپنی اور یاسمین بیٹی کی گلوخلاصی کروا ہی لوں گا لیکن تم.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئے مگر میں اور یاسمین ان کی بات سمجھ چکے تھے۔ یاسمین جلدی سے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈال کر باپ سے بولی۔

''تو کیا پاپا! ہم شہزی کو اکیلا چھوڑ دیں؟''

''ہرگز نہیں بیٹی! خدانخواستہ ایسا میں نے کب کہا؟'' پروفیسر جمشید اس کی طرف پُرشفیق مسکراہٹ سے تکتے ہوئے بولے۔ ''میرا بتانے کا مطلب یہ تھا کہ ان عوامل کو تم ذہن میں رکھو اور فیصلہ کرو کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہماری منزلیں ابتدا سے ہی الگ تھیں۔'' بالآخر میں نے کہا۔ اگرچہ میں خود بھی اس نئی اور گمبھیر صورتِ حالات سے پریشان اور متفکر سا ہو گیا تھا۔ ''آپ اور میں الگ ہو جاتے ہیں، میرے حالات میں جانوں، آپ دونوں باپ بیٹی میری وجہ سے اپنی مشکلات میں اضافہ نہ کریں تو بہتر ہوگا۔'' میں نے بغیر کسی بات کا برا منائے اور تلخی کے بالکل صاف دل اور نیک نیتی سے کہا تو یاسمین کے چہرے پر دکھ اور ایک قطعیت کے سے تاثرات ابھرے، وہ نہایت رسان کے ساتھ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے ہی پروفیسر جمشید نے بڑے حلیم ... اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں بیٹا! میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ ہم تم سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو تمہاری وجہ سے ہی ہمیں اس درندہ اور جلاد صفت شخص کوہارا سے رہائی نصیب ہوئی ہے، یہ تو جانے کب سے ہماری جان کا دشمن بنا ہوا تھا، اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا تمہی نے ہی تو ہمیں دلایا ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم نے بھلا یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم اپنی الگ راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں، اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔''

''پاپا نے بالکل ٹھیک کہا ہے شہزی!'' یاسمین بھی فوراً میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''ہم سب ہر آفت اور مشکل میں ساتھ رہیں گے۔ جب تک یہ مصیبت ٹل نہیں جاتی۔''

''میں مشکور ہوں لیکن میرا معاملہ واقعی کچھ اور سطح کا ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''میرا جلد سے جلد امریکا پہنچنا بے حد ضروری ہے۔''

''کیسا بھی سہی، مگر ہم تمہارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ بس! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہاں پہنچ ہی گئے ہیں تو پہلے اپنا مشن مکمل کریں گے۔ ہم قاہرہ کا رخ کرنے کے بجائے اسی گمنامی میں رہتے ہوئے اپنے مشن کا آغاز کر ڈالتے ہیں۔''

یہ سب پروفیسر جمشید نے ایک جذبۂ جوش تلے اور حتمی لہجے میں کہا اور پھر مطمئن نظر آنے لگے۔ میں بھی خاموش ہو رہا۔ یاسمین خانم کے عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

مجھے پروفیسر جمشید کی باتوں نے فکرمند کر دیا تھا کیونکہ ان کا کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ میری دوبارہ امریکا روانگی ایک بار پھر کھٹائیوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ میری قاہرہ سے روانگی اب اتنی آسان نظر نہیں آتی تھی۔ پتا نہیں کتنے ہی تفتیشی مراحل سے مجھے گزرنا پڑتا۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میں کیلی فورنیا روانگی کے لیے اس طیارے میں سوار ہوا تھا جس میں کوہارا بھی سوار تھا۔

''لیکن تم کسی بات کی فکر نہ کرو بیٹا.....!''

اچانک شاید مجھے پریشان دیکھ کر پروفیسر جمشید نے کہا۔ میں ان کا چہرہ تکنے لگا۔ ان کے چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔

''تم بے حد آسانی سے اور کسی تفتیشی چکروں میں پڑے بغیر امریکا سدھار جاؤ گے۔ بہت جلد..... ہاں! بہت جلد.....''

ان کا لہجہ بے حد پُراسرار تھا جس پر میں ہی نہیں یاسمین بھی قدرے چونک کر اپنے باپ کا چہرہ تکنے لگی۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب ہم سب یک بیک چونکے۔ باہر سے اچانک شور کی آواز سنائی دی تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

سیاناکوا

عمران قریشی

PakiBooks.site

کہانی کار جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسے گوشۂ عافیت کی تلاش ہوتی ہے جہاں سکون و خاموشی کے سوا کچھ نہ ہو... اسے بھی اپنا پسندیدہ مقام مل گیا تھا اور ایسا ساتھی بھی جو دورانِ تحریر اس کے لیے معاون ثابت ہوتا مگر اچانک ہی پُرسکون ماحول میں اس کی ایک عادتِ بد نے زبردست بھونچال بپا کر دیا...

پرانی عداوت..... انتقام اور جرم کی مثلث جسے وقت نے بکھیر دیا.....

میں نے جیپ کو قصبے کی طرف جانے والی سڑک کی طرف موڑ دیا اور ماتھے سے گرتے ہوئے پسینے کو شرٹ کی آستین سے پونچھنے کے بعد ساتھ والی سیٹ پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل اٹھا کر چسکیاں لینے لگا۔ گرم کھولتے ہوئے سیال نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ سڑک کے سیدھے ہاتھ کی طرف قصبہ تامیلی کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس کے قریب ہی پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے جیپ ریگستانی قصبے کے بازار میں داخل ہو گئی۔ بارڈر کے قریب واقع ہونے کی

وجہ سے یہاں غیر ملکی سامان کی کثرت تھی۔ بازار کے درمیان پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ اس کے سامنے زخمی شخص کا بے ترتیب وجود ہرا پڑا تھا اور ایک مخصوص ٹی وی چینل کا نمائندہ ہاتھوں میں مائک تھامے انسپکٹر کی وردی میں ملبوس شخص کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر قصبے کے رہائشی سے وجۂ حادثہ کے متعلق دریافت کیا۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

”قانون کے محافظ نے قانون کی ہی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ بوڑھے شخص کو شراب پی کر ایسی ٹکر ماری کہ بے چارے کی ٹانگ کی ہڈی چیخ کر رہ گئی۔ اب بضد ہے کہ وہ شراب کے نشے میں ڈرائیونگ نہیں کررہا تھا بلکہ حادثہ اتفاقیہ ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر پولیس جیپ کے اندر جھانک کر دیکھا۔ تب وہاں سیٹ پر اسی برانڈ کی شراب والی بوتل کو پڑے ہوئے پایا جو میری جیپ میں بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنی جیپ کا رخ کیا اور شراب کی بوتل کو اگلی سیٹ سے اٹھا کر ڈیش بورڈ کے نیچے بنے ہوئے دراز میں چھپا دیا پھر جیپ کو اسٹارٹ کر کے پیچھے کی طرف موڑنے لگا۔ میں ہمیشہ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے شراب پی کر ڈرائیونگ کرنے سے احتراز کرتا ہوں لیکن اس دفعہ خلافِ توقع گرمی نے میرے اوسان خطا کر کے رکھ دیے تھے۔ اس لیے بحالتِ مجبوری مجھے ڈرائیونگ کے دوران شراب نوشی کا مرتکب ہونا پڑا تھا۔

جیپ کو خاص حد تک پیچھے لے جانے کے بعد میں نے متبادل راستے کا انتخاب کیا اور بازار سے ملحقہ رہائشی علاقے میں داخل ہوگیا۔ یہاں قریب ہی میرے نام پر بائر کردہ وہ مکان تھا جو اسٹیٹ ایجنٹ کی طرف سے میرے لیے تجویز کردہ تھا۔ یہ دو منزلوں پر مشتمل صرف دو افراد کے لیے مخصوص تھا۔ مکان کے نیچے والے حصے میں گیراج اور اس کے سامنے ٹی وی لاؤنج بنا ہوا تھا جس سے سیڑھیاں دوسری منزل کی طرف جاتی تھیں۔ دوسری منزل پر خواب گاہ ... اور اس کے آگے ٹیرس بنا ہوا تھا۔

میں نے مکان میں داخل ہونے کے بعد اے سی آن کردیا اور ٹی وی لاؤنج سے ہوتا ہوا گیراج کی طرف آ گیا۔ میرے پاس نہایت مختصر سامان تھا۔ کاغذوں کے چند پلندے۔ ٹائپ رائٹر اور اس کے علاوہ محدود ملبوسات پر مشتمل اٹیچی کیس۔ اس سامان کے علاوہ میری مخصوص شراب کا کریٹ بھی تھا۔ قصبے کی طرف آتے ہوئے مجھے سفر کے دوران یہ خدشہ لاحق رہا تھا کہ قصبے میں شراب کی عدم دستیابی کی وجہ سے کہیں مجھے دوبارہ شہر کا طویل سفر نہ کرنا پڑے۔ لیکن انسپکٹر کی جیپ میں اپنے برانڈ والی بوتل دیکھ کر میرے دل کو تسلی ہوگئی تھی کہ شراب کا حصول قصبے میں ممکن ہے۔ شاید بارڈر سے اسمگل ہو کر قصبے میں آرہی تھی۔ میں نے سامان کو خواب گاہ میں منتقل کیا۔ پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر شراب نوشی میں مصروف ہوگیا۔

میں تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھتا ہوا نوجوان رائٹر تھا۔ دو تین کتابوں کی اشاعت نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر لا بٹھایا تھا۔ یک دم ملنے والی شہرت نے مجھے کچھ پریشان بھی کردیا تھا۔ پبلشرز کی ایک بھیڑ تھی جو میرے ساتھ طویل معاہدے کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی لیکن معاوضے کی حد نہایت قلیل ہونے کی وجہ سے میں نے پبلشرز کو نظرانداز کرتے ہوئے ٹی وی لائن کو ترجیح دی اور اس وقت ملک کی نامور پروڈکشن کے زیرِ سایہ کام کرنے کی نیت سے قصبہ تاملی کا یہ مکان مہینے بھر کے لیے میرے نام مختص کردیا گیا تھا۔ ڈرامے کی کہانی لکھنے کے لیے مجھے نہ صرف تگڑا معاوضہ دیا گیا تھا بلکہ وقت کی کمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ٹائپسٹ لڑکی کو بھی میرے تحریری کام کے لیے مقرر کردیا گیا تھا۔ کہانی کا مواد مجھے پروڈیوسر کی طرف سے دستیاب ہوگیا تھا اور مقیم نفسیاتی مریضوں پر مشتمل ایک ایسی آبادی سے تعلق رکھتی تھی جو سب ایک ہی خاندان سے منسلک تھے اور تمام کے تمام نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھے۔

..... مکان کے گیٹ پر لگی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل کر دروازہ کھولا تو بیس پچیس سال کے درمیان قدم رکھتی ہوئی لڑکی کو سائیکل کے ہمراہ سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آنے کی وجہ دریافت کی۔ وہ سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے یونیک پروڈکشن کی جانب سے بھیجا گیا ہے۔ میں سند یافتہ ٹائپ رائٹر ہولڈر ہوں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ اپنی سائیکل کو گھسیٹتے ہوئے اندر چلی آئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور وہ اپنے شولڈر کٹ بالوں کو پی کیپ میں چھپائے ہوئے تھی۔ اس نے سائیکل کو میری جیپ کے پاس کھڑا کیا اور میرے پیچھے چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ میں نے اسے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور فریج میں سے کولڈ ڈرنک کی بوتل نکالنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے کسی چینی گڑیا کی طرح خاموش بیٹھی

تھی۔ میں نے مشروب کی بوتل کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ دوبارہ سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔ ”فیمی.......“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فیمی میرے پاس وقت نہایت کم ہے اس لیے مجھے کم و بیش تمہاری صلاحیتوں پر ہی انحصار کرنا ہوگا۔ اگر تمہاری جانب سے مجھے امید افزا صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو یقین جانو میں پروڈیوسر سے تمہاری سفارش کرنے کے علاوہ اپنی طرف سے بھی انعام و اکرام دوں گا۔“

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے جو معاوضہ موصول ہو چکا ہے، وہ میری توقعات سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ رہی صلاحیتوں کی بات...... تو اس کے لیے میرا ایرا گون کمپنی کا سرٹیفکیٹ کافی ہوگا۔ میں ان کی قابل ترین شاگرد رہ چکی ہوں۔“ اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ کھولا اور اندر سے پلاسٹک میں سربند سرٹیفکیٹ باہر نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

میں نے وہ دوبارہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری قابلیت کا اندازہ کام کے بعد ہوگا اور کام کے اوقات شام پانچ بجے سے آٹھ کے درمیان ہوں گے۔ اس دوران تمہیں میرے تحریر کردہ مواد کو نہ صرف کاغذ پر ٹائپ کرنا ہوگا بلکہ اگر پروف ریڈنگ بھی کرسکو تو اس کا معاوضہ میں علیحدہ دوں گا۔“

فیمی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ پروف ریڈنگ کا کام میں بااحسن و خوبی کرسکتی ہوں۔“

میں نے پہلی دفعہ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی زندگی میں پہلی اور شاید آخری لڑکی تمہاری صورت میں دیکھ رہا ہوں جسے مزید معاوضے سے چڑ ہے۔ وجہ دریافت کرسکتا ہوں؟“

اس نے سر پر پہنی ہوئی کیپ کو اتار کر میز پر رکھ دیا پھر ایک گھونٹ سا بھرنے کے بعد بولی۔ ”میرے آگے پیچھے میری تنہائیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ زیادہ کما کر کسے خوش کرسکوں گی۔ صبح کے وقت اسکول میں پڑھاتی ہوں اور شام کو مختصر کام...... مہینے کا اتنا کما لیتی ہوں جو میری ضروریات سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔“

اس کے لب و لہجے میں کوئی بات ایسی تھی جو اس کی بے بسی اور غم زدہ دل کی عکاسی کرتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”شادی شدہ ہو؟“

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ ”گزشتہ سال ہوئی تھی لیکن چند عرصے میں ناکام ہونے کے بعد ختم ہوگئی۔“ بات کے اختتام پر اس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈالا اور مختصر ڈبا نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اس میں چکن سوپ ہے۔ میں نے آپ کے لیے بنایا ہے۔ اگر آپ کو کھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو میں وہ بھی تیار کرسکتی ہوں۔“

میں نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ تاہم اگر ایسا کر دو تو نہایت مشکور ہوں گا۔“

اس نے جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ اٹھ کر ٹی وی لاؤنج سے ملحقہ کچن کی طرف چلی گئی۔ قصبے کی بھولی بھالی سی لڑکی مجھے مختصر ملاقات کے دوران میں اچھی لگنے لگی تھی۔ میں نے سر کو جھٹکا اور خاموشی کے ساتھ سوپ پینے لگا پھر یہ روز کا معمول بنتا چلا گیا۔ وہ شام کو پانچ بجے مکان میں داخل ہوتی۔ میں اور میرا تحریر کردہ کام دونوں اس کے منتظر ہوتے۔ وہ خاموشی کے ساتھ اسے ٹائپ کرتی اور اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا ٹیرس میں رکھی میز پر لگا دیتی۔ ہم دونوں خاموشی کے ساتھ کھانا تناول کرتے۔ اس دوران ہمارے درمیان کچھ بات چیت بھی ہوتی۔ جو سراسر کام سے متعلق ہوتی۔ کھانے کے بعد وہ برتن سمیٹ کر اپنی سائیکل پر بیٹھ کر رخصت ہو جاتی۔ میں چند لمحے شراب نوشی کرنے کے بعد آرام گاہ کی طرف چلا آتا۔ میری مخصوص شراب کا کوٹا تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ مجھے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

یہ ہفتے کی شام کی بات ہے۔ فیمی کی آمد کے بعد میں نے ٹائپنگ کا کام ملتوی کردیا اور فیمی کو بتایا کہ میں اسے آج کھانے کے لیے باہر لے جانا چاہتا ہوں۔ واپس آتے ہوئے بازار سے کچھ خریداری بھی کرتا آؤں گا۔ اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ہم جیپ میں بیٹھ کر قصبے سے باہر بنے ہوئے ریسٹورنٹ کی طرف چلے آئے۔ صبح سے آسمان بادلوں کے گھیرے میں تھا۔ تمام دن ماحول پر حبس طاری رہا تھا لیکن شام سے قبل ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ریسٹورنٹ کی عمارت ایک پہاڑی ٹیلے کو ہموار کر کے بنائی گئی تھی۔ ٹیلے کے چاروں طرف میز اور کرسیوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ وہاں بیٹھ کر غروبِ آفتاب کا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے الگ تھلگ میز کا انتخاب کیا اور

PakiBooks.Site

کھانے کا آرڈر دے دیا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں ڈوبتے ہوئے سورج پر مرکوز تھیں اور چہرے پر اداسی چھائی تھی۔ میں نے خاموشی کو توڑنے کی نیت سے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ ''یہ ریسٹورنٹ اُس کا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا۔ شادی کے بعد ہم کئی دفعہ یہاں آئے۔ وہ ہمیشہ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے آخری لمحوں میں توڑ پھوڑ اور دھینگا مستی کا باعث بنتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ آنا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ مہینے کے شروع میں مجھے زبردستی لے آتا تھا۔ پہلی تاریخوں میں اس کے پاس رقم کی کثرت ہوتی تھی۔ وہ انہیں برباد کرتا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم دونوں کے درمیان طلاق کی وجہ کیا تھی؟''

وہ زخم خوردہ لہجے میں بولی۔ ''ہمارے درمیان طلاق نہیں ہوئی۔ صرف نفرت اور ضد کی ایک دیوار ہے جو علیحدگی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہماری آخری ملاقات کو..... وہ ملاقات بھی بے معنی اور فضول تھی۔ اس کا کچھ مقصد نہیں تھا۔ سوائے ڈرانے دھمکانے اور یہ بتانے... کہ وہ طلاق نہیں دے گا اور مجھے تمام عمر تنہائی کی زندگی بسر کرنا ہوگی۔''

ویٹر نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا تھا اور ملگجی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ریسٹورنٹ کے مخصوص حصے کی لائٹس کو آن کر دیا گیا تھا۔ اب ریگستان کا منظر گمشدہ تھا اور ریسٹورنٹ کا مخصوص ایریا روشن تھا۔ میں نے کھانے کی پلیٹ کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے عدالت سے رجوع کیا؟''

وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''قانون اس کا خرید کردہ ہے۔ وہ سب اس کے آگے مجبور و بے بس ہیں۔ وہاں دھکے کھانے سے بہتر ہے کہ میں تمام زندگی تنہائی کے عالم میں گزار دوں۔ شادی کے فوراً بعد مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بات منوانے کا گُر بخوبی جانتا تھا۔ اس نے مجھ پر ظلم کی انتہا کر دی۔ لیکن میں خاموش رہی اور تمام زندگی خاموش رہتی۔ اگر وہ میری ماں کو بے دردی کے ساتھ قتل نہ کر دیتا۔''

میرے ہاتھوں سے چمچ نیچے گرتے گرتے بچا۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات تھے اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ ہونٹ غصے سے کپکپا رہے تھے۔ وہ میری طرف توجہ دیے بغیر روانی کے عالم میں بولے چلے جا رہی تھی۔

''اس نے میری آنکھوں کے سامنے ائر کنڈیشن کے سسٹم میں ردّوبدل کی جس کی وجہ سے وہ دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا اور میری ماں جل کر راکھ ہو گئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قتل کا اعتراف کر لیا۔ اس کے خلاف میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کرتی۔ اس لیے پیچ و تاب کھانے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھی رہی۔ وہ آج بھی ہمارے آبائی مکان میں رہ رہا ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکوں۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور ہم کھانا کھانے لگے۔ شہر میں میری واقفیت انتہائی درجے کی تھی لیکن قصبے کی علیحدہ بات تھی۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ تاہم شہر جا کر میں اس کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہم نے کھانا ختم کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ میں نے فیمی کو اس کے ایک کمرے پر مشتمل مکان میں چھوڑا اور جیپ کو بازار کی طرف موڑ دیا۔ قصبے کا بازار سرِشام بند ہو جاتا تھا تاہم شراب ڈیلر رات گئے تک بازار میں دستیاب ہوتے تھے۔ اس محدود بازار میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ گنتی کی چند دکانیں تھیں جن پر پورے قصبے کا انحصار تھا۔ ان میں سے دو کے پاس میری پسندیدہ شراب نہیں تھی لیکن تیسری دکان میں تھی۔ دکان کا بوڑھا مالک اسے بند کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں نے جب جیپ اس کی دکان کے سامنے روکی تب اس نے ناگوار نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا پوپلا منہ کھول کر چلاتے ہوئے کہا۔ ''جیپ سے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کرنا۔ دکان بند ہو چکی ہے۔ اب صبح سے پہلے تمہیں شراب دستیاب نہیں ہو سکتی۔''

میں جیپ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور خوشامدی لہجے میں ہمکلام ہوا۔ ''مجھے اس کی اشد ضرورت ہے۔ اگر نہ ملی تو رات بے چینی کے عالم میں گزرے گی۔''

اس نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر اتنی ہی طلب تھی تو سرِشام آ کر لے جاتے۔ یہ آنے کا کون سا وقت ہے؟''

میں بہانہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھے احساس ہے لیکن طبیعت کی ناسازی کی بدولت ایسا نہیں کر پایا۔ ورنہ عام دنوں میں کوٹا ختم ہو جانے سے قبل بندوبست کر لیتا ہوں۔''

بوڑھا غصیلے لہجے میں مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے

ہوئے بولا۔ ''میں کیش باکس مقفل کر چکا ہوں دوبارہ کھولنا اب ممکن نہیں ہے۔ تم صبح آنا۔''

مجھے اس سے اس بدتمیزی کی توقع نہیں تھی لیکن احتجاج کرنا بھی اختیار سے باہر تھا۔ قصبے کی وہ واحد دکان تھی جہاں سے مجھے شراب دستیاب ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس کی بدمزاجی کو فراموش کرتے ہوئے میں نے جیب میں سے بٹوا باہر نکالا اور نوٹوں کی گڈی باہر نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ بوڑھے کی نگاہیں گڈی پر چپک کر رہ گئیں۔ پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''کون سا برانڈ چاہیے۔''

میں نے اُسے نام بتایا۔

وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔ ''میرے پاس تمہارے مطلوبہ برانڈ کی محدود مقدار موجود ہے۔ اس لیے میں فی بوتل پر کچھ رقم مزید اوپر لوں گا اگر منظور ہو تو بتاؤ۔ ورنہ صبح آ کر لے جانا۔''

مجھے اس کی کاروباری ذہنیت پر غصہ تو بہت آیا لیکن اپنی مجبوری کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے ہامی بھر لی۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے رکھے ہوئے شراب کا کریٹ اٹھایا اور مجھے تھما کر رقم کیش باکس میں رکھنے لگا۔ میں نے کچھ آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں اس برانڈ کے کریٹ بہ کثرت رکھے ہوئے تھے۔ میں جھنجلائے ہوئے قدموں کے ساتھ دکان سے باہر آ گیا۔ اس چند منٹ کی بک بک نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ میں نے دماغ کو اعتدال پر لانے کے لیے شراب کے کریٹ کو کھولا اور ایک بوتل نکال کر بے تحاشا اسے حلق میں انڈیلنے لگا۔ بوڑھا دکان کا شٹر بند کرنے کے بعد اسے تالا لگانے میں مصروف تھا۔ میں نے زیرِلب اسے چند گالیوں سے نوازا اور آدھی بوتل خالی کر کے اسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ میری دماغی حالت بہتر ہونے لگی لیکن شراب کا نشہ حواسوں پر طاری ہوتا چلا گیا۔ بوڑھے نے شٹر کو تالا لگانے کے بعد اپنی سرخ و سفید رنگ کی جیکٹ کو درست کرتے ہوئے اس کی ٹوپی کو سر پر اوڑھ لیا پھر دکان کے پاس کھڑے ہوئے اسکوٹر پر بیٹھ کر میری جیپ کے سامنے سے ہوتا ہوا دوسری طرف کی گلی میں داخل ہو گیا۔ بارش کے قطرے زمین پر گرنے لگے۔ میں نے دوبارہ بوتل اٹھائی اور چسکیاں لینے لگا۔ مجھے رہ رہ کر شراب فروش بوڑھے شخص پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے ناجائز منافع ہتھیایا تھا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور الٹے ہاتھ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر موڑ دیا اور سوچنے لگا۔ شہر سے دور افتادہ قصبے میں قانون کی بالادستی نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتی تھی۔ انسپکٹر کا شراب پی کر بوڑھے کی پٹڑی توڑ دینا۔ فیمی کے شوہر کا اس کی ماں کو قتل کرنے کے بعد قتل کا اعتراف کرنا اور اب بوڑھے شخص کا ناجائز منافع خوری میں ملوث ہونے کے بعد نہایت دھڑلے کے ساتھ اضافی رقم وصول کرنا۔ میرا دماغ غصے کی شدت سے کھولنے لگا اور حواسوں پر سیاہ دھند طاری ہونے لگی۔ شراب نے کام شروع کر دیا تھا اور میرا جسم جیپ کے جھٹکوں کے ساتھ جھولنے لگا تھا۔

جیپ اخلیل روڈ پر داخل ہو گئی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی طرف سرخ و سفید رنگ کا متروک شدہ ٹیلی فون بوتھ کا ڈھانچا کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ بوڑھے آدمی نے بھی سرخ و سفید رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اسٹیئرنگ پر میرا ہاتھ کچھ سوچ کر بہک گیا۔ جیپ نے طوفانی رفتار کے ساتھ ٹیلی فون بوتھ کا رخ کیا اور اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ میں نے پھرتی کے سات اسٹیئرنگ کو سیدھا کیا۔ جیپ دوبارہ سڑک پر آ گئی۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے گندی گالی سے شراب فروش بوڑھے کو نوازا اور ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ جیپ نے ایک دفعہ پھر رفتار پکڑنی شروع کی۔ اس کے بہترین شاک اوپری سطح کو جھٹکوں سے محفوظ کیے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے سڑک کے درمیان وہ بوڑھا آدمی سرخ و سفید رنگ کی جیکٹ میں ملبوس جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ شاید وہ بھی شراب کے نشے میں دھت تھا۔

میری بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں نفرت کی لہر دوڑنے لگی۔ چہرے کے عضلات تن گئے۔ میں نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کیا اور جیپ کا رخ لڑکھڑاتے ہوئے بوڑھے کے ناتواں جسم کی طرف کر دیا۔ بارش کی شدت میں بھی جیپ کی رفتار کی مناسبت سے اضافہ ہو رہا تھا۔ جیپ کے اگلے شیشے پر پانی کے قطروں کی وجہ سے منظر دھندلانے لگا۔ میں نے وائپر چلا کر شیشے کو صاف کیا۔ شراب فروش بوڑھے کا وجود تیزی کے ساتھ قریب آتا چلا گیا۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ وہ وجود بوڑھے شخص کا نہیں تھا بلکہ سرخ شال اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ کوئی عورت ہے۔ میں نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ماحول جیپ کے پہیوں کی چرچراہٹ کی آواز سے گونج اٹھا لیکن وہ وجود جیپ کے اگلے حصے سے ٹکرا کر ٹائروں کے نیچے کچلتا چلا گیا۔ جیپ کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ اپنی جگہ پر گھوم گئی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ طوفانی بارش

Pakusociety

نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر وہ بدنصیب عورت دم توڑ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی شراب کی بوتل دھماکے کے ساتھ زمین پر گری۔ میں نے چونکتے ہوئے کرچیوں کی طرف دیکھا اور پھرتی کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر اس کا رخ موڑنے لگا۔ گاڑی کے ٹائر خون سے بھدے ہو رہے تھے۔ انہیں جلد از جلد صاف کرنا ضروری تھا۔ بوڑھے شخص کے مغالطے میں، میں نے ناحق اس عورت کو کچل دیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ نادانستگی کے عالم میں ہوا تھا۔ جیپ کا رخ موڑنے کے بعد میں نے ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ اس کا برسنا میرے حق میں مفید تھا۔ گاڑی کے ٹائروں سے خون صاف ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی گھر میں داخل ہونے کے فوراً بعد میں نے ڈیٹرجنٹ ملے پانی سے ٹائروں کو اچھی طرح دھویا پھر صحن کو صاف کرنے کے بعد ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ شراب کا نشہ اُڑن چھو ہو چکا تھا اور اب میں کسی حد تک اپنے ہوش و حواس میں تھا۔

میں نے ٹی وی کا بٹن آن کیا اور مختلف چینلز کے درمیان نیوز چینل کو تلاش کرنے لگا۔ ایک کرائم چینل پر اینکر نرم گرم آواز میں بتا رہی تھی۔ موجودہ دن سال کا گرم ترین دن ثابت ہوا۔ کاروبارِ زندگی آدھے دن تک مفلوج رہنے کے بعد سرِ شام بیدار ہوا۔ گھروں میں مقید لوگوں نے ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لیے بازار کا رخ کیا۔ خریداری کے ان اوقات کے دوران لوگوں کا جمِ غفیر اشیائے خورونوش کی دکانوں پر دکھائی دیا۔ میں نے زیرِ لب گالی دیتے ہوئے چینل تبدیل کر دیا۔ کرائم چینل پر دن کی مصروفیات بیان کی جا رہی تھیں۔ میں نے دوبارہ نیوز چینل کی تلاش میں بٹن دبانا شروع کیا۔ دوسرے چینلز پر بھی خرافات پیش کی جا رہی تھیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ایک چینل پر حادثے کی تفصیل اور باریکیوں سے مطلع کیا جانے لگا۔ میں نے کان اینکر کی آواز پر لگا دیے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''چند لمحات قبل انگلیل روڈ پر یہ اندوہناک واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ حادثے کے دوران قصبہ تاملی سے تعلق رکھنے والے میئر فاروق الحق کی بوڑھی والدہ جن کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ انہیں نہایت بے دردی کے ساتھ کچل کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ پولیس کی نفری انگلیل روڈ پہنچ گئی ہے اور ان کے کہنے کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹوں کے دوران مجرم کی گرفتاری ممکن بنانے کی حتی الوسع کوششیں کی جائیں گی۔ ہمارے مقامی رپورٹر کے مزید کہنے کے مطابق جائے وقوعہ کے قریب غیر ملکی شراب کی بوتل کی کرچیوں کی صورت کچھ ایسے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں جن کا برانڈ نایاب ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات عدم دستیابی کا باعث بنا رہتا ہے۔ قصبے میں ایسے دکان داروں کے متعلق معلوم کرنا مشکل نہیں جن کے پاس اس شراب کا ذخیرہ حادثے سے قبل موجود تھا۔ اینکر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر دوبارہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

ایک حالیہ ثبوت کے متعلق معلومات آپ تک ہم پہنچانے والی ہوں۔ ہمارا مقامی رپورٹر اس ثبوت کی نشاندہی کا سبب ... بنا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق لاش کو کچلنے والی گاڑی کے ٹائروں پر ایک مخصوص کمپنی فورڈ کا مونوگرام پایا گیا ہے۔ میں دوبارہ دہرائے دیتی ہوں۔ مونوگرام فورڈ کمپنی کے مختصر الفاظ پر مشتمل ہے۔ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات حالیہ ہونے والی بارش کی وجہ سے غیر واضح ہیں۔ لیکن جائے وقوعہ کے قریب کچھ دور تک خون سے بھرپور ان نشانات پر کمپنی کا مونوگرام صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ میں نے گھبرا کر ٹی وی کا بٹن آف کر دیا اور اٹھ کر جیپ کی طرف چلا آیا۔ ٹائروں پر واقعی مونوگرام کھدا ہوا تھا۔ ٹائروں کے دھلنے کے بعد یہ مونوگرام اور بھی واضح دکھائی دے رہا تھا۔

میں دوبارہ ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔ شراب نوشی کے دوران میں نے دل میں پکا تہیہ کیا کہ اگلے دن قصبے کو چھوڑ کر شہر منتقل ہونے کی کوششیں کروں گا۔

تمام رات پریشانی کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آئی۔ علی الصباح ٹی وی پر خبریں سننے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ قصبے کے تمام داخلی اور خارجی راستوں پر چوکیاں بنا کر انہیں بند کر دیا گیا ہے۔ اب اندر آنے اور باہر جانے کے لیے ان چوکیوں پر اندراج کرنا ضروری تھا۔ پولیس والوں کے کہنے کے مطابق ان کی تفتیش کا دائرۂ کار انگلیل روڈ کے اردگرد کا علاقہ تھا اور انہیں اس ایریے کے درمیان مجرم کی پوشیدگی کا یقین تھا۔ ان کے مزید کہنے کے مطابق ٹاؤن کی تمام گاڑیوں کے ٹائر چیک کرنے کے لیے پولیس کی مزید نفری دوپہر کے بارہ بجے تک قصبے میں پہنچنے والی تھی۔

میں قصبے میں بُری طرح پھنس کر رہ گیا تھا۔ مجھے جلد از جلد جیپ کے ٹائروں سے نجات حاصل کر لینی چاہیے تھی۔ یہ وہ واحد ثبوت تھے جو مجھے بوڑھی عورت کا قاتل ثابت کر سکتے تھے۔ میں نے ٹی وی لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور فیمی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اتوار کا دن تھا۔ اسے گھر پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ دوسری بیل پر اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کون بات کر رہا ہے؟''

میں نے پریشان لہجے میں اُسے گھر آنے کے لیے کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا پھر شراب کی بوتل اٹھا کر اس کے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے۔

فیمی کی آمد آدھے گھنٹے کے بعد متوقع ہوئی۔ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہونے کے بعد اس نے سرگوشی بھرے لہجے میں مجھ سے خیریت دریافت کی۔ میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔ ''تمہیں حالاتِ حاضرہ سے کچھ دلچسپی ہے۔''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''یعنی تم قصبے کے حالات سے بے خبر ہو۔''

اس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پریشان لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں آپ میئر کی والدہ والے حادثے کے متعلق بات تو نہیں کرنا چاہتے؟''

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔ یقین جانو جو کچھ بھی ہوا نادانستگی کے عالم میں ہوا۔ اس میں کوئی ذاتی مفاد یا کسی بھی قسم کی دشمنی اور کدورت نہیں پائی جاتی، وہ اچانک ہی میری جیپ کے سامنے آ گئی تھی۔''

فیمی کا منہ حیرت کے مارے کھل گیا۔ آنکھیں پھٹ کر حلقوں سے باہر آنے لگیں پھر اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے پہلی دفعہ اونچی آواز میں بولی۔ ''نادانستگی ہی میں سہی لیکن اس حادثے کی وجہ سے آپ بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ میئر کی ماں ذہنی طور پر تندرست نہ ہونے کے باوجود بھی قصبے کی معزز ترین ہستی تھی۔ اس کی ہلاکت کے بعد تمام قصبہ سوگوار ہے۔ مخصوص مونوگرام والے ٹائروں کی گاڑی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہر اُس گھر کو قابلِ تفتیش نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے جہاں گاڑی موجود ہے۔ قصبے میں ٹائر فروخت کرنے والی دکانوں پر پولیس کے اہلکار متعین کیے جا چکے ہیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کسٹمر سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد خرید و فروخت کی اجازت دیتے ہیں۔ آپ قصبے میں بُری طرح پھنس چکے ہیں۔''

میں نے پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے پاس واحد ثبوت مخصوص ٹائروں والی جیپ کی صورت میں ہے۔ اگر ان ٹائروں کو گھر سے باہر

خانساماں

''کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آ نکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ پھر سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے، نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی تھی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے یہ عندیہ بھی لینے کی کوشش کی کہ ہم ہفتے میں کتنی دفعہ باہر مدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کافی تردد کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہم میں، وہی خوبیاں تلاش کر رہے ہیں، جو ہم ان میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا تو ہم نے کہا کہ اصولاً ہمیں محنتی آدمی پسند ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام میں جُتی رہتی ہیں۔ کہنے لگے۔

''صاحب! ان کی بات چھوڑیے۔ وہ گھر کی مالکہ ہیں۔ میں تو نوکر ہوں۔'' ساتھ ہی انہوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجھوں گا۔ جھاڑو نہیں دوں گا۔ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا۔ میز نہیں لگاؤں گا۔ دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا۔ ''پھر کیا کرو گے؟''

''یہ تو آپ بتائیے۔ کام آپ نے لینا ہے۔ میں تو تابع دار ہوں۔''

☆☆☆

مزاح نگار کے لیے نصیحت، فصیحت اور فرمائش حرام ہیں...... یوں تو مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں بہ آسانی حل ہو جاتے ہیں، بالخصوص اردو ادب میں...... لیکن مزاح کے اپنے تقاضے، اپنے ادب آداب ہیں۔ شرطِ اول یہ کہ برہمی، بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے، ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خود شکاری کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کہ...... ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔'' مزاح نگار اس وقت تک تبسم زیرِ لب کا سزاوار نہیں، جب تک اس نے دنیا اور اہلِ دنیا سے رج کے پیار نہ کیا ہو۔ ان سے، ان کی بے لہری و کم نگاہی سے، ان کی سرخوشی و ہشیاری سے، ان کی تردامنی اور تقدس سے......

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب سے اقتباس

انتخاب...... سیدزاہد علی شاہ

منتقل کر دیا جائے تو وہ مجھے کبھی مجرم گردان نہیں سکتے۔ تم ان ٹائروں کو اپنے ایک کمرے کے مکان میں بخوبی چھپا سکتی ہو۔ میں تمہیں اس کے لیے معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ چونکہ تمہارے گھر میں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ہے اس لیے وہ اسے قابلِ توجہ تصور نہ کرتے ہوئے شک کی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے۔''

فیمی نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد خلافِ توقع اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ جیپ کے ٹائروں کو نکال کر ٹی وہ لاؤنج میں چھپا دیجیے۔ میں انہیں ساتھ لے جاؤں گی میرے اسکول کا ایک کولیگ قصبے میں ایسا موجود ہے جو نئے ٹائروں کی دستیابی میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے پاس بڑے ماڈل کی پرانی جیپ ہے۔ جس کے ٹائر استعمال شدہ اور بوسیدہ ہیں۔ اگر وہ ٹائروں کی خریداری کے لیے دکان کا رخ کرے گا تو مجھے یقین ہے کہ پولیس والوں کی پوچھ گچھ اور جانچ پڑتال میں پورا اترنے کے بعد خریداری میں کامیاب ہوجائے گا۔''

میں نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے صبری کے ساتھ کہا۔ ''میں ٹائروں کو جیپ سے علیٰحدہ کرتا ہوں۔ تم رات کو انہیں اپنے ساتھ لے جانا۔''

فیمی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ٹائروں کی خریداری کے لیے مجھے رقم کی ضرورت ہوگی۔ وہ آپ کو ابھی ادا کرنا ہوگی۔ علاوہ ازیں میری کوشش ہوگی کہ چاروں ٹائروں کی خریداری یکمشت نہ ہو۔ اس کے لیے مجھے اسکول کے کسی دوسرے کولیگ کو بھی ساتھ ملانا ہوگا۔ چار ٹائروں کی یکدم خریداری سے پولیس والے چوکنے ہوسکتے ہیں۔''

میں نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور رقم لینے کے لیے خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ رقم تھمانے کے بعد میں نے جذباتی انداز میں اس کی مدد کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جیپ کے چاروں ٹائروں کو علیٰحدہ کر کے اُسے اینٹوں کے سہارے کھڑا کر دیا۔ پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر فیمی کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی تین گھنٹے بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کا ہم عمر نوجوان لڑکا بھی تھا جس کا نام احمد تھا۔ وہ دونوں پرانی کھچاڑا جیپ میں آئے تھے اور ان کے ساتھ چار عدد استعمال شدہ ٹائر بھی تھے۔ انہوں نے ٹائر مجھے تھماتے ہوئے مونوگرام والے ٹائر اپنی جیپ میں رکھنے کے لیے کہا۔ وہاں پچھلے حصے میں اوپر سے نیچے تک تربوز بھرے ہوئے تھے۔ یہ تربوز قصبے کے باہر سے لائے گئے تھے۔ میں نے ٹائروں کو تربوزوں کے نیچے دفن کیا اور وہ دونوں جیپ میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیتے ہوئے گیٹ بند کیا اور دونوں کی عقلمندی کو داد دیتے ہوئے ان کے لائے ہوئے استعمال شدہ ٹائروں کو جیپ میں لگانے لگا۔ چونکہ نئے ٹائر پولیس کو شک میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتے تھے۔ اس لیے ان دونوں نے پرانے ٹائروں کا انتخاب کیا تھا اور ان کا انتخاب قابلِ تعریف تھا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔ میں اب کسی حد تک مطمئن تھا۔ مخصوص مونوگرام والے ٹائروں کی عدم موجودگی کے باعث اب مجھے کوئی بھی مجرم نہیں گردان سکتا تھا لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔

سہ پہر چار بجے کے قریب مکان کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو خلافِ توقع شراب فروش بوڑھے کو سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آنے کی وجہ دریافت کی۔

وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں تمہیں وجہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ حالات سے آگاہی تمہیں بھی ہے اور قابل حد تک مجھے بھی ہے۔ اگر ان حالات کے متعلق اندر بیٹھ کر کچھ بات چیت کر لیں تو مناسب ہوگا۔'' اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا اور مکان کے اندر گھستا چلا گیا۔ کار پورچ میں کھڑی ہوئی جیپ پر اس کی نگاہیں چپک کر رہ گئیں۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''یقیناً میں نے اسی جیپ کو اپنی دکان کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا تھا لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت جیپ کے ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ٹائر بھی کچھ بہتر حالت میں تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہیں تبدیل کر دیا گیا ہے۔''

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ مجھے ٹائر تبدیل کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ تمہاری مہربانی ہوگی اگر اپنے آنے کا مقصد جلد از جلد بیان کرنے کے بعد مجھے کام کرنے کی اجازت دے دو۔ میں نہایت مصروف ہوں۔''

بوڑھا ہنکارا بھرتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ صوفے کے سامنے رکھی ہوئی میز پر شراب کی وہ بوتل رکھی ہوئی تھی جو اس کی دکان سے خرید کردہ تھی۔ وہ بوتل کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری دکان سے خریدی گئی ہے۔ کل رات کو میئر کی والدہ کے قتل سے قبل تم نے اسے میری دکان سے خریدا تھا۔'' اس نے شراب کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور قریب رکھے ہوئے گلاس میں ڈال کر چسکیاں لینے لگا۔

میں نے تلخ لہجے میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ابھی تک تمہارے یہاں آنے کا مقصد سمجھ نہیں آیا۔ میئر کی والدہ والے حادثے کا میرے ساتھ کیا تعلق؟''

بوڑھا سرد لہجے میں بولا۔ ''میں حادثے کا چشم دید گواہ ہوں۔ تم نے گزشتہ رات میئر کی والدہ کو شراب نوشی کی حالت میں کچل کر ہلاک کیا۔ اس وقت تمہاری جیپ کے ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ وہ یقیناً تم نے گھر کے اندر کہیں چھپا دیے ہوں گے۔ میں انہیں تلاش کر لوں گا۔''

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اپنی بے سروپا بکواس کو بند کرو۔ میں تمہارے بہکاوے میں نہیں آنے والا۔ میں نے تمہیں اسکوٹر پر بیٹھ کر الخلیل روڈ کے مخالف طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا اگر تم عینی شاہد ہو تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم نے مخالف جانب جانے کے باوجود بھی حادثے کو اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ لیا؟''

بوڑھے نے شراب کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''الخلیل روڈ پر دوبارہ آنا میرے لیے ناممکن نہیں تھا۔ کچھ بھی کام پڑ سکتا تھا۔ مثلاً ٹیلی فون بوتھ کی ضرورت۔ تم نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرا تقریباً تمام کام ٹیلی فون سروس کا مرہونِ منت ہے۔ کل رات گھر جانے سے قبل مجھے فون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میری دکان میں سہولت دستیاب تھی لیکن دکان کو دوبارہ کھولنا دشوار تھا۔ اس لیے میں نے اسکوٹر کا رخ الخلیل روڈ کی طرف کر دیا اور میں نے نہ صرف تمہیں ٹیلی فون بوتھ کو تباہ کرتے ہوئے دیکھا بلکہ بعد ازاں میئر کی بوڑھی ماں کو کچلتے ہوئے بھی دیکھا۔ اگر میں اپنا بیان تھانے میں ریکارڈ کروا دوں تو تم خود سوچ سکتے ہو کہ اس کے بعد پولیس کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔''

میں نے اس کی بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم بغیر ثبوت کے مجھ پر الزام لگانے کی کوششیں کر رہے ہو۔ پولیس والے مخصوص مونوگرام کے ٹائروں والی جیپ کو تلاش کر رہے ہیں لیکن میری جیپ کے ٹائروں پر مونوگرام نہیں ہے۔ اب اگر تم خاموشی کے ساتھ مکان سے باہر کا رخ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ بصورت دیگر تمہیں اٹھا کر باہر بھی پھینک سکتا ہوں۔''

بوڑھے نے طویل سانس لیتے ہوئے گلاس میں موجود شراب کو حلق میں انڈیلا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے زیادہ رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ منہ بند رکھنے کے لیے بیس ہزار سے کام چلا لوں گا۔ اگر انکار کرو گے تو کل صبح تمہارے خلاف بیان ریکارڈ کروا دوں گا۔ اس کے بعد حالات کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فیمی کو دوبارہ کال کی اور صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد گھر آنے کی درخواست کی۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ کیا۔ میرے پاس اب انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے کے بعد دوبارہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو پولیس کی وردی میں ملبوس انسپکٹر کو اپنا منتظر پایا۔ یہ وہی پولیس والا تھا جسے میں نے قصبے میں داخل ہوتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں ملوث پایا تھا۔ میں نے اس سے آنے کی وجہ دریافت کی تو وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''مجھے تم سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔ یہاں نہیں..... اندر بیٹھ کر..... گرمی بہت زیادہ ہے۔''

میں نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔ ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ شراب کی بوتل سے چپک کر رہ گئی۔ اس نے بے تابانہ قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے بوتل کو اٹھایا پھر لمبا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''مجھے اسی کی تلاش تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ یہیں سے دستیاب ہوگی۔''

میں نے پریشان کن لہجے میں یقین کی وجہ دریافت کی تو وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ رات میئر کی والدہ کو نہایت بے دردی کے ساتھ کچل کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی لاش کے پاس شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل کی کرچیاں ملی ہیں اور وہ کرچیاں اسی برانڈ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قصبے میں شراب کی صرف تین دکانیں ہیں۔ دو دکانوں پر اس مہنگی شراب کی عدم موجودگی ثابت ہوئی لیکن تیسری دکان کا بوڑھا مالک شراب کی خرید و فروخت میں ملوث پایا گیا۔ ہماری پوچھ گچھ پر اس نے بتایا کہ گزشتہ رات صرف تم نے شراب خریدی اور خریداری کے بعد تمہاری جیپ الخلیل روڈ کی طرف روانہ ہوئی۔ تم جانتے ہو کہ یہ وہی روڈ ہے جہاں حادثہ ہوا۔''

میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یعنی تمہارے کہنے کے مطابق میئر والے واقعے میں..... میں ملوث

PakiPoint.Site

ہوں۔‘‘
اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ’’ابھی حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں ہے لیکن شواہد کے منظرِ عام تک آنے سے پہلے اب تم قصبے سے باہر نہیں جا سکتے ہو۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ شراب کی بوتل اٹھا کر ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل آیا۔ جیپ کے قریب جا کر اس نے ٹائروں کو چیک کیا۔ وہ مٹی اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ چند لمحے کے معائنے کے بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ’’شراب فروش بوڑھے کے کہنے کے مطابق جس وقت تم نے انگلیل روڈ کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ اس وقت موسلا دھار بارش کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے بیان کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمہاری جیپ کے ٹائروں کو بارش کی وجہ سے کیچڑ میں لت پت ہونا چاہیے لیکن یہ گرد آلود ہیں۔ تم اس غیر معمولی بات کی وجہِ تسمیہ بیان کر سکتے ہو؟‘‘

میں نے برجستگی کے عالم میں جواب دیا۔ ’’میں نے گھر آنے کے فوراً بعد کیچڑ سے بھرے ہوئے ٹائروں کو ڈیٹرجنٹ ملے پانی سے دھویا تھا۔ وہ بدنما داغوں کا باعث بن رہے تھے۔‘‘

انسپکٹر کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ’’لیکن تمہاری جیپ کے ٹائر گرد آلود ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر یہ کہنا ناممکن نہیں کہ مہینے بھر سے انہیں دھویا نہیں گیا۔‘‘

میں نے زبردستی قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ’’اگر قریبی ریگستان کا طویل اور پیچیدہ راؤنڈ لگایا جائے تو نئی گاڑی کے ٹائروں کی حالت بھی میری جیپ کے ٹائروں سے مختلف نہیں ہوگی، تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ میں نے آج صبح ہی ریگستان کا طویل چکر لگایا ہے جس کی وجہ سے ٹائر گرد آلود ہیں۔‘‘

انسپکٹر کے چہرے پر سوچ کے تاثرات ابھرے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شراب کی بوتل کو ہونٹوں سے ..... لگایا اور طویل گھونٹ بھرنے کے بعد سرد لہجے میں ہمکلام ہوا۔ ’’گزشتہ رات حادثے کے بعد قصبے کے تمام داخلی اور خارجی راستوں پر چوکیاں بنا کر انہیں بند کر دیا گیا تھا۔ بالفرض اگر تم ریگستان میں جانے میں کامیاب ہو بھی گئے تھے تو وہاں تمہارے آنے اور جانے کا اندراج موجود ہونا چاہیے۔ مجھے اپنا نام بتاؤ۔ میں ابھی معلومات حاصل کر کے واپس آتا ہوں اور اگر تمہارے پاس خرید کردہ جیپ کی کمپنی کا رابطہ نمبر موجود ہو تو مجھے دے دو۔ میں ان سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

میں نے پریشان انداز میں انکار میں سر ہلایا۔

’’ٹھیک ہے میں خود ہی نمبر معلوم کر لوں گا۔ تمہاری شخصیت مشکوک ہے۔ میں مکان کے باہر اپنا آدمی متعین کیے جا رہا ہوں۔ اس لیے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرنا۔ ورنہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ جلد تم سے ثبوتوں کے ساتھ ملاقات ہوگی۔‘‘ وہ گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے کے بعد فیمی گھر میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے انسپکٹر کی آمد سے مطلع کرتے ہوئے تمام بات چیت اس کے سامنے دہرا دی۔ وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولی۔ ’’آپ کو ریگستان کی طرف جانے کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے تھا اور کمپنی سے اسے یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی کہ معلوم کردہ جیپ کے ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام کھدا ہوا ہوتا ہے۔ آپ بُری طرح پھنس چکے ہیں لیکن فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔‘‘

میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اگر حالات سے جان خلاصی کے لیے مجھے گرفتار کروانے کا دل میں تہیہ کر چکی ہو تو پھر تمہارا یہاں بیٹھنا فضول ہے۔ پولیس اسٹیشن جا کر انہیں میرے متعلق دو۔ میں حالات سے دلبرداشتہ ہو چکا ہوں۔‘‘

’’آپ کو دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یقین کر لیجیے کہ میں آپ کو قتل کے جرم میں ملوث نہیں ہونے دوں گی۔ آپ کو کل صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ کل کی صبح جو میئر کی والدہ کے قتل کے طور پر منظرِ عام پر آئے گا۔ یاد رکھیے گا کہ وہی میری مرحوم ماں کا قاتل اور میرا سابقہ شوہر ہوگا۔‘‘

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ مزید بات چیت کے موڈ میں نہیں تھی اس لیے کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد اٹھ کر رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے آدھے گھنٹے کے بعد انسپکٹر گھر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’چوکی پر مامور اہلکاروں نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ تم قصبے سے باہر نہیں گئے تھے اور جیپوں کی خرید و فروخت والی کمپنی نے بھی اس بات کی ہامی بھری ہے کہ تمہارے پاس موجود جیپ کے ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام پرنٹ ہوتا ہے۔ میرے پاس تمہارے مکان کی تلاشی کے وارنٹ موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جیپ کے اصل ٹائر گھر میں پوشیدہ ہیں۔‘‘

میں نے بے بسی کے عالم میں اسے تلاشی کی اجازت دے دی اور وہ مکان کو کھنگالنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ناکام و نامراد میرے سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ ’’وہ یہاں نہیں ہیں۔ شاید تم نے انہیں کہیں اور منتقل کر دیا ہے۔ تم سے اگلوانا میرے لیے مشکل نہیں ہے لیکن میں اس وقت تمہیں گرفتار نہیں کرنا چاہتا ہوں..... کل صبح میئر کی آمد کے فوراً بعد تمہیں اس کے سامنے پیش کر دوں گا۔ تب تک تمہیں مکان میں نظر بند رہنا ہوگا۔‘‘

میں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ مکان سے باہر نکل گیا۔

رات گزر گئی۔ صبح حبس زیادہ تھا۔ یہ گرم ترین دن کی پیش گوئی تھی۔ میں نے بے دلی کے ساتھ ناشتا کیا پھر اب تک کے حالات کی آگاہی کے لیے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی پر خبریں سننے لگا۔ یہ مقامی چینل تھا اور اس پر قصبے کے حالات پر تبصرہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اچانک نشریات بند کر کے بریکنگ نیوز نشر کی جانے لگیں۔ جس کے مطابق میئر کی آمد گھنٹے..... کے دوران متوقع تھی۔ اینکر نے مزید بتایا۔

رواں دن کی شروعات کے دوران میئر کی بوڑھی ماں کا قاتل پولیس گرفتار کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن ان کے کہنے کے مطابق یہ گرفتاری میئر کی آمد تک جان بوجھ کر پسِ پشت ڈالی جا رہی ہے۔ میئر کی آمد کے فوراً بعد ہنگامی طور پر مجرم کو میڈیا کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ میں نے ٹی وی کا بٹن آف کر دیا اور شراب کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ میری شراب نوشی حالات کی پیچیدگیوں کی وجہ سے اپنی انتہا کو پہنچتی جا رہی تھی۔ ایک دن قبل خریدا ہوا کریٹ ختم ہونے والا تھا۔ دروازے کی گھنٹی نے بج کر ہنگامہ خیز دن کا اعلان کیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے فیمی کو کھڑے ہوئے پایا۔ وہ بہترین لباس میں ملبوس تھی اور اُس کے چہرے پر طمانیت رقص کر رہی تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھنے کے بعد بولی۔

’’ٹی وی کو آن کر دیجیے۔ کچھ ہی دیر میں میئر کی والدہ کے قاتل کا اعلان کیا جانے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اعلان آپ کے حق میں مفید ہوگا۔‘‘

میں نے اٹھ کر ٹی وی آن کر دیا۔

چینل پر حالاتِ حاضرہ سے متعلق کوئی پروگرام پیش کیا جا رہا تھا۔ دوسرے چینلز کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ فیمی کے چہرے پر سنجیدگی بھرے تاثرات تھے اور وہ گہری سوچ میں گم تھی۔ میں نے کچھ پوچھنا مناسب خیال نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ ٹی وی دیکھنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے بعد بلیٹن پیش کیا جانے لگا۔ مختصر خبروں کے بعد اینکر نے بتایا کہ چند لمحات کے بعد قاتل کو منظرِ عام پر پیش کیا جانے والا ہے۔ ہمارا چینل یہ سب کچھ لائیو ٹیلی کاسٹ کرے گا۔ آپ سے گزارش کی جاتی ہے کہ چینل کو تبدیل نہ کیجیے گا۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ متوقع پردہ کشائی قصبے کے ایک رہائشی کی مرہونِ منت ہے جس کا نام صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے۔ ہمارے چینل کا کیمرا مین اور اینکر قاتل جیپ کی جائے پوشیدگی کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر بعد آپ سب کچھ اپنے ٹی وی اسکرین پر بخوبی دیکھ سکیں گے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی فیمی کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے اسکرین کو گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

میں نے پوچھا۔ ’’شاید قصبے کے اس رہائشی سے گزشتہ روز میری ملاقات ہو چکی ہے۔ کیا وہ احمد نہیں ہے۔ جس کے ساتھ تم شادی کرنا چاہتی ہو؟‘‘

فیمی کرب انگیز لہجے میں بولی۔ ’’مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ کون ہے۔ میں تو صرف اپنی ماں کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس دفعہ قانون میرا ساتھ دے گا۔‘‘

اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ ’’ناظرین اب ہم آپ کو لائیو منظر دکھانے والے ہیں۔ آپ اسکرین کی طرف متوجہ ہو جائیے۔‘‘

اس کے خاموش ہونے کے بعد جو منظر نمودار ہوا وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کی نامکمل عمارت کے سامنے کا تھا۔ عمارت کے سامنے چینل کی وین کھڑی تھی۔ اینکر اور کیمرا مین کے علاوہ قصبے کا وہ رہائشی چہرے کو نقاب کے پیچھے پوشیدہ کیے کھڑا تھا۔ کریو کے ایک آدمی نے گیٹ پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اینکر مائیک کو ہاتھ میں تھامے کریو کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ وہاں سامنے چند ایسی جیپیں کھڑی تھیں جو ہیوی ہونے کے علاوہ جدید بھی تھیں۔ اینکر مائیک کو چہرے کے قریب لاتے ہوئے پُرجوش لہجے میں بولا۔ ’’ناظرین! جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم اس وقت پولیس اسٹیشن کی عمارت کے اندر کھڑے ہیں اور ہمارے سامنے تین عدد ایسی جیپیں کھڑی ہیں جن کا تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ کے سرکردہ افراد سے ہے۔

PakiBooks Site

آپ ہمارے ساتھ کھڑے قصبے کے اس رہائشی کو بہ خوبی دیکھ رہے ہوں گے جس کی نشاندہی کی بدولت ہم مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہونے والے ہیں۔ مجھے بتایا جارہا ہے کہ میسز کی گاڑی قصبے میں داخل ہو چکی ہے۔ اگر وہاں موجود ہمارے چینل کے نمائندوں میں سے کوئی ان کے قریب موجود ہے تو مہربانی کرکے انہیں ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ نشاندہی کے فوراً بعد مجرم قصبے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔

بات مکمل کرنے کے بعد اس نے کیمرا مین کو جیپوں کے ٹائروں کو فوکس کرنے کا حکم دیا۔ کیمرے کا رخ اینکر سے ہٹ کر جیپوں کے ٹائروں کی طرف ہوا۔ دو جیپوں کے ٹائر ہر قسم کے مونوگرام سے مستثنیٰ تھے لیکن تیسری جیپ کے ٹائر پر فورڈ کمپنی کا مونوگرا بنا ہوا تھا۔ اینکر نے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس اہلکار سے پوچھا۔ ''یہ جیپ کس کی ہے؟''

اہلکار نے بتایا۔ ''انسپکٹر آغا ریحان کی...... وہ عمارت کے اندر موجود ہے۔''

کیمرا مین نے جیپ کا کلوزاپ مکمل کرنے کے بعد جیپ کے اندر کا منظر فلمبند کرنا شروع کیا۔ وہاں ڈیش بورڈ کے نیچے شراب کی خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اینکر نے بوتل کو سر کے پاس سے تھامتے ہوئے کیمرے کی طرف کیا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''ناظرین! آپ اپنے ٹی وی اسکرین پر شراب کی بوتل کو دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ وہی برانڈ ہے جس کی کرچیاں ہمیں جائے حادثہ پر دستیاب ہوئی تھیں۔ قصبے کے شراب فروش بوڑھے کا بیان ہم مجرم کی گرفتاری کے بعد پیش کریں گے جس کے مطابق قتل والی رات مطلوبہ شراب کی بوتل خریدنے کے لیے انسپکٹر آغا ریحان اس کی دکان پر آیا تھا۔''

میں نے چونکتے ہوئے فیمی کی طرف دیکھا وہ سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔ ''بوڑھا کئی ہزار کی تگڑی رقم ..... کے بعد بیان دینے کے لیے رضامند ہوا ہے۔ یہ رقم میں نے آپ کے کھاتے میں لکھ دی ہے۔ لیکن درحقیقت انسپکٹر اس دن شراب کی بوتل خریدنے دکان پر گیا تھا۔ وہ بوڑھے کا مستقل گاہک ہے۔''

میں نے دوبارہ نظریں ٹی وی اسکرین پر مرکوز کر دیں۔ اینکر بول رہا تھا۔ ''یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ چند روز قبل انسپکٹر ایسے حادثے میں ملوث پایا گیا تھا جس کی تفصیل میں نے اپنے چینل پر بیان کی تھی۔ شاید آپ میں سے بہت سے ناظرین کو یاد ہوگا کہ اس وقت بھی انسپکٹر نے شراب کے نشے میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے بوڑھے شخص کو نشانہ بنایا تھا۔ اس وقت وہ اپنے اثر و رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے گرفتاری سے بچ گیا تھا لیکن اب سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ دیکھتے ہیں میسز کس حد تک معاملے کو آگے لے جانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ میں ایک دفعہ پھر یقین دہانی کرواتا چلوں۔ کچھ دیر میں قاتل کی گرفتاری کا منظر ہمارے چینل پر براہِ راست پیش کیا جانے والا ہے۔ آپ چینل تبدیل نہ کیجیے گا۔''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے فیمی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے لیکن چہرے پر اطمینان کی لہر موجود تھی۔ میری آنکھوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔ ''پولیس ڈپارٹمنٹ کی زیرِ تعمیر عمارت میں چوکیدار کی عدم موجودگی کے باعث انسپکٹر کی جیپ کے ٹائر تبدیل کرنا اور اس کی جیپ کے اندر خالی شراب کی بوتل کو رکھنا میرے اور احمد کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا۔ انسپکٹر آغا ریحان ہی میرا سابقہ شوہر ہے۔ یقیناً کچھ دیر بعد کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا اور میری ماں کی روح کو بھی تسکین مل جائے گی۔''

میں نے جذباتی انداز میں آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا احسان زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گا۔ تم نے مجھے جس دلدل میں دھنسنے سے بچایا ہے، شاید میں تمام زندگی بھی اس سے نکلنے کی کوشش کرتا رہتا تب بھی باہر نہیں نکل پاتا۔''

فیمی بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اپنی ماں کی موت کا بدلہ مجھے لینا ہی تھا۔ علاوہ ازیں وہ مجھے طلاق دینے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا اور طلاق کے بغیر میں احمد سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ تاہم اس تمام کیے دھرے میں قصوروار آپ بھی ہیں۔ نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کرنا سنگین جرم ہے۔ میسز کی والدہ کے قاتل درحقیقت آپ ہیں۔ اگر اپنے سابقہ شوہر سے مجھے ذہنی عداوت نہ ہوتی تب میں کبھی بھی آپ کا ساتھ نہ دیتی۔''

میرا سر شرم سے جھک گیا اور وہ میرے ہاتھوں کو جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

پیادہ

امجد جاوید

عوام... سیاست... اور ریاست کے درمیان رابطے کا کام سیاست داں کرتے ہیں... اب یہ عوام کی ذمّے داری ہے کہ وہ ریاست کا حکمران کس کو چُنتے ہیں... اور کس نظام کو اپنے اوپر مسلط کرتے ہیں... لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہر دفعہ عوام دھوکا کھا جاتے ہیں... عوام کو آج تک اپنے ووٹ کی اہمیت کا اندازہ نہیں... عوام کی ذمّے داری ہے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت سے ایسے شخص کا چناؤ کریں جو اپنا تاریخی اور سیاسی پس منظر رکھتا ہو... سیاست دانوں کی سیاست پر مبنی ایک تیز رفتار کہانی... اپنے مفادات کی بساط پر بچھائے گئے مہروں کی اکھاڑ پچھاڑ...

الیکشن کی گہما گہمی...... سیاست و ریاست
کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھاتی یادگار تحریر

دوپہر کا سورج جیسے سوا نیزے پر آگیا ہو۔ گرمی کی شدت سے پرندے اپنے گھونسلوں میں چھپ گئے تھے۔ آسمان پر کہیں بھی بادل کا ایک ٹکڑا نہیں تھا کہ بارش کی کوئی امید ہی پیدا ہو جائے۔ ایسے میں گاؤں کے چوک میں رونق لگی ہوئی تھی۔ چوک پر لگے بڑے بڑے نیم کے درختوں کے نیچے بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں بچے، بوڑھے، نوجوان اور ادھیڑ عمر ہر طرح کے لوگ تھے۔ چوک میں دو دکانیں تھیں۔ وہ دکان دار بھی وہیں آبیٹھے تھے۔

PakiBooks.Site

درختوں کی گھنی چھاؤں میں کچھ چارپائیوں پر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ کچھ زمین پر لکیریں ڈال کر ''بارہ ٹہنی'' کھیل رہے تھے۔ کوئی ہاتھ میں سیل فون تھامے اپنی چیٹ میں مشغول تھا۔ ایک طرف زمین پر چادر بچھائے چار افراد تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ ان کے اردگرد کھڑے لوگ کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کا شور زیادہ تھا۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ پتے پر پتا پھینکا جا رہا تھا۔ ایسے میں اسلم نے تاش کا پتا زور سے پھینکا اور ساتھ میں زور سے کہا۔ ''یہ لو پھر بیگم.....''

اس کے ساتھ ہی چند تحسین آمیز آوازیں ابھریں۔ اگلے ہی لمحے مشتاق نے اس سے بھی زور سے پتا مارتے ہوئے کہا۔

''یہ لے پھر تیری بیگم کی.....'' یہ کہتے ہوئے اس نے جذبات میں ایک گندی گالی دے دی۔ گالی کا ارتعاش ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اسلم نے ایک زناٹے دار تھپڑ مشتاق کے کان کے نیچے رکھ دیا۔ چٹاخ کی زوردار آواز ابھری تو وہاں سناٹا چھا گیا۔ سبھی دم بخود رہ گئے کہ یہ کیا ہوا؟ اس کے ساتھ اسلم نے کئی گالیاں مشتاق کو دے ڈالیں۔ مشتاق کو ایک لمحہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ جب اسے اتنے لوگوں میں اپنی ذلت کا احساس ہوا تو وہ انتہائی سرعت سے اٹھا اور اس نے اسلم کے ٹھوکر ماردی جو اس کے سینے اور گردن کے درمیان لگی۔ اسلم پیچھے گرا اور زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اُٹھا اور اس نے مشتاق کا گریبان پکڑ کر اس کے منہ پر پے در پے دو تین گھونسے مار دیئے۔ اتنی دیر میں بیچ بچاؤ کرانے کے لیے کئی نوجوان اٹھ گئے۔ ایک بندے نے مشتاق کو پکڑ کر وہاں سے لے جانا چاہا تو اس نے اسی نوجوان کے تھپڑ مارتے ہوئے غصے میں اسے گالی دی۔

اسے وہاں سے لے جانے والا نوجوان تھپڑ کھا کر حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید تھپڑ کھانے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا گالی دینے پر اس کا دماغ خراب ہوا۔ اس نے مشتاق کو گریبان سے پکڑا اور دھکا دے دیا اور اس کے اوپر چڑھ کر اسے مارنے لگا۔ ایسے میں مشتاق کا ایک کزن بھی وہیں تھا، وہ بھی اسے مارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جو لڑائی ختم کروانا چاہتے تھے مگر وہ بھی تھپڑوں اور گھونسوں سے نہ بچ سکے۔

وہاں پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون کسے مار رہا ہے اور کون چھڑوا رہا ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی کسی کا لگتا تھا۔ ہوا یہ چاہیے تھا کہ اردگرد کے لوگ بیچ بچاؤ کراتے اور انہیں الگ کر دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جو اسلم کے حامی تھے، مشتاق پر ٹوٹ پڑے۔ مشتاق کو پٹتا دیکھ کر مشتاق کے حامی بھی لڑنے لگے۔ وہاں ایک دم سے میدان گرم ہو گیا۔ ایک دو منٹ کے اندر اندر درختوں کی چھاؤں کے نیچے ماحول بدل کر رہ گیا۔ دونوں طرف ہی سے مغلظات کا طوفان امڈ کھڑا ہوا تھا۔

چوک میں ہاہا کار مچ گئی تھی۔ تبھی وہاں بیٹھے بزرگوں کو خیال آیا کہ معاملہ بڑھ گیا ہے وہ اٹھ کر ان کا بیچ بچاؤ کرانے لگے۔

''اُوئے خدا کے لیے، ان کا بندوبست کرو، یہ مر جائیں گے۔''

ایک بزرگ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ تبھی کچھ لوگوں کو خیال آیا اور وہ زخمیوں کو لے کے اسپتال کی جانب بھاگے۔ اسلم کے زخمی ساتھی کو بھی وہاں پر موجود لوگوں نے کار میں ڈالا اور فوراً شہر لے کر دوڑے۔ تاش کے پتے وہیں بکھر کے رہ گئے۔ چوک میں اس ہنگامے کی بازگشت رہ گئی۔ کوئی غصے میں آ گیا تھا تو کوئی ان کی بے وقوفی پر افسوس کر رہا تھا۔

اگلے دو گھنٹوں تک وہ تھانے سے ہو کر پٹی کروا چکے تھے۔ ان میں سے کئی لوگوں کو چوٹیں آئی تھیں۔ وہ اپنی چوٹیں سہلا کر مخالف پارٹی کو قہر بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں طرف ہی سے پرچہ درج ہو چکا تھا۔

☆☆☆

چوہدری فرحان اپنے ٹھنڈے بیڈ روم میں محو استراحت تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے دیوار پر ایل ای ڈی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ وہ چند ماہ پہلے لندن سے پاکستان آ گیا تھا۔ وہ کئی برس پہلے وہاں پڑھنے کے لیے گیا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس نے نہ صرف وہاں کی شہریت اختیار کر لی بلکہ اپنا چھوٹا سا کاروبار بھی جما لیا تھا۔ اب اس کا بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ اس نے وہ سارا بزنس سنبھال لیا تھا۔ پاکستان میں اس کا باپ سیاست میں ایک نام رکھتا تھا۔ اس نے کبھی الیکشن نہیں لڑا تھا لیکن وہ جس کے ساتھ ہوتا، وہ دھڑا جیت جایا کرتا تھا۔ اس میں اس کے باپ کا بھی مشاہدہ ہوتا تھا کہ کون سی پارٹی بھاری ہے، وہ اسی کا ساتھ دیتا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ دنیا سے کوچ کر گیا تو چوہدری فرحان کو وطن واپس آنا پڑا۔

لندن میں رہ کر اس نے ساری زندگی جد و جہد کی

تھی۔ وہ یہاں فارغ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کی جو سو ڈیڑھ سو ایکٹرز زمین تھی، اس پر مزارع کام کرتے تھے۔ وہ جیسے ہی یہاں آیا تھا، اس کے اردگرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ہر کوئی اسے مشورہ دیتا۔ ایک نے اسے فیکٹری لگانے کا مشورہ دیا، جسے اس نے بہت پسند کیا۔ اس نے گھی بنانے والی فیکٹری لگانے کا منصوبہ بنایا اور اس پر کام شروع کر دیا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں کسی بھی کام کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ دو ماہ بعد ہی اسے پتا چل گیا کہ یہاں گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا۔ وہ پریشان ہو کر رہ گیا۔

اس کے بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ کام کیسے چلتا ہے۔ وہ فیکٹری پر کافی سے زیادہ سرمایہ کاری کر چکا تھا اور اسے ہر حال میں مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے دوستوں سے مشورہ کیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا باپ سیاست میں کیوں سرگرم رہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی سیاست کرے گا۔ ورنہ ممکن ہے اسے یہاں فیکٹری ہی نہ لگانے دیں۔ اس کے باپ کے دوستوں کو بھی امید ہو گئی کہ یہ چوہدری فرحان بھی انہی کے ساتھ چلے گا لیکن چوہدری فرحان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہی تھا کہ وہ علاقے کے بڑے بڑے جگادری قسم کے سیاست دانوں کے سامنے کیسے اپنا رنگ جما سکے گا؟ وہ اپنے باپ کی طرح صرف حلیف بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا، وہ خود سیاست کے میدان میں کھلاڑی بن کر اترنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے اردگرد لوگوں میں چند بندے چن لیے۔ ان میں ایک فلک شیر تھا جو علاقے کے بارے میں بہت جانتا تھا اور اس کے باپ کے بھی بہت نزدیک رہا تھا۔ وہ اس کی بات پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اسی نے کہا تھا کہ ابھی الیکشن بہت دور ہیں۔ مناسب وقت پر حلقے میں انٹری دیں گے اور پھر ایک بھرپور مہم چلائیں گے تاکہ پورے حلقے میں خود بخود مشہوری ہو جائے۔ اس لیے چوہدری فرحان محدود تھا لیکن اندر ہی اندر کام جاری تھا۔

یخ بیڈ روم میں فلم کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ پوری محویت سے فلم دیکھ رہا تھا۔ انہیں لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے، ایل ای ڈی کی آواز میوٹ کی اور کال ریسیو کر لی۔

''ہاں بول فلک شیر، کیا بات ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''چوہدری صاحب، آج قدرت نے وہ موقع دے دیا ہے جس کا ہمیں انتظار تھا۔ باہر نکلنے کی تیاری کریں۔'' دوسری جانب سے فلک شیر نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

''اُوئے بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟''

''اپنے گاؤں میں دو گروپ آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ اس وقت وہ اسپتال میں پڑے ہیں۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔

''کس بات پر لڑے؟'' چوہدری فرحان نے پوچھا تو فلک شیر نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''او چوہدری صاحب وہ کسی بھی بات پر لڑے ہوں، بس لڑ پڑے ہیں، یہی وقت ہے سیاست میں انٹری کا۔ ہمیں ایک گروپ کو سپورٹ کرنا ہے اور ان دونوں کی صلح نہیں ہونے دینی۔''

''تمہاری بات تو ٹھیک ہے، لیکن کیا کسی گروپ کے بندے نے تمہیں مدد کے لیے کہا ہے؟'' چوہدری فرحان نے پوچھا۔

''کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے فرق نہیں پڑتا، ہم نے اپنا کام نکالنا ہے، دونوں گروپ مجھے جانتے ہیں۔ جس نے پہلے مدد کے لیے کہہ دیا، ہم اسی کے ساتھ ہیں۔ آپ بس جلدی سے تیار ہو جائیں۔'' اس نے کہا۔

''میں تیار ہو جاتا ہوں لیکن تم ذرا بات کر لو پھر جہاں تم پہنچنے کو کہو گے میں آ جاتا ہوں۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے مگر یہ بات یاد رکھیں، شام ہونے سے پہلے تک میاں طارق نے ان کی صلح کروا کر سارا کریڈٹ لے جانا ہے۔ اس سے پہلے پہلے ہمیں.... اپنا کام کرنا ہے۔'' فلک شیر نے اسے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلایا تو وہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''چل میں آ رہا ہوں، اسپتال ہی۔ تم انہیں ذہنی طور پر تیار کرو۔'' اس نے کہا تو فلک شیر بولا۔

''نہیں نہیں، اسپتال نہیں آنا، تھانے جانا ہے۔ انسپکٹر کو قابو کرنا ہے۔''

''اچھا میں سمجھ گیا لیکن تم اپنی پارٹی کے بارے بتا دینا۔'' یہ کہہ کر اس نے کال منقطع کر دی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

چوہدری فرحان کو ابھی ان کاموں کا تجربہ نہیں تھا لیکن اسے پتا تھا کہ ایسے معاملات ہوتے کیسے ہیں۔ اس کا کزن ایک پراناٹل اونر تھا۔ اس نے اپنے اسی کزن کے کہنے پر گھی کی مل لگائی تھی۔ مستریوں سے لے کر انجینئر تک اسی نے

PakPoint.me

بجھوائے تھے۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک تھے۔ اس معاملے میں بھی چوہدری نے اپنے کزن سے مدد لینے کا سوچا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور اس کا نمبر ملا دیا۔

''ہاں جی، حکم جناب۔'' دوسری جانب سے کال ریسیو کرتے ہی کہا گیا۔ تبھی اس نے اختصار سے سارا معاملہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بندہ دو جو اس انسپکٹر کا گرو ہو۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ تم دس منٹ انتظار کرو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے کزن نے فون بند کر دیا۔ چوہدری فرحان کو یہ دس منٹ گزارنا بہت مشکل ہو گئے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد فون آ گیا۔

''کچھ بنا؟'' چوہدری فرحان نے بے تابی سے پوچھا۔

''اصل میں یہ معمولی سا کام تھا انسپکٹر لیول کا، کسی بڑے بندے کی بات کرتے تو جلدی ہو جاتا تھا۔ خیر، ابھی تمہیں کچھ دیر بعد اسی انسپکٹر کا فون آ جائے گا۔ اسے اپنی بات سمجھا دینا اور اس کو ساتھ رکھنا۔ اگر اس کا تبادلہ بھی ہو جاتا ہے تو اگلے بندے کو بھی تمہارے بارے بتا کے جائے گا۔ اب دوبارہ مجھے اتنے چھوٹے بندے کے لیے نہیں کہنا۔'' اس کے کزن نے کہا اور فون بند کر دیا۔ چوہدری فرحان نے اس پر شرمندگی محسوس نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی خامی ہے۔ اس خامی کو دور کیسے کرنا ہے، وہ یہ جانتا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد چوہدری فرحان کی فورویل تھانے کے باہر رکی۔ ایک گارڈ نے جلدی سے اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ باہر نکلا تو اس نے سفید کاٹن کا شلوار قمیص اور سیاہ چپل پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ، ہاتھ میں قیمتی گھڑی اور سلیقے سے سنوارے ہوئے بال۔ وہ بڑے کروفر سے اترا اور اندر کی جانب چل پڑا۔ وہ انسپکٹر کے کمرے میں گیا تو وہاں میاں طارق کے ساتھ چند معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ چوہدری فرحان نے بڑے احترام کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا پھر سب سے مل کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''لو جی اب چوہدری صاحب بھی آ گئے ہیں، جو بات کرنی ہے، شروع کریں۔'' انسپکٹر نے سکون سے کہا تو میاں طارق نے کہا۔

''او یار بات کیا کرنی ہے، بس یہ بے وقوف یونہی آپس میں لڑ پڑے ہیں، کون سا ان کی دشمنی ہے۔ ان کی صلح کروائیں، پرچہ خارج کر کے انہیں گھر جانے دیں۔''

''کیا یہ صلح اتنی آسان ہے میاں صاحب، ایک بندہ زیادتی کرے اور پھر اس سے صلح بھی کریں۔'' اسلم نے آگے بڑھ کر جذباتی لہجے میں کہا۔

''تم سب ایک جیسے ہو، بھئی لڑے.....'' میاں طارق نے کہنا چاہا تو اسلم نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''نہیں میاں صاحب، یہ مشتاق، بندے کو بندہ نہیں سمجھتا، ہر بندے کو گالی دیتا ہے، یہ ایسا صرف اس لیے کرتا ہے کہ آپ کی شاباشی ہے اسے، یہ آپ کا بندہ ہے۔ اس لیے اسے اتنی جرأت ہو گئی ہے۔''

''او یار خدا کا خوف کرو، میرا بندہ، تم بھی تو میرے بھائی ہو، میرے بچوں کی طرح ہو۔ میرے لیے تو تم سب ایک جیسے ہو۔'' میاں طارق نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر مجھ سے زیادتی ہوئی ہوتی تو آپ یوں آتے، چند دن پہلے جو خدا بخش کا تنازعہ بنا تھا اس کے ساتھ، آپ نے وہاں بھی اس کی حمایت کی۔'' ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا تو میاں طارق بولا۔

''وہ تو معاملہ ہی دوسرا تھا لیکن کیا تم نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے مشتاق سے لڑ کر؟''

''دیکھا، ہم جانتے ہیں کہ آپ اسی کی حمایت کریں گے۔'' اسلم نے تیزی سے کہا تو ایک طرف کھڑے مشتاق نے نخوت سے کہا۔

''تم لوگوں سے کون صلح کر رہا ہے، وہ تو میاں صاحب بڑے ہیں اس لیے خاموش تھا۔ نہیں میاں صاحب ہمیں نہیں کرنی صلح۔''

یہی وہ موقع تھا جہاں چوہدری فرحان کو محسوس ہوا کہ اسے بولنا چاہیے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''میاں صاحب، اپنے لوگوں کو آپ اتنی ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ کسی کے بھی گلے پڑ جائیں۔ کیا کسی غریب کو جینے کا حق نہیں ہے؟ آپ کچھ خیال کریں۔ ان لوگوں کو جینے دیں۔ ایسے تو نہ کریں سیاست۔''

اس کے یوں کہنے پر میاں طارق نے حیرت سے چوہدری فرحان کو دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے خود پر قابو پا کر سکون سے بولا

''چوہدری صاحب، یہ سیاست نہیں ہے۔ سیاست ایسے نہیں کی جاتی، میں صلح کروا رہا ہوں۔ انہیں آپس میں لڑوا نہیں رہا۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیاست ان لوگوں کو آپس

میں لڑوانے کا نام ہے۔'' چوہدری فرحان تیزی سے بولا۔

''کیا چاہتے ہیں آپ؟'' میاں طارق نے سکون سے پوچھا۔

''جس نے زیادتی کی ہے، اُسے سزا ملنی چاہیے اور جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، کم از کم اس کی بے گناہی کا احساس کرنا چاہیے۔ اب اگر آپ کا بندہ کھلی بدمعاشی کرے تو دوسروں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ دوسروں کو بھی جینے کا حق دیں۔'' چوہدری فرحان نے بڑے سکون سے جواب دیا تو میاں طارق مسکرا دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ آخر وہ بھی ایک گھاگ سیاست داں تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں بولا۔

''چلیں پھر ہم سب چلتے ہیں، جو پولیس کرتی ہے کرنے دیں۔''

''پولیس کا یہ کام ہے، وہ تفتیش کرے جس نے زیادتی کی ہے، اسے سزا ملنی چاہیے۔'' چوہدری فرحان نے سخت لہجے میں کہا۔

''وہی تو کہہ رہا ہوں۔ آؤ چلیں۔ ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں پھر۔'' میاں طارق نے بھی سختی سے کہا۔

''او نہیں جی نہیں، ہم کروالیں گے اپنی ضمانتیں۔ بھگت لیں گے یہ کیس، لیکن کسی سے صلح نہیں کرنی۔ اب ہم دیکھیں گے کون گاؤں میں بدمعاشی کرتا ہے۔'' اسلم نے جذباتی انداز میں کہا تو مشتاق بھی تنک گیا۔

''اب بدمعاشی تو تیری نکالنی ہی پڑے گی مجھے۔''

''ٹھیک ہے جی، میں تو چلتا ہوں۔'' میاں طارق نے دونوں طرف کے تیور دیکھے اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ اس کے ساتھ آئے لوگ بھی باہر کی جانب چلے گئے۔ تبھی انسپکٹر نے دونوں پارٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لے جاؤ ان سب کو اور الگ الگ ڈال دو حوالات میں۔''

اگلے چند منٹ میں وہ سبھی حوالات میں تھے۔ چوہدری فرحان نے مسکرا کر انسپکٹر کی طرف دیکھا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر چل دیا۔ وہ چلتا ہوا اس حوالات کے سامنے آن رکا، اسلم اس کے قریب آ گیا۔ دونوں کے درمیان سلاخیں تھیں۔ چوہدری فرحان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''گھبرانا نہیں اسلم، ابھی میرا وکیل آ جاتا ہے۔ وہ تم سب کی ضمانتیں کروا لے گا۔ تم لوگوں کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اسلم نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو چوہدری فرحان نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ آج وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔

☆☆☆

گاؤں کی فضا میں نفرت گھل چکی تھی۔ چوک میں لگے نیم کے درختوں کے نیچے وہ رونق ہی نہیں رہی تھی۔ اب چند بزرگوں کے علاوہ کچھ بچے ہوتے تھے۔ وہ بھی اگر کوئی کھیل کھیلتے یا تھوڑا شور کرتے تو وہ بیٹھے بوڑھے انہیں بھگا دیا کرتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے لوگ ایک دوسرے سے محتاط ہو گئے تھے۔ مشتاق تو اب اپنے ساتھ پسٹل بھی رکھنے لگا تھا۔ وہ اندر سے کافی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ تھانے میں تو وہ اپنے ہی غصے میں اندھا ہو چکا تھا لیکن بعد میں اُسے جب ہوش آیا تو وہ بہت اُلجھ چکا تھا۔ وہ بڑکیں تو مار بیٹھا تھا لیکن اب اس کا اپنا حال تنگ ہو گیا تھا۔ پولیس سے جان چھڑوانے، ضمانت کروانے اور عدالت تک جانے میں جو رقم خرچ ہوئی، سو ہوئی، وہ اپنے کام کاج سے بھی جاتا رہا۔ اسے اپنے ساتھ دو بندے بھی رکھنے پڑتے تھے۔ نجانے کب کس دشمن سے سامنا ہو جائے۔ وہ جھکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اسلم وغیرہ آئیں اور آ کر اس سے معافی مانگیں۔ اس طرح صلح ہو سکتی ہے ورنہ وہ خود جا کر صلح نہیں کرے گا۔

دوسری طرف بھی یہی حال تھا۔ وہ لوگ صلح کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں مالی لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ انہیں بس یہ پتا ہوتا تھا کہ عدالت میں پیشی کس دن ہے۔ وہ اس دن جاتے تھے اور تاریخ لے کر آ جاتے تھے۔ باقی وکیل جانے اور اس کا کام۔ ان کے پیچھے چوہدری فرحان کھڑا تھا۔ اسلم اور اس کی پارٹی کا جو بھی صلاح مشورہ ہوتا، وہ فلک شیر سے کرتے، وہ آ کے چوہدری فرحان کو بتا دیا کرتا تھا۔

مشتاق کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اپنی ہزیمت کا بدلہ لے۔ آخر ایک دن اسے خیال آ ہی گیا۔ گاؤں کے ساتھ بہنے والی نہر سے جو کھالا آتا تھا۔ وہ مشتاق کی زمینوں کے درمیان سے گزر کر جاتا تھا۔ آگے اسلم کے کھیتوں کو اسی کھالا سے پانی لگتا تھا۔ ایک دن مشتاق نے اس وقت کھالا توڑ دیا جب اسلم کے کھیتوں کو پانی لگ رہا تھا۔ کسان کے لیے سب سے اہم اس کا پانی ہوتا ہے اور پانی پر بھائی بھائی کا قتل کرتا آیا ہے۔ آبی ماہرین تو اب جا کے یہ بات کر رہے ہیں کہ آنے والے

Pak Books.Site

دنوں میں پاکستان میں شدید ترین پانی کی قلت ہونے جا رہی ہے اور اقوام متحدہ کا دعویٰ ہے کہ آنے والے دور میں جنگیں پانی کی وجہ سے ہوں گی لیکن اس ایک کھال پر ایک جنگ ہونے جا رہی تھی۔ اسلم جانتا تھا کہ اس کی زمین کو بنجر کرنے کی یہ سازش مشتاق نے کی اور مشتاق کے پیچھے میاں طارق کا ہاتھ ہے۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

اس لیے پہلے صلح سے ہی اس بات کو ختم کرنا چاہتا تھا جب اس سے بات نہ بنتی تو ظاہر ہے اس کے بعد لڑائی ہی ہونا تھی۔ جس میں کسی کا کچھ بھی نقصان ہو سکتا تھا۔ اسلم سمجھ رہا تھا کہ مشتاق نے یہ شرارت کیوں کی ہے۔ اس لیے اس نے تھوڑا تحمل سے کام لیا اور اس نے یہ بات گاؤں والوں کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اسی ڈر، خوف اور نفرت کے ماحول میں چوک والے نیم کے درختوں کے نیچے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں پر اسلم اور اس کے چند ساتھی بھی آگئے۔ انہوں نے آکر کھال والی ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی۔ تبھی ایک بوڑھا بولا۔

''یار بات یہ ہے کہ تم دونوں کی لڑائی ہے۔ مشتاق نے ایسا کرنا ہی تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میری مانو تو دونوں صلح کرلو، اس لڑائی بھڑائی میں کچھ نہیں رکھا۔''

''اسی لیے تو میں آپ سب کے پاس آیا ہوں۔ آپ اُسے سمجھائیں۔ لڑائی میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب اس نے پانی روک کر جھوخود لڑنے والی بات کی ہے۔ اس بار تو اس نے میرا پانی ضائع کر دیا۔ اگلی بار بھی اس نے ایسا کیا تو پھر کیا ہوگا؟'' اسلم نے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہا۔

''بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، وہ کھال سب کا مشترکہ ہے، اس کی ملکیت تو نہیں ہے۔'' دوسرے بزرگ نے کہا۔

''مشتاق جان بوجھ کر شرارت کر رہا ہے۔ ہمیں اسے روکنا چاہیے۔'' ایک بوڑھے نے صلاح دی۔

''ہم اسے سمجھاتے ہیں۔ اگر ہماری بات مان گیا تو۔'' تیسرے نے کہا تو اسلم ان کے پاس سے اٹھ آیا۔ اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔ بوڑھوں نے مشتاق کو بلا بھیجا۔ اس تک خبر پہنچ گئی تھی کہ اسلم ان بزرگوں کے پاس سے ہو کر گیا ہے۔ وہ ان کے بلانے پر آ گیا۔ ساری بات سن کر بولا۔

''دیکھیں جی، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ چوہوں کے بلوں کی وجہ سے وہ کھال ٹوٹ گیا۔ وہ صرف مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔''

''تیرے کھیتوں میں کھال ٹوٹا تو اصول یہ ہے کہ تجھے ٹھیک کرنا تھا یا پھر سب گاؤں والوں کو بتاتا۔ ایسا مت کرو۔ وہ کھال ٹھیک کرواؤ، دوسرے بھی اسی سے پانی لگاتے ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ دشمنی بڑھا رہے ہو۔'' ایک بزرگ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''او بابا تم تو ہو ہی ان لوگوں کے ساتھ۔ نہیں کراتا میں ٹھیک، جسے ضرورت ہے وہ ٹھیک کرالے۔'' مشتاق نے بدتمیزی سے کہا۔

''اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا۔ تھوڑا تحمل سے کام لو۔'' پاس بیٹھے بزرگ نے کہا تو مشتاق بولا۔

''جسے ضرورت ہے وہ خود ٹھیک کرالے نا۔''

اس نے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ اس نے کسی کی بات نہیں مانی۔

اسی سہ پہر گاؤں کے چند لوگ، جن میں اسلم بھی تھا۔ وہ سب ٹوٹے کھال کو خود ٹھیک کرنے چل دیے۔ وہ سارے اس جگہ پہنچے۔ ہر ایک کے پاس اپنی اپنی کسی تھی۔ انہیں احساس تو تھا کہ مشتاق مزاحمت کرے گا۔ اس لیے انہوں نے اپنے کام سے کام رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے کھال کو ٹھیک کر رہے تھے کہ اتنے میں مشتاق اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آن پہنچا۔ اس نے آتے ہی اسلم کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری زمین پر پیر رکھنے کی؟''

''جانے دو یار، ہم مشترکہ کھال پر کھڑے ہیں، تیری زمین پر نہیں۔'' اسلم نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

''یہ مشترکہ کھال میری زمین میں ہے، تیری جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کئی گالیاں دے دیں۔ بلاشبہ وہ لڑنا چاہتا تھا۔ اسلم یہی سوچ کر آیا تھا کہ وہ جو مرضی کہتا رہے، جواباً کچھ نہیں کرنا۔ وہ خاموش رہا اور کھال پر بند باندھنے کے لیے اس نے کسی اوپر اٹھائی۔ سامنے والی پارٹی نے یہی سمجھا کہ وہ کسی مشتاق کے مارنے لگا ہے۔ ایک شور اٹھا اور وہ اسلم کو مارنے کے لیے لپکے۔ اسلم کے ساتھی بھی چوکنا تھے۔ وہ ایک حصار کی صورت میں سامنے آگئے۔ اسلم تک رسائی نہ پا کر انہوں نے سامنے کھڑے لوگوں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ وہ بھی ان سے بھڑ گئے۔ مشتاق پارٹی کی طرف سے ڈنڈے نکل آئے۔ جبکہ اسلم پارٹی نے پہلے ہی ہاتھوں میں کسیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف کی پارٹیاں لڑ رہی تھیں۔ ایسے میں مشتاق نے پسٹل نکالا اور تاک کر اسلم

پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے کاندھے اور سینے کے درمیان لگی، اس نے دوسرا فائر کر دیا۔ اسلم کی ایک چیخ بلند ہوئی۔

''اسلم کو مشتاق نے مار دیا۔''

ایک آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک ماحول بن گیا۔ مشتاق کے ساتھ لڑنے والوں کو یہ بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ یوں قتل بھی کرنا ہے۔ وہ سب ششدر رہ گئے۔ وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مرتے ہوئے اسلم کو دیکھ رہے تھے۔ اسلم کے ساتھیوں نے اسے اٹھایا اور اسپتال کی طرف بھاگے۔ لیکن زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اسلم دم توڑ گیا۔ اس لڑائی میں یہ پہلا قتل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شام ہو چکی تھی۔ چوہدری فرحان اپنے بنگلے کی چھت پر لگائی فائبر کی چھتری کے نیچے ایک صوفہ نما کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں سامنے دھری ایک چھوٹی سی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ یوں تو ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہلکی سی ٹی شرٹ کے ساتھ شارٹس پہنا ہوا تھا۔ اس کے دائیں جانب ائیر کولر رکھا ہوا تھا جو اسے ٹھنڈی ہوا دے رہا تھا۔ وہ کھلے ماحول کا مزہ لینے کے لیے چھت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے صائمہ کا انتظار تھا۔ کہنے کو تو وہ اس کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ صائمہ نے اس وقت اس کے ہاں ملازمت کی تھی جب اس نے گھی بنانے کی مل لگائی تھی۔ چوہدری فرحان اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے اسے مل سے نکال کر اپنی پرسنل سیکریٹری بنایا، پھر اسے اپنی ذاتی زندگی میں داخل کر لیا۔ صائمہ نے تو جیسے ''نہ'' کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ وہی کچھ کرتی جو چوہدری فرحان اسے کہتا۔ بنگلے ہی کے ایک حصے میں اس نے چھوٹا سا آفس بنا کر دیا ہوا تھا۔ جہاں ایک مرد اور تین لڑکیاں اس کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ چوہدری فرحان کا ایک ایسا کمرا بھی تھا، جہاں سوائے صائمہ کے کوئی دوسرا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ خود ہی اس کمرے کو صاف کرتی اور اپنا سارا سامان ادھر رکھتی تھی۔

چوہدری فرحان مختلف حالات میں اس سے مختلف فرمائش کرتا تھا۔ خود صائمہ کو بھی نت نئے فیشن کا شوق تھا۔ جو وہ باہر تو پورا نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کمرے تک ضرور وہ پورا کر لیتی تھی۔

صائمہ چھت پر نمودار ہوئی۔ دراز قد، لمبے بھیگے ہوئے گیسو، جیسے ابھی نہا کر آئی ہو۔ اس نے مختصر سا سلیولیس کا سرخ فراک پہنا ہوا تھا جو بہ مشکل اس کی رانوں تک آ رہا تھا۔

اس کے بعد صرف پیروں میں نازک سی چپل تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ تیکھے نین نقش والی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا بھرپور جسم اس کی نسائیت کا اظہار کر رہا تھا۔ چوہدری فرحان نے اس کے میک اَپ سے عاری چہرے کو دیکھا پھر چٹکی سے اُس کے نرم ہونٹوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم بہت اچھا کرتی ہو صائمہ، میرے پاس آتے ہوئے میک اَپ نہیں کرتی ہو۔ مجھے یونہی اچھا لگتا ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے آج۔'' صائمہ نے اپنے بھیگے ہوئے بال ایک طرف جھٹکتے ہوئے کہا

''ہاں، بولو کیا بات ہے؟'' چوہدری فرحان نے تجسس سے پوچھا۔

''کہنے کو تو میں آپ کی ایک معمولی سی پرسنل سیکریٹری ہوں۔ لوگ بھی مجھے اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب بہت زیادہ وقت میں آپ کے یہاں گزارتی ہوں تو شک ہوتا ہے۔ میں اپنے گھر والوں سے بہانے کر کر کے عاجز آ چکی ہوں۔ میرا بہت زیادہ......'' وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ چوہدری فرحان بول اٹھا۔

''ارے فکر نہ کرو، کچھ دنوں تک سب خاموش ہو جائیں گے۔''

''کیسے خاموش ہو جائیں گے؟ آپ میری بات سمجھ نہیں رہے۔'' اس نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا تو وہ تجسس سے بولا۔

''اچھا سمجھاؤ، بات کیا ہے؟''

''دیکھیں، میرے گھر سے یہاں آنے کا ایک وقت ہے، لیکن واپس جانے کا کوئی وقت نہیں۔ میں نے کبھی آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، بس یہی چاہتی ہوں کہ ایک وقت مقرر ہو اور میں......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''ارے، تمہیں کس نے کہا کہ لگی بندھی تنخواہ میں کام کرو، جو تم میں ہے نا، وہ کسی میں نہیں، اکاؤنٹ تمہارے پاس ہوتے ہیں، گھر والوں کو کچھ زیادہ دے دیا کرو، میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، تم چیز ہی ایسی ہو۔'' اس نے خمار بھرے لہجے میں کہا تو صائمہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

''پھر وہی بات...... آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی پیسے کی بات نہیں کی اور جب بھی پیسے کی بات کرنے کا سوچا تو مجھے یہی سوچ روک لیتی تھی کہ آپ مجھے لالچی سمجھو گے۔''

''جب میں نے تم پر اعتماد کیا ہے تو......'' اس نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں، میں آپ کو سمجھاتی ہوں، میں گھر سے نکلتی ہوں، اس طرح چادر لپیٹ کر کہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے لیکن جب یہاں آجاتی ہوں تو جیسا آپ کہتے ہیں، میں ویسا کرتی ہوں۔ آپ جو کہیں، جیسا لباس پہنائیں، پہن لیتی ہوں، بیڈروم میں جو کہیں، کرتی ہوں۔ لیکن باہر بھی ایک دنیا ہے۔ وہ بھی سوچتی ہے۔ ان کا بھی دماغ ہے۔ میں دنیا کے سامنے اس طرح نہیں آنا چاہتی کہ بدنام ہو جاؤں۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

''گولی مارو دنیا کو، تم کل مجھے اپنا پاسپورٹ دو۔ ہم کچھ دن کسی دوسرے ملک چلتے ہیں، وہاں تو کوئی نہیں دیکھنے والا ہوگا۔ چار دن خوب عیش کر کے آتے ہیں۔ باقی دیکھتے ہیں۔ ابھی اس قدر حسین موسم میں ایسی بات کر کے ماحول تو خراب نہ کرو۔'' چوہدری فرحان نے اسے قریب کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ صائمہ کوئی جواب دیتی، چوہدری فرحان کا سیل فون بول پڑا۔ اس نے اسکرین دیکھی تو وہ فلک شیر کا فون تھا۔ اس نے کال ریسیو کر کے کہا۔

''ہاں بولو، فلک شیر، کیا بات ہے؟''

''وہ مشتاق نے اسلم کو قتل کر دیا ہے۔'' فلک شیر نے اسے اطلاع دی تو ایک لمحے کے لیے چوہدری فرحان کے ذہن میں بھی نہیں آیا کہ اسلم کون اور مشتاق کون۔ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''کون اسلم؟''

''اجی وہی جو ہمارے گاؤں کا تھا اور لڑائی ہوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا اچھا میں سمجھ گیا، بہت بُرا ہوا یار یہ تو۔'' چوہدری نے کہا۔

''میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ ایک تو ہم نے ایف آئی آر درج کروانی ہے، دوسرا ہم نے احتجاج کرنا ہے۔ ہم نے روڈ بلاک کرنی ہے۔ ٹائر جلانے ہیں۔ وہاں آپ کو بھی آنا ہے۔ وجہ یہی ہوگی کہ پولیس ایف آئی آر درج نہیں کر رہی ہے۔''

''میں سمجھ گیا.....'' چوہدری فرحان نے کہا۔

''اس لیے انسپکٹر سے بات کر لیں۔ وہ کوئی قانونی جواز بنا لے گا۔'' فلک شیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں کر لیتا ہوں بات۔'' یہ کہہ کر اس نے کال ختم کر دی۔ پھر لمحہ بھر سوچ کر اس نے صائمہ کی طرف دیکھا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے، تم کل آجانا۔ آج تو یہ قتل کا معاملہ آن پڑا ہے۔''

''ویسے مجھے یہ فلک شیر ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔'' صائمہ نے کہا

''کیوں؟'' چوہدری فرحان نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے یوں گھور گھور کر دیکھتا ہے جیسے ابھی کھا جائے گا، اسے شک ہی نہیں یقین بھی ہے کہ.....'' یہ کہتے ہوئے وہ جان بوجھ کر مسکرا دی۔

''اسے سب پتا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ میرا وفادار ملازم ہے۔ اس کے سینے میں پتا نہیں کتنے راز ہیں۔ خیر اب تم جاؤ۔ کل سہی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ صائمہ اٹھی اور اسی طرح ٹہلتی ہوئی چھت سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

جس وقت چوہدری فرحان روڈ پر پہنچا، گاؤں کے لوگوں نے ٹریکٹر ٹرالیاں لگا کر روڈ بلاک کیا ہوا تھا۔ درمیان میں جو کھلی جگہ تھی، وہاں پر پرانے ٹائروں کو آگ لگائی ہوئی تھی۔ زبردست نعرے بازی ہو رہی تھی۔ روڈ کے دونوں اطراف میں دور دور تک ٹریفک کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ وہاں پر میڈیا بھی پہنچا ہوا تھا۔ چوہدری فرحان جیسے ہی وہاں پہنچا، لوگوں نے جوش میں زیادہ نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ وہ ایک ٹرالی پر چڑھ گیا۔ ایک مائیک اسپیکر اسے تھما دیا گیا۔ اس نے وہ پکڑتے ہی کہا۔

''سنو، میں آپ سب کو ایک خوش خبری دے رہا ہوں، آپ کا یہ احتجاج رائگاں نہیں گیا۔ جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ ہمارے بہت ہی اچھے دوست اسلم کو ایک ظالم شخص نے قتل کر دیا ہے تو میں فوراً تھانے گیا۔ وہاں جا کر مجھے پتا چلا کہ اس ظالم شخص نے کس کے ایما پر یہ ظلم کیا ہے۔ یہ وہی سیاسی شخصیت ہے جو پرچہ درج نہیں ہونے دے رہا تھا۔ میں اس کا نام اس وقت منظرِ عام پر لاؤں گا جب پورے ثبوت میرے ہاتھ میں ہوں گے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں تب ہی وہاں سے اٹھا ہوں جب میں نے پرچہ درج کرا دیا ہے۔ پرچہ ہو چکا ہے۔ یہ اس کی کاپی میرے ہاتھ میں ہے۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ ہجوم میں زبردست نعرے بازی ہونے لگی۔ کوئی اس کے حق میں نعرے لگا رہا تھا، کوئی مخالف کے خلاف، ایک شور تھا جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تبھی اس نے

جشنِ آزادی و ساون نمبر کی مناسبت سے اگست 2018ء کا خوب صورت پاکیزہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ناول کی چونکا دینے والی اقساط

دردانہ نوشین خان نے چھیڑا اچھوتا موضوع اپنے نئے مِنی ناول صُفہ میں

حیا بخاری کے پُراثر قلم سے نکلا ایک یادگار ناولٹ..... محبت لفظ ہے لیکن

تہجد.....قیام اللیل

کے موضوع پر پڑھیے..... شمع ہدایت کے سلسلے

میں اختر شجاعت کی زبردست تحقیق

اس کے علاوہ

نامور قلم کاروں کی متاثر کُن تحریریں جن میں رفاقت جاوید، پروین عذرا تشنہ، اسما طاہر، نگہت غفار، افراح سکندر، فرحین اظفر و دیگر شامل ہیں

دلچسپ معلوماتی، تفریحی و اصلاحی مستقل سلسلے جن میں حسن افزا نسخے، مزیدار کھانوں، کی تراکیب و مسحور کُن شاعری بھی شامل ہے اور یہ سب آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے ہی تو ہے

PakiBooksClub

کچھ لمحے انتظار کے بعد کہا۔

''سنو سنو، اب میں آپ سب بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ یہ احتجاج ختم کریں، اس روڈ پر مسافر بہت اذیت میں ہیں، انہیں جانے کا راستہ دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے مائیک اسپیکر واپس کر دیا۔ پھر ٹرالی سے اتر کر لوگوں کے ہجوم سے نکلتا ہوا اپنی کار میں جا بیٹھا۔ تبھی لوگ اپنی ٹریکٹر ٹرالیاں ہٹانے میں لگ گئے اور روڈ کھلنے لگا۔

چوہدری فرحان سیدھا اسلم کے گاؤں پہنچا۔ وہاں پر جنازہ تیار تھا۔ وہ جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا۔ علاقے بھر سے لوگ وہاں آئے ہوئے تھے۔ اسلم کے رشتے دار، دوست، تعلق دار اور دوسرے وہ بھی جنہیں اس ناگہانی موت پر غم و غصہ تھا۔ جب تک اسلم کو دفنا نہیں لیا گیا، وہ وہیں کھڑا رہا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہونے کو تھا جب وہ واپس اپنے بنگلے پہنچا تھا۔ وہ بہت زیادہ تھک چکا تھا۔

اگلی صبح اسلم کی رسم قل خوانی تھی۔ گاؤں میں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ چوہدری فرحان بالکل اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں پر موجود ہر بندے کو یہ اطلاع تھی کہ رات مشتاق کو پکڑنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ فرار ہو چکا ہے، کہاں ہے اس بارے کسی کو نہیں پتا۔ اس کی گرفتاری کے لیے چھاپا صرف اور صرف چوہدری فرحان کے دباؤ دینے کی وجہ سے پڑا تھا۔ یہ افواہ بھی یا پروپیگنڈا کسی کو اس کی سمجھ نہیں تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ بات لوگوں میں پھیل رہی تھی کہ مشتاق کو میاں طارق نے پناہ دے رکھی ہے۔ وہ اب صلح کی کوشش کر کے مشتاق کو بچا لے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ میاں طارق کے خلاف بھی یہ بات گردش کرنے لگی تھی کہ مشتاق اسی کا آدمی تھا اور اس کے ایما پر ہی اسلم کو قتل کیا گیا تھا۔ وجہ کیا تھی کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ اس افواہ یا پروپیگنڈا کا اثر یہ ہوا کہ جیسے ہی دعا کا وقت ہوا، میاں طارق کی فور وہیل آن رکی۔ وہ اپنی فور وہیل سے اتر کر اس پنڈال کی طرف آ رہا تھا کہ چند جوشیلے نوجوان آگے بڑھے۔ وہ میاں طارق کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ میاں طارق نے ان کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ایک نوجوان نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میاں صاحب، آپ اسی طرح واپس چلے جائیں۔''

''خیر ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے کہا نا کہ آپ واپس چلے جائیں اسی میں خیریت ہے، ورنہ لوگوں میں آپ کے بارے میں بہت غصہ ہے۔'' اس نوجوان نے غصے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں پنڈال سے چند دوسرے نوجوان بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میاں طارق بھانپ گیا کہ معاملہ درست نہیں، لوگوں کے تیور خراب لگتے ہیں اس لیے وہ بولا۔

''میں تو دعا میں شامل ہونے آیا تھا۔ اگر آپ کو میرا آنا پسند نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ واپس پلٹا اور سیدھا اپنی فور وہیل تک گیا، اس میں بیٹھا اور اگلے چند لمحوں میں وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اگلے چند لمحوں میں یہ اطلاع چوہدری فرحان تک پہنچا دی گئی۔ اس نے بغیر کسی ردعمل کے یہ خبر سنی اور ہلکے سے سر ہلا دیا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی فتح پر خوش تھا۔

یہ سارا کارنامہ فلک شیر کا تھا۔ وہ بھی وہیں موجود تھا۔ وہ چھوٹے قد کا فربہ مائل تھا۔ اس کے سر کے بال گھنگریالے اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ موٹے نین نقش کا بندہ تھا۔ خاص طور پر اس کی بے چین آنکھیں سب سے پہلے متوجہ کرتی تھیں۔ اس کے بات کرنے کا انداز بہت دل موہ لینے والا تھا۔ ہر بندہ اس کی بات پر یقین کر لیتا تھا۔ اصل میں اسے مل میں رکھا اس لیے گیا تھا کہ وہ علاقے سے مزدور، مستری یا دوسری افرادی قوت کو پورا کرے۔ وقت کے ساتھ ساتھ چوہدری فرحان کو پتا چل گیا کہ وہ بڑے کام کا بندہ ہے۔ اس نے فلک شیر کو نوٹ دیک کر لیا۔ چھوٹے موٹے مسائل اس نے خود حل کر لیے تھے۔ کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تو خودی ہی حل کر لیتا۔ دھیرے دھیرے وہ چوہدری فرحان کے قریب ہو کر اس کا اعتماد جیت گیا۔ وہ جو غریب آدمی تھا، اتنا کمانے لگا کہ اس نے اپنی چھوٹی سی گاڑی لے لی۔ مل میں اس کی خوب چلتی، جسے چاہتا رکھتا، جسے چاہتا نکلوا دیتا تھا۔

☆☆☆

گاؤں میں مشتاق کی گرفتاری کے لیے لوگ سرگرم تھے۔ رسم قل کی اگلی شام ہی گاؤں کے ایک لڑکے نے سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو اپ لوڈ کر دی۔ اس میں مشتاق کو فائر کرتے ہوئے صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ گالیاں بکتے ہوئے فائر کر رہا تھا۔ تبھی شور اٹھتا ہے کہ مشتاق نے اسلم کو مار دیا۔ اگلے ہی لمحے خون میں لت پت تڑپتا ہوا اسلم دکھائی دیتا ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ منٹ کی ویڈیو ہوگی۔ اس ویڈیو کے اپ لوڈ کرنے کے ساتھ اس لڑکے نے حکام بالا سے یہ

استدعا کی تھی کہ ایک سیاسی گروپ کے بدمعاش نے ایک غریب کسان کو مار دیا۔ وہ قاتل ابھی تک فرار ہے۔ اسے سیاسی دباؤ کی وجہ سے گرفتار نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ چند جذباتی جملے..... جس میں درخواست کی گئی تھی کہ کسی بڑے جھگڑے سے بچنے کے لیے قاتل کو فوری طور پر گرفتار کیا جائے۔

وہ ویڈیو جنگل کی آگ کے مانند پھیل گئی۔ ہر بندے کے پاس اسمارٹ فون ہے اور سوشل میڈیا کے ساتھ منسلک ہے۔ دو دن ہی میں ہر طرف یہ شور مچ گیا کہ آخر پولیس مشتاق کو کیوں گرفتار نہیں کر رہی۔ ایک چینل کے صحافی کے ہاتھ وہ ویڈیو لگ گئی۔ اس نے باقاعدہ ڈاکومینٹری بنانے کا سوچ اور سیدھا اس گاؤں میں آ پہنچا۔ اس نے اپنی ڈاکومینٹری کو سنسنی خیز بنانے کے لیے مجموعی طور پر ایسا تاثر دیا کہ یہ بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ پولیس صرف اور صرف سیاسی دباؤ کی وجہ سے قاتل کو گرفتار نہیں کر رہی ہے۔ اس کے ذمے دار یہاں کے سیاسی نمائندے ہیں جو حکومتی اثر و رسوخ کی وجہ سے قاتل کو گرفتار نہیں ہونے دے رہے ہیں۔ اگلے ہی دن یہ ڈاکومینٹری اس چینل پر چل گئی جس سے وہ صحافی منسلک تھا۔ اس سے علاقے میں مزید غم و غصہ بڑھ گیا۔ ہر طرف سے یہی صدائیں بلند ہونے لگیں کہ مشتاق ... کو گرفتار کیا جائے۔ شہر میں انسانی حقوق کی ایک تنظیم نے ایک ریلی نکال دی۔ اس کی تصویریں اور ویڈیو بھی منظر عام پر آ گئے۔ پولیس پر مشتاق کی گرفتاری کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ لوگ منتظر تھے کہ کب اسے گرفتار کیا جاتا ہے۔

وہ اسلم کے قتل کا دسواں دن تھا جب فلک شیر کو یہ اطلاع ملی کہ مشتاق ایک قریبی..... گاؤں میں اپنے رشتے داروں کے ہاں چھپا ہوا ہے۔ اسے یہ اطلاع مل کے ایک کاریگر نے دی تھی۔ اس اطلاع پر اس نے فوراً ہی تصدیق کے لیے لوگ بھیج دیے۔ شام تک اس کی تصدیق ہو گئی۔ فلک شیر کا رابطہ چوہدری فرحان سے تھا۔ چوہدری فرحان نے اُسی وقت انسپکٹر کو بلوایا اور ساری تفصیل اسے بتا دی۔ انسپکٹر کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ اس نے چوہدری فرحان سے یہی کہا کہ اب کسی سے بات نہیں کرنی، وہ خود اس سارے معاملے کو دیکھے گا۔

رات کا دوسرا پہر ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ انسپکٹر کے آدمی سادہ کپڑوں میں اس گاؤں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دے دی تھی کہ مشتاق اپنے رشتے دار کے ڈیرے پر سو رہا ہے۔ بڑی خاموشی سے وہ سب وہاں پہنچے۔ مشتاق باہر صحن میں سویا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو تین بندے بھی تھے۔ انسپکٹر نے اسے جا لیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس کے چاروں طرف پولیس تھی۔

''اگر مرنا ہے تو میرے سامنے مزاحمت کرنا، ورنہ سکون سے میرے ساتھ چلو۔'' انسپکٹر نے اسے گردن سے پکڑتے ہوئے کہا۔ مشتاق کو علم ہو چکا تھا کہ وہ اب مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ اس لیے خاموشی سے پولیس جیپ میں جا بیٹھا۔ پولیس اسے رات گئے تھانے میں لے آئی۔

ہر طرف کے دباؤ سے بچنے کے لیے پولیس نے باقاعدہ میڈیا کو بلا کر اس کی گرفتاری کی نہ صرف خبر دی بلکہ اس کی تصویر بھی جاری کر دی۔ اس خبر سے علاقے میں کافی حد تک سکون ہو گیا۔ لیکن کسی کو بھی یہ پتا نہیں تھا کہ اسلم کا بھائی اکرم کیا منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ یہ تو اچانک اس دن پتا چلا جب مشتاق کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔

اس دن مشتاق کو لے کر پولیس کی گاڑی عدالت پہنچی تھی۔ اس کے ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے اردگرد دس بارہ پولیس والے اپنی حفاظت میں گاڑی سے نکال کر عدالت کی طرف لے جا رہے تھے۔ لوگوں کا رش اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن علاقے میں یہ مشہور ہو چکا تھا اس لیے تھوڑے بہت لوگ اور مقامی میڈیا کے کچھ لوگ وہاں پر موجود تھے۔ وہ سب عدالت کے باہر کھڑے تھے۔ انہیں اپنے بلاوے کا انتظار تھا۔ ایسے میں ایک موٹر سائیکل پر دو سوار اس طرح آ کر کہ ان کا رخ مشتاق کے بالکل سیدھ میں تھا۔ موٹر سائیکل چلانے والا وہی نوجوان تھا جسے چوک میں مشتاق نے زخمی کیا تھا اور اس کے پیچھے اسلم کا چھوٹا بھائی اکرم تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا، اکرم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پسٹل سیدھا کیا اور یکے بعد دیگرے کئی فائر جھونک دیے۔ بلاشبہ اس کا نشانہ مشتاق تھا۔ اسے دو گولیاں لگ چکی تھیں، اس کے ساتھ کھڑا پولیس کانسٹیبل بھی سینے پر ہاتھ رکھے سڑک پر گر چکا تھا۔ فائرنگ کے اس واقعے کو دس سے پندرہ منٹ گزر گئے تھے جب لوگوں کو سمجھ آئی اس وقت تک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اکرم کا راستہ روکا جاتا، اس نے ہوائی فائر کر دیا۔ لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔ موٹر سائیکل والے نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

عدالت میں فائرنگ اور پولیس کی حراست میں کسی ملزم کو قتل کر دینے کا یہ واقعہ معمولی نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس حرکت میں آ گئی۔ شہر سے باہر جانے والے سارے

Pdf Books Hub

راستوں پر ناکا لگ چکا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد پولیس کو شہر سے باہر جانے والی ایک سڑک پر وہ موٹر سائیکل پڑی مل گئی لیکن وہ دونوں حملہ آور غائب تھے۔ مشتاق کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی۔ شام ہونے تک..... لاش کو ورثا کے حوالے کر دیا گیا لیکن وہ دونوں حملہ آور..... کہیں بھی نہیں ملے۔ شام تک مختلف چینلز پر یہ خبر چیخ چیخ کر بیان کی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس دن گرمی کی شدت میں کافی کمی آ چکی تھی۔ دوپہر کے بعد چوہدری فرحان اپنے بیڈ روم میں تھا۔ وہ تھوڑا سکون لینا چاہتا تھا۔ اس کے اعصاب کافی تھکے ہوئے تھے۔ وہ بیڈ پر آ کر لیٹا ہی تھا کہ صائمہ بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ آتے ہی بے تکلفی سے بیڈ کے ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جی سر، مجھے آپ نے بلایا۔''

''ہاں یار، میں تھوڑی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اپنے ان نرم نرم ہاتھوں سے میرے کاندھے تو دبا دو۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تو صائمہ اٹھی اور بیڈ کے سرہانے چلی گئی۔ اس نے چوہدری فرحان کو اٹھا کر بٹھا دیا اور دھیرے دھیرے سے اس کے کاندھے دبانے لگی۔ چوہدری فرحان کو جیسے سکون آنے لگا تھا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اس نے اپنا سر صائمہ کی گود میں رکھا اور لیٹ گیا۔

''پہلے تو آپ کو اتنی تھکاوٹ نہیں ہوتی تھی، یہ آج کل کیوں ہونے لگی ہے؟'' صائمہ نے پیار سے اس کے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''تم دیکھ نہیں رہی ہو، پورے علاقے سے کس طرح لوگ میرے پاس آ رہے ہیں۔ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے مجھے وقت تو دینا پڑتا ہے۔'' اس نے سکون سے بتایا

''آپ اچھے بھلے ایک بزنس مین ہیں، کیوں سیاست کا شوق آپ نے پال لیا ہے۔ اس میں تو یہی کچھ ہے۔ اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا۔'' صائمہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا پتا، یہاں سیاست بھی ایک بزنس ہے۔ کروڑوں لگاؤ اور اربوں کماؤ۔ اس کے علاوہ اگر آپ سیدھے سادے سے بزنس مین ہیں... تو آپ کی ایک فائل بھی آگے نہ بڑھے۔ ایک کلرک بندہ ہی آپ کو سو چکر دے جائے۔ سیاست ایک طاقت بھی ہے۔ پھر اختیارات کا اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔ کیا سمجھی ہو؟'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے چونکتے ہوئے کہا، ''وہ آج آپ کے ٹریول ایجنٹ کا فون آیا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' اس نے صائمہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ آپ نے جو کچھ عرصہ پہلے ویزا اپلائی کیا تھا میرا۔''

''ہاں ہاں، وہ ہو نہیں گیا تھا؟'' چوہدری فرحان نے پوچھا

''وہ کہہ رہا تھا کہ ویزے کی معیاد ایک ہفتے بعد ختم ہو جائے گی۔ اگر ٹکٹ بنوانے ہیں تو بتائیں۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔'' صائمہ نے عام سے لہجے میں کہا۔

''اوہ سوری یار، میرے تو دماغ ہی میں نہیں رہا کہ ہمیں کچھ دنوں کے لیے دبئی جانا ہے۔''

''تو پھر کیا کہوں میں ٹریول ایجنٹ کو؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''اسے کہو، دو دن بعد کی ٹکٹیں بنوا دے، تین دن ہم وہاں رہیں گے۔'' چوہدری فرحان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''بس اتنے ہی دن؟'' وہ شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

''اوہ کوئی بات نہیں، بس یہ ماحول تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو میں تمہیں لندن بھی گھما دوں گا۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو، وہ اسلم اور مشتاق والے واقعے کے بعد تو لوگ میری جانب یوں اُمنڈ پڑے ہیں جیسے ان کا نجات دہندہ صرف میں ہی ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہی تھی کہ دن تھوڑے ہیں، میں تو اس لیے کنفرم کر رہی تھی کہ گھر والوں کو بتا دوں۔'' صائمہ نے نرم انداز میں کہا اور اس پر جھک گئی۔ اس پر چوہدری فرحان نے خمار آلود انداز میں کہا۔

''یار، یہ تیرے گھر والے۔ خیر، تم تیاری کر لو۔ تین دن سکون سے گزار کر آتے ہیں۔ اب تو یہاں فرصت بہت ہی کم ملے گی۔'' اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو صائمہ اٹھ گئی۔ اس نے بیڈ سے اتر کر پوچھا۔

''میں آج کا.....''

''نہیں، ابھی مجھے صرف سونا ہے، پھر دیکھ لیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں پھر چونک کر بولا، ''اور ہاں، سہ پہر کے وقت فلک شیر آئے گا، جیسے ہی وہ آئے مجھے بتانا میں چاہے سو رہا ہوں، میں فون آف کر رہا ہوں۔'' صائمہ نے غور سے اس کی بات سنی اور سر ہلاتے ہوئے بیڈ

روم سے نکلتی چلی گئی۔

سہ پہر کے وقت صائمہ بیڈ روم میں آئی تو چوہدری فرحان فریش ہو چکا تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس نے خود پر مہنگا پرفیوم چھڑکتے ہوئے پوچھا۔

''آ گیا ہے فلک شیر؟''

''جی، وہ آ گیا ہے، وہیں آفس میں بیٹھا ہے۔ وہیں بٹھاؤں یا.....'' یہ کہتے ہوئے صائمہ نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں، اسے لاؤنج میں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور صائمہ مڑ گئی۔ وہ بھی بیڈ روم سے نکلتا چلا گیا۔

وہ لاؤنج میں پہنچا تو وقت فلک شیر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چوہدری فرحان نے ایک ہاتھ ملایا اور اسے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بیٹھ گیا۔

''میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ وہ اسلم کا بھائی جو فرار ہے، اس کا کیا بنا، کچھ پتا چلا اس کا؟'' چوہدری فرحان نے پوچھا۔

''ہاں جی، مجھے تھوڑی تھوڑی خبر ملی ہے کہ وہ اس شہر میں نہیں کہیں اور ہے، میں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکا پھر تیزی سے پوچھا۔ ''آپ کیا سوچ رہے ہیں اس کے بارے میں؟''

''وہ ہمارے بڑے کام آ سکتا ہے۔ اسے اس علاقے کے لیے خوف بنا دیا جائے۔ اس کے عوض ہمیں صرف اس کی سرپرستی کرنا ہوگی۔'' چوہدری فرحان نے فلک شیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات تو آپ کی بڑی معقول ہے۔ ظاہر ہے آگے بھی کئی لوگوں نے سر اٹھانا ہے۔ پرانے کسی بندے پر اعتماد کے بجائے اسی کو استعمال کر لیا جائے۔ ویسے تجویز بہت اچھی ہے۔'' فلک شیر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نا، میاں طارق کے پاس ہر طرح کے بندے ہیں، جہاں چاہتا ہے اپنا بندہ استعمال کر لیتا ہے۔ ابھی تو وہ ہمیں اس لیے کچھ نہیں کہہ رہا کہ وہ ہمیں اپنے مقابلے ہی کا نہیں سمجھتا لیکن کب تک؟ آخر ایک دن اس کا اور ہمارا آمنا سامنا تو ہونا ہی ہے۔ ہمیں بندوں کی ضرورت ہے۔'' چوہدری فرحان نے آئندہ دنوں کے بارے میں اسے بتایا۔

''سرکار وہ میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ ابتدائی طور پر میں نے شہر سے چند بندے جوڑ لیے ہیں..... وہ بھی اٹھتے ہوئے نوجوان ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا سیانا اور پڑھا لکھا ہے۔ بس تھوڑا سا غریب ہے۔ میں نے اُسے نوکری کا آسرا کرایا ہے۔ باقی آہستہ آہستہ پورے علاقے سے بندے اکٹھے کرتے جائیں گے۔'' اس نے اپنی رائے دی۔

''ہاں لوگ تو اب اکٹھے ہو رہے ہیں، وہ سب لوگ جو میاں طارق کے مخالف ہیں، ان کے کام کاج میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔'' چوہدری فرحان نے اسے ہدایت دی۔

''سرکار میں نے ہر محکمے میں ایک بندہ ''فٹ'' کر لیا ہے۔ پیسے دو اور کام لو، اس کی مجھے بالکل بھی ٹینشن نہیں ہے۔'' اس نے جوش سے بتایا۔

''ہاں ابھی الیکشن میں کافی وقت پڑا ہے، تب تک یہ ہو جانا چاہیے، جو بندے ساتھ جڑتے ہیں، ان سے بھی کام لو۔'' اس نے پھر ہدایت دی۔

''آپ فکر ہی نہ کریں جی، الیکشن تک تو پورے علاقے میں آپ کا طوطی بولے گا۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا تو چوہدری فرحان نے سر ہلا دیا پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اچھا جاؤ، وہ میڈم صائمہ کے آفس میں جاؤ، وہاں سے کچھ رقم لے لو تمہارے کام آئے گی۔''

''جی بہت مہربانی۔'' اس نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔ چوہدری فرحان نے فون پر صائمہ کو ایک معقول رقم دینے کے بارے میں کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ آج اس کی شہر میں تاجران کے ساتھ میٹنگ تھی۔

☆☆☆

دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اکرم اور اس کا ساتھی راشد چھپتے پھر رہے تھے۔ ہر پل انہیں پکڑے جانے کا خوف تھا۔ وہ کسی رشتے دار کے پاس جا نہیں سکتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ قتل کر کے بھاگے ہوئے ہیں۔ کوئی اجنبی انہیں کیسے پناہ دے سکتا تھا۔ وہ اپنے ہی ایک تعلق دار کی وساطت سے ایک زمیندار کے ڈیرے پر موجود تھے۔ وہ کب تک وہاں پڑے رہتے۔ انہیں روٹی تو مل جاتی تھی لیکن یہ روٹی کب تک چلتی۔ ان کے پاس جو پیسے تھے وہ بالکل ختم ہو..... گئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں پیسہ بنانے کے لیے کہیں چوری کرنا پڑتی یا پھر ڈاکا ڈالنا پڑتا۔ وہاں موجود دیگر جرائم پیشہ لوگوں اور اشتہاریوں نے انہیں یہی راستہ

PakiBooks.site

بتایا تھا۔ وہ انہیں گھمن گھیریوں میں تھے کہ ایک دن اُن کے پاس اکرم ... کا ایک کزن لطیف جا پہنچا۔ وہ تینوں ایک کمرے میں سکون سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تبھی اکرم نے پوچھا۔

''ہاں بتا، کیا صورتِ حال ہے؟''

''صورتِ حال کا کیا پوچھتے ہو، یہ شکر ہے کہ چوہدری فرحان کی وجہ سے ہمارے گھروں سے کسی کو تھانے نہیں بلوایا گیا۔ ورنہ تمہیں تو پتا ہے پولیس والوں کا، کیا کچھ کرتے ہیں۔'' اس کے کزن لطیف نے بتایا۔

''ہاں یار، یہ تو اچھا کیا چوہدری فرحان نے 'بڑے کام کا بندہ ہے۔'' راشد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

'یہاں تم لوگوں کا کیا حال ہے؟'' کزن نے پوچھا۔

''حال کیا ہے یار، بس چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' راشد نے جواب دیا۔

''تم لوگوں کے لیے چوہدری فرحان کا ایک پیغام ہے۔ وہ تم دونوں کی ذمے داری لیتا ہے۔ خرچہ پانی سب ملتا رہے گا۔ اس کا کہنا ہے کہ سکون سے رہو، جہاں وہ تمہیں رکھے گا۔ تب تک کوئی صلح کا راستہ نکل آئے گا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، لیکن وہ ہمیں رکھے گا کہاں، اس علاقے میں تو ہم پکڑے جائیں گے؟'' اکرم نے تشویش سے پوچھا۔

''ابھی تو صرف تم لوگوں کی ہاں چاہیے۔ آخر وہ تمہیں کہیں رکھے گا ہی۔'' لطیف نے تیزی سے کہا۔

''اور سیدھی سی بات ہے، جب وہ ہم دونوں کی ... سرپرستی کرے گا، ہر طرح کا تحفظ دے گا تو کام بھی لے گا۔'' راشد نے سوچنے والے انداز میں کہا تو ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ تبھی اکرم نے حتمی انداز میں کہا۔

''یار، یہاں تو غیروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بھی تو ہمیں استعمال ہی کریں گے۔ نکلو یہاں سے، وہاں صلح کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میرے فون کا انتظار کرنا، جب سارا معاملہ طے ہو جائے گا تو میں تمہیں کال کر دوں گا۔'' لطیف نے کہا۔

لطیف نے جاتے ہی اگلے دن فلک شیر سے رابطہ کیا۔ اسے ان دونوں کا احوال بتاتے ہوئے کہا۔

''بھائی فلک شیر، ان دونوں کو کسی طرح وہاں سے نکالو، وہاں وہ ٹھیک نہیں ہیں۔''

''چلو میں ان کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ مگر ایک شرط ہے، وہاں ان کے ساتھ کوئی بھی رابطے میں نہ رہے۔ ورنہ وہ بہت جلدی پکڑے جائیں گے اور اگلے کا بھی اعتماد جائے گا۔'' فلک شیر نے کہا۔

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا ..... کسی محفوظ جگہ پر ہوں تو بندہ کسی طرف کا سوچتا ہے۔'' لطیف نے کہا۔

''ہاں یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ ابھی دونوں خاندانوں میں بہت غصہ ہے۔ وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ میں کرتا ہوں کچھ۔'' فلک شیر نے اسے تسلی دی تو وہ مطمئن ہو گیا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد لطیف کا فون آ گیا۔ اس نے انہیں ایک دوسرے شہر بلا بھیجا تھا۔ وہ وہاں سے نکلے اور اس شہر جا پہنچے۔ وہاں پر ایک گھی مل تھی۔ یہ چوہدری فرحان کے کزن کی گھی مل تھی۔ فلک شیر کا وہاں اتنا اثر نہیں تھا لیکن چوہدری فرحان نے ان دونوں کو وہاں رکھوا دیا تھا۔ انہیں وہیں کام بھی کرنا تھا وہیں ان کا کوارٹر بھی تھا۔ وہ سکون سے وہاں رہنے لگے تھے۔ وہ خاموشی سے دو ماہ تک وہیں کام کرتے رہے۔ اس دوران ان کا رابطہ فلک شیر سے ہی ہوتا تھا۔ وہ دو چار دن بعد انہیں فون کر لیتا۔ حال احوال پوچھتا، انہیں تسلی دیتا اور کام کرتے رہنے کا کہہ کر بات ختم کر دیتا۔ وہ بھی خوش تھے کہ چوہدری فرحان نے ان پر بڑا احسان کیا ہے اور انہیں محفوظ مقام پر رکھا ہوا ہے۔

ایک رات انہیں فلک شیر کا فون آیا۔ کچھ دیر حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

''یار، چوہدری فرحان پر ایک مشکل آن پڑی ہے اور وہ مشکل تم لوگ ہی دور کر سکتے ہو۔''

''ہم، وہ کیسے؟'' اکرم نے حیرت سے پوچھا۔

''یار یہاں شہر میں ایک بندہ ہے، وہ چوہدری فرحان کو مسلسل جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ بات بھی دشمنی والی کوئی نہیں۔ دراصل وہ میاں طارق کا آدمی ہے۔ وہ اس بندے کے ذریعے مخالفت نکال رہا ہے۔'' فلک شیر نے بڑے دکھ سے کہا تو اکرم کو غصہ آ گیا۔

''مجھے بتاؤ کرنا کیا ہے؟'' اس نے حتمی انداز میں پوچھا۔

''کرنا کیا ہے بس اسے ڈرانا دھمکانا ہے۔ اسے یہ پتا ہی نہیں لگنا چاہیے کہ کس نے اسے ڈرایا ہے۔'' فلک شیر نے یوں کہا جیسے یہ کوئی بہت معمولی سا کام ہو۔ اگلے ہی لمحے اکرم نے کہا

''بندہ بتاؤ کون ہے، کام ہو جائے گا۔''

''میں ابھی تھوڑی دیر میں ساری تفصیل بتا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

دوسرے دن کی صبح ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ اکرم اور راشد موٹر سائیکل پر سوار شہر کے گنجان آباد علاقے میں داخل ہوئے۔ تھوڑے بہت لوگ آ جا رہے تھے۔ صبح کے ناشتے والی دکانیں کھل چکی تھیں۔ تھوڑے بہت گاہک وہاں موجود تھے۔ کچھ لوگ سیر کے لیے نکل رہے تھے اور کچھ سیر سے واپس آ رہے تھے۔ راشد نے اپنی موٹر سائیکل ایک دکان کے سامنے روکی۔ وہ باہر سڑک پر ہی کھڑے رہے۔ انہوں نے لسی کا آرڈر دیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کے سامنے لسی کے دو بڑے پیتل کے گلاس رکھ دیے گئے۔ وہ بظاہر لسی پی رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں دکان کے بالکل سامنے والی گلی کی طرف تھیں۔ وہ سکون سے لسی پی چکے تھے۔ ویٹر ان سے لسی کی قیمت لے جا چکا تھا۔ ایسے میں گلی سے ایک دراز قد، ادھیڑ عمر آدمی نکلا۔ اس نے سادہ سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں چونک گئے۔ وہ شخص گلی کے دائیں جانب سڑک پر مڑ گیا تھا۔

وہ دونوں سکون سے اٹھے۔ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آرام سے چل دیے۔ وہ شخص چہل قدمی کے سے انداز میں جا رہا تھا۔ وہ کوئی دو سو قدم کے فاصلے تک گیا ہوگا کہ انہوں نے موٹر سائیکل بالکل اس کے ساتھ لگا دی۔ عینک والے شخص نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر تھوڑا پرے ہٹتے ہوئے بولا۔

''دھیان سے چلاؤ بھائی۔''

''تم بھی دھیان کرو ذرا۔'' پیچھے بیٹھے ہوئے اکرم نے سرد سے لہجے میں کہا تو وہ شخص بولا۔

''موٹر سائیکل پر تم آ رہے ہو، تم......''

''تم جو لیڈری چمکانے کے چکر میں ہو نا، اس کا دھیان کرو، چوہدری فرحان کی مخالفت بہت مہنگی بھی پڑ سکتی ہے، سمجھے۔''

اکرم نے کہا ہی تھا کہ عینک والا شخص چونک گیا، اس نے غور سے ان دونوں کو دیکھا پھر انتہائی غصے میں بولا۔

''مطلب، چوہدری فرحان اب غنڈا گردی پر اتر آیا ہے، یوں مجھے کھلے عام دھمکیاں دے گا، رُکو میں تم لوگوں کو ابھی سبق سکھاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس عینک والے نے بھاگ کر پیچھے بیٹھے اکرم کو گدی سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ تھی لیکن اکرم خود کو نیچے گرنے سے بچا نہ سکا۔ راشد نے صورتِ حال خراب ہوتے دیکھی تو گلی کے ایک نکڑ پر تھوڑا آگے لے جا کر موٹر سائیکل روک دی۔ وہ عینک والے کو معمولی آدمی سمجھنے کی غلطی کر چکے تھے۔ انہیں جان لینا چاہیے تھا کہ جو چوہدری فرحان سے الجھ سکتا ہے، وہ کوئی عام فرد نہیں ہو سکتا۔ راشد نے دیکھا جیسے ہی اکرم کی پشت نے زمین کو چھوا، عینک والے نے اس کا ایک بازو پکڑ کر گھسیٹنا چاہا۔ لیکن اس وقت تک اکرم اٹھ گیا تھا مگر اپنے پاؤں پر سنبھلا نہیں تھا۔ عینک والے نے اسے دیوار کی جانب دھکا دے دیا۔ اس وقت تک راشد وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سامنے گلی میں دیکھا، دو افراد گلی میں آ رہے تھے۔ وہ اسی علاقے کے ہی ہو سکتے تھے۔ راشد نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ انہیں جلد از جلد اس معاملے کو ختم کرنا ہوگا۔ ورنہ زیادہ لوگ اکٹھے ہوں گے تو بچ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ پہلے ہی اشتہاری تھے۔ یہ سوچتے ہوئے راشد نے عینک والے پر چھلانگ لگا دی۔ وہ پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے جھکائی دے دی۔ راشد اپنی جھونک میں آگے نکلتا چلا گیا۔

اکرم دیوار سے ٹکرایا تو ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا........ دو تین بار سر کو جھٹک کر اس نے دیکھا کہ راشد نے عینک والے پر چھلانگ لگائی اور اپنی ہی جھونک میں آگے نکلتا چلا گیا ہے کیونکہ عینک والا راستے سے ہٹ چکا تھا۔ اکرم کو غصہ آ گیا۔ وہ دو افراد بھی انہیں دیکھ کر بھاگے تھے۔ اکرم نے انتہائی سرعت سے پسٹل نکالا اور لگاتار تین فائر کر دیے۔ پُرسکون ماحول کو فائرنگ کی آواز نے چیر کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے عینک والے شخص کو سینہ پکڑ کر گرتے ہوئے دیکھا۔ راشد نے بھاگ کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر لی جیسے ہی اکرم بھاگتا ہوا جا کر موٹر سائیکل پر بیٹھا، راشد نے اگلے ہی لمحے موٹر سائیکل بھگا دی۔

صبح کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ پندرہ سے بیس منٹ میں وہ شہر سے باہر نکل گئے تھے۔ پلان کے مطابق وہاں ایک فور وہیل گاڑی کھڑی تھی۔ انہوں نے موٹر سائیکل وہیں چھوڑی جو بلاشبہ چوری کی تھی۔ وہ فور وہیل میں بیٹھے تو وہ چل دی۔ ڈرائیور کے ساتھ فلک شیر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ عینک والا شخص قتل ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی ملال نہیں تھا۔ کافی دور جا کر اس نے اکرم کی جانب نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اب تم دونوں کو واپس گھی مل نہیں جانا بلکہ یہ تمہیں جہاں اتارے، وہاں جا کر مجھ سے رابطہ کر لینا۔ اب سکون سے رہو۔''

PakiBooks.site

''ٹھیک ہے۔'' اکرم نے کہا۔

کچھ فاصلے پر فلک شیر فوروہیل سے اتر گیا۔ اس کے اترتے ہی فوروہیل ہوا ہوگئی۔ اکرم نے راشد کی جانب دیکھا تو دونوں تلخی سے مسکرا دیئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ حالات کے بھنور میں پھنس چکے ہیں اور وہ جس دنیا میں آگئے ہیں وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ ان کے کھاتے میں دو قتل ڈالے جا چکے ہیں۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ گلی میں سے فرار ہوتے ہوئے انہیں کئی ایک افراد نے دیکھا تھا۔

☆☆☆

شہر میں ہفتہ بھر احتجاج چلتا رہا تھا۔ پولیس نے پہلے دن ہی نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کر لی تھی۔ اخباروں میں ان دونوں کے خاکے شائع ہو چکے تھے۔ وہ خاکے کچھ اس طرح کے تھے جنہیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ سوشل میڈیا پر بہت شور مچایا جا رہا تھا لیکن قاتلوں کا کچھ سراغ ملتا تو پولیس کوئی کارروائی کرتی۔ قتل ہو جانے والا شہر کی انجمن تاجران کا اہم عہدیدار تھا۔ وہ شخص اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ چوہدری فرحان کی مخالفت کر رہا تھا۔ یہ کوئی ایک دن کی مخالفت نہیں تھی۔ بلکہ جب سے اس نے گھی مل لگانے کا ارادہ کیا تھا تب سے ہی وہ مخالفت کرتا چلا آ رہا تھا۔ مخالفت کی شدت اسی شخص کی طرف سے ہوتی تھی۔ چوہدری فرحان نے کبھی اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ تاجران میں بات چیت سے حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ گھی مل کی پروڈکشن بہت بڑھ گئی تھیں، چوہدری فرحان نے مقامی تاجران کو زیادہ منافع پر مال دینے آفر کی تھی۔ اس پر بہت سارے تاجران چوہدری فرحان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ چوہدری فرحان تین دن بعد جب دبئی کا ٹور لگا کر واپس آیا تو شہر میں احتجاج چل رہا تھا۔ وہ بھی احتجاج میں شامل ہو گیا۔ پولیس کی تفتیش نجانے کدھر کی کدھر نکل گئی تھی۔

اس صبح وہ اپنے بنگلے والے آفس میں بیٹھا ہوا تھا جہاں وہ لوگوں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ یہ کمرا اس آفس سے ملحق تھا، جہاں صائمہ بیٹھتی تھی۔ اس سے ملنے والا پہلا شخص فلک شیر تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''مجھے یہ بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اسے قتل کر دیں گے، انہیں صرف ڈرانے کے لیے کہا گیا تھا لیکن .....'' فلک شیر نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''اچھا کیا انہوں نے، میرے خیال میں سمجھداری کا ثبوت دیا، ورنہ اب تک وہ پکڑے جا چکے ہوتے اور ان کے ساتھ ہمارا نام بھی آ جاتا، اب کون بتائے گا کہ کون لوگ تھے۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ اب سارا ملبا نامعلوم افراد پر ڈال دیا گیا ہے۔'' فلک شیر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا مجھے یہ بتاؤ علاقے کی صورتِ حال کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھیں جی، ہمارے پاس کوئی گورنمنٹ کی گرانٹ تو ہے نہیں جو خرچ کریں، میں تو انہی لوگوں سے رابطہ رکھتا ہوں جو میاں طارق کے مخالف ہیں۔ کچھ بات سن لیتے ہیں کچھ ٹال دیتے ہیں۔'' فلک شیر نے بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس کا بھی حل نکال لیتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے لوگوں سے رابطے میں رہو جس کے جو کام آیا جا سکتا ہے۔ اس کا کام کرو۔''

''جی وہ تو ہو ہی رہا ہے۔'' اس نے دھیمے سے کہا پھر اٹھتے ہوئے بولا، ''مجھے اجازت ہے جی، آج کچھ لوگوں نے عدالت میں آنا ہے۔''

''ہاں جاؤ اور فون پر مجھے اطلاع دے دینا کہ ان کا کیا بنا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے لیے آگے بڑھا، تبھی چوہدری فرحان نے بڑے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف بڑھائی جو فلک شیر نے پکڑ کر جیب میں ڈال لی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے باہر نکلتا چلا گیا۔

چوہدری فرحان کو ملنے کے لیے بدر شاہ آیا ہوا تھا۔ وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن چوہدری فرحان اس کے بارے میں بہت معلومات رکھتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے چوہدری فرحان اس سے سوشل میڈیا کے ذریعے ہی متعارف ہوا تھا۔ پھر وہ باقاعدہ بدر شاہ کو نگاہ میں رکھنے لگا۔ وہ سوشل میڈیا پر بہت ایکٹو تھا۔ اس نے چوہدری فرحان کو متاثر کیا۔ وہ سوچنے لگا کہ بدر شاہ کو کیسے استعمال کیا جائے۔ پھر اس کے ذہن میں پلان آ ہی گیا۔ اس نے اپنے خاص لوگوں سے اس کے بارے میں مزید معلومات لیں۔ کبھی کبھی وہ اس سے بات کرنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی بات سے بات کبھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ کل شام اس نے بدر شاہ کو ملنے کے لیے بلا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک درمیانے سے قد والا، فربہ مائل نوجوان اندر داخل ہوا۔ چوہدری فرحان نے اسے

تصویروں میں دیکھا ہوا تھا وہ اس سے اٹھ کر ملا۔ سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے کہا۔

''بدر شاہ، تم سوشل میڈیا پر بڑے فعال ہو، اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''جی سر، جب کرنے کو کچھ نہیں تو یہی کرنا ہے۔'' اس نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا تو چوہدری فرحان ہنستے ہوئے بولا۔

''چلو ہم تمہیں کام پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی، تمہاری تعلیم تو کامرس ہے، لیکن تمہارا زور سیاست پر ہے؟''

''سر یہ کون سی سائنس ہے، جو نہ سمجھ میں آئے۔ جب مجھ جیسا بندہ بے روزگار ہوگا، اسے نوکری نہ ملنے سے جو مسائل کا سامنا ہے، اس پر وہ یہ تو سوچے گا ہی کہ مجھے نوکری کیوں نہیں مل رہی؟ سچی بات یہی ہے کہ ہمارے حکمران، سیاست داں ایسا نہیں سوچتے۔'' نوجوان نے تلخی سے کہا تو اس نے سامنے بیٹھے نوجوان کو جانچنے کی خاطر کہا۔

''یار ویسے ایک بات ہے، تعلیم صرف نوکری کے لیے تو نہیں حاصل کی جاتی، اگر آپ میں صلاحیت ہے تو.....''

''سوری سر، پلان ہوتے ہیں، حکومت اپنے عوام کے لیے پلان کرتی ہے۔ خیر وہ نہ کریں لیکن جب ووٹ لینا ہوتا ہے تو پھر وعدے بھی نہ کریں، اس ملک کے نوجوانوں کو خواب بھی نہ دکھائیں۔ کہہ دیں کہ وہ بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ سر، نوجوانوں کے بارے میں سوچنا کس کو ہے؟ یہ سوال بھی نہ کریں؟'' اس بار... وہ کافی حد تک تلخ ہو گیا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، خیر، تمہیں پتا ہے کہ ہم بزنس بھی کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ تھوڑا سوشل ورک بھی چل رہا ہے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ تم ایک باصلاحیت نوجوان ہو۔ تم ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ نوکری بھی کرو، خود بھی کماؤ، دوسروں کو بھی کمانے کا موقع دو۔ یہ تمہاری صوابدید ہے کہ یہ تم کیسے کرتے ہو، کیسا پلان بناتے ہو۔'' اس نے بڑے سکون سے اسے آفر دے دی تو بدر شاہ بولا۔

''میں اکیلا تو یہ سب نہیں کر پاؤں گا، اس کے لیے ایک ٹیم چاہیے۔''

''تو لے لو ٹیم، کرنا تم نے ہے نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا

''میری ایک این جی او ہے، ہے تو وہ چھوٹے لیول پر۔ اس کی بنیاد میں نے بزنس پر ہی رکھی ہے، اس طرح میرے ساتھ کافی لوگ ہیں۔ ہم بزنس بھی کریں گے رفاہی کام بھی کریں گے۔ یہ میں پہلے ہی کر رہا ہوں، اب اگر آپ کی سپورٹ ہوگی تو میں بڑے پیمانے پر کر سکتا ہوں۔'' اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''تم شروع کرو، نوکری تو تم یہاں کرو گے، اس کے علاوہ جو میں کر سکا کروں گا، حکومت سے بھی جو فنڈ لے سکے، وہ ہم لیں گے۔ جو کرنا ہے بالکل بے فکر ہو کر کرو، لیکن ایک شرط ہے۔'' چوہدری فرحان نے ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ..... کیا شرط.....'' بدر نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو نوجوان بہت جذباتی ہوتے ہیں، ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کرنا جو کسی بھی طرح غیر قانونی ہو۔ ہمیں قانون کی پاسداری کرنا ہے۔ اخلاقی طور پر لوگوں کو ایک اچھا تاثر دینا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو بدر شاہ نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل، ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''آپ اپنا آفس بنائیں، ملزکی جو پراڈکٹ ہے، اس سے نوجوانوں کو کمانے کا موقع دیں، کوئی مسئلہ ہو یہ ساتھ میں میڈم صائمہ ہیں، انہیں بتائیں یہ آپ کا مسئلہ حل کر دیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے چوہدری فرحان نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب باتیں ختم اور وہ چلا جائے۔ بدر سمجھ گیا۔ اس نے ہاتھ ملایا اور کمرے سے ..... چلا گیا۔ چوہدری فرحان نے صوفے سے ٹیک لگا لی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا، وہ اپنی ایک نئی دنیا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ صائمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک فائل پکڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ نمایاں تھا۔ اس نے وہ فائل چوہدری فرحان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''اس پر سائن کر دیں۔''

''وہ تو میں کر دیتا ہوں، لیکن یہ تمہیں ہوا کیا ہے؟'' اس نے صائمہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے، میں تو ویسی ہوں جیسے پہلے تھی لیکن شاید اب آپ کی نظروں میں پہلی جیسی نہ رہی ہوں۔'' اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو چوہدری فرحان کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے دھیمے سے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بات کیا ہے، بتاؤ گی بھی؟''

PakPoolSite

''کچھ نہیں، بس آپ یہ سائن کردیں۔'' اس نے نخرا دکھاتے ہوئے کہا۔

''وہ کر دیتا ہوں، لیکن جو بات ہے وہ مجھے بتاؤ۔'' چوہدری فرحان نے کہا تو صائمہ چند لمحے سوچتی رہی پھر دھیمے سے شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

''جب سے ہم دبئی سے آئے ہیں، آپ نے مجھے بالکل بھی وقت نہیں دیا، نظر انداز کر کے رکھ دیا ہے، جیسے میں ایک فالتو اور فضول چیز ہوں۔ اگر میں اب آپ کو اچھی نہیں لگتی تو بتا دیں میں.....''

''یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ حالات کیا ہیں۔ میں اس لیے وقت نہیں دے سکا۔ دوسرا ہم اتنا بھرپور وقت گزار کر آئے ہیں، میرے تو خیال میں ایک ہفتہ کیا ..... خیر، ہم آج شام اکٹھے گزاریں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسے مانگنے کا وقت نہیں چاہیے۔'' اس نے منہ پھلا کر کہا

''دیکھو صائمہ، تمہاری اور میری شادی تو ہو نہیں سکتی، اگر ہو گئی تو میرے بچے مجھے جینے نہیں دیں گے اور نہ معاشرہ تمہیں چین سے جینے دے گا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ جو تم میں ہے، وہ میں نے کسی میں نہیں دیکھا، میں تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ سیاست میں میری مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ بزنس بہت بڑھ گیا ہے یہ تم بھی جانتی ہو، سب کچھ تمہارے ہاتھوں کے نیچے سے نکلتا ہے۔ تم خود دیکھو، میں وقت کہاں سے لاؤں۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے باقی بات شام کو ہوگی۔'' اس نے نرم سے لہجے میں کہا اور فائل آگے کر دی۔ چوہدری فرحان نے دستخط کیے تو وہ خاموشی سے فائل اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ چوہدری فرحان اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔ صائمہ اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔

☆☆☆

بدرشاہ کی سوشل میڈیا پر بڑی نظر تھی۔ اس کی زیادہ تر دلچسپی علاقے کے حالات و واقعات سے تھی۔ علاقے کے ہر گوٹھ، بستی اور گاؤں کے علاوہ شہر میں بھی اس کے ساتھ لوگ منسلک ہو چکے تھے۔ ان لوگوں میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو کسی نہ کسی حوالے سے سیاست اور سیاست دانوں سے نالاں تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کی مدد سے وہ اپنی این جی او کو بہت فعال بنا چکا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ علاقے میں ہونے والے کسی بھی واقعے کی صرف مذمت ہی کر سکتے تھے لیکن عملی طور پر کچھ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کا سامنا طاقت ور سیاست دانوں سے تھا۔ جب سے وہ چوہدری فرحان سے جڑا تھا، تب سے اس میں حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے علاقے کے کسی بھی ناخوشگوار واقعے پر نہ صرف آواز بلند کر سکے بلکہ کچھ نہ کچھ عملی طور پر بھی کر سکے۔

انہی دنوں میں اس کی نگاہوں کے سامنے ایک چھوٹی سی ویڈیو گزری۔ شہر کے اسپتال میں ایک عورت اپنا بچہ لیے رو رہی تھی۔ وہ واویلا کر رہی تھی کہ ڈاکٹر اس کے بچے کو نہیں دیکھ رہے، وہ اپنے بچے کو کوریڈور کے فرش پر لٹائے دوہائی دے رہی تھی۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن کوئی بھی اس سے ہمدردی نہیں کر رہا تھا۔ وہ ویڈیو زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کی تھی۔ کسی نے سوشل میڈیا پر وہ ویڈیو لائیو دکھائی تھی۔ ساتھ ہی اس بندے نے یہ اپیل کی تھی کہ اس عورت کی آواز کو سنا جائے۔ اس ویڈیو کو دیکھتے ہی بدرشاہ کے دل میں ایک درد جاگا۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ عوام تو اس طرح رُلتے رہیں اور بااثر لوگ جو مرضی کرتے رہیں۔ اس کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔ اس نے فوراً سوشل میڈیا پر ایک بیان دے دیا کہ اس کے دوست اسپتال پہنچیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی بائیک لی اور سیدھا اسپتال جا پہنچا۔ پارکنگ میں بائیک لگا کر وہ اسی کوریڈور میں پہنچا۔ وہ عورت اسی اسپتال میں تھوڑی سی تلاش سے مل گئی۔ وہ اس عورت کے پاس جاتے ہی بولا۔

''بی بی، کون ڈاکٹر نہیں دیکھ رہا؟''

''وہ کہتے ہیں سارے ڈاکٹر اندر میٹنگ کر رہے ہیں، دیکھو میرے بچے کو کتنا بخار ہے۔ میں پانچ میل دور بستی سے آئی ہوں۔ کوئی دیکھتا ہی نہیں میرے بچے کو۔'' وہ عورت روتے سسکتے ہوئے بولی۔

''اچھا، دو منٹ، میں کچھ کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر ایم ایس کے کمرے کی جانب چلا گیا۔ دروازے پر چپراسی نے اسے روکنا چاہا۔ وہ چند لمحے وہیں رک گیا۔ وہ دروازے کی جھری سے اندر دیکھنے لگا، جہاں سے آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ایم ایس کے کمرے کا ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ سب ڈاکٹرز کے سامنے چائے دھری ہوئی تھی اور وہ کسی نئے ڈاکٹر کی شادی پر بات کر رہے تھے۔ وہ میٹنگ دراصل اس ڈاکٹر کے اعزاز میں تھی۔ تقریباً دو منٹ بعد ہی اسے یقین ہو گیا کہ اندر صرف گپ شپ چل رہی ہے۔ تبھی اس

نے غصے میں چپراسی کو ایک جانب دھکیلا اور اندر گھس گیا۔ اسے یوں اچانک اندر آتا دیکھ کر وہ حیران ہو گئے۔ تبھی ایک نوجوان ڈاکٹر اٹھا اور اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''تمہیں تمیز نہیں کسی کے دفتر میں داخل ہونے کی؟''

''آپ سب لوگ اس وقت ڈیوٹی پر ہو، باہر ایک بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے، آپ سب یہاں چائے پی رہے ہو، گپیں لگا رہے ہو۔'' بدرشاہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو وہی نوجوان ڈاکٹر بولا۔

''یہاں لوگ روز ایسے ہی آتے ہیں، اور سنو یہ میٹنگ بھی ہماری ڈیوٹی ہے، اب فوراً کمرے سے نکلو، میٹنگ کے بعد دیکھتے ہیں۔''

''اگر وہ بچہ جان سے ہار گیا تو.....؟'' اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''تو پھر ہم کیا کریں یار، جاؤ نکلو یہاں سے۔'' ایم ایس نے کہا تو بدرشاہ کا دماغ خراب ہو گیا۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور شدید غصے میں کہا۔

''یہی بات ذرا یہاں کہو، پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کرو گے اور میں کیا کروں گا۔''

اس کا اتنا کہنا ہی تھا کہ ڈاکٹر اٹھے اور انہوں نے دھکے دے کر بدرشاہ کو کمرے سے نکالنا چاہا۔ بدرشاہ ریکارڈنگ آن کر چکا تھا۔ تھوڑی بہت ویڈیو ریکارڈ ہو گئی تھی۔ اندر دھکم پیل ہو رہی تھی۔ باہر اس کے کئی ساتھی جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے بدرشاہ کی آوازیں اور شور سنا تو وہ بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی سیل فون تھے۔ وہ بھی ریکارڈنگ کرنے لگے۔ شور سن کر اسپتال کا عملہ بھی وہیں آ گیا۔ اسپتال میں آئے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ نوبت ہاتھا پائی تک جاتی، کچھ لوگ درمیان میں پڑ گئے۔ ایم ایس بھی معاملے کی نزاکت سمجھ گیا تھا۔ یہاں ہونے والی ہاتھا پائی کی بازگشت بہت دور تک جا سکتی تھی۔ اس نے ایک بزرگ سے ڈاکٹر کو آگے کر دیا کہ وہ سب میں بیچ بچاؤ کرائے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

''چھوڑو بیٹا، میں دیکھتا ہوں، کہاں ہے مریض؟'' اس بزرگ ڈاکٹر نے پوچھا تو بدرشاہ بولا۔

''اب ہم نے اس بچے کو یہاں دکھانا ہی نہیں ہے۔ کیا پتا تم لوگ اس کا کیسا علاج کرو، غصے میں اس بچے کو ویسے ہی مار دو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا، ''اس بچے کو فوراً پرائیویٹ اسپتال لے کر چلو۔ میں اپنی جیب سے کرواتا ہوں اس کا علاج۔''

ایک لڑکا کار لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس نے بچے اور ماں کو کار میں بٹھایا اور اسپتال سے باہر لے گیا۔

دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔ اس بچے کا نجی اسپتال میں علاج شروع ہو گیا تھا۔ بچے کا بخار کم ہو گیا تھا۔ بچہ ہوش میں باتیں کرنے لگا تھا۔ اس وقت تک سوشل میڈیا پر ایم ایس کے کمرے کی کہانی اپ لوڈ ہو گئی تھی۔ اس عورت کا بیان، پہلی کوریڈور والی ویڈیو، ایم ایس کے کمرے والی ویڈیو کے ساتھ بدرشاہ کا بیان موثر ثابت ہوا تھا۔ شہر کے صحافی دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک ایم ایس کے حق میں تھے اور دوسرے مخالف۔ اسی طرح شہر میں بھی حمایتی اور مخالفین اپنی اپنی رائے دینے لگے تھے۔ شام کے وقت بدرشاہ نے ایم ایس کے تبادلے کے لیے کل احتجاج کا اعلان کر دیا۔

اگلے دن صبح کے وقت ہی اسپتال کے باہر لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ بدرشاہ کے ساتھی وہاں آنے والوں میں پلے کارڈ تقسیم کر رہے تھے۔ احتجاج کرنے والوں سے زیادہ تماشائی جمع ہو گئے۔ میڈیا بھی پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں پولیس بھی آ گئی۔ احتجاج کرنے والوں نے کچھ دیر تک وہیں احتجاج کیا اور پھر ان کا رُخ شہر کی جانب ہو گیا۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں لوگ اپنا آپ دکھاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں، جو خود کو نمایاں کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ ان میں سوشل ورکر بھی ہوتے ہیں، سیاست میں دلچسپی لینے والے بھی اور وہ جو لوگوں کی نظروں میں آنا چاہتے ہیں۔ جگہ جگہ انہوں نے تقریریں کیں۔ ایم ایس کو ظالم ترین شخص قرار دیا جانے لگا۔ ایسے میں بدرشاہ کو چوہدری فرحان کی کال ملی۔

''بدر میاں، یہ احتجاج کب تک رہنا ہے؟''

''جب تک چلے گا سر۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں اسے جلد ختم کرو۔ وہ لوگ مذاکرات پر تیار ہیں۔'' چوہدری فرحان نے عام سے انداز میں کہا۔

''کیا کہتے ہیں؟'' بدرشاہ نے پوچھا۔

''کہنا کیا ہے وہی معافی تلافی اور کیا۔ بس تم اسے ختم کرواور آ جاؤ۔'' چوہدری فرحان نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد بدرشاہ نے احتجاج ختم کرنے کے ساتھ اپنے مطالبات بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیے۔

چیمبر آف کامرس میں شہر کے چند معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں میاں طارق بھی تھا۔ دوسری جانب بدرشاہ

Ink Books

کے ساتھ اس کے دو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ چوہدری فرحان بھی وہیں موجود تھا۔ ایم ایس کے ساتھ وہ نوجوان ڈاکٹر بھی تھا۔ بہت ساری باتوں کے بعد یہ طے پایا کہ ایم ایس کا تبادلہ نہیں ہوگا۔ نوجوان ڈاکٹر معافی مانگے گا اور آئندہ کسی مریض کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ بدرشاہ کی ساری باتیں نہیں مانی گئیں لیکن اس نے ایک بات منوالی۔ وہ یہ کہ... ڈاکٹر ایک ہفتے میں کسی نہ کسی بستی یا گاؤں میں وقت دے گا۔ وہاں وہ مریضوں کو مفت دیکھے گا۔ بدرشاہ کی یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ جو اصل میں چوہدری فرحان کی کامیابی تھی۔ کیونکہ بدرشاہ چوہدری فرحان کا احسان مند تھا۔ جب چاہتا اسے جس طرف چاہتا موڑ سکتا تھا۔ چوہدری فرحان جانتا تھا کہ سوشل میڈیا ایک بھیانک طاقت بن کر ابھر رہا ہے۔ اس کے ذریعے کسی بھی شریف آدمی کی بلاوجہ بھی پگ چورا ہے پر پگڑی اچھالی جاسکتی ہے۔ اور اس پر کوئی قانون بھی لاگو نہیں ہوتا۔ یہاں تو ویسے ہی ایک غریب عورت اور بچے کا معاملہ تھا۔

☆☆☆

اس دن چوہدری فرحان اپنے بنگلے کی بالائی منزل کے اس کمرے میں تھا جہاں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہ کئی دنوں سے علاقے میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی سرگرمیوں کے بعد تھک چکا تھا۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن اور رات تنہائی میں گزار دینے کے بعد وہ بہت حد تک پُرسکون ہوگیا تھا۔ ایسے میں اسے سب سے پہلے صائمہ ہی کا خیال آیا۔ اس نے صائمہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ فوراً ہی پہنچ گئی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اس نے بیڈ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم پاس ہو تو خوشگواریت ہی ہوتی ہے۔'' اس نے کپڑوں میں لپٹی ہوئی صائمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی تو وہ بھی مسکرا دیا۔ وہ کمرے میں موجود ایک الماری کی جانب بڑھی اس میں سے ایک ڈبا نکالا اور پھر باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد واپس پلٹی تو گیلے بالوں کے ساتھ اس نے سیاہ رنگ کی مہین سی نائٹی پہنی ہوئی تھی۔ چوہدری فرحان نے دیکھا، صائمہ کا سفید بدن اس میں سے چھلک رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے تو دیوانہ ہوگیا۔

''یہ کیا ہے.....'' اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

''آن لائن شاپنگ سے خریدی ہے۔ ڈالرز میں آئی ہے۔'' اس نے نائٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا، اچھا لگ رہا ہے۔'' چوہدری فرحان نے کہا اور اسے اپنے قریب کرلیا۔

لنچ کا وقت ہوتے ہی صائمہ واپس اپنے آفس میں جا چکی تھی۔ اس کے جاتے ہی چوہدری فرحان کو فون کال آگئی۔ وہ کال ایک سیاسی پارٹی کے مقامی عہدیدار کی تھی۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے کہا۔

''ہمیں پتا ہے کہ آپ سیاست میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتے لیکن علاقے میں جو آپ کی خدمات ہیں اس سے علاقے کے لوگوں میں آپ کے لیے ایک اچھا تاثر پایا جاتا ہے۔''

''بس جی مجھے کیا کرنا ہے۔ میں تو سیدھا سادہ ایک کاروباری بندہ ہوں۔ اپنے اندر کے انسان کے لیے میں یہ خدمت بھی کرتا رہتا ہوں۔ سیاست بڑا مشکل کام ہے، میرے جیسے بندہ کہاں نباہ کرسکتا ہے۔'' اس نے انتہائی منافقت سے کہا، حالانکہ وہ ایسے ہی کسی وقت کا منتظر تھا، جب لوگ اسے خود سیاست میں آنے کی دعوت دیں۔

''کل ہماری ایم این اے صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ آپ ہماری پارٹی جوائن کریں۔ یہ باتیں، فون پر تو نہیں ہوسکتیں۔ آپ ہمیں وقت دیں، ہم آپ کے پاس آجاتے ہیں یا آپ تشریف لائیں، ہم بیٹھ کر سکون سے بات کرلیتے ہیں۔''

''چلیں میں کوئی وقت نکالتا ہوں۔ پھر کرلیتے ہیں گپ شپ۔'' اس نے دھیمے سے کہا لیکن اندر سے اس کا من جھوم اٹھا تھا۔ اس نے کال بند کی اور سوچنے لگا۔

فلک شیر اور بدرشاہ کے علاوہ علاقے کے بہت سارے تاجر اس کے ساتھ منسلک ہوگئے تھے۔ تقریباً ایک سال سے زیادہ کا وقت گزر جانے پر اسے اس دن کا ہی انتظار تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی محنت ضائع نہیں ہوئی تھی بلکہ جو بھی اس نے سرمایہ کاری کی تھی، اب اس کے منافع کا وقت شروع ہوگیا تھا۔ اس نے محنت بھی بہت کی تھی۔ اپنی گھی مل کے برانڈ کو جہاں تک پہنچا سکتا تھا پہنچا دیا تھا۔ اس برانڈ کے ساتھ اس کا نام بھی لوگوں کے ذہن میں پیوست ہو چکا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ جو فصل اس نے بوئی تھی۔ اب وہ بارآور ہوگئی تھی۔

چند دن بعد اس نے سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

اس نے جان بوجھ کر کوئی عہدہ نہیں لیا بلکہ ایک کارکن

کی حیثیت سے کام کرنے کا اعلان کیا۔ یہ وہی پارٹی تھی جس میں میاں طارق اس وقت ایم پی اے تھا۔ کل اگر چوہدری فرحان الیکشن لڑتا تو اس کا مقابلہ میاں طارق ہی سے ہونا تھا۔ یہ بات وہ دونوں ہی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

تقریباً دو ہفتے گزرے ہوں گے۔ چوہدری فرحان اور میاں طارق دونوں ہی ایک تاجر کی بیٹی کی شادی میں اکٹھے ہوگئے۔ دونوں... ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوشگوار انداز میں ملے۔ مسکراتے ہوئے تصویریں بنوائیں اور پھر باتیں کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔ لوگوں سے دور تنہائی میں جاتے ہی میاں طارق نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''چوہدری صاحب، میں عرصہ بیس برس سے اس علاقے میں سیاست کررہا ہوں۔ جس طرح آپ نئے ہیں، اسی طرح ایم این اے مجھ سے بھی پرانا سیاست داں ہے۔ آپ بھی سمجھتے ہیں اور میں بھی وہ اپنے گھوڑے تیار کر رہا ہے تاکہ اس علاقے میں مضبوط رہے۔''

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ ایم این اے آپ کو نہیں چاہ رہا اور وہ میری طرف متوجہ ہوگیا ہے؟'' چوہدری نے تصدیق کرنے والے انداز میں کہا تو میاں طارق بولا۔

''جی، میرا اُن سے کافی حد تک اختلاف ہوگیا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو نقصان ہمارا ہوگا۔ وہ کوئی تیسرا بندہ بھی چن سکتا ہے۔'' میاں طارق نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بات تو آپ کی بالکل معقول ہے۔ ہمیں اپنا نقصان نہیں کرنا۔'' چوہدری نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں، آپ حلقے میں پوری طرح محنت کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں یہ آپ کا حق ہے لیکن جہاں میرے مفادات ہیں، میرے لوگ ہیں، انہیں آپ نہیں چھیڑیں گے۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا، جہاں آپ کے مفادات ہیں، میں اس میں نہیں آؤں گا۔'' میاں طارق نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' چوہدری فرحان سمجھ گیا کہ وہ نرم لفظوں میں اسے کیا سمجھانا چاہتا ہے۔ میاں طارق اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ اس کے راستے میں نہیں آئے ورنہ کھلی دشمنی ہوجائے گی۔

''آنے والے دنوں کی سیاست کیا کہتی ہے، نہ آپ جانتے ہیں اور نہ میں، ممکن ہے ایم این اے ہی الیکشن سے باہر ہو۔ پھر ہمیں ہی ایک دوسرے کا سوچنا ہے۔ کیونکہ ہماری پارٹی ایک ہے۔'' میاں طارق نے اسے آنے والے دنوں کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی۔ چوہدری فرحان بھی سمجھا کہ میاں طارق اسے یہ سمجھا رہا ہے کہ تیرا میرا مقابلہ نہیں بنتا، وہ خود ایم این اے کا الیکشن لڑنا چاہتا ہے۔ اس لیے ذرا سنبھل کر چلے۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے یہ بات سمجھی اور بڑے سکون سے کہا۔

''دیکھو جی طارق صاحب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ الیکشن میں کون کیا کرتا ہے۔ ہاں یہ بات میں مان لیتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کی راہ میں نہیں آئیں گے۔''

''چلیں ایسا ہی سہی۔ مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ آپ بھی میری بات سے اتفاق کریں گے۔'' طارق نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دھمکی دے دی تھی۔

میاں طارق سے ہونے والی چھوٹی سی ملاقات نے چوہدری کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چوہدری فرحان یہ سمجھتا تھا کہ میاں طارق کو ہر معاملے کی خبر ہے لیکن وہ اس قدر باخبر ہوگا، اس کا اسے احساس نہیں تھا۔ پہلی بار اسے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میاں طارق اب تک خاموش کیوں رہا۔ وہ کوئی اور ہی کھیل کھیل رہا تھا۔ چوہدری فرحان ابھی تک اس دائرے میں ہی داخل نہیں ہوا تھا۔

اس سہ پہر جب وہ واپس اپنے بنگلے پر گیا تو کافی حد تک آرزدہ تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری محنت برباد ہوگئی ہے۔ اس کی فورویل پورچ میں رُکی تو وہ ڈھیلے قدموں سے اندر چلا گیا۔ وہ سیدھا اپنے بیڈروم میں جا پہنچا تھا۔ وہ افسردہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ اس بات کو ابھی مت سوچو لیکن دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ تم ہار گئے ہو۔ وہ اسی اُدھیڑبُن میں تھا کہ صائمہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے چوہدری فرحان کے چہرے پر دیکھا اور بالکل قریب آکر بولی۔

''کیا ہوا آپ کو، ایسے کیوں مرجھائے ہوئے ہیں؟''

''نہیں تو، میں مرجھایا ہوا نہیں بلکہ بہت تھک گیا ہوں، ان سیاسی سرگرمیوں نے مجھے بہت تھکا دیا ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہو۔

''میں مانتی ہوں کہ یہ سیاسی سرگرمیاں بندے کو تھکا دیتی ہیں۔ لیکن بندہ اس وقت تھکاوٹ کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگتا ہے جب اس پر مایوسی سوار ہونا شروع ہو جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے؟'' صائمہ نے کہا اور ایک کرسی کھینچ کر اس کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔

''کسی حد تک تم ٹھیک کہہ سکتی ہو۔ میں نے علاقے میں

بہت سارا پیسہ لگا دیا، بہت محنت بھی کی، لوگوں کے بہت کام بھی آتا ہوں لیکن اس کا وہ خاطر خواہ نتیجہ نہیں دیکھ رہا جو ہونا چاہیے۔'' وہ مترنم لہجے میں بولا۔

''آپ رہے ہیں لندن میں اور آپ وہاں کی سیاست کو لاشعور میں بسا کر بیٹھے ہوئے ہیں، یہ یہاں کی سیاست ہے، اس کی نہ آج تک کسی کو سمجھ آسکی ہے اور نہ ہی اسے کسی نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تو وہ ہنستے ہوئے بولا

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''آپ میرے کہنے کو چھوڑیں، اپنی کہی ہوئی ایک بات یاد کریں۔'' صائمہ نے ایک ادا سے کہا۔

''وہ کون سی؟'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''آپ نے ایک بار کہا تھا کہ یہ سیاست بھی ایک کاروبار ہے۔ کہا تھا نا آپ نے، اس میں پتا نہیں کتنے لگاؤ تو کتنے بن جاتے ہیں۔'' صائمہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں نے کہا تھا اور ہے بھی ایسا ہی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''جب آپ کوئی کاروبار کرتے ہیں، تو اس میں ایک بہترین ٹیم بناتے ہیں جو بالکل پروفیشنل ہو۔ آپ کے منافع کو بڑھائے۔ دیکھیں سرمایہ دار کو اپنے مزدور سے غرض نہیں ہوتی، بلکہ اپنے منافع سے غرض ہوتی ہے۔ وہ وقت پر کام کے لیے پہنچے تو وہ انہیں گھر مہیا کرتا ہے۔ کالونی بناتا ہے، بناتا ہے نا، اس کے بچوں کا اسکول یہ سب سہولیات۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو، وہ بات کہو۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ بھی سیاست کو ایک کاروبار سمجھیں اور ایک بہترین ٹیم بنا لیں۔ اس ٹیم پر خرچ کریں، اس سے نتائج لیں۔ یہ جو آپ کے طریقے ہیں، یہ پرانے ہو چکے ہیں، یہاں کا ووٹر بھی سمجھ چکا ہے۔''

''تمہارے خیال میں ٹیم کیسی ہونی چاہیے؟'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے، اس میں بہترین تجزیہ کار ہوں، صحافی ہوں، سوشل میڈیا والے ہوں، ایک سسٹم کے ساتھ ایک سوچ کے ساتھ مطلوبہ نتائج لیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ہی بات بٹھا دیں کہ آپ ہی اس علاقے کے تمام مسائل حل کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ یہ بات پہنچا دینا بھی تو ایک مکمل آرٹ ہے سر۔'' صائمہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''اوکے، تم سارے کام ختم کر کے آؤ، میں بھی فریش ہو جاؤں۔ ہم آج ہی سے یہ پلان کرتے ہیں۔'' چوہدری فرحان نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہی اسپرٹ چاہیے۔ کل نہیں آج۔''

اس پر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ وہ چلی گئی تو چوہدری فرحان خود میں ایک نئی قوت محسوس کرنے لگا۔ بعض اوقات کوئی معمولی سی بات انسان کو پژمردہ کر دیتی ہے اور کبھی کبھی ذرا سا سہارا انسان کو پھر سے توانا کر دیتا ہے۔ اسے صائمہ پر بہت زیادہ پیار آیا تھا۔

اسی شام فلک شیر نے فون کیا کہ وہ ایک ایمرجنسی معاملے کے لیے بنگلے پر آرہا ہے۔ چوہدری فرحان نے اسے بلا لیا۔

''خیر ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے ہو؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''بولو کیا بات ہے؟'' چوہدری فرحان نے سنجیدگی سے پوچھا تو فلک شیر اسے تفصیل بتانے لگا۔

کچھ دن پہلے فلک شیر کو اُڑتی ہوئی خبر ملی تھی کہ مشتاق کے گھر والے میاں طارق کے ہاں گئے تھے۔ اسی دن اکرم اور راشد کے گھر والے بھی شہر میں تھے۔ بظاہر یہ معمولی سی بات تھی لیکن جب اس نے کھوج لگائی تو اُسے پوری تفصیل مل گئی جو اسے پاگل کر دینے والی تھی۔ اس اطلاع کی تفصیل یہ تھی کہ کافی عرصے سے تینوں گھروں کے درمیان کچھ لوگ صلح کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی یہ کوشش رنگ لے آئی تھی۔ جس دن وہ شہر گئے تھے۔ دراصل وہیں پر صلح کا معاملہ طے ہو گیا تھا۔ دونوں گھر اس دشمنی میں اجڑ گئے تھے۔ ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے نہ وہ کوئی کام کاج کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کی کوئی آزادی رہی تھی۔ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اکرم اور راشد پھر بھی انہیں کچھ بھیج دیتے تھے لیکن سب سے زیادہ پتلا حال مشتاق کے گھر والوں کا ہوا تھا۔ ان تینوں گھروں کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ راشد اور اکرم دونوں گرفتاری دے دیں گے۔ اس کے بعد جیسے ہی مقدمہ چلا تو صلح نامہ ہو جائے گا۔ اگر ریاستی دہشت گردی کا معاملہ چلا بھی تو اکرم کو عمر قید ہو جائے گی۔ یہ اس طرح بھاگتے رہنے سے زیادہ بہتر ہے۔ تینوں گھر سکون سے تو رہیں گے۔ اگرچہ یہ بہت اچھا فیصلہ تھا۔ انہوں نے اتنا نقصان ہو جانے کے بعد اب سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا تاکہ مزید کسی نقصان سے بچا جا سکے۔ مگر یہ فلک شیر کے لیے

بالکل بھی قابلِ قبول نہیں تھا۔ چوہدری فرحان کی باری جب آتی سو آتی، وہ تاجر کے قتل میں ملوث تھا۔ اگر پولیس نے ان دونوں سے منوا لیا تو وہ بھی قتل کے اس الزام میں دھر لیا جائے گا۔ یہ اسے بالکل بھی منظور نہیں تھا۔

ساری بات سن کر چوہدری فرحان کو یہ لگا جیسے میاں طارق اسی بل بوتے پر اسے باتیں سنا گیا ہے۔ وہ صرف ایک بڑک تھی جو مار گیا تھا ورنہ اندر سے کوئی بات نہیں تھی۔ اسے اطمینان ہو گیا، تبھی اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے فلک شیر، تم سکون سے رہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں سب دیکھ لوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' کہنے کو تو فلک شیر نے کہہ دیا لیکن اس کا من مطمئن نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اکرم اور راشد کو اپنے کزن لطیف کے ذریعے ساری معلومات مل رہی تھیں۔ انہیں یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ میاں طارق کے پاس سارے معاملات طے پا چکے ہیں۔ اب صرف یہ طے کرنا تھا کہ کس طرح اور کہاں پولیس کو گرفتاری دینی ہے۔ اس کی ذمے داری میاں طارق نے لے لی تھی۔ وہ دونوں وہاں سے کسی بھی وقت نکلنے کو تیار تھے۔ انہیں صرف اپنے کزن لطیف کے فون کا انتظار تھا کہ کب وہ انہیں کال کر کے بتاتا ہے تو وہ یہاں سے کھسک جائیں گے۔ وہ اس فرار سے عمر قید کی سزا بھگتنے کو تیار تھے۔

اس رات وہ کھانا کھا کر ٹی وی دیکھ رہے تھے، جب ڈیرے سے ان دونوں کا بلاوا آ گیا۔ ڈیرے پر موجود اشتہاری نے ان دونوں کو ایک جیپ میں بنگلے پر بھیج دیا۔ ڈرائیور انہیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر تک باہر لان میں دھری کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کافی وقت گزر گیا۔ اندر سے بھیجی گئی چائے بھی وہ پی چکے تو اکرم نے راشد سے پوچھا۔

''یار ہمیں بلا کر یوں بٹھایا ہوا کیوں ہے؟''

''یہی میں سوچ رہا ہوں۔ اگر کوئی کام تھا تو ہمیں بتا دیتے۔''

''کہیں کوئی گڑ بڑ تو نہیں؟'' اکرم نے اپنا شک ظاہر کیا۔

''بظاہر تو ایسا کچھ نہیں لگتا، ویسے کہیں ہمارے بھاگ جانے کی اطلاع تو نہیں مل گئی انہیں؟'' راشد نے تشویش سے کہا۔

''یار بات سن، یہ بات صرف ہم دونوں کو پتا ہے، ہم نے تو کسی سے بات نہیں کی، انہیں کیا ہمارے اندر کی باتیں پتا چل گئی ہیں؟'' اکرم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''یار میں نے تو یونہی بات کر دی تھی، اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔'' راشد نے کہا ہی تھا کہ اندر سے ملازم آیا اور اس نے کہا۔

''تم دونوں جا سکتے ہو۔ صاحب مصروف ہیں صبح تم دونوں سے ملیں گے، صبح آ جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اکرم نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب چل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی راشد بھی چلتے ہوئے بنگلے کا گیٹ پار کر گیا۔ سڑک پر آتے ہی اس نے سکون سے کہا۔

''یار ویسے ہم فضول ہی سوچ رہے تھے۔''

''اچھا اب یہ بات کرو بھی نہ، ایویں خواہ مخواہ مشکل ہو جائے گی اگر کسی کو شک بھی پڑ گیا تو۔'' اکرم نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ بولا، ''اب ڈیرے پر کیسے جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی سواری.....'' یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا پھر بولا، ''یار میرا خیال ہے یہیں سے نکلتے ہیں، یہ ایک اچھا موقع ہے۔ کیا کہتے ہو؟''

''نکلنے کو تو نکل جائیں، موقع بھی اچھا ہے، لیکن یہاں سے جائیں گے کہاں؟'' راشد نے پوچھا۔

''جانا کہاں ہے، سیدھے گھر، وہاں سے میاں طارق کے پاس۔ وہیں سے گرفتاری دے دیں گے۔ جان چھوٹے گی اس عذاب سے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا تو راشد بولا۔

''چل پھر اڈے کی طرف چلتے ہیں۔ دیکھو کوئی رکشا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ رُک گئے۔ انہوں نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ کچھ فاصلے پر ایک رکشا آتا ہوا دکھائی دیا۔ انہوں نے اسے ہاتھ دیا تو وہ قریب آ کر رُک گیا۔ تبھی راشد نے اس سے پوچھا۔

''لاری اڈے چلو گے؟''

''نہیں جی اُدھر نہیں جانا۔'' رکشے والے نے کہا اور رکشا بڑھا لیا۔ وہ کسی دوسرے رکشے کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ پانچ سات منٹ گزر گئے، کوئی رکشا دکھائی نہیں دیا۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ ایک کار اُن کے پاس آ کر رکی۔ اگلی نشست پر بیٹھے بندے نے پوچھا۔

''یار ایک ایڈریس بتا سکتے ہو؟''

''کون سا؟'' راشد نے کہا تو وہ بندہ ایک کاغذ ہاتھ

میں پکڑے باہر آ گیا۔ اس نے کاغذ راشد کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اکرم کے ایک گھونسا پڑا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ جب تک وہ سنبھلے، کار میں سے دو تین بندے باہر نکلے، انہوں نے انتہائی سرعت سے پسٹل نکال کر کہا۔

''چلو گاڑی میں بیٹھو۔''

''کون ہو تم لوگ؟'' اکرم نے پوچھا۔

''سب بتاتے ہیں، بیٹھو ورنہ گولی مار دوں گا۔'' ایک نوجوان نے کہا تو اس کے ساتھ ہی باقی لوگوں نے دھکیل کر انہیں کار میں بٹھا دیا۔ جیسے ہی وہ کار میں بیٹھے، ان کے سر پر زوردار شے لگی، وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گئے۔

ان دونوں کو جب ہوش آیا تو ویرانے میں تھے۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر ٹریفک چل رہی تھی۔ ان کے سامنے کھڑے چار افراد نے پسٹل تانا ہوا تھا۔

''لاری اڈے کیا کرنے جا رہے تھے؟''

''تمہیں کیسے پتا؟'' اکرم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''رکشے والے نے فون پر بتایا۔ تم دونوں کے بارے میں پتا چل چکا ہے کہ یہاں سے جانا چاہتے تھے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''سنو، ہم پولیس والے ہی ہیں، تم دونوں کو صرف گولی مارنا ہوتی تو کب کی مار دیتی تھی انہوں نے جہاں تم لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ جن کا کھا رہے تھے انہی کے خلاف سازش کی، خیر، تم لوگوں کو زندہ رکھ کر ہمیں کچھ نہیں ملنے والا لیکن اشتہاری کو مار دینے میں ہمیں تھوڑا فائدہ مل سکتا ہے۔ اس لیے تم دونوں کا مر جانا بہت ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے پسٹل سیدھا کیا اور فائر کرنا شروع کر دیے۔ دوسروں نے بھی فائر کیے۔ کچھ دیر بعد اکرم اور ارشد دونوں وہیں دم توڑ گئے۔

اگلے دن کے اخبار میں قتل اور ڈکیتی کی مختلف وارداتوں میں ملوث دو افراد کے پولیس مقابلے میں مارے جانے کی خبر نمایاں تھی۔

☆☆☆

چوہدری فرحان کی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ اکرم اور ارشد دونوں ہی اس کے لیے لٹکتی ہوئی تلوار تھے۔ یہ فلک شیر کی بڑی کامیابی تھی، جو بروقت اس نے چوہدری فرحان کو بچا لیا تھا۔ ورنہ حالات کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ اس طرف سے اطمینان ہوا تو اس نے اپنی سیاست کی طرف توجہ دی۔

چوہدری فرحان نے اپنی گھی مل پر معززینِ شہر کی دعوت کی تھی۔ یہ دعوت ایم این اے کے اعزاز میں تھی۔ معززینِ شہر نے بھرپور طریقے سے ایم این اے کا استقبال کیا۔ دو چار گھنٹے وہاں گھی مل میں گہما گہمی رہی۔ لوگ کھا پی کر چل دیے۔ چوہدری فرحان اپنے ساتھ ایم این اے کو لے کر اپنے بنگلے پر آ گیا۔ سہولت سے تنہائی میں بیٹھنے کے بعد ایم این اے نے کہا۔

''چوہدری صاحب، میری میاں طارق کے ساتھ پچھلے چھ برس سے رفاقت چل رہی ہے۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔''

''ایسی کیا بات ہو گئی جناب۔'' چوہدری فرحان نے پوچھا۔

''یہ آپ کے شہر کے ساتھ ہی کوئی دو سو ایکڑ زمین حکومت کی پڑی ہے۔ میاں طارق چاہتا ہے کہ وہ زمین کسی نہ کسی طرح اسے الاٹ ہو جائے۔ خیر، یہ کوئی نئی بات نہیں، وہ کافی عرصے سے کوشش کر رہا ہے لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ وہ اکیلا ہی دو سو ایکڑ ہضم کر جائے۔ آخر کچھ دوسرے لوگوں کا بھی اس زمین پر حق ہے۔'' ایم این اے نے تفصیل سے بتایا۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔ ویسے آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے اصل بات تک رسائی کے لیے پوچھا تو وہ بولا۔

''دیکھو جی، ہمیں بھی الیکشن لڑنا ہے، اس پر خرچ آتا ہے۔ اس بار میاں طارق نے جو خرچ کیا، وہ بالکل دکھاوے کا تھا۔ سارا بوجھ مجھ پر آ پڑا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میرے الیکشن کا خرچ ہی مجھے دے دو، وہ اس پر بھی راضی نہیں۔ دوسرا وہ اب ایم این اے کا الیکشن لڑنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں اب اس کے ساتھ کیا مفاہمت ہو سکتی ہے۔''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ چلیں تھوڑا وقت ہی رہ گیا ہے الیکشن میں، ہم ساتھ چلتے ہیں۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ کم از کم اس حلقے تک تو آپ کی ساری الیکشن مہم میرے ذمے ہو گی۔'' چوہدری فرحان نے کہا تو ایم این اے خوش ہو گیا۔ اس کے یہاں آنے کا اصل مقصد ہی یہی تھا کہ وہ اسے اپنا سرمایہ کار بنا لے۔ تبھی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''چوہدری صاحب، آپ اس حلقے میں کھل کر کام کریں۔ جہاں آپ سمجھیں کہ میری ضرورت ہے، چاہے وہ جیسا بھی کام ہو مجھے بتائیں۔ ذرا بھی جھجک محسوس نہ کریں۔ دوسری بات جو یہ آپ کہہ رہے ہیں نا کہ الیکشن میں تھوڑا وقت پڑا ہے، یہ تھوڑا نہیں ہے، الیکشن سر پر سمجھیں آپ۔ آپ جیسے نئے امیدوار کے لیے تو مزید محنت کی ضرورت

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550

اندھیری رات کے مسافر -/475

اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے المناک مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت اور بربادی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش -/300

قیصر و کسریٰ -/625

ظہورِ اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550

شیرِ میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے -/500

داستانِ مجاہد -/300

پردیسی درخت -/450

یوسف بن تاشفین -/500

معظم علی -/475

خاک اور خون -/550

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450

قافلۂ حجاز -/599

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/425

پورس کے ہاتھی -/300

جہانگیر بُکس 91

انسان اور دیوتا -/450

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300

آخری چٹان -/450

سو سال بعد -/225

سفید جزیرہ -/325

شاہین -/475

اندلس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ

دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165

اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165

حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195

اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140

حکایاتِ رومیؒ -/180

دلچسپ و عجیب حقائق -/170

حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199

دلچسپ وحیرت انگیز باتیں -/150

ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات -/180

بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)

... طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ دور جدید کا پہلا لغت

جہانگیر بُک ڈپو

022-2780128 042-35757086
042-37220879 051-5539609 021-32765086

ہے۔ آپ کھل کر سامنے آجائیں۔ جہاں آپ مجھے بلائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا بلکہ آپ زیادہ سے زیادہ پروگرام رکھیں۔ ابھی سے عوامی رابطہ مہم شروع کر دیں۔''

''جی بالکل، حلقے میں آپ کا ووٹر بھی ہے، میں بھی تھوڑی بہت محنت کر چکا ہوں۔ اب وقت ہے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلا جائے۔ میں بالکل تیار ہوں۔''

چوہدری فرحان نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر چائے پینے کے دوران ان کی حلقے کے حوالے سے باتیں ہوئیں، پھر ایم این اے وہاں سے خوش ہو کر گیا۔ دونوں نے ہی ایک دوسرے کو خوب سبز باغ دکھائے تھے۔

ایم این اے کے جانے کے بعد اس نے بدر شاہ کو بلا لیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد چوہدری فرحان نے پوچھا۔

''اگر ہم باقاعدہ سیاست میں آنے کا اعلان کر دیتے ہیں تو حلقے میں ہماری پوزیشن کیا ہوگی؟''

''جہاں تک میری ذاتی رائے ہے اور میں نے اس پر سوچا بھی ہے تو آپ الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں ہیں۔ لیکن...... الیکشن لڑنا اور الیکشن جیت جانا دو الگ الگ باتیں ہیں۔'' بدر شاہ نے الجھا ہوا جواب دیا تو اس نے کہا۔

''مجھے صاف لفظوں میں بتائیں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

''دیکھیں اس حلقے سے میاں طارق کے سوا کوئی مضبوط امیدوار نہیں ہے۔ اگر مقابلہ ہوا تو اسی سے ہوگا۔ وہ بڑا گھاگ سیاست داں ہے۔ جہاں اس کا ووٹ بینک ہے وہاں اس سے لوگ ناراض بھی بہت ہو چکے ہیں۔ جب تک اس کے مقابلے پر بہت مضبوط امیدوار نہیں ہوگا، تب تک ووٹر بھی اپنی سوچ نہیں بدلے گا۔''

''یہ سوچ کیسے بدلی جا سکتی ہے؟'' چوہدری فرحان نے پوچھا۔

''اس حلقے کا زیادہ علاقہ دیہاتی ہے۔ یہاں دھڑے بندی کی سیاست چلتی ہے۔ اس کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہے کہ اگر آپ اس دھڑے کے سب سے پرانے لوگوں کو منا لیتے ہیں تو اچھا خاصا ووٹ آپ اپنے نام کر لیتے ہیں، اور وہ لوگ نہیں مانتے تو وہی ووٹ آپ کے خلاف جا سکتا ہے۔ دوسرا الیکشن میں ہوتی ہے ایک ہوا بنانی، وہ اگر بن جائے تو سیاست داں کے سارے کام دھرے رہ جاتے ہیں۔''

''تم کیا کر سکتے ہو؟'' چوہدری فرحان نے پوچھا۔

''میں آج ہی سے ہوا باندھنی شروع کر دیتا ہوں جو الیکشن تک آپ کا نام ہر گھر میں پہنچا دے گی۔ کم از کم ذہن سازی تو ہوگی۔ علاقے کی فضا آپ کے حق میں ضرور ہو گی۔'' بدر شاہ نے یقین سے کہا۔

''چلو، تم یہی کام کرو، اپنی ٹیم سے جس طرح کام لینا ہے لو۔ اس کے لیے ایک مخصوص بجٹ بھی لے لو۔'' چوہدری فرحان نے کہا

''نہیں بجٹ کی ہمیں ضرورت نہیں، جو پہلے ہے وہی بہت ہے۔ بس یہ ہے کہ ہمارے ساتھ چلنے والے بے روزگار نوجوانوں کے روزگار کا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔'' بدر شاہ نے ایک اچھی سوچ کا اظہار کیا۔

''الیکشن کے بعد سارے معاملات تم لوگوں نے ہی دیکھنے ہیں۔ جہاں بھی اور جیسے بھی ہمیں موقع ملا، ان سب کو ایڈجسٹ کریں گے۔'' چوہدری فرحان نے جوش بھرے لہجے میں یقین دلایا۔

''بالکل ٹھیک ہے، آپ کے پروگرام بنانا، حلقے کے لوگوں سے ملوانا، لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرنا، یہ ہماری ذمے داری۔ آپ دھڑے کے لوگوں پر محنت کریں۔'' بدر شاہ نے بتایا۔

''ڈن ہو گیا بدر، ہم آج ہی سے کام شروع کرتے ہیں۔'' چوہدری فرحان نے کہا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے بہت کچھ طے کر لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ مخالف پارٹی کے کون کون لوگ ہیں جو اُن کا سامنا کر سکتے ہیں۔ ان کی طرف سے کون کون لوگ ہیں جو سوشل میڈیا پر بہت زیادہ ایکٹو ہیں۔ اس کے پاس میاں طارق کی کرپشن کے حوالے سے بہت زیادہ مواد ہے۔ وہ اسے استعمال کرے گا۔

☆☆☆

الیکشن کا اعلان ہوتے ہی الیکشن مہم اچانک ہی بہت زوروں پر چلی گئی۔ مختلف پارٹیوں کے لوگ ایک دوسرے پر الزام تراشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ چوہدری فرحان نے علاقے میں بہت محنت کی تھی۔ اس کے ساتھ ایم این اے بھی تھا۔ وہ جو بدر شاہ نے کہا تھا کہ وہ اس کی ہوا باندھ دے گا، ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ اس کا رابطہ اپنے کزن کے ساتھ تھا۔ وہ بھی الیکشن میں اسی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑ رہا تھا۔

چوہدری فرحان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میاں طارق جو کہ ایم این اے کا الیکشن لڑنے کے خواب دیکھ رہا تھا، اسے

اپنی صوبائی سیٹ بچانا بہت مشکل ہو گئی تھی۔ یہ چوہدری فرحان کی پہلی کامیابی تھی۔ اس کی ٹیم بھرپور محنت کر رہی تھی۔ وہ جب تھک ہار کر رات گئے واپس آتا تو صائمہ اس کی منتظر ہوتی تھی۔ جیسے ہی وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوتا، صائمہ کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی۔ وہ اسے ہر طرح سے فریش کرتی، پُرسکون نیند کا ماحول بناتی اور یہاں تک کہ اس کی ساری تھکن اتر جاتی۔ صبح جب وہ بیدار ہوتا تو ایک نئے دن کی طرح وہ بالکل فریش ہوتا۔ وہ کئی بار صائمہ سے یہ اظہار کر چکا تھا کہ وہ اس کے لیے نعمت ثابت ہو رہی ہے۔

وہ دن بھی آ گیا جب کاغذات نامزدگی جمع کروائے جانے تھے۔ جس وقت وہ اپنے کاغذات جمع کروانے گیا تو اس کے ساتھ ایک جمِ غفیر تھا۔ لوگ اس کے لیے نعرہ بازی کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سوشل میڈیا پر یہ لکھا جانے لگا کہ الیکشن سے پہلے ہی الیکشن ہو گیا۔ چوہدری فرحان جیت گیا۔ یہ ساری بدر شاہ کی محنت تھی۔ ایم این اے نے بھی کاغذات جمع کروائے تو بھی ایسا ہی منظر تھا۔ حلقے کے عوام کو یہ بتا دیا گیا کہ ایم این اے اس کے ساتھ ہے۔ اب اگلا مرحلہ پارٹی ٹکٹ کا تھا۔

چوہدری فرحان کو یہ پورا یقین تھا کہ ٹکٹ اُسے ہی ملے گا۔ جہاں ایک طرف اس کے کزن نے اسے یقین دلایا تھا تو دوسری طرف پارٹی فنڈ کے نام پر ایک بڑی رقم وہ دے چکا تھا۔ انہی دنوں اسے میاں طارق کی طرف سے پیغام ملا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ ایک طرح سے حیرت انگیز بات تھی کہ اس کا مخالف امیدوار اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک ہی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی مفاہمت کی بات بھی ہو سکتی تھی۔ کہتے ہیں نا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ یہ سیاست بھی تو ایک طرح کی جنگ ہی تھی۔ چوہدری فرحان نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سے ضرور ملے گا۔

چند دن میں ہی دونوں کی ملاقات طے ہو گئی۔ شہر سے تھوڑا باہر ایک ایسے زمیندار کے گھر وہ ملاقات طے پا گئی جس پر دونوں ہی اعتماد کرتے تھے۔ یہ ملاقات صبح صبح طے پائی تھی، جب لوگ ابھی گھروں میں ہوتے ہیں۔ دیے گئے وقت پر چوہدری فرحان اپنے بنگلے سے نکل کر اپنے اس دوست کے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اس کے ساتھ چند گارڈ تھے۔ ڈرائیور فور وہیل چلا رہا تھا۔ وہ جس وقت دوست کے گھر پہنچے تو وہاں چند ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

میاں طارق پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک کمرے میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔

''بھئی چوہدری صاحب داد دینا پڑتی ہے آپ کی محنت کو اور آپ کی ٹیم کو، جس طرح انہوں نے محنت کی اور تقریباً ایک برس کے اندر اندر آپ کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ آپ الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں آ گئے ہیں۔'' میاں طارق نے خوشدلی سے کہا۔

''میاں صاحب، اس میں تھوڑا سا اضافہ کر لیں، الیکشن جیتنے کی پوزیشن میں آ گیا ہوں۔'' چوہدری فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بے شک ایسا ہی سمجھ لیں، یہ جیت ہار تو اسی دن سامنے آتی ہے نا، جس دن پرچی بیلٹ بکس سے نکلتی ہے۔'' میاں طارق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے ہم اس موضوع پر بات کریں جس کے لیے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔'' چوہدری فرحان نے سنجیدگی سے کہا۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ذرا چائے آ جانے دیں۔'' میاں طارق نے عجیب سے لہجے میں کہا تو وہ بے چینی سے بولا۔

''نہیں ابھی چائے کا کوئی موڈ نہیں ہے پھر سہی، آپ بات کریں۔''

''میں جو بات کرنے جا رہا ہوں، اس کے بارے میں آپ یہ یقین کر لیں کہ یہ صرف آپ کے اور میرے درمیان ہوگی۔ یہ جو ہمارا مشترکہ دوست ہے، اسے بھی اس بات کے بارے ذرا سا بھی پتا نہیں ہے۔ یہ صرف ہم دونوں کو معلوم ہو گی۔'' میاں طارق نے تمہید کے طور پر کہا اس پر چوہدری فرحان خاموش رہا تو وہ چند لمحے بعد بولا۔ ''میرا خیال یہ ہے چوہدری صاحب، آپ یہ الیکشن نہ ہی لڑیں تو بہتر ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' چوہدری فرحان نے حیرت سے کہا

''ہو سکتا ہے۔'' میاں طارق نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے؟ مجھے سمجھائیں۔'' وہ غصے میں آ گیا۔

''سو طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ دیکھیں مجھے ایم این اے کا الیکشن لڑنا تھا، وہ چھوڑ کر میں اب چھوٹی سیٹ پر آ گیا ہوں صرف آپ کی وجہ سے۔ آپ نے میرا نقصان کیا۔''

''میں نے اپنی......'' اس نے کہنا چاہا تو میاں طارق سخت لہجے میں بولا۔

''نہیں، آپ میرے ساتھ بھی ایڈجسٹ کر سکتے

PakiBooks.Site

تھے۔ آپ ایم این اے کے ساتھ جُڑ گئے۔ صرف مجھے ہرانے کے لیے، الیکشن سے آؤٹ کرنے کے لیے۔ کیا اس طرح میں الیکشن سے آؤٹ ہو سکتا ہوں؟''

''دیکھیں ہر کسی کو الیکشن لڑنے کا حق ہے، میں بھی لڑ رہا ہوں، آپ بھی لڑ رہے ہیں۔ یہ تو ووٹ فیصلہ کرتا ہے نا کہ کون جیت جاتا ہے اور کون ہارتا ہے۔'' چوہدری فرحان نے سکون سے کہا۔

''چوہدری، سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ اب ٹکٹ کے معاملے پر تمہارا اور میرا مقابلہ ہوتا ہے۔ میں تمہیں آفر کرتا ہوں، اس الیکشن میں میرا ساتھ دو، میں تمہیں شہر کی چیئرمین شپ دے دوں گا۔'' میاں طارق نے نخوت سے کہا۔

''اتنا بڑا بول مت بولو میاں طارق، کیا تم نے مجھے یہی کہنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔ تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے تم الیکشن سے پہلے ہی ذہنی طور پر ہار گئے ہو؟'' چوہدری فرحان نے کہا۔

''نہیں، تم مجھے کبھی بھی نہیں ہرا سکتے، یہ ناممکن ہے۔ تم یہ دعا کرو کہ میں تمہیں اس الیکشن مہم میں اپنے ساتھ رکھ لوں۔ ورنہ جھٹک کر پرے بھی مار سکتا ہوں۔ تمہارے پلّے کچھ بھی نہیں رہے گا۔'' میاں طارق کا لہجہ اب نفرت آمیز ہو گیا تھا جس سے چوہدری فرحان کو غصہ آ گیا۔

''چلو پھر ہم الیکشن کے میدان ہی میں ملتے ہیں۔''

''میں تمہیں اپنا کوورنگ امیدوار بھی نہیں رکھنا چاہتا، تم الیکشن کی بات کر رہے ہو، تم الیکشن سے آؤٹ ہو میری جان۔'' یہ کہتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا، پھر بولا، ''اور مزے کی بات یہ ہے کہ میری الیکشن مہم میں تمہارا پیسہ خرچ ہوگا۔ تم نے جو اتنی محنت کر کے اپنے لیے ووٹ بینک بنایا ہے نا، اسے کہو گے کہ وہ سب ووٹ مجھے ڈالیں۔ اسے کہتے ہیں سیاست۔''

''اتنی خوش فہمی ہو گئی ہے تمہیں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''تم نے ابھی پوچھا ہے نا، کہ میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے۔ تو سنو۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرامائی طور پر خاموش ہو گیا پھر ہولے سے بولا، ''ذرا اپنے فون کا نیٹ کھولو، اور دیکھو، تمہارے فون میں کیسے کیسے ویڈیو پڑے ہیں۔ اس کے بعد مجھے بتانا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ۔''

اس نے کچھ اتنے اعتماد سے کہا تھا کہ چوہدری فرحان نے اپنا سیل فون دیکھنا شروع کر دیا، پہلی ہی ویڈیو نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وہ صائمہ کے ساتھ گزارے ہوئے وہ لمحے تھے جو اگر عوام میں چلے جاتے تو چوہدری فرحان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ یہ وہ لمحات تھے جو دبئی میں گزرے تھے۔ وہ دونوں ساحلِ سمندر پر تھے۔ صائمہ نے بکنی پہنی ہوئی تھی اور وہ صرف شارٹس میں تھا۔ دونوں ساحلِ سمندر پر جو کچھ کر رہے تھے وہ یہاں کی عوام کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔

اگلی ویڈیو اس کے اپنے ہی بیڈروم کی تھی۔ وہ صائمہ کے ساتھ تھا۔ اس ویڈیو میں گفتگو بھی چل رہی تھی۔ ایسی آوازیں تھیں کہ اپنے کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ جس نے بھی یہ ویڈیو بنائی تھی، اس کا کوئی انتہائی قریبی بندہ تھا۔ ورنہ اس کے بیڈروم تک کون رسائی کر سکتا تھا۔

تیسری ویڈیو دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے سیل فون اپنی جیب میں رکھا اور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

''یہ تو صرف دو ویڈیوز ہیں چھوٹی چھوٹی، میرے پاس تو سیل فون بھرا پڑا ہے، روزانہ ایک ویڈیو سوشل میڈیا پر جائے تو تمہارا حشر کیا ہو یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''کس نے بنائی ہیں یہ ویڈیوز؟'' اس نے مرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یار جب شطرنج کھیلتے ہیں نا، تب مہروں ہی سے کھیل آگے بڑھتا ہے۔ یہ مہرے ہی ہوتے ہیں جن سے شہ مات دی جاتی ہے۔ یہ سیاست کا کھیل شطرنج کے کھیل جیسا ہے۔ اس میں بھی طرح طرح کے مہرے لڑتے ہیں اور تم تو ایک پیادے سے مار کھا گئے یار۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہتے ہو، ویسا ہی ہوگا لیکن یہ بتاؤ کہ......'' اس نے سوال پوچھنا چاہا تو میاں طارق نے کہا۔

''وہی جس کی تمہارے بیڈروم تک رسائی تھی۔ وہ میرا پیادہ تھا، جو تمہارے خانے میں جا بیٹھا تھا نہیں بلکہ میں نے بٹھایا تھا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا۔

''جب کوئی کھیل کھیلتے ہیں نا، تو اس کے سارے داؤ آنا چاہئیں۔ اناڑی جب مار کھاتا ہے تو اسی طرح حیرت سے دیکھتا ہے جیسے تم دیکھ رہے ہو۔ جب تم گھی مل لگا رہے تھے میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ تم ایک دن میرا سامنا کرو گے۔ میں نے تمہاری مخالفت بھی کی تو مجھے یقین ہو گیا۔ انہی دنوں میں نے اپنا پیادہ تمہارے خانے میں فٹ کر دیا۔''

''کون ہے وہ؟'' چوہدری فرحان نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''چل بتا دیتا ہوں، ورنہ کہیں تمہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے۔ سامنے آ جاؤ بھئی۔''

اس نے کہا تو صائمہ کمرے میں آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکان اور آنکھوں میں بے چینی تھی۔

''تم...... تم نے یہ کیا سب کچھ؟'' چوہدری فرحان نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ ہنس دی پھر بولی۔

''کیوں میں نہیں کر سکتی، تمہارے ہاں تو صرف تنخواہ تھی۔ اتنے پیسے تو کوئی کال گرل بھی نہ لے جتنے تم مجھ پر خرچ کرتے تھے۔ اس کی تمہیں سمجھ نہیں آئی۔ تم یہ سمجھتے تھے کہ میں تم پر عاشق ہو گئی ہوں؟''

''بہت بُرا کیا تم نے صائمہ، تم نے بہت برا کیا۔'' چوہدری فرحان نے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔

''اچھا یا بُرا، یہ میں نہیں جانتی، میں نے دونوں طرف سے پیسے بنائے ہیں اور اب سے کچھ دیر بعد میں یہ پاکستان چھوڑ کر دبئی جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ ہاں کبھی دبئی آنا ہو تو میرے پاس آ جانا، ہم مل کر پرانے دن یاد کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''اچھا تم نکلو، تمہاری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔'' میاں طارق نے کہا تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر کی جانب چل دی۔ اسے گئے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ میاں طارق نے چوہدری فرحان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کچھ دیر بعد تم دیکھو گے، تمہیں خود احساس ہوگا کہ میری الیکشن مہم تمہارے پیسے سے چل رہی ہے۔ اس صائمہ کا اور میرا مشترکہ اکاؤنٹ ہے جس میں تمہارے پیسے پڑے ہوئے ہیں۔ کیسا لگے گا تمہیں؟''

''ٹھیک ہے میاں طارق، جیسا تم چاہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میاں طارق نفرت بولا۔

''دشمن سے میں ہاتھ ملانے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ جاؤ، جیسے کہوں ویسے کرنا۔ دھیان سے جانا، راستے میں تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

چوہدری فرحان وہاں سے نکلا تو اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بھی پتا چل رہا تھا۔ وہ فور وہیل میں بیٹھا تو وہ چل دی۔ ہر طرف نیلگوں اُجالا پھیل گیا تھا۔ جیسے ہی وہ مین سڑک پر آئے، انہیں لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ تھوڑی سی ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی رکے، ایک گارڈ بھاگ کر گیا کہ پتا کرے کیا ہوا ہے۔ وہ گارڈ چند منٹ بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس نے آتے ہی چوہدری فرحان کے کان میں کہا۔

''سر جی، وہاں میڈم صائمہ کی لاش گاڑی میں پھنسی ہوئی ہے، وہ اسی گاڑی میں نکلی تھیں۔''

گارڈ کی بات سن کر چوہدری فرحان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ڈرائیور سے نکل جانے کو کہا۔ اس نے صائمہ کی لاش دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ میاں طارق کا سرپرائز تھا۔

چوہدری فرحان اپنے بنگلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر بعد میاں طارق کو فون کر دیا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا

''ہاں کیسا رہا سرپرائز؟''

''تم نے جو سرپرائز دیا سو دیا، اب جو میں دے رہا ہوں، اس کے بارے میں غور سے سنو۔'' یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر بولا، ''میں نے تمہارے فون پر اپنا اور صائمہ کا نکاح نامہ بھیجا ہے۔ اُسے دیکھ لینا اور اس......''

''تم کیا سمجھتے ہو، اس طرح تم بچ جاؤ گے۔ جب تک تم اس کی حقیقت بیان کرو گے تب تک......'' میاں طارق نے کہنا چاہا تو اس نے بات کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''صرف میری سنو میاں طارق، اس نکاح نامے کے ساتھ کچھ ویڈیوز ہیں، میں تو نکاح نامے کی وجہ سے بچ جاؤں گا اور تردید کے لیے وہ بھی اس دنیا میں نہیں لیکن تمہیں اپنی بیوی کا طلاق نامہ بھی نہیں بچا سکے گا۔''

''بکواس مت کرو۔'' میاں طارق دہاڑا۔

''ویڈیو دیکھو، اور پھر مجھے بتاؤ تم میری الیکشن مہم میں پیسہ بھی لگاؤ گے اور میرا پیسہ واپس بھی تم ہی لاؤ گے۔ اپنے کاغذات واپس لے کر میری حمایت کا اعلان بھی کرو گے۔''

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اور میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ اس وقت تک جب تک یہ کھیل پورا نہیں ہو جاتا۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔ وہ اپنا فون بند کر چکا تھا۔ چوہدری فرحان نے اسے ایک میسج بھیج دیا۔

''یاد رکھو، کھیل میں صرف پیادے مارے جاتے ہیں، تم بھی ایک پیادے ہو۔''

PakiBooks.Site

زمین خور

کبیر عباسی

زمین سے وابستگی رکھنے والے کبھی اس کی ملکیت سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے... انسیت... وابستگی جب محبت میں بدل جاتی ہے تو اس کے اختیارات میں بھی تبدیلی آتی چلی جاتی ہے... زمین سے جڑے ایک ایسے ہی خاندان کی داستان... ایک محبت کا سمندر تھا... دوسرا بغض و نفرت کا پیکر... دونوں بھائیوں کے درمیان دوریاں بڑھتی جارہی تھیں... اور دل و زمین میں بھی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں... وقت و حالات کے بہتے دھاروں کی لپیٹ میں آجانے والوں کی المیہ داستان...

زمین دوست اور زمین خور کا خونی ٹکراؤ..... سرورق کا سنسنی خیز رنگ.....

نقاش کی آنکھ کسی نامعلوم سے احساس کے باعث یکدم ہی کھل گئی تھی۔ وہ گھور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کی سماعتوں نے کوئی اجنبی آواز سنی ہے جس کے باعث نیند کی دیوی نے یکدم ہی اس پر سے اپنا مہربان ہاتھ اٹھالیا ہے۔

اس نے اپنے کان نامعلوم آواز پر مرکوز کرلیے۔ غور سے سننے پر اسے بس جھینگر کے بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن بے چینی کے باعث نیند آنہ سکی۔

اس کا بستر زمین پر بچھا تھا۔ بستر کیا تھا بس گھاس پھوس اکٹھی کرکے جھونپڑی کے ایک کونے میں ڈال دی گئی تھی۔ اس نے اندھیرے میں چپل تلاش کرکے پہنے۔ اسی وقت وہ آواز پھر سے اس کے کانوں کے پردے سے ٹکرائی۔

''لگتا ہے وہ آگئے ہیں۔'' اس نے خود کلامی کی۔

وہ چپل گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے پیچھے لگا بھاری پتھر اُس نے اٹھایا ہی تھا کہ دروازے کا کواڑ چرچراہٹ کی آواز سے کھلتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی روشنی کا ایک ہیولا سا اندر داخل ہوا۔ اس کا دل یک لخت ہی اچھل کے جیسے حلق میں آگیا۔

☆☆☆

یہ تیرہ افراد پر مشتمل ایک پورا گروہ تھا۔ وہ اپنے ہتھیار کندھوں پر اٹھائے تیزی سے منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بلند و بالا چیڑ کے درختوں کے پتوں کی سرگوشیاں ان کے کانوں میں سائیں سائیں کررہی تھیں۔ یہ پورے چاند کی رات تھی۔ درختوں کے پتوں سے چھنتی چاندنی ماحول کو پُراسرار رنگ دے رہی تھی۔ وہ ٹارچ لائٹس ہاتھ میں اٹھائے بے فکری سے چلتے جارہے تھے۔ اس بات سے بے

خبر کے آج ان کی کارروائی دیکھنے کے لیے ایک ذی نفس اُن کے قرب و جوار میں موجود ہے۔

☆☆☆

وہ ہڑبڑا کے یکدم پیچھے ہٹا تھا۔ اگلے ہی پل اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تو وہ خوفزدہ سی ہنسی ہنس دیا۔ یہ ایک درخت کا سایہ تھا جو چاندنی کے ساتھ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہوا تھا۔ چاندنی کے اندر آتے ہی جیسے تاریک جھونپڑی میں نور سا پھیل گیا۔ ہوا کے باعث درختوں کے پتے ہل رہے تھے جن کی وجہ سے چاندنی بھی جیسے محوِ رقص تھی۔

وہ دھیرے سے باہر آگیا۔ اگست کا آخر چل رہا تھا۔ رات کے وقت موسم میں ہلکی سی خنکی محسوس کی جاسکتی تھی۔ تاہم اس خنکی میں بھی عجب طرح کا سُرور تھا۔

آواز مسلسل آنے لگی تھی۔ اب یہ آواز اس کے لیے معنویت سے بھرپور تھی۔ یہ صرف آوازیں نہیں تھیں بلکہ اس کے لیے ان آوازوں میں پوری کہانی پنہاں تھی۔ پل بھر میں ہی اس کے ذہن نے کہانی کی ساری کڑیاں جوڑ لی تھیں۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا تھا جس کا اسے انتظار تھا اسی دن کی خاطر وہ دنیا سے کٹ کے اس ویرانے میں آبسا تھا۔ وہ جھونپڑی میں واپس گیا اور اپنا واحد ہتھیار اٹھالیا۔ ہتھیار اٹھاتے ہی اس نے نرمی سے اس پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے دھاتی لمس نے اسے سُرور کی کیفیت سے دوچار کردیا تھا، لیکن اگلے ہی پل اندیشوں کے ناگ اسے ڈسنے لگے۔

اس کے دوست خطرے میں تھے۔ اس وقت صرف وہی تھا جو اُن کی جان بچانے کا باعث بن سکتا تھا وہ یہ بات جانتا تھا لیکن دوسری طرف وہ ''قاتل جتھے'' کی سفاکی سے بھی واقف تھا۔ انہیں اگر اس کی موجودگی کا شائبہ تک ہوجاتا تو اس کی جان بچنا محال ہوجاتا۔

وہ چاند کی روشنی میں آواز کے ماخذ کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ ہر چند قدم کے بعد رک کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اسے ڈر تھا کہ ''قاتل جتھے'' نے اردگرد نگران نہ چھوڑے ہوئے ہوں۔ ان کے ڈر سے اس کے دل کی دھڑکن اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ مکمل احتیاط سے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

مسلسل گونجتی آواز یک لخت ہی خاموش ہوگئی۔ وہ بھی رک گیا۔ اب جنگل میں ماتمی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

وہ چوکنا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ چند پل اسی جان لیوا سکوت کی نذر ہوگئے۔ وہ ہمت کرکے پھر سے آگے بڑھنے لگا اور پھر وہ اسے نظر آگئے۔

اس کی توقع کے مطابق وہ اپنی ضرورت کے ہر ہتھیار سے لیس تھے۔ چاند کی روشنی میں اسے ان کے ''ٹارگٹس'' بھی نظر آگئے۔ وہ سب سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے

PakiBooks.site

تھے۔ ان میں بچے بھی تھے، جوان بھی اور بوڑھے بھی لیکن وہ جانتا تھا کہ قاتل جتھے کے ٹارگٹس جوان اور بوڑھے ہی بنتے ہیں۔ وہ سب قاتل جتھے کے ہتھیاروں کے سامنے بالکل بے بس تھے۔

قاتل جتھے کے چند ارکان اپنے ایک ''ٹارگٹ'' کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان کا ٹارگٹ شدید زخمی تھا۔ وہ جاں کنی کے عالم میں تھرا رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی کراہیں سن کے نقاش نے اس کا درد جیسے خود محسوس کیا۔

قاتل گروہ کے ارکان کے ہاتھ اپنے ہتھیاروں پر جمے تھے۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ٹارگٹس کی بے بسی سے لطف کشید کر رہے ہیں۔

اس نے اپنا ہتھیار سنبھال لیا۔ اب وہ انہیں شوٹ کرنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

نقاش ایک گاؤں میں پلا بڑھا تھا۔ اس کا گاؤں پیالہ نما وادی میں تھا۔ مقامی زبان کے مطابق اسے ''ڈونگہ گراں'' کہا جاتا تھا۔ پہاڑوں سے گھرا یہ گاؤں خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ پہاڑوں پر چیڑ، کیل اور دیودار کے درختوں کے جنگلات تھے۔ یہ انتہائی قیمتی لکڑی تھی۔ یہ سرکاری جنگلات تھے۔ گاؤں کے لوگ یہاں سے جلانے کی لکڑی حاصل کیا کرتے۔ گو کہ اس پر بھی پابندی تھی لیکن محکمۂ جنگلات کی ملی بھگت سے ان کا کام چل رہا تھا۔

نقاش کے دادا گل زمین کا پھلوں کا بہت بڑا باغ تھا۔ اس باغ سے ٹنوں کے حساب سے سیب، خوبانی، آلو بخارے اور اخروٹ پیدا ہوتے جو ایبٹ آباد شہر کی منڈی میں فروخت ہوتے۔ باغ میں بیسیوں لوگ کام کرتے تھے۔ جون، جولائی میں خوبانی کا سیزن ہوتا۔ خوبانی کے درختوں سے پھل اتارا جاتا اور پیٹیوں میں پیک کرلیا جاتا۔ شہر سے آڑھتی آتے اور یہ پھل لے جاتے۔ اگست میں آلو بخارے اتارے جاتے تو اگلے ہی ماہ اخروٹ اور سیب پک چکے ہوتے۔ باغ میں مختلف انواع کے سیب لگے تھے جن کے باعث نومبر تک لوگ مصروف رہتے۔ نومبر میں برف باری کا سیزن شروع ہوجاتا۔ تب درختوں کو برف سے محفوظ رکھنے کے اقدامات کیے جاتے۔ کچھ درختوں کی شاخ تراشی کی جاتی۔ اسی ماہ لوگ موسم سرما کے لیے ایندھن اور جانوروں کے لیے چارا اکٹھا کرتے۔ جن لوگوں کے اپنے درخت تھے وہ انہی سے استفادہ کرتے باقی لوگ جنگل سے لکڑیاں کاٹ لاتے۔

گل زمین کے دو ہی بیٹے تھے۔ انور اور اکبر۔ اکبر بڑا تھا۔ اس نے پرائمری پاس کرنے کے بعد باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ بیس سال کی عمر میں ہی اس کی شادی اپنی خالہ زاد سے کردی گئی۔ اس شادی سے ان کے دو بچے ہوئے۔ نقاش بڑا تھا۔ اس سے چھوٹی ایک بہن تھی۔

انور لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ بمشکل پرائمری پاس کرسکا تھا۔ اکبر اس سے پانچ سال بڑا تھا لیکن انور نے کبھی اسے بڑے بھائی والا احترام نہیں دیا تھا۔ اس کا اکبر سے تعلق بس رسمی سا تھا۔

گل زمین اس کی لاابالی طبیعت کی وجہ سے اس سے نالاں رہتے۔ وہ اسے سمجھاتے لیکن وہ ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دیتا۔ آخرکار انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پرائمری کے بعد اسے اچانک آگے پڑھائی کا شوق پیدا ہوگیا۔ دراصل وہ فی الحال اپنی زندگی سے بھرپور لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے پڑھائی ہی سب سے بہتر بہانہ ملا تھا۔ گل زمین نے اسے ایبٹ آباد بھیج دیا۔ وہاں وہ ہوسٹل میں رہتا۔ مہینے میں ایک چکر وہ گھر کا لگاتا۔

گل زمین کا رویہ دونوں بیٹوں کے ساتھ مختلف تھا۔ اکبر ان کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ اب وہ اسے اپنے ہر معاملے میں شریک کرتے۔ اس سے مشورہ طلب کرتے۔ دوسری طرف وہ انور کی لاابالی فطرت کی وجہ سے اس سے کھنچے کھنچے سے گئے تھے۔

انور، اکبر کے ساتھ انہیں محبت سے بات کرتا دیکھتا تو اس کا دل حسد سے جلنے لگتا۔ وہ مہینے بعد گھر واپس آتا تو اپنے باپ سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتا۔ اس امر نے بھی باپ اور بیٹے کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کردیا۔

انور میٹرک کے بعد بھی گاؤں واپس آنے کے لیے تیار نہ ہوا نہ ہی اس نے کالج میں داخلہ لیا۔ گل زمین ادھر اس کے مشاغل سے بھی بے خبر تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ان کا یہ بیٹا ان کے ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔ اس مسئلے کا انہیں ایک ہی حل نظر آیا اور وہ حل اس کی شادی تھا۔ اب بیوی ہی اس کے قدموں میں لگام ڈال سکتی تھی۔

اس بار وہ واپس آیا تو انہوں نے اس سے شادی کے سلسلے میں بات کی۔ زرتاشہ ان کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ وہ گاؤں کی خوبصورت ترین لڑکی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ انور کے لیے زرتاشہ سے شادی کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا لیکن اس نے ان کی توقع کے برخلاف شادی سے انکار کردیا۔ ایسا

پہلی بار ہوا تھا کہ گل زمین کی بات ماننے سے کسی نے انکار کیا تھا۔ ان کا کہا تو پورے گاؤں کے لیے پتھر پر لکیر کی طرح ہوتا تھا۔ وہ انکار کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ ان کا ہاتھ پہلی بار اٹھا اور انور کے منہ پر طمانچے کی صورت میں پڑا۔

وہ سکتہ زدہ باپ کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کی ذات میں اس تھپڑ نے جو طوفان برپا کیا تھا، اسے نہ جانے کیا کچھ بہا کے لے جانا تھا۔

☆☆☆

نقاش اپنا ہتھیار اٹھائے پُرسوچ انداز میں قاتل جتھے کو دیکھ رہا تھا۔

''لائٹر دینا۔ میں ذرا ایک سگریٹ پھونک لوں۔'' نقاش کے کانوں میں مدھم سی آواز پڑی تو وہ جیسے اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ آواز اس کے لیے جانی پہچانی تھی۔ وہ جھک کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ شخص سائے میں تھا۔ نقاش اسے دیکھنے سے قاصر رہا۔

''استاد، جلدی کرو۔ کام نمٹاؤ اور نکل چلو۔ ایسا نا ہو کوئی دیکھ لے۔'' دوسرا شخص لائٹر بڑھاتے ہوئے بولا۔ اس کے خوفزدہ انداز سے نقاش نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص نیا نیا ان کے ساتھ شامل ہوا ہے۔

''اوئے ہمارے ساتھ شامل ہوئے ہو تو دل بڑا کرو۔ بزدلوں کی ہمارے ہاں کوئی جگہ نہیں۔'' استاد بے پروائی سے بولا۔ اس نے لائٹر کا شعلہ بلند کیا تو اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ نقاش کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ حقیقتاً اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ یہ شخص تو اس کے خیال میں مر چکا تھا۔ اس کے اچھلنے سے اس کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ ڈھلوان پر لڑھکتا چلا گیا۔

نقاش کے اندر اپنے پورے گھرانے کے قاتل کو دیکھ کے طیش کی جو لہر اٹھی تھی، وہ لڑھکتے پتھر کو دیکھتے ہوئے پل بھر میں ہی خوف میں تبدیل ہوگئی۔ وہ سکتہ زدہ سا لڑھکتے پتھر کو دیکھ رہا تھا کہ ایک چیختی ہوئی آواز اسے ہوش میں لے آئی۔

''کون ہے ادھر؟'' اس آواز کے ساتھ ہی بہت سی ٹارچ لائٹس کا رخ اوپر کی طرف اٹھا تھا۔ نقاش تیزی سے ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

ٹارچ لائٹس اس کے اردگرد محوِ رقص تھیں۔ ''لگتا ہے یہ پتھر خود ہی اپنے زور پر لڑھکا ہے۔'' کسی نے اپنی رائے دی۔

''نہیں، اس طرف کوئی موجود ہے۔ مجھے ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔'' استاد کی آواز سن کے نقاش کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''کوئی جانور ہوگا استاد۔'' دبی دبی سے ایک آواز ابھری۔ یہ اسی شخص کی آواز لگ رہی تھی جو جلد از جلد کام ختم کرنے کا متمنی تھا۔

استاد نے جواب میں جانور کا غلیظ رشتہ اس شخص سے جوڑا۔ وہ شخص منمنا کے رہ گیا۔

''چلو، سب لوگ چیک کرو یہ کون مائی کا لال ادھر موجود ہے؟'' استاد کی آواز سنتے ہی روشنیوں کا دائرہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

نقاش ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ چھپنے کی کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا لیکن اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی۔ بچاؤ کا واحد راستہ فرار ہی تھا۔ وہ لوگ قریب پہنچ جاتے تو اسے اپنی جان بچانا مشکل ہوجاتا۔ اس نے بھاگنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ درختوں کا سہارا لے کے آگے بڑھنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جلد ہی ان کی پہنچ سے دور نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ معاً اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے ایک پتھر لڑھکا۔ پتھر کی آواز قاتل گروہ کے لیے وہاں کسی کی موجودگی کا واضح پیغام تھا۔

اس نے یکایک چھلانگ لگا کے ایک درخت کے عقب میں پناہ لی۔ ایک ٹارچ کی لائٹ اسی جگہ پڑی جہاں وہ لحظہ بھر پہلے موجود تھا۔

''اس طرف ہے کوئی؟'' ایک چیختی ہوئی آواز ابھری۔

چند لمحات اسے سنبھلنے میں لگے۔ ٹارچ لائٹس اس کی طرف تیزی سے بڑھنے لگیں۔ وہ اٹھ کے ایک بار پھر بھاگنا شروع ہوگیا۔ جھاڑیوں کے باعث اسے بھاگنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اسے یہ کوشش بھی کرنا پڑ رہی تھی کہ جھاڑیوں کی سرسراہٹ زیادہ واضح نہ ہو لیکن اس کی یہ ساری کوشش بیکار گئی۔ اسے دیکھ لیا گیا تھا۔

☆☆☆

انور تھپڑ کھانے کے بعد سکتہ زدہ انداز میں باپ کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے لیکن اس کا باپ اس کی کیفیت سے بے خبر غصے میں نجانے کیا کچھ کہتا جارہا تھا۔

انور چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد جھٹکے سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنا بیگ اٹھائے وادی سے باہر

PakiBooks.site

جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ گل زمین اسے بے یقینی سے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس وقت گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ انور کی ماں کوثر اگر گھر میں موجود ہوتی تو وہ لازماً اسے روکنے کی کوشش کرتی۔

انور کے اندر آگ سی جل رہی تھی۔ اس آگ کی حدت اسے جلا رہی تھی۔ بس کی سیٹ پر بیٹھا وہ اس آگ کی تپش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش پر غور کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کو بھڑکانے میں اہم کردار اس کا بھائی ادا کر رہا ہے۔ وہ نفرت سے اس کے متعلق سوچنے لگا۔

شام کو وہ ایبٹ آباد پہنچا۔ اس نے میٹرک کے بعد وہاں ایک دو کمروں پر مشتمل گھر کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔ اس کے دوست ادھر آتے تو خوب ہلا گلا ہوتا۔ رات بھر تاش کی بازی جمتی۔ سگریٹ کے ساتھ اس نے چرس پینا بھی شروع کر دی تھی۔

گاؤں جانے کی صورت میں اسے اپنی یہ آزاد اور پُرلطف زندگی خیرباد کرنا پڑتی۔ وہ آزاد پنچھی تھا۔ اس کے باپ نے اسے قید کرنے کے لیے زرتاشہ کی صورت میں ایک خوبصورت پنجرے کا اہتمام کیا تھا لیکن اسے یہ قید گوارا نہ تھی۔

اس کے پاس جو رقم تھی وہ چند دن میں ہی ختم ہوگئی۔ اس نے اپنی ماں کو فون کیا۔ ماں اس کی آواز سنتے ہی رونے لگی۔

''پُتر، تو نے اپنے باپ سے کیا کہا؟ وہ تجھ سے ناراض ہیں۔''

وہ سنتے ہی بھڑک گیا۔ ''وہ مجھ سے خوش ہی کب ہوئے ہیں۔ ان کا تو بس ایک ہی بیٹا اکبر ہے۔ مجھ سے تو ہمیشہ انہوں نے سوتیلوں والا سلوک کیا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ وہ تجھے بھی اکبر جتنا ہی چاہتے ہیں۔ بس تیرا ذمّے داریوں سے جان چھڑانا انہیں پسند نہیں۔'' اس کی ماں نے تشفی کی کوشش کی۔

''اٹھا لوں گا ذمّے داری بھی، ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''تیری عمر میں اکبر نے سارا باغ سنبھال لیا تھا۔'' وہ محتاط سے انداز میں بولیں۔

''اکبر..... اکبر..... تنگ آ گیا ہوں میں اکبر کی قصیدہ گوئی سن سن کے۔''

دوسری طرف اسے اپنی ماں کی سسکیاں سنائی دیں تو وہ نرم انداز میں بولا۔ ''ماں، بابا کو سمجھاؤ۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔ اگر انہوں نے مجھ پر غیر ضروری دباؤ ڈالا تو میں گھر لوٹ کے نہیں آؤں گا۔''

''کیوں شادی نہیں کر سکتے۔ زرتاشہ میں کیا برائی ہے؟''

''برائی اُس میں نہیں۔ بس میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''اچھا میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گی لیکن تیرے رویّے سے انہیں بہت دکھ پہنچا ہے، تو ان سے معافی مانگ لے۔''

اسے تو جیسے پتنگے لگ گئے۔ ''میں معافی مانگ لوں؟ آپ کو پتا ہے انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ اپنے جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھایا۔ میرا قصور کیا تھا۔ بس یہی تو کہا تھا کہ میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔

''پُتر، تو کیا ہوا اگر انہوں نے تجھ پر ہاتھ اٹھا لیا۔ وہ باپ ہیں تیرے۔''

''اچھا..... دیکھوں گا۔ ابھی مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ مدثر کے ہاتھ بھیج دینا۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''تمہارے باپ نے مجھے تمہیں پیسے دینے سے منع کر دیا ہے۔'' اس نے اتنا کہتے ہی فون رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد پھر سے فون بجنے لگا لیکن وہ فون کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں جا کے لیٹ گئی۔ اس کا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ آنسوؤں سے اپنے غم کا مداوا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسری طرف انور ماں کے رقم دینے سے انکار پر ششدر رہ گیا تھا۔ اس نے اکبر کو کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس وقت گھر نہ ہوتا۔ رات تک اسے انتظار کرنا تھا۔

رات کو اس نے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ اب وہ دعا کر رہا تھا کہ کال اکبر ہی اٹھاتا۔ اس کی دعا بر آئی۔ اس کے کانوں میں اکبر کے السلام علیکم کی آواز آئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اکبر کی آواز سن کے خوشی محسوس ہوئی تھی۔

''اکبر میں انور بات کر رہا ہوں۔'' وہ سلام کا جواب دیئے بغیر سپاٹ انداز میں بولا۔

''ہاں..... بولو۔'' اکبر نے بھی اسی کا سا انداز اختیار کیا۔

''مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ مدثر کے ہاتھ کل تک بھجوا دینا۔'' اس کا تحکمانہ انداز سن کے اکبر نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

''مجھے بابا نے تمہیں رقم بھجوانے سے منع کر دیا ہے

اور میں ان کے حکم کی سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتا، بہتر ہوگا تم خود اُن سے بات کر لو۔'' اس نے اتنا کہتے ہی فون رکھ دیا۔

انور کے بدن میں تو جیسے آگ لگ گئی۔ اس کا وجود نفرت سے سلگنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک زہریلا منصوبہ پنپنے لگا۔

☆☆☆

نقاش نے اپنے جسم پر ٹارچ کی لائٹ پڑتے دیکھی تو اس کے سینے کے پنجرے میں مقید دل جیسے پھڑ پھڑانے لگا۔

''وہ رہا..... اوئے رک جا۔'' اس کی سماعتوں میں چیختی آوازیں پڑیں تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ دیکھ لیا گیا ہے۔ رکنے کا مطلب موت تھا۔ وہ بھاگتا رہا۔ خوف کے باعث اس کے جسم کا بال بال کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے رکنے کا حکم اور گولی چلانے کی دھمکی وقفے وقفے سے ملتی رہی تاہم کسی نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی جسارت نہیں کی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ فائرنگ کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتے۔ وہ تو ویسے بھی ان کے نرغے میں تھا ان سے بچ کے کیسے جا سکتا تھا۔

ٹارچ برداروں سے اس کا فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بچنے کی ایک ترکیب آ گئی تھی لیکن اس ترکیب پر عمل کرنے سے قبل وہ اپنے ہتھیار کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اس ترکیب پر عمل کرنے میں اسے اپنے ہتھیار کے ضائع ہونے کا خدشہ تھا۔ اس ہتھیار ہی کی مدد سے تو وہ قاتل جتھے سے مقابلہ کر سکتا تھا وہ اس کا ضیاع کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

آخرکار بھاگتے ہوئے اسے ایک مناسب جگہ مل ہی گئی جہاں وہ اپنا ہتھیار محفوظ کر سکتا تھا۔ یہ ایک کھوکھلے درخت کا تنا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا ہتھیار درخت کی کھوہ میں ڈال دیا۔ ہتھیار کو محفوظ کرنے کے بعد اس کی فکرمندی قدرے کم ہو گئی۔ اب وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک خطرناک عملی کارروائی پر آمادہ تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جب ڈونگہ گراں کے داخلی راستے سے ایک ہیولا گاؤں میں داخل ہوا۔ اس نے پہاڑ کی بلندی پر ایک لمحے کے لیے رک کے گاؤں کا نظارہ کیا۔ اسے دور وادی میں چند ٹمٹماتی روشنیاں نظر آئیں۔ اس کی نظروں نے ان روشنیوں میں سے اپنا ٹارگٹ منتخب کیا اور مطمئن انداز میں ڈھلوان سے اتر کے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ ہیولا ٹارچ کی روشنی میں تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں میں چیڑ کے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بھی جیسے اسے اس کے خطرناک قدم سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اس کا ضمیر بے حسی کی چادر تانے جانے کب کا سو چکا تھا۔ وہ تو اندر کی آواز سننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا، اس پر باہر کی کوئی آواز بھلا کیا اثر کر سکتی تھی۔ اچانک اس کے کانوں میں درد سے بھری ایک آواز پڑی تو وہ ٹھٹک کے رک گیا۔

یہ کسی لومڑی کی آواز تھی جو گاؤں میں نحوست کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ جب کبھی لومڑی چلّاتی ہے، گاؤں پر کوئی مصیبت ضرور نازل ہوتی ہے۔ لومڑی کی آواز وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔ جواب میں گاؤں کے کُتّے خوفزدہ سے انداز میں بھونکنے لگتے تو لومڑی خاموش ہو جاتی۔

اس نے لومڑی کی آواز سنی تو اس کے لبوں پر زہریلی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

لگتا ہے اسے گاؤں پر نازل ہونی والی مصیبت کی خبر ہو گئی ہے۔ اس کے ذہن میں خیال آیا۔

وہ اپنے گھر کے احاطے میں پہنچا تو اس کی نظر لومڑی پر پڑی۔ وہ ان کے گھر کی طرف رخ کر کے جیسے بین کر رہی تھی۔ ان کے گھر میں کتا بھی موجود تھا جو جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔

انور نے اپنے قدموں سے آہٹ پیدا کی۔ لومڑی اسے دیکھتے ہی بھاگ گئی۔ وہ واش روم کے دروازے کے پاس پہنچ کے دبک کے بیٹھ گیا۔ اب وہ بے چینی سے اپنے ٹارگٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

لومڑی کی آواز سن کے کوثر کی آنکھ کھل گئی۔ ''یا اللہ خیر..... یہ نحوست ماری آج کیوں چلّا رہی ہے۔'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔ کمرے میں زیرو واٹ کا بلب روشن تھا۔ اس نے کمرے میں موجود دوسری چارپائی پر لیٹے اپنے شوہر پر نظر ڈالی۔ گل زمین لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ کوثر بھی سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن گاہے بگاہے گونجتی لومڑی کی آواز اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔

''اکبر کے ابا.....'' وہ دھیمی سی آواز میں بولی۔ گل زمین کے لحاف میں سرسراہٹ ہوئی اور انہوں نے لحاف سے اپنا منہ باہر نکالا۔

''کیا ہوا؟'' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کوثر کو دیکھنے کی

PakSociety

کوشش کرنے لگے۔

''باہر لومڑی بول رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ خوفزدہ سے انداز میں بولی۔

اسی لمحے لومڑی پھر بولی۔ اس بار آواز جیسے ان کے احاطے سے ہی آئی تھی۔

گل زمین چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کے باہر کی طرف چل پڑے۔

''نہیں..... آپ باہر نہ جانا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ کوثر کی خوفزدہ آواز سن کے رک گئے۔ انہوں نے کوثر کی طرف مڑ کے دیکھا۔ اس کی ہراساں نظروں میں چھپی التجا وہ سمجھ گئے۔ وہ اس کے پاس آ کے لیٹ گئے اور اسے تسلی دینے لگے۔

سر کا سائیں ساتھ ہو تو کس طرح ہر ڈر دل سے نکل جاتا ہے۔ کوثر نے سوچا۔

☆☆☆

اکبر کی آنکھ کھلی تو اسے رفع حاجت کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے وہ لوگ رات کو چائے، قہوے کا استعمال زیادہ کرتے تھے جس کی وجہ سے رات کو کم از کم ایک بار اسے اٹھنا پڑتا تھا۔

اس سردی میں اٹھ کر بیت الخلا تک جانا اسے دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ انہیں پیشاب کی تکلیف تھی اور رات میں کئی بار انہیں بیت الخلا کا رخ کرنا پڑتا تھا۔

وہ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو چار و ناچار اسے اٹھنا پڑا۔

دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا کا جھونکا اس سے ٹکرایا تو وہ جھرجھری لے کے رہ گیا۔ اس وقت وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ جس تکلیف کا سامنا کرنے والا ہے، اس کے سامنے یہ سرد ہوا کا جھونکا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

☆☆☆

نقاش نے وہ ڈھلوان دیکھی اور پل بھر رک کے اپنے عقب میں نظر ڈالی۔ دو ٹارچ بردار اس سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ اس نے اللہ کا نام لے کے ڈھلوان پر چھلانگ لگا دی۔ وہ تیزی سے لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔

یہ ڈھلوان ایک سلائڈ سے وجود میں آئی تھی جو تقریباً پچاس ساٹھ فٹ نیچے پُرشور آواز میں بہتے ایک پہاڑی نالے تک چلی گئی تھی۔ نقاش لڑھکتا ہوا چھپاک کی آواز کے ساتھ نالے میں گرا۔ ڈھلوان پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس لیے لڑھکتے ہوئے وہ کسی بڑی چوٹ سے محفوظ رہا تھا۔ چھوٹی موٹی خراشوں کی اسے پروا نہیں تھی۔

نالے کا پانی یخ ٹھنڈا تھا۔ وہ لرز کے رہ گیا۔ نقاش نے خود کو سنبھالا اور تیرتے ہوئے خود کو ایک چٹان کی اوٹ میں چھپا لیا۔ بھیگ جانے کے باعث اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

ڈھلوان کے اوپر موجود لوگوں کی دھیمی سی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ چٹان کی اوٹ سے سر نکال کے اوپر کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے دشمنوں کی ٹارچ لائٹس ڈھلوان پر رقص کر رہی تھیں۔ نقاش کو اطمینان کا احساس ہوا، وہ ان کی زد سے نکل چکا تھا۔

اب اسے چڑھائی کا سفر درپیش تھا۔ وہ درختوں کی آڑ میں اوپر کی طرف بڑھنے لگا۔ دفعتاً اسے جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ ٹھٹک کے رک گیا۔ اس کی نگاہ جھاڑیوں کے عقب میں پڑی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دو سرخ دہکتے انگارے اسے گھور رہے تھے۔

☆☆☆

انور سکون سے بیٹھا اپنے ٹارگٹ کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کچھ ہی دیر میں اس کا ٹارگٹ واش روم کا رخ ضرور کرے گا۔

سردی شدید تھی لیکن اس وقت جو کیفیت تھی، وہ سردی گرمی سے بے نیاز تھا۔ اس کے اندر کی آگ نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے سلب کر لی تھی۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے ہی لہو کو اپنے ہاتھ سے ٹھنڈا کر کے کتنے بڑے ظلم کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے۔ اس وقت شیطان اس پر پوری طرح حاوی تھا۔

اس کے کان آہٹ سننے کے منتظر تھے مگر اس کا انتظار طویل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف ہولناک سناٹا چھایا تھا۔ اس سناٹے میں اسے صرف ایک آواز سنائی دے رہی تھی، اور وہ آواز اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی۔ جو اپنی مخصوص لے میں شیطانی منتر کا جاپ کرنے میں مصروف تھی۔

اسے وہاں بیٹھے آدھے گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا کہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے ایک ہیولا واش روم کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جوں جوں قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی، شیطانی منتر تیز ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ہیولا چلتے ہوئے واش روم کے پاس پہنچا۔ وہ اندر

داخل ہونے ہی لگا تھا کہ انور نے عقب سے اسے دبوچ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کی کمر کے گرد جھپاڈالا اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔ وہ مچلنے لگا لیکن انور کی گرفت مضبوط تھی۔ مچلتے ہوئے اس کی ٹانگ واش روم کے دروازے پر لگی۔ سناٹے میں دھیمی سی آواز بھی انور کو کسی بم کے دھماکے کی طرح محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے ٹارگٹ کو پیچھے کھینچ لیا۔ چند لمحوں بعد ہی مچلتا وجود اس کی بانہوں میں ساکت ہو گیا۔ اس نے پھر بھی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر جمائے رکھا۔ اس نے اپنی گرفت تبھی ڈھیلی کی تھی جب اس کے ہاتھوں نے اس کے چہرے کو ٹھنڈا ہوتے محسوس کیا تھا۔ شیطان نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا، آج ایک بار پھر اس نے خدا سے کیا اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ آج پھر اس نے ابنِ آدم کو بہکا دیا تھا۔

اس نے اپنی بانہوں میں جھولتے وجود کو واش روم کے دروازے کے سامنے ڈال دیا۔ اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اپنے ہی لہو کو اپنے ہاتھ سے ٹھنڈا کرنے کے بعد اس کے دل میں جلتا الاؤ بجھ چکا تھا۔

☆☆☆

نقاش سکتہ زدہ سا اپنے سامنے موجود دہکتے انگاروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک جسیم بھیڑیا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں اس کا ہیولا کسی مضبوط سے مضبوط شخص کے دل میں لرزا برپا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ تو محض بیس سالہ جوان ہی تھا۔

نقاش گزشتہ چار ماہ سے اس جنگل میں رہائش پذیر تھا لیکن اس کا سامنا بھیڑیے سے پہلی بار ہوا تھا۔

بھیڑیا چند لمحے تو یک ٹک اسے دیکھتا رہا، لیکن پھر اس نے نقاش کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے پلٹنے لگا۔ اس کی پشت پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ اسے اپنی دھڑکن کانوں میں بجتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ وہ بھیڑیے سے بھاگ کر جان نہیں بچا سکتا۔ اس سے بچاؤ کا اسے ایک ہی حل نظر آیا۔ وہ درخت کی شاخ پکڑ کے تیزی سے اس پر چڑھنے لگا۔ ننگے پاؤں ہونے کے باعث اسے درخت پر چڑھتے ہوئے مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کی چپل کھو چکی تھی۔ کبھی کبھار کچھ کھو جانا بھی نعمت ہی ہوتا ہے۔ اسے آج پہلی بار اس چیز کا احساس ہوا تھا۔

بھیڑیا پہلی ناکامی کے بعد غضب ناک انداز میں دانت نکوستا اس کی طرف لپکا۔

لمحوں کے فرق سے اس نے اپنی ٹانگ بھیڑیے کے جبڑے میں آنے سے بچائی۔ وہ ہانپتا کانپتا درخت کی چوٹی تک اوپر چڑھتا چلا گیا۔ پسینہ اس کے جسم سے دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

بھیڑیا اپنے شکار کو پنجے سے نکلتا دیکھ کے غراتے ہوئے بے چینی سے درخت کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ نقاش اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نیم تاریکی میں درخت کے گرد گھومتا بھیڑیا کسی عفریت کے مانند لگ رہا تھا۔

اس کے حواس کچھ سنبھلے تو اس نے دشمنوں کی تلاش میں ڈھلوان کی سمت دیکھا۔ کچھ ہی دور نیچے سے ٹارچ لائٹس کی روشنی میں چند افراد تیزی سے اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے، اس بات سے بے خبر کے اب کی بار ان کا ٹکراؤ اپنے شکار کے بجائے ''شکاری'' سے ہونے والا ہے۔

☆☆☆

اکبر نے دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی سماعتوں سے ایک نامانوس سی آواز ٹکرائی۔ اس کے چہرے پر اچنبھے کا تاثر ابھرا۔ وہ انہیں تاثرات کے ساتھ واش روم کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ اسی لمحے اس نے وہ نامانوس آواز دوبارہ سنی، لیکن اس بار آواز کا ماخذ سامنے تھا۔ یہ اس کا کتا تھا جو واش روم کے سامنے پڑے ایک انسانی وجود کے پاس کھڑا جیسے فریاد کر رہا تھا۔

اکبر بھاگا، زمین پر بکھرے پڑے وجود کو دیکھ کے اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ تھامنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دھڑام سے گھٹنوں کے بل گرا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اپنے باپ کے چہرے کو چھوا۔ ٹھنڈے یخ لمس نے اسے احساس... دلا دیا تھا کہ اس کا باپ زندگی کی حرارت سے محروم ہو چکا ہے۔ پاس کھڑے کتے نے ایک بار پھر آسمان کی طرف منہ کر کے فریاد کی۔ وہ بھی جیسے اکبر کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ انور سے بھلا تو وہ کتا تھا جو مالک کی موت پر نوحہ کناں تھا۔

اکبر باپ کی لاش اٹھا کے اندر کی طرف بڑھا۔ گل زمین کی لاش دیکھ کے کوثر جیسے اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھی۔ اس کی دلدوز چیخوں نے پورے گاؤں کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ان کا گھر لوگوں سے بھر چکا تھا۔ گل زمین کی لاش دیکھ کے ہر آنکھ اشکبار تھی۔

دور پہاڑ پر موجود انور نے اپنے گھر میں ہونے والی ہلچل دیکھی۔ اسی لمحے آسمان سے برف کے گالے اترنے

PakiBooks.site

لگے تھے۔ آج کی رات پہلی بار اس کے اندر کچھ پگھلا تھا۔ اسے سردی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنے وجود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا، اپنے گھر کی طرف الوداعی نظر ڈالی اور چل پڑا۔ پل بھر میں اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کا گلا اس نے بے حسی کی چادر سے گھونٹ دیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے چلنے کے بعد وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی۔ یہ گاڑی وہ اپنے ایک دوست سے مستعار مانگ کے لایا تھا۔ گاؤں تک سڑک نہیں جاتی تھی اس لیے یہاں سے آگے اسے پیدل جانا پڑا تھا۔

اچانک شروع ہونے والی برفباری اس کی توقع کے برخلاف جلد ہی رک گئی تھی یعنی قدرت بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں گاڑی موڑی اور واپسی کے سفر پر ہولیا۔

☆☆☆

نقاش اپنے دشمنوں کو اوپر آتے دیکھ رہا تھا۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ اس وقت نقاش کو اپنے دونوں دشمن اپنے دوست محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے آپس میں بھڑنے کا وقت تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ بے چینی سے ان کا تماشا دیکھنے کا انتظار کرنے لگا۔

بھیڑیے نے بھی آنے والوں کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ وہ چوکنا انداز میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ سرخ انگاروں کے مانند دہکتی آنکھیں دیکھ کے نقاش کو ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

وہ دو افراد تھے جو چوکنا انداز میں اپنے اطراف کا مشاہدہ کرتے اوپر آ رہے تھے۔ ان کی نظر بھیڑیے پر پڑی تو وہ ٹھٹک کے رک گئے۔ بھیڑیا پہلے سے ہی غیظ و غضب کا شکار تھا۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی لمبی جست بھری اور ایک شخص کو لیتا ہوا زمین پر جا گرا۔ بھیڑیے نے ایک ہی لمحے میں اس کا نرخرہ ادھیڑ دیا تھا۔ اس شخص کے منہ سے نکلنے والی چیخ انتہائی بھیانک تھی۔ دوسرا شخص یہ سارا منظر ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد اسے صورتِ حال کا احساس ہوا تو وہ بھاگا۔ بھیڑیا اسے بھاگتے دیکھ کے اس کے پیچھے لپکا۔ نقاش درخت پر بیٹھا یہ خونی کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں شور مچانے لگی۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص اور بھیڑیا اس کی نظروں سے درختوں میں اوجھل ہو گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس سمت دیکھنے لگا لیکن درختوں نے منظر اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ نیچے سے خرخراہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ دیر قبل یہ شخص اس کی جان لینے کا خواہاں تھا، اور اب خود اس کے جسم سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ قدرت ایسے ہی اپنا آپ دکھاتی ہے۔

اوپر بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑ چکا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔ نیچے پہنچتے ہی اس کی نظر اپنے دشمن کی خونچکاں لاش پر پڑی۔ اس کے گلے سے خون نکل نکل کے جم چکا تھا۔ نقاش ٹھٹھرا کے رہ گیا۔ وہ اس کے پاس سے گزر کے نیچے جانے لگا۔ وہ جلد از جلد اپنے ہتھیار تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ رات کو اس کے دشمن بے نیل مرام واپس جا چکے ہوں گے۔ اس کے باوجود وہ بار بار رک کے چوکنا انداز میں اپنے اردگرد بغور دیکھ لیتا تھا۔ وہ جب اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچا تو سورج درختوں کے عقب سے نمودار ہو چکا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ درخت کی کھوہ میں ہاتھ ڈالا تو اپنے ہتھیار کو غیر موجود پا کے اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

اس نے ٹٹول کے دیکھا تو اس کے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرائے۔ مانوس سا لمس محسوس کر کے اس کے چہرے کی رنگت بحال ہو گئی۔ اس نے اپنا ہتھیار باہر نکال لیا۔ یہ ایک جدید کیمرا تھا۔

کل رات اس نے کیمرے کا استعمال جنگل میں آنے کے بعد پہلی بار کیا تھا حالانکہ جنگل میں پھیلے حسین مناظر کو..... دیکھ کے بے اختیار اس کے دل میں ان مناظر کو کیمرے میں مقید کرنے کی خواہش اجاگر ہوتی تھی لیکن مسئلہ چارجنگ کا تھا۔ اس جنگل میں اسے بجلی میسر نہیں تھی۔ اسے کیمرے کی ضرورت کسی بھی وقت پڑ سکتی تھی اس لیے اس کا ہمہ وقت چارج رہنا ضروری تھا۔

اس نے کیمرا آن کیا۔ اس کے انداز سے بے چینی عیاں تھی۔ رات کو اندھیرے کے باعث اس نے نائٹ موڈ استعمال کیا تھا۔ اس کے ہاتھ خوف کے باعث کانپ رہے تھے۔ جانے کیمرے نے اس کا مقصد پورا کیا تھا یا نہیں۔ وہ بے چینی سے ادھر ہی کھڑا ہو کے پنے ہتھیار کی کارکردگی چیک کرنے لگا۔

ویڈیو قدرے بہتر بنی تھی۔ چار افراد کے چہرے پہچانے جا رہے تھے۔ بیک گراؤنڈ میں ان کا جاں بلب ٹارگٹ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ مطمئن انداز میں کیمرا جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ اس کے قریب ایک آواز ابھری۔

''اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔ تم میرے نشانے پر ہو۔''

☆☆☆

گل زمین کا جنازہ گاؤں کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ اردگرد کے علاقوں سے بھی ہزاروں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس سے گل زمین کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ رات کو ہونے والی برف باری بھی جلدی ہی رک گئی تھی، صبح چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی جس کے باعث تدفین میں انہیں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اکبر صبح سے سیکڑوں لوگوں کو ساری کہانی سنا چکا تھا۔ تقریباً سب کا یہی خیال تھا کہ گل زمین کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ سب موجودہ دور کی خوراک اور بیماریوں پر لعن طعن کر رہے تھے۔ اکبر نے انور کو بھی فون پر باپ کی موت کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ صبح ہی واپس آ گیا تھا۔ اس نے اکبر سے لپٹ کے خوب مگرمچھ کے آنسو بہائے تھے۔

وقت نے سب کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا لیکن کوثر ابھی تک اپنے شوہر کی موت کو قبول نہیں کر پائی تھی۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی۔ اکبر اور اس کی بیوی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتے لیکن اس کا گھاؤ گہرا تھا۔

چالیسویں پر فاتحہ کے لیے پورے گاؤں کے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے کھانے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ انور بھی تقریب کے انتظامات میں پیش پیش رہا۔ چالیسویں کے بعد شام کو سب گھر والے مل بیٹھے۔ سب گل زمین کی باتیں کر رہے تھے لیکن انور خاموش..... وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس نے یہ چالیس دن بڑی مشکل سے گاؤں میں کاٹے تھے۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ باتوں میں ذرا سا وقفہ آیا تو وہ کھنکھار کے بولا۔

''اکبر، اب تو چالیسواں ہو گیا۔ میں اب واپس جانا چاہتا ہوں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ٹھیک ہے تم جب جانا چاہو جا سکتے ہو لیکن مارچ میں تمہیں واپس آنا ہوگا۔ میں اکیلے باغ کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔'' اکبر نے بھی سپاٹ لہجہ ہی اختیار کیا تھا۔ کوثر کھوئی کھوئی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے جیسے ان باتوں سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ البتہ اکبر کی بیوی انیلہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بات اب کسی نئے رخ پر مڑنے والی ہے۔

''تو میں نے کون سا اب اکیلے تمہیں سارے باغ کی دیکھ بھال کرنے دینا ہے۔ کل ہی کچھ لوگوں کو بلا کے ہم اپنا حصہ الگ کر لیتے ہیں۔'' انور تیزی سے بولا۔

اکبر کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے سرخی نمودار ہوئی لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اب وہ گھر کا بڑا تھا۔ اسے ایسے معاملات فہم و فراست سے حل کرنے تھے۔ وہ نپے تلے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے میں خود چاہتا ہوں کہ ہم اپنا حصہ الگ کر لیں۔ اس سے ہم بعد میں پیش آنے والے مسائل سے بچ جائیں گے۔ میں کل ہی کچھ لوگوں کو بلوا لیتا ہوں۔''

''باغ اور باقی زمین تو ہم بانٹ لیں گے لیکن مکان کے بارے میں تم نے کچھ سوچا۔ یہ تو ظاہر ہے میرے حصے میں ہی آئے گا، تمہیں تو اپنا الگ گھر بنانا پڑے گا۔'' ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سے چمک تھی۔ اکبر کی رنگت ایک لمحے کے لیے متغیر ہوئی۔ انیلہ بھی بے چین نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

مقامی رواج کے مطابق مکان سب سے چھوٹے بیٹے کے حصے میں آتا تھا لیکن ایسا اس کی شادی کے بعد ہوتا تھا، وہ بھی اس صورت میں کہ گھر چھوٹا ہوتا اور ایک سے زائد خاندانوں کے لیے ناکافی ہوتا۔ ان کا گھر تو کافی بڑا تھا شادی کے بعد بھی دونوں بھائی ایک گھر میں رہ سکتے تھے۔

''یہ معاملہ بھی کل اپنے بڑوں کے سامنے رکھ دوں گا۔ ..... وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' اکبر اپنے بھائی کو جانتا تھا۔ اس نے انور کے ساتھ الجھنے کے بجائے درمیانی راہ نکالی۔

''ٹھیک ہے۔ تم ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔'' وہ طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور اٹھ کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

نقاش نے گردن گھما کے اپنے عقب میں دیکھا۔ اس سے چند فٹ دور ڈھلوان پر ایک گراندیل شخص کھڑا تھا۔ اس کے چوڑے چبڑے پر پھیلی گھنی داڑھی اس کی خوفناکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سی سرخی تھی۔ یہ جابر تھا۔ قاتل گروہ کا ایک رکن..... اس کے پورے گھرانے کی موت کا ذمے دار..... جسے قدرت نے دوسری زندگی سے نوازا تھا لیکن یہ دوسرا موقع بھی اسے راہِ راست پر نہیں لا سکا تھا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑے پستول کا رخ نقاش کے سر کی طرف تھا۔ نقاش کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں حیرانی کا تاثر ابھرا۔ وہ اس کے بے ترتیب بڑھے ہوئے بالوں اور داڑھی کے باوجود اسے پہچان چکا تھا۔

''تم زندہ ہو؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔ ''میں تو انور کو

PakBooksite

تمہاری موت کا یقین دلا چکا تھا۔''

نقاش کچھ نہ بولا۔ اس کا تو خیال تھا کہ رات کو اس کی تلاش ترک کر کے وہ واپس چلے گئے ہوں گے۔ لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا اور اب یہ غلط اندازہ اس کے لیے مہلک ثابت ہونے والا تھا۔

نقاش کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے ٹنول کے میموری کارڈ کو پریس کیا۔ لمحے بھر میں ہی وہ اس کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کیمرا جابر کے اوپر دے مارا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھرتی سے بیٹھ گیا تھا۔ جابر کے ہاتھ سے اضطراری طور پر فائر ہوا جو کیمرے کو لگا۔ کیمرے کے پرخچے اُڑ گئے۔

نقاش نے فوراً ڈھلوان پر چھلانگ لگا دی۔ یہ وہی ڈھلوان تھی جو رات کو اس کی جان بچانے کا سبب بنی تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔ اس نے اپنی مٹھی بند کر رکھی تھی۔ اس مٹھی میں اس کے دشمنوں کی موت اور اُن گنت لوگوں کی جانیں محفوظ تھیں۔ وہ اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔

جب وہ پانی میں گرنے لگا تو اس نے گھاس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا نچلا دھڑ پانی سے جا لگا۔ اس نے ہاتھ اوپر کر کے چلتے ہوئے پانی کو کراس کیا۔ پانی اس کے سینے تک آگیا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگر اس کا توازن خراب ہو جاتا تو اس کے ہاتھ میں رکھا میموری کارڈ پانی سے خراب ہو سکتا تھا۔ اسے اس بات کا ادراک تھا۔ اس لیے وہ لمحہ بہ لمحہ سنبھلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ چٹان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اسے اپنے جسم میں ایک دہکتا ہوا انگارا اترتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز بلند ہوئی۔ پرندے چلّاتے ہوئے آسمان کی طرف محوِ پرواز ہوئے۔ نقاش ان سے بے خبر چٹان کے اوپر جا گرا۔ پانی اس کے جسم سے بہتے لہو سے سرخ ہونے لگا۔

☆☆☆

انور کے جانے کے بعد انیلہ اور اکبر میں بحث چھڑ گئی۔ کوثر ایک بار پھر لاتعلق سی ہو گئی تھی۔ اس نے ان کی گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ انیلہ، انور کی گفتگو پر برہم لگ رہی تھی۔ اکبر اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ معاملہ اس کی مرضی کے مطابق ہی حل ہو گا۔ رات گئے تک اسی مسئلے پر ان کے درمیان گفت و شنید ہوتی رہی۔

صبح ہوئی تو اکبر اپنے چچا شامیر اور ماموں، نیاز کو پکڑ لایا۔ زمین کی تقسیم انہی دونوں کو کرنی تھی۔ اکبر کے چچا ان دونوں کو بٹھا کے بولے۔

''بیٹا، آپ دو ہی بھائی ہیں۔ مل کے رہیں گے تو سارا گاؤں تم دونوں کی عزت کرے گا، لیکن تم دونوں میں پھوٹ پڑ گئی تو سارا گاؤں تم لوگوں کا تماشا دیکھے گا۔''

انور بیزاری سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ان کی بات کاٹ کے بولا۔ ''ٹھیک ہے چچا۔ ہم دونوں بچے نہیں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتے ہیں۔ آپ بس تقسیم کے دوران انصاف کے تقاضوں کو مدِنظر رکھیں۔'' ایسا کہتے ہوئے اس کے لبوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اکبر نے اس کی مسکراہٹ خاص طور پر نوٹ کی۔

چند گھنٹوں بعد زمین کی تقسیم ہو چکی تھی۔ انہوں نے عارضی نشانات لگا کے حد بندی کر لی تھی۔ بعد میں وہ ان نشانات کو پکا کر لیتے اور پٹواری کے ذریعے زمین کا انتقال اپنے نام کر لیتے۔ اکبر اور انور دونوں اس تقسیم پر متفق تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کے انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے انور بولا۔

''زمین کی تقسیم تو ہو چکی لیکن اب اکبر کو جلد از جلد اپنا گھر بنا لینا چاہیے، کیونکہ یہ گھر تو ظاہر ہے میرا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

اکبر کا خیال تھا کہ اس معاملے پر اس کے چچا اور ماموں اس کا ساتھ دیں گے لیکن وہ اپنے چچا کا جملہ سن کے حیران رہ گیا۔ وہ اس سے مخاطب ہو کے گویا ہوئے تھے۔

''اکبر بیٹا، تم اپنا مکان سردیاں ختم ہوتے ہی بنوا لو۔ مکان تو اب انور کا ہے لیکن تب تک ہم تمہیں چھوٹ دیتے ہیں۔ تم جب تک اس مکان میں رہ رہے ہو۔ انور کو کرایہ دیتے رہنا۔''

اکبر کے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''مکان ہم دونوں میں برابر تقسیم ہو گا۔ وہ بھی تب جب یہ شادی کرلے گا۔''

''بیٹا اللہ بخشے تمہارے والد صاحب نے میرے سامنے بارہا کہا کہ مکان وہ انور کے حوالے کریں گے۔ تمہارے مکان کے لیے تو انہوں نے جگہ تک دیکھ رکھی تھی۔ وہ تو بس ان کا وقت پورا ہو گیا ورنہ وہ خود ان سردیوں کے بعد تمہارے مکان کی تعمیر کا ارادہ رکھتے تھے۔'' انور اسے دیکھ کے تپانے والے انداز میں مسکرایا۔ اکبر ہکا بکا اپنے چچا کا بیان سن رہا تھا۔ جانے انور نے انہیں کیسی گیدڑ سنگھی سنگھائی تھی کہ وہ اس کی ہم نوائی کر رہے تھے، ورنہ اس کے بابا اگر ایسا کوئی ارادہ رکھتے تھے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسے نہ بتاتے۔ وہ تو چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی مشاورت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ غصے سے بولا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ بابا اگر کوئی ایسا ارادہ رکھتے تو مجھے ضرور بتاتے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' وہ گرج کے بولے۔ ''چلو نیاز، اسے تو بڑوں کا لحاظ ہی نہیں۔ ہمارا ہی دماغ خراب تھا جو بے عزتی کرانے یہاں آگئے۔'' اکبر ان کے رویّے پر انہیں تاسف سے دیکھنے لگا۔ انور نے جھٹ سے ان کا ہاتھ پکڑا۔

''آپ ایسے یہاں سے نہیں جا سکتے۔ اکبر کو تو واقعی بڑوں کا لحاظ ہی نہیں رہا۔ میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔''

اکبر کا جیسے خون کھول اٹھا۔ وہ چیخ کے بولا۔ ''کوئی ضرورت نہیں تمہیں میری طرف سے کسی سے معافی مانگنے کی۔ میں جانتا ہوں تم نے ہی انہیں کوئی الٹی سیدھی پٹی پڑھائی ہے، ورنہ بابا نے تو مجھے تم کو پیسے تک دینے سے منع کر دیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مکان تمہارے نام کرنے کا ارادہ کرتے۔''

''دیکھا تم نے..... ہم یہاں ایک منٹ بھی اور نہیں رک سکتے۔ تم لوگ جانو اور تمہارا کام۔ ہمیں اب تم لوگوں کے معاملے میں نہیں پڑنا۔'' اکبر کے چچا یہ کہتے ہوئے غصے سے باہر نکل گئے۔ انور انہیں روکتا رہ گیا۔

اُن کے جانے کے بعد وہ پلٹا۔ ''بہتر ہے تم مکان فوراً خالی کر دو۔ ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔'' اس کے سرد لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ دروازے کے عقب میں موجود انیلہ نے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس کی۔ انور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

انور اس کی راہ کا کانٹا بن چکا تھا۔ وہ اس کانٹے کو بروقت نہ نکالتا تو یہ کانٹا زندگی بھر اس کے لیے چبھن کا باعث بنا رہتا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارے کا فیصلہ کیا۔ اس کام میں ایک شخص اس کی مدد کر سکتا تھا۔ انور جب شہر چلا جاتا تو وہ شخص وہاں اس کے لیے حادثاتی موت کا بندوبست کر سکتا تھا۔

اکبر فیصلہ کرتے ہی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ آج ہی شہر جانا چاہتا تھا، کیونکہ موسم کا کوئی پتا نہیں تھا کب برف باری شروع ہو جاتی اور شہر جانے والا ہر راستہ مسدود ہو جاتا۔ اس نے رقم نکالنے کے لیے لاکر کھولا تو حیران رہ گیا۔ خالی لاکر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے چیخ کے انیلہ کو آواز دی۔ خالی لاکر کے آگے ہکا بکا کھڑے اکبر کو دیکھ کے وہ سارا ماجرا سمجھ گئی تھی۔

''تم نے یہاں سے پیسے تو نہیں نکالے؟'' وہ انیلہ کو دیکھتے ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولا تھا۔

''نہیں۔ میں بھلا آپ کی اجازت کے بغیر کیسے یہاں سے پیسے نکال سکتی ہوں۔'' وہ فق رنگت کے ساتھ بولی۔

''یہ یقیناً اس کمینے کا کارنامہ ہے۔'' اس کا اشارہ انور کی طرف تھا۔

ان کا کمرا کھلا ہی رہتا تھا۔ لاکر کی چابی الماری کے اوپر رکھی رہتی تھی۔ ان کے گھر کا ہر فرد یہ بات جانتا تھا۔ اس لیے انور کے لیے یہاں سے رقم نکالنا کچھ خاص مشکل نہیں تھا۔ لاکر میں پانچ لاکھ کے قریب رقم پڑی تھی۔ یہ اکبر کی کل پونجی تھی۔ اب وہ تہی داماں ہو چکا تھا۔ یہ پہلی شکست تھی جو انور نے اسے دی تھی۔ وہ اس کا وار اسی پر پلٹنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگا۔ اس بار زر اور زمین نے آدم کے دو بیٹوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

☆☆☆

انور شہر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ جب تصور میں وہ اکبر کے لاکر کھولتے وقت کے تاثرات دیکھتا تو بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ جاتی۔ اس نے شہر پہنچتے ہی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی تھی۔

گاؤں میں سب کچھ اس کی منشا کے مطابق ہوا تھا۔ کوئی بھی شخص گل زمین کی موت کی اصل وجہ جان نہیں پایا تھا۔ بعد ازاں اس کے چچا نے بھی اس کی توقع کے مطابق اس کا ساتھ دیا تھا۔ ماموں کی اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ سیدھے سادے اپنے کام سے کام رکھنے والے شخص تھے۔ اس کے چچا جو کہتے وہ بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے۔ چچا کو شیشے میں اتارنے کے لیے اس نے وعدوں کا جال بچھایا تھا۔ ان کی زمین چچا کے گھر سے ملحق تھی۔ وہ اپنا گھر وسیع کرنا چاہتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ساتھ کی زمین ان کی اپنی نہیں تھی۔ گاؤں میں زمین کو ماں کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ کوئی شخص اپنی زمین اپنے سگے بھائی کو بھی فروخت نہیں کرتا تھا۔ انور نے اپنی کچھ زمین چچا کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بدلے میں انہوں نے اس کا کام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ انور کے وعدوں کے لین دین کی پہلی تجارت اس کے نزدیک

PakBooks.com

کامیاب رہی تھی۔

شام کو اس نے فون کر کے اپنے دوستوں کو بلا لیا۔ آج کی رات وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جشن منانا چاہتا تھا۔ دوستوں کو بلوانے سے پہلے اس نے امپورٹڈ وہسکی کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ اس سے قبل کبھی کبھار ہی اسے شراب پینے کا موقع ملتا تھا۔ رقم کی کمی کی وجہ سے وہ یہ علت پالنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اب حالات مختلف تھے۔ اب اس کا اکاؤنٹ رقم سے بھر چکا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا جس پر عمل کر کے وہ کروڑوں میں کھیل سکتا تھا۔ اب اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ جو اس کے باپ کی صورت میں اس کے سامنے کھڑی تھی، دور ہو چکی تھی۔ اب اسے اس کی من مرضی سے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ میوزک لگا کے... آنے والے وقت کے خوش کن تصور میں کھو گیا۔

☆☆☆

اکبر جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے میں گھوم رہا تھا۔ وہ بار بار انور کو گالیاں دینے لگتا۔ نقاش اس وقت محض چار سال کا تھا۔ اس نے باپ کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ اس روپ نے اسے سہما دیا تھا۔

انیلہ، اکبر کو تسلیاں دینے لگی۔ ''آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی آپ شہر چلے جانا۔ اس نے رقم اپنے پاس ہی رکھی ہوگی۔ یا بہت ہوا تو بینک میں جمع کرا دی ہوگی۔ اگر اس نے رقم واپس دینے سے انکار کر دیا تو آپ پولیس چوکی چلے جانا۔''

اکبر کو یہ تجویز پسند آئی تھی۔ رقم ایک بار اس کے پاس واپس آجاتی تو وہ انور سے نمٹ سکتا تھا۔ وہ اس تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر کے سو گیا۔

صبح وہ شہر جانے کے ارادے سے جلدی اٹھا تھا لیکن دروازہ کھولتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ رات کے کسی پہر شروع ہونے والی برفباری نے شہر تک جانے کا ہر راستہ مسدود کر دیا تھا۔ برف باری اب بھی جاری تھی۔

اکبر دل مسوس کے رہ گیا۔ اتنے خراب موسم میں شہر جانا قریب قریب ناممکن ہی تھا۔ اس کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بہار لونی تو گھروں میں بند لوگوں کو باہر نکلنے کا موقع ملا۔ اُن کے کام کا سیزن شروع ہو چکا تھا لیکن اس بار اکبر کے پاس لوگوں کو تنخواہیں دینے کے پیسے ہی نہیں بچے تھے۔ انور اس کی ساری جمع پونجی لے اُڑا تھا۔

انور کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے ارد گرد سے قرض پکڑ کے اپنا کام شروع کیا۔ اسے انور کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انور مکان سے بے دخل کرنے کے لیے جلد ہی گاؤں کا رخ کرے گا لیکن اس کا یہ خیال باطل ثابت ہوا۔ دو سال گزر گئے لیکن انور گاؤں لوٹا نہ اس کا فون آیا۔ اب تو اکبر یہ سوچنے لگا تھا کہ شاید انور اس دنیا میں ہی نہیں رہا، کیونکہ وہ اگر زندہ ہوتا تو کم از کم ماں سے تو رابطہ کرتا۔ ویسے بھی انور جس راہ کا مسافر بن چکا تھا، وہ راہ بہت جلد موت کے دروازے تک انسان کو پہنچا دیتی ہے۔

کوثر کی حالت میں ان دو سال میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی تک ہر وقت اپنے ہی خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔

اکبر نے پہلے سال تو انور کی زمین کو نہیں چھیڑا تھا تاہم دوسرے سال اس نے انور کی زمین پر بھی کام شروع کر دیا تھا۔ اب وہ انور کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا لیکن اس کا اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ انور دو سال بعد گاؤں لوٹا اور اس شان سے لوٹا کہ گاؤں کا ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا۔

☆☆☆

ان دنوں گاؤں میں ایک جلسے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جلسے سے خطاب کرنے کے لیے اس حلقے کے ایم پی اے اور ایم این اے کو آنا تھا۔ جلسے کے انتظامات انور ہی کرا رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا تھا کہ اس جلسے میں انہیں بہت بڑی خوشخبری ملنے والی ہے۔ اکبر کو یہ ساری خبریں لوگوں سے ہی ملی تھیں۔ انور اپنے گھر نہیں آیا تھا۔ انور کے لوٹ آنے سے اکبر کے دل میں اندیشے سر سرانے لگے تھے۔ ابھی تو اس نے انور کی گمشدگی پر سکھ کی سانس بھی صحیح طرح نہ لی تھی کہ وہ لوٹ آیا تھا۔

دو ہفتے بعد جلسہ ہوا تو دیگر لوگوں کی طرح اکبر بھی جلسے میں شریک ہوا۔ وہ انور کا رنگ ڈھنگ دیکھ کے حیران رہ گیا۔ ان دو برسوں میں اس کی صحت بہت اچھی ہوگئی تھی اور بول چال بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ پُراعتماد تو وہ پہلے بھی تھا لیکن اب اس کے انداز میں ایک خاص طرح کی تمکنت محسوس ہوتی تھی جس سے ہر شخص پر رعب طاری ہو جاتا تھا۔

ایم پی اے نے اپنے خطاب کے دوران جو خوشخبری دی اس نے لوگوں کو ہکا بکا کر دیا۔

گاؤں تک سڑک نہ آنے کی وجہ سے لوگوں کو بہت

مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس نے گاؤں تک روڈ آنے کی خبر دے کے سب کو حیران کر دیا تھا کہ اس سے پہلے تو کسی نے روڈ کی تعمیر کے لیے نہ کوئی کوشش کی تھی نہ ہی کسی سیاستداں نے ان سے ایسا کوئی سیاسی وعدہ کیا تھا۔ ایم پی اے کے مطابق روڈ کے فنڈز منظور ہو چکے تھے اور بہت جلد کام شروع ہونے والا تھا۔

جلسے کے بعد اکبر گھر لوٹ آیا۔ وہ انیلہ کو انور کے بارے میں بتا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اکبر نے دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ دروازے پر انور کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایم پی اے اور چند دیگر افراد بھی موجود تھے۔ انور انتہائی پُرتپاک انداز میں اکبر سے ملا۔ اس کا رویہ دیکھ کے اکبر اس سے کوئی شکایت کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکا۔

انور نے ایم پی اے سے اس کا تعارف کرایا۔ اکبر انہیں اپنی بیٹھک میں لے آیا۔ انور، کوثر سے ملا تو کوثر کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہ جاگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے انور کو پہچانا ہی نہیں تھا۔ انور نے بھی اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ البتہ وہ انیلہ اور بچوں سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔

اس نے جاتے وقت جو کچھ کیا تھا، انیلہ وہ بھولی نہیں تھی۔ اس کی واپسی بھی اسے پسند نہیں آئی تھی، اپنے رویے سے اس نے انور کو اس کا احساس دلا دیا تھا۔ تاہم اس نے انیلہ کے سرد رویے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

وہ اس سے دو برسوں کے غیاب کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی، لیکن اس نے چاہتے ہوئے بھی اس سے کوئی سوال نہ کیا، اس نے انور کے ساتھ رویہ مستقل سپاٹ ہی رکھا۔

اس نے بچوں کو ہزار، ہزار روپے کے نوٹ دیئے تو انیلہ نے اسے منع کیا۔ وہ بولا۔

''بھابی، کیوں شرمندہ کر رہی ہیں۔ ان بچوں پر میرا بھی اتنا حق ہے جتنا آپ کا۔ افسوس کہ میں یہ حق اچھی طرح نہ نبھا سکا لیکن اب میری پوری کوشش ہوگی کہ مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئیں ان کا ازالہ کر سکوں۔'' اس کے لہجے سے اخلاص کی خوشبو آ رہی تھی۔ انیلہ حیرانی کے باعث کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

انور واپس آیا تو باقی لوگ چائے پی چکے تھے۔ انور کے آتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اکبر نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے دیر ہو جانے کا عذر پیش کر کے اجازت طلب کی۔ اکبر انہیں چھوڑنے باہر تک آیا۔ انور جاتے ہوئے اکبر سے بولا۔

''بھائی، مجھ سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ میں ان سب پر آپ سے شرمندہ ہوں۔ امید ہے آپ چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے معاف کر دیں گے۔'' وہ یہ کہہ کے اکبر کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ اکبر گنگ کھڑا اُسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو اس مختصر سی ملاقات میں چاہنے کے باوجود اس سے دو برسوں کے غیاب کے متعلق استفسار تک نہیں کر سکا تھا۔

اس رات دیر تک انیلہ اور وہ انور کی کایا پلٹ پر بات کرتے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انور سدھر چکا ہے۔ ان کا خیال درست تھا یا نہیں، اس کا فیصلہ وقت کو کرنا تھا۔

☆☆☆

چند دن بعد ہی گاؤں میں سڑک کا کام شروع ہو گیا۔ سڑک کا ٹھیکا انور ہی کو ملا تھا۔ وہ اپنی نگرانی میں سڑک کا کام کرا رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ انتہائی پُرجوش تھے۔ وہ انور سے ایسے پیش آ رہے تھے جیسے وہ آسمان سے اترا فرشتہ ہو اور گاؤں کے مسائل حل کرنے کے لیے خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہو۔

انور کو ملنے والے اتنے پروٹوکول کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اس کی خوش اخلاقی جسے حقیقت میں چرب زبانی کہا جا سکتا تھا، دوسرا اس کے ایم پی اے اور ایم این اے جیسی بااثر شخصیات سے تعلقات۔ ان دو خصوصیات نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

گاؤں کے سبھی لوگ ایک دوسرے سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آیا کرتے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کی غمی خوشی میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں انور گاؤں کا واحد فرد تھا جس کا گاؤں کے دیگر لوگوں سے کیا، اپنے گھر کے لوگوں تک سے تعلق محدود سا ہی تھا۔

اکبر کے گھر میں انور نے جو چوری کی تھی، اکبر نے سب گاؤں والوں کو اس کے متعلق بتا دیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس سے نفرت محسوس کرتے تھے لیکن اس کے تازہ رویے نے گاؤں والوں کو تمام باتیں بھلا دی تھیں، حتیٰ کے اکبر بھی اس کے سابقہ رویے کو بھلا چکا تھا۔

اب وہ دو برس بعد جیسے نیا ہو کے لوٹا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنے سابقہ رویے کا ازالہ کر دیا تھا۔ اب وہ سب لوگوں سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آ رہا تھا۔ انور نے سڑک کے کام سے پہلے انجینئر کے ساتھ مل کے سڑک کا

Pak Books Site

سروے مکمل کیا تھا۔ سڑک کا بیشتر حصہ جنگل میں سے ہی گزر رہا تھا، جنگل سے گزرنے کے بعد سڑک گاؤں کے بیچوں بیچ ہوتی دوسرے گاؤں میں داخل ہو جاتی۔ دونوں گاؤں کے بیچ بھی کچھ حصہ جنگل کا آتا تھا۔

تین ماہ کے قلیل عرصے میں سڑک کا کام مکمل ہو گیا۔ سڑک سے گاؤں کی زندگی کی رفتار میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا۔ پہلے جو لوگ سالوں شہر کا رخ نہیں کرتے تھے اب ہر چند دن کے بعد جانے لگے تھے۔ کام کے دوران انور اپنے گھر میں ہی رہا تھا۔ کام ختم ہوتے ہی وہ واپس چلا گیا تھا۔

اکبر اور انور کے درمیان جو ساری زندگی ایک خلیج سی قائم رہی تھی ان تین ماہ نے وہ خلیج یکسر ہی پاٹ دی تھی۔ اب ان دونوں کے درمیان حقیقی بھائیوں والا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ انور نے اپنے دو برسوں کے غیاب کے متعلق بھی اکبر کو مطمئن کر دیا تھا۔

دونوں بھائیوں کے لیے اب زندگی سہل ہو چکی تھی۔ انور کی دانست میں اس کی زندگی کو مشکل اس کے باپ نے بنایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی راہ کی اس... مشکل کو اپنے ہاتھ سے ختم کر دیا تھا، اور اکبر کی زندگی کی سب سے بڑی مشکل انور تھا۔ اس کے خیال میں اس کی مشکل کو ختم کرنے میں قدرت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

ان دونوں کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کی زندگیوں میں بھی بہت سی آسانیاں آ گئی تھیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ آسانیاں دراصل ان کی مشکلات کا نقطہ آغاز ہیں۔ اس بات کا ادراک ہونے تک پانی محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اُن کے سروں کے اوپر سے گزر چکا تھا۔

☆☆☆

الیکشن کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ گاؤں والوں کو جنگل کی طرف سے ایک رات عجیب و غریب آوازیں... سنائی دیں — آواز کا ماخذ دور ہونے کی وجہ سے کوئی بھی شخص ان آوازوں کو معنی پہنانے سے قاصر تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی، کچھ سردی اور کچھ خوف کے باعث کسی نے اٹھ کے ان آوازوں کے متعلق تحقیق کرنے کی ہمت نہ کی تھی۔ صبح ہر شخص ان آوازوں کے متعلق ہی گفتگو کر رہا تھا۔ ہر کوئی اپنا اپنا اندازہ بیان کر رہا تھا تاہم وہ سب اندازے ہی تھے، ان کی درستی کے بارے میں کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ہر راز آشکار ہونے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ جلد ہی لوگوں نے یہ معما بھی حل کر لیا تھا۔ وہ ان آوازوں کا ماخذ اور وجہ جان گئے تھے۔ یہ آگہی ان کے لیے جان لیوا تھی۔ جب سے انہوں نے آوازوں کے معنی سمجھے تھے، وہ ان میں چھپے اپنی تباہی و بربادی کا پیغام سمجھنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن وہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ دن کے وقت ان آوازوں کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہتیں، لوگ اپنے ذہنوں میں سرسراتے اندیشوں کا اظہار کرتے، لیکن یہ کسی حد تک ہی رہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے جتنی ہمت و توانائی درکار تھی، وہ اتنی ہمت خود میں مجتمع ہی نہ کر پائے۔

جس طرح وہ رات کو کتوں، جھینگروں، گیدڑوں اور دیگر جنگلی جانوروں کی آوازیں سننے کے عادی ہو گئے تھے، وہ ان آوازوں کے بھی عادی ہوتے چلے گئے۔ اب وہ آرام سے کان لپیٹ کے سو جاتے۔ دن کے وقت ہونے والی چہ میگوئیاں بھی دم توڑ گئیں۔ خطرہ ان کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا لیکن انہوں نے کبوتر کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وقت گزرتا رہا۔ اس عرصے میں اکبر کی زندگی میں ایک ہی بڑی تبدیلی آئی تھی۔ اس کی ماں اپنے شوہر کی وفات کے کچھ عرصے بعد گم صم حالت میں ہی دنیا سے منہ موڑ گئی تھی۔ انور بھی جنازے پر آیا تھا۔ چالیسویں تک ادھر ہی رہا تھا۔ چالیسویں تک تعزیت کے لیے آنے والے مہمانوں کا تانتا بندھا رہا تھا، انور اب عوامی آدمی بن چکا تھا، وہ لوگوں سے سماجی رابطے کا یہ موقع ضائع کرنا چاہتا تھا نہ ہی لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دے سکتا تھا۔

نقاش ان آوازوں کو سنتے سنتے ہی جوان ہوا تھا مگر وہ دیگر لوگوں کی طرح خاموش نہیں رہا تھا۔ کالج کا نیا نیا دور تھا۔ وہ جوان اور جذباتی تھا۔ وہ آنے والی تباہی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا، نہ ہی وہ دیگر لوگوں کی طرح اپنی آنکھیں بند کر سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر اتنے برسوں میں گاؤں کے لوگ خاموش رہے ہیں تو اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ ہو گی۔ وہ ان کی خاموشی کو ان کی بزدلی اور حماقت سے تعبیر کرتا تھا۔ اس نے لوگوں کو آنے والے وقت کا منظر دکھانے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔ وہ تو حالات کے ساتھ سمجھوتا کر چکے تھے۔ اب وہ کیسے ایک جوان اور جذباتی شخص کے پیچھے چل سکتے تھے۔

نقاش لوگوں کے رویّے سے مایوس نہیں ہوا تھا، وہ جانتا تھا کہ کامیابی کا دروازہ پہلی دستک سے نہیں کھلتا۔ اس نے دستک دینا جاری رکھا، آخر کار دروازے میں جھری پیدا

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلبہری

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر

اجمل زیدی

برص ملہری کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

مستقل پتہ

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مکان نمبر 62 اسٹریٹ نمبر 20 سیکٹر G-8/1
مرکز چوک (تعلیمی چوک) اسلام آباد
فون (051)32331725
موبائل 0300-8566188

لاہور

قیام

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

پشاور

قیام

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر

ہوٹل امین
جی ٹی روڈ نزد بجھوری چوک پشاور شہر
موبائل: 0300-8566188

ملتان

قیام

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

ہوٹل سلور سینڈ
ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون: 62-4518061 (061)
4582803 (0300-8566188)

کراچی

قیام

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

فورچون سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188

PakiBooks.site

ہوئی۔ ایک شخص اس کی بات ماننے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ شخص اس کا باپ تھا۔ پہلے پہل تو وہ بھی نقاش کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا رہا مگر پھر حالات نے ایک کروٹ لی۔ مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور انہیں ایک راہ نظر آنے لگی۔

انہیں ایک بااثر اور ذمے دار شخص سے مدد ملنے کی امید پیدا ہوئی تھی۔ نقاش نے مسئلے کا حل اکبر کے سامنے رکھا تو وہ بھی بادلِ ناخواستہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ دونوں رات کے اندھیرے میں اس شخص سے ملے تھے۔ اس کا نام عزیر اسد تھا۔ اس کی عمر محض تیس سال تھی لیکن اس کے باوجود اکبر اس کی بُردباری سے متاثر ہوا تھا۔

عزیر انہی کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ تباہی و بربادی کا پیغام لانے والی آوازیں سنتا رہا تھا۔ وہ اب ان آوازوں کو خاموش کرانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے طویل تگ و دو کی تھی اور اب وہ اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ ان آوازوں کے ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا، لیکن وہ تنہا تھا۔ اسے ایک ٹیم کی ضرورت تھی جو اس کے شانہ بشانہ کھڑی ہوتی۔

اس نے اپنا لائحہ عمل اکبر اور نقاش کو سمجھایا۔ ان دونوں نے اس پر اپنا کام شروع کر دیا۔ بلاؤں کی بے شمار آنکھیں اور بے شمار کان تھے۔ انہوں نے اپنے نادیدہ بازوؤں کے جال میں بے شمار لوگوں کو جکڑ کے بے بس کر رکھا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کے جال میں پھنسا کوئی شخص آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں ہلاتا اور انہیں خبر تک نہ ہوتی۔ جلد ہی نقاش اور اکبر کی حرکت ان کی نظر میں آ گئی۔

اکبر اور نقاش کو احساس تک نہ ہوا اور بلائیں ان پر قہر بن کے ٹوٹ پڑیں۔

☆☆☆

بارش پانچ دنوں سے متواتر جاری تھی۔ ان پانچ دنوں میں محض چند وقفے ہی ایسے آئے تھے جب بارش کا زور ٹوٹا تھا ورنہ بارش اتنی رفتار سے برس رہی تھی کہ انہیں اپنی ٹین سے بنی چھت پر ہتھوڑے بجتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر فکر و تردد کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

بارش کا زور کچھ دیر کے لیے ٹوٹا تو نقاش حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکل آیا۔ بارش کا پانی پوری رفتار سے ان کے مکان کے اطراف سے گزر رہا تھا۔ ان کا گھر بھی گاؤں میں بنے دیگر گھروں کی طرح ایک ڈھلوان پر ہی واقع تھا۔ نقاش پانی سے گزرنے لگا تو اسے ایسا لگا جیسے پانی کا تیز ریلا اسے بہا لے جائے گا۔ وہ مضبوطی سے قدم جماتا اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی وہ چند قدم ہی اوپر چڑھا تھا کہ اسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ پانی کا ایک بڑا ریلا ان کے مکان کی عقبی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ اگر کچھ دیر تک اسی رفتار سے دیوار سے ٹکراتا رہتا تو دیوار کی مزاحمت یقیناً دم توڑ جاتی۔ اگر پانی کا یہ ریلا ان کے گھر میں گھس جاتا تو سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا۔

اکبر کو دو دن سے بخار تھا۔ وہ اس کی مدد بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اسے اس پانی کا بہاؤ اکیلے ہی موڑنا تھا۔ وہ اسے کچھ بتائے بغیر گھر سے کدال اور بیلچہ لے آیا۔ بارش نے کچھ دیر بعد ہی دوبارہ زور پکڑ لیا تھا۔ نقاش بارش سے بے پروا کام میں لگا رہا۔ بڑی مشکل سے وہ ریلے کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوا۔ وہ بارش سے شرابور ہو چکا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ سخت کام کے باوجود اسے سردی لگنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ ٹھٹھرتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ابھی اس نے برآمدے میں پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ اس کی نظر دروازے کے نیچے سے باہر آتے سیال پر پڑی۔ اس سیال کا رنگ سرخ تھا۔ یہ خون تھا۔ اس کے ہاتھ سے بیلچہ اور کدال گر پڑے۔

اس نے بھاگ کے دروازہ کھولا۔ اندر کا منظر اسے دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

دروازے پر اس کی ماں کی خونچکاں لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم سے بہتا خون دروازے سے باہر جا رہا تھا۔ اس نے جھک کے ماں کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ لہو سے تر ہو گئے۔ اس کی ماں کے جسم پر لاتعداد گھاؤ نظر آ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم کو کسی تیز دھار آلے سے چھید دیا گیا ہو۔

نقاش کے احساسات جیسے منجمد ہو کے رہ گئے۔ اس نے بے تاثر انداز میں اپنی نگاہ اٹھائی تو ایک اور لرزہ خیز منظر اس کا منتظر تھا۔ کمرے کے وسط میں اس کی معصوم بہن خاموش نظروں سے چھت کی طرف گھور رہی تھی۔ اس کے سینے سے بہتا لہو فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

معاً ایک آواز جیسے اسے ہوش میں لے آئی۔ یہ آواز اس کے باپ کی چارپائی سے آ رہی تھی۔ اس کے باپ کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ اس کا جسم بھی لہولہو تھا تاہم وہ ابھی

زندہ تھا۔ وہ نقاش کو آواز دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لپک کے اس کے پاس پہنچا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، تاہم بارش کے شور میں اس کے لبوں سے نکلتی مدھم آواز نقاش کی سماعتوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اس نے اپنے کان باپ کے ہونٹوں سے لگا دیے۔

''بھاگ جاؤ۔'' اس کے کانوں سے سرگوشی ٹکرائی۔

''کس نے کیا یہ سب؟'' وہ چلایا۔

''جابر۔'' اس ایک لفظ نے ساری کڑیاں جوڑ دی تھیں۔ وہ جابر کو جانتا تھا۔ یہ انہی لوگوں کا ہرکارہ تھا جن کو بے نقاب کرنے کے لیے انہوں نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا تھا۔

''وہ..... وہ تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ تم بھاگ جاؤ۔'' ٹوٹی ہوئی آواز میں یہ چند لفظ ادا کرتے ہی اس کے باپ نے ایک ہچکی لی اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ نقاش اپنے باپ کے مردہ وجود کو سکتہ زدہ دیکھتا رہ گیا۔

کمرے میں جلتی انگیٹھی کب کی بجھ چکی تھی۔ کھلے دروازے سے سردی کی لہر اندر آ رہی تھی۔ نقاش چند لمحے پہلے سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ لیکن اب وہ جیسے سردی سے یکسر ہی بے پروا ہو گیا تھا۔ اس کی رگوں میں تو لہو کی جگہ لاوا دوڑنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔ یہ جابر کا ساتھی تھا۔ وہ گیٹ کے پاس سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں خون آلود خنجر تھا۔ اسے دیکھتے ہی نقاش کے لہو میں شرارے پھوٹنے لگے۔ اس نے برآمدے میں پڑا ہوا بیلچہ اٹھایا اور اس شخص کی طرف لپکا۔

نقاش کے تاثرات میں نجانے کیا بات تھی کہ وہ شخص الٹے قدموں بھاگ کھڑا ہوا۔ نقاش نے بھاگتے ہوئے گیٹ کراس کیا۔ وہ شخص ان کے گھر کے قریب سے بہتے ہوئے پانی کا ریلا کراس کر رہا تھا۔ نقاش دہاڑا۔ اسی پل اس شخص کے قدم ڈگمگائے اور پانی کا ریلا اسے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ نقاش کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص پانی میں بہتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دفعتاً اس نے ایک نامانوس سی آواز سنی۔ اس نے آواز کے ماخذ کی جانب دیکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی اس کا واسطہ اپنے پورے خاندان کی خونچکاں لاشوں سے پڑا تھا۔ ان لاشوں کو دیکھ کے اس پر ایک قیامت گزر گئی تھی لیکن قیامت کہتے کسے ہیں، اس کا ادراک اسے یہ منظر دیکھ کے ہوا تھا۔

☆☆☆

انور بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ بار بار ایک نمبر ملا رہا تھا لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اس نے موبائل سے ''کال می'' کا ایک میسج کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات دیکھے جا سکتے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے ہی جابر نے اسے بتایا تھا کہ آدھا کام ہو گیا ہے لیکن نقاش غائب ہے۔ وہ اسے ڈھونڈ کے اس کا کام بھی تمام کر دیں گے لیکن اس کے بعد سے جابر فون اٹھا نہیں رہا تھا۔

فون یقیناً جابر نے سائلنٹ پر لگا رکھا ہو گا اس لیے اسے کال کا پتا ہی نہیں چل رہا ہو گا۔ وہ خود کو تسلیاں دینے لگا۔

انور نے نقاش اور اکبر کی باتیں سن لی تھیں۔ شک تو اسے اسی وقت پڑ گیا تھا جب اکبر اس سے کرید کرید کے اس کی اگلی کارروائی کے متعلق سوالات کر رہا تھا۔ اس نے اس سے قبل تو ان معاملات میں کبھی اپنی دلچسپی ظاہر ہی نہ کی تھی۔ انور کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے ٹالتا رہا تھا۔ اکبر اسے اپنی طرف بغور دیکھنے پر جز بز ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا رویہ دیکھ کے انور کے ذہن میں سر اٹھانے والے شبہے کو تقویت ملی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلا تھا۔ اکبر کو نقاش کے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کے وہ باہر نکل آیا تھا۔ نقاش کے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگ کے اس نے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ اکبر اس کے جوابات سے مایوس لگ رہا تھا لیکن نقاش اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کے اس کے دل میں نفرت کا تیز بگولا اٹھا۔ اس نے اسی وقت انہیں مروانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اگلے ہی دن شہر چلا گیا لیکن اسی دن بارش نے ایسا زور پکڑا کہ اگلے کئی دن بارش کی نذر ہو گئے۔ اس سے اب مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے جابر اور اس کے ساتھیوں کو سارا منصوبہ بتا کے ان کی طرف بھیج دیا تھا۔ جابر نے اکبر کے پورے گھرانے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد واردات کو ڈکیتی کا رنگ دینا تھا۔ اکبر کی موت کی خبر سن کے اس کے دل کو تسکین ہوئی تھی لیکن اصل فساد کی جڑ تو نقاش تھا۔ جوں جوں اس کی موت کی خبر ملنے میں دیر ہو رہی تھی، اس کا پارا ہائی ہوتا جا رہا تھا۔

وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور شرمین اندر

داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے جان، تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' وہ لاڈ سے بولی۔

''کچھ نہیں، ایسے ہی بارش نے بیزار کر دیا ہے۔ ہفتہ ہو گیا ہے لیکن رک کے ہی نہیں دے رہی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

شرمین مسکرائی۔ ''تمہیں پتا ہے بارش کیوں نہیں رک رہی؟''

وہ اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیونکہ میں دعا مانگ رہی ہوں کہ بارش نہ رکے۔'' اس کی مسکراہٹ میں غرور چھپا تھا۔

''اور تم بھلا کیوں بارش نہ رکنے کی دعا مانگ رہی ہو؟'' وہ اچنبھے سے بولا۔

''بس مجھے اچھی لگ رہی ہے بارش، اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شرمین کو کچھ اچھا لگے اور اسے وہ نہ ملے۔'' وہ گردن جھٹک کے غرور سے بولی۔

انور اس کی بات سے متفق تھا۔ انہیں ساتھ رہتے ہوئے چودہ پندرہ سال ہو گئے تھے۔ ان برسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ شرمین نے کچھ چاہا ہو اور اسے نہ ملا ہو۔ وہ خود اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔

شرمین سے اس کی پہلی ملاقات بینک میں ہوئی تھی۔ اور پہلی ہی ملاقات میں دونوں نے ایک دوسرے کو گھائل کر دیا تھا۔

شرمین مقامی ایم پی اے کی اکلوتی اولاد تھی۔ ایم پی اے نے اسے اپنے داماد کے روپ میں قبول کر لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا انور نہ صرف اس کا بزنس سنبھالے بلکہ اس کی سیاسی سیٹ پر بھی وہی بیٹھے، وہ اسٹیج پر اس کی تربیت کرنے لگا۔ اس نے انور کے سامنے ایک منصوبہ رکھا۔ یہ منصوبہ اس کے گاؤں کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیتا۔ اسے اس بات کا ادراک تھا لیکن اس کے پیشِ نظر تو ہمیشہ سے اس کا ذاتی مفاد رہا تھا۔ جو شخص اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنے باپ کو قتل کر سکتا تھا اسے دیگر لوگوں کے نقصان کی بھلا کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ دل و جان سے اس منصوبے میں شریک ہو گیا۔ اس منصوبے کا پہلا مرحلہ گاؤں تک روڈ کی تعمیر تھی۔ روڈ کا ٹھیکا ایم پی اے کی اپنی کنسٹرکشن کمپنی کو ہی ملا جسے انور نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سڑک کی تعمیر سے انہوں نے دہرے مقاصد حاصل کیے تھے۔ ایک تو لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ آنے والے الیکشنز میں وہ اپنے اس ''کارنامے'' کو کیش کراتے اور دوسرا اُن کے منصوبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ اکبر اور گاؤں کے دیگر لوگوں سے اچھے تعلقات بھی اس کے منصوبے کا حصہ تھے۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کے اس نے اکبر سے خوش اخلاقی سے پیش آنا شروع کر دیا تھا۔

کچھ ہی عرصے میں اس کی شادی شرمین سے ہو گئی تھی۔ اب ان کے دو بچے تھے۔ وہ دونوں اسلام آباد کے ایک بورڈنگ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔

انور، شرمین کے گھر میں ہی رہتا تھا۔ وہ اپنے آبائی گھر جاتا رہتا تھا، شرمین بھی اس کے ساتھ جاتی تھی لیکن وہ ادھر کبھی رہنے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ انور پچھلے چودہ پندرہ سال سے اس منصوبے کو چلا رہا تھا۔ اکبر اور نقاش کی صورت میں پہلی بار منصوبے کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی تھی۔ ایسی رکاوٹیں اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ وہ تو ایسی رکاوٹ کو اس وقت بھی اپنے ہاتھ سے ہٹا چکا تھا جب اس کے پاس اختیارات نہیں تھے۔ اب تو وہ بے بہا اختیارات اور دولت کا مالک تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اب وہ راستے میں حائل ہونے والی رکاوٹ کو نہ ہٹا پاتا۔

معاً اس کا سیل بجا۔ اس نے فوراً کال وصول کی۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کے اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

☆☆☆

نقاش کا دل سامنے کا خوفناک منظر دیکھ کے لرز گیا تھا۔ جنگل کی طرف سے چٹانوں اور مٹی کا ایک سیلاب درختوں کو ساتھ لیے گاؤں کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ یہ وہی تباہی تھی جس کا خدشہ لوگوں کو اتنے عرصے سے ستاتا رہا تھا لیکن انہوں نے اپنی آنکھیں اور کان بند کر رکھے تھے۔ انہوں نے اجتماعی خاموشی سادھ رکھی تھی۔ اب انہیں اپنی خاموشی کا خراج اجتماعی طور پر ہی وصول کرنا تھا۔

نقاش کا دل لینڈ سلائڈ کو دیکھ کے ایک لمحے کے لیے رکا لیکن پھر جان بچانے کی فطری جبلت اس پر حاوی ہو گئی۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنے پورے گھرانے کی موت کا دکھ، دشمنوں کا خوف، انتقام کا جذبہ، سب احساسات ایک لمحے میں اس کے دل سے نکل چکے تھے۔ اگر کوئی احساس زندہ تھا تو بس جان بچانے کا احساس تھا۔

گڑگڑاہٹ کی آواز اتنی بلند تھی کہ تمام لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ گاؤں میں ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی، لگتا تھا کہ برسوں کی اجتماعی خاموشی کی کسر آج وہ چلّا

چلّا کے نکال رہے ہوں۔

ہر طرف قیامت کا سا سماں تھا۔ لوگ اپنی قیمتی چیزوں حتیٰ کے اپنے اہل و عیال تک سے غافل ہو چکے تھے۔ ہر ایک کے نزدیک ایک ہی چیز اہم تھی اور وہ ان کی اپنی جان تھی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کی چیخ و پکار میں جہاں اجتماعیت تھی وہاں عجیب طرح کی انفرادیت بھی تھی۔ ہر شخص اپنے لیے چیخ رہا تھا۔ موت سب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان سب نے اکٹھے اس کا شکار ہونا تھا لیکن ... ہر شخص اس عجیب لمحے میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

نقاش اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ راستے میں بارش کا بہتا پانی اس کے لیے مشکلات کھڑی کر رہا تھا لیکن جان بچانے کا احساس ہر مشکل پر حاوی تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ بار بار اوپر کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ ''زمینی طوفان'' اور اس کے درمیان تیزی سے فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ لوگوں کو بھی لینڈ سلائیڈنگ کی خبر ہو چکی تھی۔ پورا گاؤں لرزہ خیز چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ان کی آوازیں پتھروں کی گڑگڑاہٹ پر حاوی آ چکی تھیں لیکن نقاش کو جیسے کسی کی خبر ہی نہیں تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگیں جیسے شل ہو چکی تھیں، رکنے کا مطلب موت تھا، وہ شل ٹانگوں کے ساتھ بھاگتا رہا۔ آخر کار اس کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ بے دم ہو کے گر پڑا۔ اس میں اوپر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

کافی دیر بعد اس کی حالت سنبھلی تو وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے عقب میں نظر ڈالی تو اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کے مسل ڈالا۔ اس کے چہرے پر بارش کے برستے پانی کے ساتھ آنسوؤں کی دھاریں بھی شامل ہو گئیں۔ پورا گاؤں مٹی میں دفن ہو چکا تھا۔ لوگوں کی چیخیں معدوم ہو چکی تھیں۔ برسوں کی ''اجتماعی خاموشی'' نے آخر کار انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ زندگی میں تو وہ ظلم کے خلاف اکٹھے ہو نہیں سکے تھے، موت کے بعد وہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک اجتماعی قبر میں.....

☆☆☆

عزیر اسد اس وقت اپنے گھر میں موجود تھا۔ اسے بارش بہت پسند تھی، ٹین کی چھت پر پڑتی بارش کی آواز ہمیشہ اس کے دل میں ترنگ جگا دیتی تھی، یہ آواز اسے موسیقی سے زیادہ مسرور دیتی تھی لیکن ایک ہفتے سے برستی بارش نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اب بارش کی آواز اسے سُرور کے بجائے اذیت دینے لگی تھی۔ اوپر سے پانچ گھنٹے سے بجلی بھی گئی ہوئی تھی۔ اب اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ انگیٹھی کے پاس بیٹھا تھا۔ ٹارچ لائٹ کی چارجنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ کمرے میں ایک موم بتی کا مدھم سا شعلہ لرز رہا تھا۔ جس کی روشنی کمرے میں موجود تینوں نفوس کے چہروں پر چھائے تفکر کو مزید گہرا رنگ دے رہی تھی۔

''پتا نہیں یہ بارش کیا رنگ لائے گی؟'' عزیر کا باپ پُرتفکر انداز میں بولا۔

''اباجی خیر کی دعا مانگیں۔'' عزیر بولا تو اس کی ماں سر پر اوڑھی چادر پھیلا کے دعا مانگنے لگی۔

''یا اللہ رحم کر۔ یا اللہ اس بارش کو رحمت کی بارش بنا۔ یا اللہ ہم سب کو محفوظ رکھنا۔'' وہ دل سے دعا مانگ رہی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے دعا مانگنے میں دیر کر دی ہے اور بارش ان کے گرد و نواح میں کتنی تباہی پھیلا چکی ہے۔

کچھ دیر بعد چھت پر پڑنے والی بارش کی آواز مدھم ہوئی تو ان کے چہرے امید کی روشنی سے جگمگانے لگے۔

''لگتا ہے بارش رک گئی ہے۔'' عزیر کا باپ پُرامید انداز میں بولا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' عزیر اٹھ کے باہر چل پڑا۔ اس نے موبائل نکال کے اس کی ٹارچ روشن کر لی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ وہ لرز کے رہ گیا۔ باہر نکل کے اس نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کے چہرے پر نرم نرم پھوار پڑنے لگی۔ آسمان تاریک نظر آ رہا تھا۔ وہ موسم کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔

وہ چلتے چلتے گیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ ہر طرف گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ان کا گھر الگ تھلگ تھا اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ اچانک ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ سردی نے اسے سرتاپا لرزا دیا۔ وہ اندر کی طرف پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر جنگلا نما گیٹ سے باہر پڑی۔ وہ ٹھٹک کے رک گیا۔ اس نے موبائل کی ٹارچ کو اس جانب موڑا تو چونک گیا۔ گیٹ سے باہر کیچڑ سے لت پت ایک انسانی وجود پڑا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کھولا اور باہر کی طرف لپکا۔

اس نے اوندھے پڑے وجود کو سیدھا کر کے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پھینکی تو اپنی جگہ پر جیسے اچھل پڑا۔ وہ نقاش تھا۔ اس کا چہرہ اتنا سرد تھا کہ عزیر کو لگا کہ وہ مر

PAKSOCIETY.COM

چکا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت اس کی ناک کے ساتھ لگائی۔ اس کے سرد ہاتھ کو ہلکی سی حرارت محسوس ہوئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ گویا وہ زندہ تھا۔ وہ اسے اٹھا کے اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

اتنی تیز بارش میں یہ اِدھر کیسے پہنچ گیا؟ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ اندر پہنچ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے والدین اسے ایک شخص کو اٹھائے دیکھ کے چونک گئے۔

''یہ کسے اٹھا لائے ہو؟'' اس کے باپ نے اچنبھے سے سوال کیا۔

''یہ ڈونگہ گراں کا رہائشی ہے اور گیٹ کے باہر پڑا تھا۔ پتا نہیں یہ اِدھر کیسے پہنچ گیا۔'' عزیر، نقاش کے ساکت وجود کو چارپائی پر رکھتے ہوئے بولا۔ اس کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔

''تم جانتے ہو اِسے؟'' اس کے باپ نے سوال کیا۔

''ہاں میں جانتا ہوں اِسے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ لوگ باہر جائیں میں اس کے کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس کے والدین خاموشی سے باہر نکل گئے۔

عزیر الماری سے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کے اسے پہنانے لگا۔ اس کا جسم خراشوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے گھٹنوں اور کہنیوں سے خون رس رہا تھا۔ عزیر نے ڈیٹول سے اس کے زخم صاف کیے اور تولیے سے اس کا جسم اچھی طرح خشک کر کے اپنے کپڑے پہنا دیے۔ اسے کپڑے پہنانے کے بعد عزیر نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بے تاثر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''نقاش۔'' عزیر نے اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے اسے آواز دی، لیکن وہ گم صم نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔

عزیر نے اپنے والدین کو آواز دے کے اندر بلا لیا۔

''ہوش آیا اِسے؟'' اس کی ماں نے نقاش کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، لیکن اسے مکمل ہوش میں آنے کے لیے تھوڑا وقت لگے گا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اسے پانی پلانے لگا۔ وہ غٹ غٹ سارا پانی پی گیا لیکن ابھی تک اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں جاگا تھا۔

اس کی ماں یخنی کا پیالا لے آئی۔ عزیر اسے یخنی پلانے لگا۔ وہ خاموشی سے یخنی پیتا رہا۔ یخنی پلانے کے بعد

اس نے نقاش کو چارپائی پر لٹا کے اسے رضائی اوڑھا دی۔

کھانا کھاتے ہوئے ان کے درمیان نقاش کے متعلق ہی گفتگو ہوتی رہی۔ عزیر کے والدین بھی حیران تھے کہ اس برستی بارش میں وہ چودہ پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ، وہ بھی جنگل میں سے طے کر کے اِدھر کیوں آیا؟

کھانا کھانے کے بعد عزیر نے نقاش کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ وہ اسے کھانا کھلانا چاہتا تھا لیکن اسے سوتا دیکھ کے اس نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔

اس کے والدین کچھ دیر بعد سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ ادھر ہی لیٹ کے نقاش کے متعلق سوچنے لگا۔ نقاش سے اس کی پہلی ملاقات چند ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔

وہ کسی کام سے ایبٹ آباد جا رہا تھا کہ سڑک کنارے کھڑے ایک لڑکے نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے کندھے پر لٹکے بیگ کو دیکھ کے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ لڑکا طالب علم ہے اور ایبٹ آباد ہی جا رہا ہے۔ وہ عام طور پر شہر جاتے ہوئے گاؤں کے لوگوں کو لفٹ دے دیا کرتا تھا۔ اس نے لڑکے کو بھی بٹھا لیا۔

تعارف کے مراحل کے دوران جب عزیر نے اسے یہ بتایا کہ وہ فاریسٹ آفیسر ہے تو نقاش نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

''لگتا ہے تمہیں میرا فاریسٹ آفیسر ہونا پسند نہیں آیا۔'' اس نے نقاش کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے والا کوئی بھی شخص مجھے پسند نہیں۔'' وہ تنفر سے بولا تھا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا ہوں۔'' عزیر نے اچنبھے سے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری کی جھلک تھی۔

''آپ کے سب ڈویژن میں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اس سے لاعلم تو ہو نہیں سکتے۔ لازمی بات ہے کہ ان لوگوں کو آپ کی سرپرستی حاصل ہے۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''مجھے تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، سیٹ سنبھالے۔ یہ سب تو پچھلے کئی برسوں سے جاری ہے۔''

''تو آپ نے ان چند دنوں میں کیا، کیا؟ آج رات بھی آوازیں آتی رہی ہیں لیکن آپ اور آپ کے آدمی جانے کونسی دوا کھا کے سوتے ہیں کہ انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔'' اس کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا لیکن جانے کیوں عزیر کو

PakiBooks.site

بُرا نہیں لگا تھا۔

''میں خود یہ آوازیں سن سن کے جوان ہوا ہوں اور ان آوازوں کو ختم کرنے کے لیے ہی اس محکمے میں آیا ہوں، مگر اس کے لیے وقت درکار ہے۔'' اس نے بُردباری سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن لگتا تھا وہ اس کے دعوے سے متاثر نہیں ہوا۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''کتنا وقت؟ جب سب کچھ تباہ ہو چکا ہوگا؟''

''مجھے اس چیز کا احساس ہے لیکن یہ کام جتنے منظم انداز میں ہو رہا ہے، اسے ختم کرنے کے لیے بھی اتنی ہی تنظیم کی ضرورت ہے۔'' وہ رسان سے بولا تھا۔

''اچھا بہانہ ہے۔ آپ جس پوسٹ پر ہیں اس پوسٹ پر ہوتے ہوئے آپ کی مرضی کے بغیر تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

''کاش ایسا ہوتا لیکن بدقسمتی سے حقیقت انتہائی تلخ ہے۔ وہ اپنا پراپر سیٹ اَپ قائم کر چکے ہیں۔ اس سیٹ اَپ میں میری حیثیت ان کے نزدیک ایک مچھر کے برابر بھی نہیں۔ وہ جب چاہیں مجھے مسل سکتے ہیں۔'' وہ اداسی سے بولا۔

نقاش اُسے نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ ''یوں کہیں ناں آپ کو اپنی نوکری اور جان دوسروں کی زندگیوں سے زیادہ پیاری ہے۔''

عزیر نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ اسے نفرت سے گھور رہا تھا۔

''دیکھو، یہ جو ''ہیرو ازم'' ہوتا ہے ناں یہ صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ حقیقت میں اکیلا شخص کچھ بھی نہیں ہوتا جب تک اس کے پاس پوری ٹیم نہ ہو۔''

''تو ٹیم پیدا کریں ناں، آپ کے پاس پورا محکمہ ہے۔ آپ سب لوگ آخر تنخواہ کس چیز کی لیتے ہیں؟ سب کچھ دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لینے کی؟'' اس نے طنز کے وار جاری رکھے تھے۔

''میرے محکمے کی تو بات ہی نہ کرو، یہ پورا محکمہ ہی بکا ہوا ہے۔ کیا نیچے کے لوگ اور کیا اوپر کے لوگ۔ مجھے بھی خریدنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری مزاحمت کے جواب میں مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں۔ میری نقل و حرکت پر میرے اپنے ہی بندوں کی گہری نظر ہے۔ اب تم بتاؤ اس صورتِ حال میں، میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔''

''اگر کچھ نہیں کر سکتے تو نوکری چھوڑ دیں۔'' وہ تنفر سے بولا تھا۔

''نہ میں نوکری چھوڑوں گا نہ میں انشاء اللہ اس کام میں ملوث کسی شخص کو چھوڑوں گا۔'' اس کا پُرعزم لہجہ دیکھ کے پہلی بار نقاش کچھ نرم پڑا تھا۔

''ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے اور اب.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے جو کچھ سوچ رکھا ہے اس کے لیے مجھے وقت درکار ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ کیسے اس سب کو روکیں گے؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''قانون کی مدد سے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ نقاش کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کی کیفیت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

''قانون تو بقول آپ کے بکا ہوا ہے۔ وہ آپ کا ساتھ کیوں دے گا؟''

''میرا ساتھ نہ دے، لیکن ان لوگوں کا ساتھ تو دے گا جو قانون کو خرید سکتے ہیں۔'' وہ پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ نقاش کا تجسس حدوں کو چھونے لگا تھا۔

''پلیز، پہیلیاں نہ بجھوائیں۔ مجھے صاف لفظوں میں سمجھائیں۔'' اس کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

''کوئی بھی کام کرنے کا سیدھا طریقہ تو ایک ہی ہوتا ہے تاہم غلط طریقے بے شمار ہوتے ہیں۔ میں سیدھا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ سیدھا یعنی قانونی طریقہ..... یہ قانونی جنگ لڑنے کے لیے مجھے چند لوگوں کی ضرورت ہے۔'' وہ ایک اجنبی پر اتنی آسانی سے اعتبار نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس بار بھی اس نے گول مول ہی جواب دیا تھا۔

''اگر آپ سنجیدہ ہیں تو میں ہر قدم پر آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' عزیر نے اسے چونک کے دیکھا تھا۔

''تم کیا کر سکتے ہو؟'' کچھ سوچتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''آپ جو کہیں گے میں وہ کروں گا۔'' وہ عزم سے بولا تھا۔

''میرے محکمے کا تو کوئی شخص میرا ساتھ دے نہیں سکتا۔ اتنے دن میں اس چیز کا مجھے یقین ہو چکا ہے، الٹا وہ مجھے بھی کچھ نہیں کرنے دیں گے۔ ایسے میں مجھے تم جیسے چند

باہمت لوگوں کی مدد کی اشد ضرورت ہے لیکن کیا تم جانتے ہو اس کام میں کتنا خطرہ ہے؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔ مجھے اس راہ پر نکلنے سے پہلے اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا ہوگی لیکن آپ یہ تو بتائیں آپ کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟''

عزیر نے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس نوجوان کے جذبے نے اسے متاثر کیا تھا۔

''میرے ذہن میں مکمل منصوبہ ہے۔ اس منصوبے پر میں خود عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس دن ان کو کارروائی کرنی ہوتی ہے، اس دن وہ مجھ پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔''

''آپ منصوبہ تو بتائیں۔'' اس نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ عزیر جانتا تھا کہ کسی نوجوان سے پہلی ملاقات میں ہی یہ سب باتیں کرنا کتنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے لیکن جانے کیوں اسے یہ نوجوان قابلِ اعتماد لگا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے، اپنے ساتھ ملانے کا فیصلہ کرلیا۔

''مجھے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ٹھوس ثبوتوں کی ضرورت ہے۔ یہ ثبوت حاصل کرنا تنہا شخص کے لیے آسان نہیں۔ اس کے لیے پوری ٹیم کی ضرورت ہے۔ تمہیں پہلے اپنے ہم خیال لوگوں کو ساتھ ملا کے ٹیم تیار کرنا ہو گی۔'' وہ احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے بولا تھا۔

''اس ٹیم کو کیا کرنا ہوگا؟''

''اس ٹیم کے کچھ افراد کو اس گروہ میں اپنی جگہ بنانی ہوگی، وہ ان کا اعتماد حاصل کرکے اس کام میں ملوث بڑے لوگوں کے متعلق ثبوت اکٹھے کر کے مجھے دیں گے۔ ان ثبوتوں کی روشنی میں، میں اس گروہ کے خلاف کارروائی کروں گا۔'' اس نے اشاروں کنایوں میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن لڑکا ذہین تھا، وہ پوری بات سمجھ گیا۔

''ہمم..... اس کام کے لیے میری نظر میں ایک ایسا شخص ہے جو تنہا سارے ثبوت اکٹھے کرسکتا ہے۔ بس انہیں منانے میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''کون ہے وہ شخص؟'' عزیر نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔

''میرا باپ۔'' وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔ ''اس کام میں میرا اچھا ملوث ہے۔ وہ میرے بابا پر اعتماد کرتا ہے، لیکن مجھ پر نہیں۔ میرے بابا اس سے باتوں ہی باتوں میں بہت سی معلومات نکلوا سکتے ہیں اور ان باتوں کو ریکارڈ بھی کرسکتے ہیں۔'' وہ پورے اعتماد سے بول رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے، تم انور کے بھتیجے ہو؟''

''ہاں، بدقسمتی سے میں اس شخص کا بھتیجا ہوں۔'' وہ تاسف سے بولا تھا۔

''پھر تو تم اور تمہارے بابا اس فرعون کو ڈبونے کے لیے واقعی موسیٰ کا کردار ادا کرسکتے ہو۔ تم مجھے اپنے بابا سے ملواؤ۔''

چند دن بعد ہی وہ اپنے باپ کو اس کے پاس لے آیا تھا۔ ان سے باتوں کے دوران اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اکبر اپنے بھائی سے کتنی نفرت کرتا ہے۔ اس نے اس نفرت کو اور ہوا دی۔ نفرت لوگوں کو تباہ کر دیتی ہے مگر وہ اس نفرت کو لوگوں کو تباہی سے بچانے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اکبر اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگیا تھا۔

چند دن پہلے وہ تنہا تھا۔ پھر اُسے نقاش ملا۔ آج وہ تین ہو چکے تھے۔ قافلہ بننا شروع ہوگیا تھا۔ ایک دن آنا تھا کہ یہ قافلہ سارے دشمنوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کے لے جاتا، چاہے ان کے دشمن جتنے چاہے طاقتور ہوتے، وہ جتنے چاہے تعداد میں زیادہ ہوتے۔ حق، پر ہمیشہ کم لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اکثریت باطل کے ساتھ ہوتی ہے لیکن حق کے ساتھ خدا کی نصرت ہوتی ہے۔ وہ باطل کی شکست کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنی جیت کے سپنے آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ ان سپنوں کو حقیقت بننے میں اہم کردار نقاش اور اس کے باپ کو ہی ادا کرنا تھا۔

وہ ان کی طرف سے کسی اچھی خبر کا منتظر تھا۔ خبر تو اسے ملی نہیں تھی، نقاش خود ہی اس کی دہلیز پر آن گرا تھا۔ اس کی بُری حالت دیکھ کے بس وہ یہ دعا ہی کرسکتا تھا کہ وہ اس کے لیے جو خبر لایا ہے، وہ بُری نہ ہو۔

☆☆☆

انور کے چہرے پر فون کال سنتے ہوئے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ شرمین اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے کال کاٹی تو شرمین کو مستفسرانہ نظروں سے خود کو دیکھتے ہوئے پایا۔

وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے۔ کس کی کال تھی۔ خیریت تو ہے؟''

وہ جب کچھ نہ بولا تو شرمین نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

''میرا پورا گاؤں لینڈ سلائیڈنگ سے تباہ ہوگیا ہے۔ ہزاروں لوگ ملبے تلے دبے ہیں۔'' اس کی آواز بھرائی... ہوئی تھی۔

''اوہ..... یہ تو انتہائی افسوسناک خبر ہے۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''ہاں، مجھے ان کی مدد کو جانا ہوگا۔'' وہ جیکٹ پہنتے ہوئے بولا۔

وہ اسے رخصت کرنے باہر پورچ تک آئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ اس کی گاڑی کو گیٹ سے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ جا رہا تھا۔

آنے والے الیکشنز میں ایم پی اے خود کھڑا ہونے کے بجائے انور کو کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے انور برستی بارش میں گاؤں کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ ورنہ اس کے دل میں گاؤں والوں کا اتنا درد ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنا آرام و سکون چھوڑ کے ان کی مدد کے لیے دوڑتا۔ ایسے مواقع ہی تو سیاستدان کیش کراتے ہیں۔ وہ بھی بس اس موقع کو کیش کرنے کے لیے چل پڑا تھا۔ اس نے ایم پی اے کو بھی گاؤں کی تباہی کے بارے میں بتایا تھا، اس نے بے حسی سے یہ خبر سنی تھی۔ اس کا اب ''عوام'' سے مفاد ختم ہو چکا تھا اس لیے ان کی مدد کے لیے وہ اپنا آرام و سکون نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جس کا مفاد عوام سے تھا وہی یہ قربانی دے سکتا تھا اور وہ دے رہا تھا۔

راستے میں وہ بار بار جابر کا نمبر ملا رہا تھا لیکن نمبر نہیں مل رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ جابر اور اس کے ساتھی بھی نقاش سمیت لینڈ سلائڈ کی نذر ہو چکے ہوں گے۔ اسے جابر اور اس کے ساتھیوں کی زندگی موت کی اتنی پروا نہ تھی تاہم وہ نقاش کو ضرور مردہ دیکھنا چاہتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہی بارش رک گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے انٹرنیٹ پر موسم کی صورتِ حال چیک کی تھی۔ اس کی توقع کے مطابق بارش کا زور ٹوٹنے والا تھا۔ آنے والے کل کو مطلع صاف تھا۔

راستے میں انہیں کئی امدادی ٹیموں کی گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ ان کے ساتھ ایمبولینسز بھی تھیں جو سائرن بجاتے تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جب وہ گاؤں میں پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ انور ایک جگہ گاڑی روکا کے نیچے اتر آیا۔

اندھیرے میں ہر طرف ٹارچ لائٹس کی روشنیاں مچو رقص تھیں۔ ان کی روشنی نے ماحول کی ہیبت ناکی میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ چند لوگ اپنی جانیں بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ گاؤں کے کئی لوگ شہر میں لینڈ سلائڈ کے وقت اُدھر موجود نہ تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ لینڈ سلائڈ کی خبر ملنے کے بعد موقع پر پہنچے تھے۔ اب وہ لوگ چیخ چلا رہے تھے۔

امدادی ٹیمیں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ وہ لوگ فی الحال اوزاروں کی مدد سے ہی کام کر رہے تھے۔ مشینوں کے پہنچنے میں ابھی مزید وقت درکار تھا۔

انور کو دیکھ کے چند لوگ اس کے گرد آ کے کھڑے ہو گئے۔ ''بس جی دعا کریں۔ آپ کا گھر تو بالکل ہی دب گیا ہے۔'' ایک شخص اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ وہ رفیق تھا۔ انور اسے جانتا تھا۔ اس کا گھر گاؤں کے شروع میں تھا۔

''اکبر بھائی کی کوئی خیر خبر؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کوئی پتا نہیں جی۔ دوسری طرف تو بہت دور تک لینڈ سلائڈنگ ہوئی ہے۔ شاید ہی اس طرف کوئی اپنی جان بچا سکا ہو۔ گاؤں کے شروع میں موجود چند لوگ ہی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔''

''یا اللہ..... میرے بھائی اور اس کے خاندان کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے زبان سے دعائیں مانگنے لگا۔ اس کی زبان پر کچھ اور دل میں کچھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اکبر تو دعا کی حد سے گزر چکا، الٹا وہ دل میں نقاش کی موت کی دعا مانگ رہا تھا۔

''توبہ جی بہت خوفناک منظر تھا۔ ایک پتھر لڑھکتا ہوا ہماری چھت پر نہ گرتا تو ہم بھی ابھی ملبے تلے دفن ہوتے۔ اس کی آواز سن کے ہم سب گھر والے باہر نکل آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مٹی اور درختوں کا ایک سیلاب تیزی سے گاؤں کو نگلتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس قیامت کے منظر کو دیکھ کے تو ہر کوئی اپنے ہوش حواس کھو بیٹھا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ کیا بتاؤں آپ کو..... اس منظر کو دیکھ کے تو میں اپنے چار سالہ بیٹے کو بھی بھول گیا تھا۔ میری گھر والی بڑی مشکل سے اسے اٹھا کے گرتی پڑتی اپنی جان بچانے میں کامیاب رہی۔'' رفیق کانوں کو بار بار ہاتھ لگا رہا تھا۔

''بس یہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔'' ایک اور شخص بولا۔ انور اس کی طرف مڑا۔ یہ سب اس کے ''اعمال'' کا نتیجہ تھا لیکن گاؤں کے معصوم لوگ اپنی تباہی کا دوش خود اپنے اعمال کو ہی دے رہے تھے۔ وہ انور کو لعنت ملامت کرنے کے بجائے الٹا اسے تسلیاں دے رہے تھے۔ انور کو گاؤں کے سادہ لوح لوگوں پر اس لمحے ٹوٹ کے پیار آیا۔

PakiBooks.site

کچھ ہی دیر بعد مشینیں پہنچنا بھی شروع ہو گئیں۔ مشینوں کے آمد کے ساتھ کام میں تیزی آگئی لیکن اندھیرے اور شدید سردی کے باعث یہ کام آسان ہرگز نہ تھا۔ انور نے لوگوں کو ملبے سے پیچھے ہٹالیا تھا۔

اب وہ امدادی ٹیم کے لوگوں کو چلّا چلّا کے اپنے مشورے دے رہا تھا۔ آخر کار امدادی ٹیم کی محنت رنگ لائی اور انہیں پہلے مکان کی چھت نظر آئی۔ مکان کے آگے سے مشین کی مدد سے ملبا ہٹایا جانے لگا۔ مکان گرا نہیں تھا۔ انور مشین والے کو چلّا چلّا کے دروازے کے رخ کے بارے میں بتانے لگا۔ امید قوی تھی کہ اس گھر کے افراد گھر کے اندر محفوظ ہوں گے۔ اس گھر میں ایک شخص اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کے ساتھ رہتا تھا۔ لوگ دور سے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ امید و بیم کی کیفیت میں لٹکے ہوئے تھے۔

انور رات بھر ادھر ہی موجود رہا تھا۔ گاؤں سے کچھ دور امدادی ٹیموں نے خیمے لگا لیے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو ان خیموں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ صبح کی روشنی میں انور نے سارا منظر دیکھا تو اس کا دل ہول گیا۔ پورا گاؤں جیسے صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا۔ بس اِکا دُکا مکانوں کی چھتیں ملبے سے جھانک رہی تھیں۔ وہ گاؤں کے دیگر لوگوں کے ساتھ مردہ برآمد ہونے والے لوگوں کی تدفین میں شریک ہو گیا۔

پورا دن لاشیں برآمد ہونے کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ چند لوگ زندہ بھی برآمد ہوئے تھے لیکن ان کی حالت تشویشناک تھی۔ انہیں ایمبولینس میں اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

شام تک امدادی ٹیمیں ملبا ہٹاتے ہٹاتے اس کے گھر کے قریب تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل سے اپنے گھر کا ملبا ہٹائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کون جانے اس کے بھائی اور بھاوج کی لاشیں کس حال میں برآمد ہوتا تھیں۔

☆☆☆

عزیر کتنی ہی دیر خیالوں میں گم رہنے کے بعد سو گیا۔ اس کی آنکھ ایک نامانوس سی آواز سے کھلی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ آواز نقاش کی چارپائی کی طرف سے آرہی تھی۔

اس نے موبائل کی ٹارچ جلا لی۔ نقاش خراٹی ہوئی آواز میں مسلسل کچھ کہے جا رہا تھا۔ عزیر نے بغور سنا تو اسے سمجھ آنے لگے۔

''سب تباہ ہو گیا۔ کچھ نہیں بچا..... چھوڑوں گا نہیں۔ ظلم کا بدلہ لوں گا۔ ایک ایک سے لوں گا..... بابا..... آپ خون کو میں رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ میری امی کو بھی مار دیا۔ میری معصوم بہن کو بھی نہیں چھوڑا..... کچھ بھی نہیں بچا۔''

عزیر سکتے کے عالم میں کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے لگا کہ نقاش کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اسے جھنجوڑنے لگا۔

''نقاش..... ہوش میں آؤ۔'' اس کی آواز آنا بند ہو گئی لیکن وہ جاگا نہیں۔ اب وہ خرخراتی ہوئی آواز کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔ عزیر نے اس کے ماتھے کو چھوا تو اچھل پڑا۔ اسے لگا جیسے اس نے جلتے انگارے کو چھو لیا ہو۔ اسے انتہائی تیز بخار تھا۔ بخار کم کرنے کا وقتی اس کے پاس ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ ایک کپڑا ٹھنڈے پانی میں بھگو بھگو کے اس کی پیشانی پر رکھنے لگا لیکن بخار کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کے عزیر کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ قریب ترین اسپتال بھی کم از کم ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ نقاش کی حالت دیکھ کے اس نے، اسے اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے والدین سو رہے تھے۔ وہ انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے نام ایک رقعہ لکھا اور نقاش کو اٹھا کے گاڑی میں ڈال لیا۔ اس نے نقاش کو پچھلی سیٹ پر لٹا کے اسے کمبل اوڑھا دیا تھا۔

سڑک نالے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ایک ہفتے کی لگاتار بارش کے باعث ہر طرف پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ اس کے پاس پوٹھوہار جیپ تھی ورنہ سڑک کی حالت ایسی تھی کہ کوئی چھوٹی گاڑی اس پر چل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سڑک کھلا ہونے کی دعا مانگنے لگا لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ان کے گاؤں کے بعد آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ سات آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ جنگل میں طے کرنے کے بعد ڈونگہ گراں شروع ہو جاتا تھا۔ جنگل میں نمبر مافیا کے باعث اب گنے چنے درخت ہی باقی رہ گئے تھے۔ ابھی وہ جنگل کے درمیان ہی پہنچا تھا کہ اسے گاڑی روکنی پڑی۔ سامنے سڑک پر ایک درخت گرا پڑا تھا۔

''یا اللہ خیر.....'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

وہ گاڑی سے اتر آیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس نے روشن رکھی تھیں۔ وہ چلتے ہوئے درخت کے پاس پہنچا تو سامنے کا منظر دیکھ کے اس کا دل جیسے اس کے سینے میں ساکت ہو گیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس جہاں تک پہنچ رہی تھیں وہاں تک اسے ملبے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ دور گاؤں کے دوسرے سرے پر چند روشنیاں محوِ رقص تھیں۔ بغور سننے کے

بعد اسے پانی کی پُرشور آواز کے بیچ ہلکی ہلکی مشینوں کی گھر گھر کی آواز آئی۔

''او خدایا..... یہ تو لگتا ہے مشینوں کی مدد سے ملبا ہٹایا جا رہا ہے۔'' اس نے اندازہ لگایا۔

اب نقاش کو واپس لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس گھر پہنچ چکا تھا۔

نقاش پر رضائی اور کمبل ڈالا۔ وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کے اس نے اپنے والدین کو جگانے کا فیصلہ کیا۔

نقاش کی حالت دیکھ کے وہ بھی پریشان ہو گئے۔ عزیر کی ماں جڑی بوٹیوں پر مشتمل قہوہ تیار کرنے لگی۔ عزیر نے اسے چمچ کی مدد سے وہ قہوہ پلایا۔ قہوہ پینے سے اس کی کپکپاہٹ رک گئی۔ اب وہ قدرے پُرسکون انداز میں سانس لے رہا تھا۔ عزیر نے اس کی پیشانی کو چھوا۔ بخار کسی حد تک کم لگ رہا تھا۔

''اس کے سر پر بھی کمبل اوڑھا دو۔ پسینہ آئے گا تو اس کا بخار ٹوٹ جائے گا۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے بخار ہوا ہے۔'' اس نے اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔

اس نے اپنے والدین کو لینڈ سلائیڈ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گئے۔ وہ بے چینی سے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

فجر کی نماز کے بعد وہ اپنے والدین کو نقاش کا خیال رکھنے کا کہہ کے باہر نکل آیا۔ اس کا بخار ٹوٹ گیا تھا۔ اب وہ سکون سے سو رہا تھا۔

ان کا گھر گاؤں کا پہلا گھر تھا اور بالکل الگ تھلگ واقع تھا۔ اس نے کچھ دور جا کے اپنے پڑوسیوں کو لینڈ سلائڈنگ کے بارے میں بتایا۔ وہ آوازیں دے دے کے باقی لوگوں کو بتانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں پورا قافلہ کدالوں اور بیلچوں سمیت ڈونگہ گراں کی طرف رواں دواں تھا۔

عزیر اپنی گاڑی لے آیا تھا۔ پانچ افراد اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ متاثرہ علاقے کے پاس پہنچ کے گاڑی روکی۔ سامنے کا منظر دیکھ کے سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

دوسری طرف امدادی سرگرمیاں جاری تھیں لیکن اس طرف جنگل تھا اور مکانات کا سلسلہ کافی دور سے شروع ہوتا تھا۔ سلائڈنگ کی وجہ سے یہ سارا علاقہ دلدل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مکانات تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جانے کتنے لوگ ملبے میں زندہ دفن تھے۔ وہ ان کے لیے دعا کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ عزیر کو نقاش کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ وہ کچھ وقت ادھر گزارنے کے بعد واپس گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

نقاش کا بخار ٹوٹ چکا تھا لیکن وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ عزیر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔ وہ اسے تسلیاں دینے لگا۔

''کیا بنا میرے گاؤں کا..... کچھ بچا؟'' اس نے روتے ہوئے پوچھا۔

عزیر کا دل کٹ کے رہ گیا۔ ''امدادی کام جاری ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''تم بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا بیتی؟'' وہ نقاش کی زبانی سارے حالات سننا چاہتا تھا۔

نقاش نے افسردہ سے لہجے میں اپنی آپ بیتی سنائی۔ آخر میں وہ اسے بتا رہا تھا۔

''گاؤں کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد میری رہی سہی توانائی بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں جانے کتنی دیر اُدھر ہی بے سدھ بارش میں پڑا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تو مجھے ہوش آیا۔ سب سے پہلے مجھے آپ ہی کا خیال آیا تھا۔ جانے کیسے میں اندھیرے میں گرتا پڑتا آپ کے گھر تک پہنچا۔ آپ کے گھر کے سامنے پہنچتے ہی میری ہمت جواب دے گئی۔ اس کے بعد مجھے ابھی ہوش آیا۔''

''تمہارے ساتھ بہت بُرا ہوا لیکن خدا کو یہی منظور تھا۔ تم آرام کرو۔ تمہارے ٹھیک ہونے کے بعد ان درندوں سے بھی نمٹنے کا کوئی طریقہ سوچ لیں گے۔''

''میں نے اُن سے نمٹنے کا طریقہ سوچ لیا ہے۔'' نقاش عجیب سے انداز میں بولا۔ ''اپنے والدین کے قاتل کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑنا۔ اس درندے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا پورا گاؤں تباہ ہو گیا۔ سیکڑوں بے گناہ لوگ اپنی زندگی سے گئے۔ اُسے مارے بغیر مجھے کبھی سکون نہیں مل سکتا۔''

''دیکھو فی الحال تم صرف آرام کرو۔ اپنے ذہن پر بوجھ ڈالو گے تو تمہاری حالت پھر خراب ہو جائے گی۔'' وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''جب تک وہ درندہ اس دھرتی پر پھر رہا ہے، میں آرام نہیں کر سکتا۔'' اس کے لہجے میں شعلوں کی سی تپش تھی۔ عزیر اسے تسلی دینے لگا۔

Hum Books Store

اس نے اپنے والدین کو بھی سمجھا دیا کہ نقاش کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دینا۔ وہ اس کی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر نقاش کے دشمنوں کو اس کے زندہ رہنے کی خبر مل گئی تو وہ اسے مارنے کی لازمی کوشش کریں گے۔ وہ ان کے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔

اگلے چند دن میں نقاش کی جسمانی حالت بہتر ہو چکی تھی تاہم روح پر لگے گھاؤ آسانی سے نہیں بھرتے۔ وہ گم صم رہنے لگا تھا۔ ڈونگہ گراں سے گزرنے والی سڑک سے ملبا ہٹا لیا گیا تھا۔ سڑک کی حالت انتہائی خراب ہو چکی تھی تاہم شہر جانے کا راستہ کھل چکا تھا۔

گاؤں کے ملبے سے چند لوگ ہی زندہ نکل پائے تھے۔ نقاش اب واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ انور سے انتقام لینا چاہتا تھا لیکن عزیر اس حق میں نہیں تھا۔ آخر کار اس نے نقاش سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''دیکھو نقاش زندگی خدا کی امانت ہوتی ہے۔ اگر یہ کسی مثبت کام میں چلی بھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اسے انتقام میں نہ جھونکو۔ تمہارے ماں باپ کے قاتل تو قدرت کے ہاتھوں اپنی سزا پا چکے۔ ایک شخص تمہارے سامنے ہی پانی میں بہہ گیا تھا۔ باقی بھی یقیناً سلائڈنگ کی نذر ہو گئے ہوں گے۔ رہا انور..... تو اسے مارنا آسان نہیں۔ تم اگر کسی طرح اسے مارنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو تمہارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ ویسے بھی اس کے قتل سے تمہارا انتقام تو پورا ہو جائے گا لیکن ان کا کام رکے گا نہیں۔ انور تو صرف ایک مہرہ ہے۔ اس کے جانے سے کسی کو... کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ وہ اسی طرح گاؤں کے گاؤں برباد کرتے رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں ہم مل کے ان کے اس سارے سیٹ اپ کو ختم کر دیں اور یہ زیادہ بڑا کاز ہے۔ اس سے تمہارا انتقام بھی پورا ہو جائے گا اور اس ملک خداداد کے ہزاروں لوگوں کی زندگیاں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔'' وہ اسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں، میں کیا کروں؟'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''وہ لوگ زیادہ عرصے تک خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ مجھے اندازہ ہے کہ وہ اپنی اگلی کارروائی کے لیے کوئی جگہ منتخب کریں گے۔ میں چاہتا ہوں تم ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کرو۔ جیسے ہم نے پہلے طے کیا تھا۔ وہ لوگ تم سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے تمہارے پورے گھرانے کو ختم کرا دیا۔ خدا نے تمہیں محفوظ رکھا تو شاید اسی لیے کہ وہ تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔'' نقاش کی آنکھوں میں نیم آمادگی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

عزیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جس طرح ٹرین کا انجن خود جلتا ہے لیکن اپنے ساتھ جڑے ڈبوں میں موجود سیکڑوں لوگوں کو ان کی منزل تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح تم بھی اپنے اندر جلتی آگ سے ہمارے دشمنوں کو خاکستر کر دو، مگر اس طرح کہ اگر تم خود جلو تو باقی لوگ تو تمہاری بدولت محفوظ رہ سکیں۔ تمہاری اس قربانی کا اجر تمہیں اللہ دے گا۔''

نقاش تیار ہو گیا۔ عزیر نے اسے اپنے سارے منصوبے کی تفصیل بتا دی۔ ''اس طرح تو نچلے لیول کے لوگوں کے خلاف ہی ثبوت حاصل ہوں گے۔ نہ بڑے لوگوں کو کوئی فرق پڑے گا نہ ان کا کام رکے گا۔'' عزیر کا منصوبہ سن کے نقاش بولا تھا۔

''میرے ذہن میں بڑے لوگوں کے لیے بھی ایک پلان ہے لیکن اس کے لیے پہلے مجھے نچلے لیول کے لوگوں کے خلاف ثبوت درکار ہیں۔'' عزیر نے آخر کار اسے مکمل تیار کر لیا تھا۔ نقاش ایک جنگل میں جا کے رہنے لگا تھا۔ اس نے نقاش کو ایک کیمرا بھی دیا تھا۔ اس نے پہلے پہل اسے ایک موبائل فون بھی دیا تھا لیکن جنگل میں کسی بھی نیٹ ورک کے سگنل ہی نہیں آتے تھے۔ موبائل کی چارجنگ کا بھی مسئلہ تھا اس لیے نقاش نے موبائل اسے واپس کر دیا تھا۔

ان کی توقع کے مطابق آخر کار قاتل جتھا ادھر بھی پہنچ گیا تھا۔ اس نے ان کے خلاف ثبوت تو حاصل کر لیا تھا لیکن جابر کی گولی نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی ساری محنت رائگاں جانے والی ہے۔

☆☆☆

اکبر کا مکان جس جگہ واقع تھا مشینوں نے وہاں سے ملبا ہٹانا شروع کیا تو انور کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ کچھ ملبا ہٹا تو اندازہ ہوا کہ اکبر کا گھر منہدم ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کے انور کا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔

مشینیں ملبا ہٹاتی رہیں لیکن وہ کسی زندہ یا مردہ شخص تک نہ پہنچ سکیں۔

''میرا خیال ہے اب اگر کوئی شخص یہاں سے برآمد ہوا بھی تو زندہ نہیں ہوگا۔ بہتر ہے آپ کام آگے بڑھا دیں۔ ہو سکتا ہے اُدھر کوئی شخص زندہ ہو۔'' اس نے مشین آپریٹر کو مشورہ دیا تھا۔ اس کے کہنے پر مشینیں آگے بڑھ گئیں۔

چند دن میں پورے گاؤں سے ملبا صاف کر لیا گیا

تھا۔ اس ساری محنت کا حاصل وہ تیرہ لوگ تھے جو ملبے سے زندہ نکالے گئے تھے۔ اب گاؤں کی بحالی کا کام شروع ہونا تھا۔ حکومت نے تمام متاثرین کو امدادی رقوم کے چیک دینے کا اعلان کیا تھا۔ گاؤں کے چند لوگ ہی زندہ بچے تھے۔ گاؤں کا حشر نشر ہو چکا تھا۔ انور نے زندہ بچ جانے والوں کو نہ صرف گاؤں میں زمینیں الاٹ کرائیں بلکہ انہیں حکومت سے امدادی رقوم بھی دلوائیں۔ یہ رقوم حکومت کی طرف سے مقامی ایم پی اے کو ملی تھیں اور اس کی ذمے داری تھی کہ ان رقوم کو صحیح شخص تک پہنچائے۔ اس نے اس کام کے لیے بھی حسب معمول انور ہی کو آگے کیا تھا۔

ڈونگہ گراں تو پورا تباہ ہو گیا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی کئی علاقوں میں لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے سیکڑوں لوگ متاثر ہوئے تھے۔ انور نے انہیں بھی امدادی رقوم دلوائیں۔

انور کے اگلے چند ماہ اسی مصروفیت میں گزرے تھے۔ جب کام مکمل ہوا تو سب سے زیادہ فائدے میں انور ہی رہا تھا۔ گاؤں کی بیشتر زمین اس نے اپنے نام کروالی تھی۔ اب آدھے سے زیادہ گاؤں کا وہ تنہا مالک تھا۔ تمام لوگوں میں رقوم تقسیم کرنے کے باوجود وہ اپنے لیے اچھی خاصی رقم بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ سادہ لوح تھے۔ اس لیے انور کو ایسا کرنے میں کسی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ان دونوں فوائد کے علاوہ انور اس موقع سے سیاسی فوائد حاصل کرنے میں بھی پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ اس عرصے میں لوگوں کے درمیان اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اب کہا جا سکتا تھا کہ آنے والے الیکشنز میں وہ پہلی بار الیکشن میں حصہ لینے کے باوجود اپنے حریفوں کو ناکوں چنے چبوانے والا ہے۔

لوگوں پر آنے والی اس ساری تباہی..... کا ذمے دار انور ہی تھا... مگر اس تباہی سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں انور ہی کامیاب رہا تھا۔ یہاں جنگل کے قانون کا راج تھا، یہاں تقسیم انصاف کے پلڑے کو دیکھ کے نہیں طاقت کے پلڑے کو دیکھ کے کی جاتی تھی۔ انور کی طرف طاقت کا پلڑا بھاری تھا سو تقسیم کے سارے قاعدے اسی کے حق میں گئے تھے۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ عزیر گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دفتر سے چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا۔ معاً ایک انسانی وجود اوپر کی طرف سے نمودار ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا اس کی گاڑی کے سامنے آن گرا۔ اضطراری طور پر اس کے پاؤں کا دبا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: مرزا شہر عباس فون نمبر: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر..... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

بریک پیڈل پر پڑا اور گاڑی رک گئی۔ وہ ہکا بکا انداز میں اپنی گاڑی کے سامنے پڑے انسانی وجود کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سڑک پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے بکھرے بالوں پر گھونسلے کا سا گمان ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو سامنے کی طرف پھیلے تھے۔ اس کا سارا جسم لہو میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں نقاش تھا۔

عزیر تیزی سے گاڑی سے اترا۔ نقاش کے پاس پہنچ کے وہ اس پر جھکا۔ اس کے بائیں کندھے پر گولی کا نشان نظر آ رہا تھا۔

نقاش نے اپنی بند مٹھی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے لب کپکپا کے رہ گئے۔ عزیر نے اس کی بند مٹھی کھولی۔ اس میں ایک بڑے سائز کا میموری کارڈ دبا تھا۔

عزیر نے کارڈ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ نقاش کی حالت تشویش ناک تھی۔ اسے جلد از جلد اسپتال میں پہنچانا ضروری تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو چونک گیا۔ اس کی آنکھ کی پتلیاں ساکت لگ رہی تھیں۔ عزیر نے دھڑکتے دل سے اس کی نبض چیک کی تو اس کے اپنے دل کی دھڑکن ڈوبنے لگی۔ اس کی نبض میں کسی قسم کی کوئی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل نکال کے اس کی اسکرین اس کے نتھنوں کے ساتھ لگائی۔ اسکرین پر بھاپ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ عزیر نے اندازہ لگایا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ وہ شاید یہ میموری کارڈ عزیر تک پہنچانے کی کوشش میں ہی جانے کتنی دیر سے موت سے لڑ رہا تھا۔ اپنا کام پورا کرتے ہی اس نے انتہائی سکون سے موت کو گلے لگا لیا تھا۔ عزیر نے اپنے حلق میں نمکین پانی کا ذائقہ محسوس کیا۔

نقاش کی حالت دیکھ کے لگ رہا تھا کہ اس کے دشمن اس کے پیچھے تھے۔ وہ ویسے بھی مر چکا تھا، اب اگر وہ اس کی لاش کو اسپتال پہنچانے کی کوشش کرتا تو وہ بھی دشمنوں کی نظر میں آ سکتا تھا۔ وہ جس پوسٹ پر تھا، اس نے اسے حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ جذباتی ہونے کے بجائے اس سارے معاملے کو حقیقت پسندی کی عینک سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے چوکنے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ جنگل میں اوپر کی طرف چند لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شنید تھی کہ یہ وہی لوگ ہوں گے جو نقاش کے پیچھے تھے۔

اس نے تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کے گاڑی اسٹارٹ کی۔ نقاش کی لاش سے بچ کے گزرتے ہوئے اسے اپنے دل پر بے پناہ بوجھ محسوس ہوا۔

اس نے گاڑی لاش کے پاس سے گزارنے کے بعد بیک ویو مرر میں دیکھا۔ نقاش کی ساکت آنکھیں جیسے اسی پر مرکوز تھیں۔ عزیر کو لگا جیسے وہ اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا ہو۔

''میری قربانی کو رائگاں نہ جانے دینا۔ میرے دشمنوں سے میرا اور بے شمار لوگوں کے خون کا حساب لینا۔''

عزیر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''انشاء اللہ میں تمہاری موت کو رائگاں نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جیسے خود کو یقین دہانی کرائی۔

کچھ دیر میں ہی وہ گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنے والدین سے ملے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ لیپ ٹاپ آن کرنے کے بعد میموری کارڈ اس نے لیپ ٹاپ میں ڈال لیا۔ اب وہ بے چینی سے لیپ ٹاپ پر ونڈو ''لوڈ'' ہوتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

جابر کی گولی نقاش کو جا لگی تھی۔ اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''آخرکار میں نے اپنا ادھورا کام مکمل کر لیا۔'' وہ زیرِ لب بولا تھا۔ ٹوٹا ہوا کیمرا اس نے اٹھا لیا تھا۔ اب وہ اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔

فائر کی آواز سنتے ہی اس کے دو ساتھی بھاگتے ہوئے اس کے پاس آ گئے تھے۔ اس نے انہیں اشارہ کیا اور احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے۔

نیچے پہنچ کے اس نے چٹان کی طرف دیکھا جہاں نقاش گرا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ چٹان نقاش کے خون سے تر تھی لیکن اس کی توقع کے مطابق لاش موجود نہیں تھی۔

''لگتا ہے وہ ایک بار پھر بچ گیا ہے۔'' وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔

''استاد، بچ کے کہاں جائے گا۔'' اس کا ایک ساتھی اپنے پستول کی نال چومتے ہوئے سفاکی سے بولا۔

انہوں نے پتھروں پر سے ہوتے ہوئے نالا کراس کیا۔ چٹان سے آگے لہو کی بوندیں ان کی راہنمائی کرنے لگیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے آگے چلنے لگے۔ چند قدم کے بعد انہیں مسلی ہوئی گھاس اور کپڑے کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔

''یہاں شاید اس نے رک کے اپنے زخم پر پٹی کی

ہے۔'' جابر کا ایک ساتھی بولا۔

یہاں سے آگے خون کی بوندیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ پھیل کے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ وہ آسانی سے نقاش کو ڈھونڈ لیں گے لیکن کئی گھنٹے پورا جنگل چھان لینے کے باوجود انہیں نقاش کا سراغ نہ ملا۔ وہ چلتے چلتے سڑک کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ نقاش کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

''استاد..... چٹان پر اتنا زیادہ خون پھیلا تھا، ہو سکتا ہے وہ مر گیا ہو، اور اسے بھیڑیا اٹھا کے لے گیا ہو۔'' رات کو ان کے دو ساتھی بھی بھیڑیے کا شکار بنے تھے۔ اس واقعے کی روشنی میں جابر کے ایک ساتھی نے اپنی رائے پیش کی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو، ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔'' جابر پُرسوچ انداز میں بولا۔

''وہ بالشت بھر کا چھوکرا ہمیں کیا مارے گا۔'' اس کا دوسرا ساتھی حقارت سے بولا۔

''تم نے جھونپڑی دیکھی تھی ناں۔'' جابر اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''وہ جانے کتنے عرصے سے وہاں رہ رہا تھا اور مجھے لگتا ہے وہ ہمارے لیے ہی وہاں رہ رہا تھا۔ میرا جب اس سے آمنا سامنا ہوا تھا تو اس نے کیمرا مجھ پر دے مارا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے ہماری رات کی کارروائی کی ویڈیو بنا لی ہو۔''

''کیمرا تو ٹوٹ گیا، بنا لی ہو... تو کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس کا ساتھی بے پروائی سے بولا۔

''کیمرے میں میموری کارڈ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے میموری کارڈ نکال لیا ہو۔ وہ میموری کارڈ کسی کے ہتھے چڑھ گیا تو ہماری خیر نہیں۔'' وہ اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے بولا۔ اس کے اندازوں نے اس کے ساتھیوں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔

دفعتاً جابر نے نیچے روڈ پر ایک گاڑی رکتی دیکھی۔ درختوں کی وجہ سے وہ پورا منظر دیکھنے سے قاصر تھے۔

''یہ گاڑی ادھر کیوں رکی ہوئی ہے؟ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ اس کے ساتھی بھی جھک کے گاڑی کو دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں بھی اُلجھن نمودار ہو گئی۔

وہ تینوں ڈھلوان پر احتیاط سے اترتے ہوئے نیچے آنے لگے۔ وہ سڑک سے کچھ فاصلے پر ہی پہنچے تھے کہ گاڑی چل پڑی۔

''یہ تو اپنے ایس ڈی ایف او کی گاڑی لگ رہی ہے۔'' جابر کا ایک ساتھی بولا۔

''ہاں..... بڑا کمینہ بندہ ہے یہ۔'' جابر نفرت سے بولا۔ ''مگر یہ ادھر کا کیوں تھا؟''

نیچے پہنچ کے ان کی نظر نقاش پر پڑی تو انہیں عزیر کے رکنے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔ جابر نے نقاش کا معائنہ کیا۔

''یہ تو گیا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن لگتا ہے یہ ''ایس ڈی ایف او'' کو سب بتا کے مرا ہے۔'' اس کے جسم میں موجود دم توڑتی حرارت سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی موت چند لمحے قبل ہی واقع ہوئی ہے۔

وہ اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی خالی جیبوں کو دیکھتے ہوئے وہ مایوسی سے بولا۔

''اگر اس کے پاس میموری کارڈ تھا تو وہ شاید ایس ڈی ایف او تک پہنچ چکا ہے۔'' اس کے ساتھی اسے متفکر نظروں سے دیکھنے لگے۔

''چلیں پھر آج اس ایس ڈی ایف او کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس سے ویسے بھی بڑے حساب بنتے ہیں ہمارے۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

رات کو وہ سب لوگ ٹرک میں آئے تھے۔ نقاش کی وجہ سے ان کا کام ادھورا رہ گیا تھا۔ باقی ساتھی ٹرک لے کے واپس روانہ ہو گئے تھے۔ جابر اپنے دو ساتھیوں کی وجہ سے نقاش کی تلاش میں رک گیا تھا۔ انہوں نے نقاش کو تو آخرکار تلاش کر لیا تھا لیکن یہ تلاش ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ اب وہ اپنے ادھورے کام کو مکمل کرنے کے لیے پیدل ہی تیزی سے عزیر کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

عزیر سکتہ زدہ انداز میں ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ ویڈیو میں دس کے قریب لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ نائٹ موڈ پر ویڈیو بننے کی وجہ سے ویڈیو کی کوالٹی زیادہ اچھی تو نہ تھی تاہم تین چار افراد کے چہرے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ یہ لوگ انور کے لیے کام کرتے ہیں۔

زمین پر ایک جنریٹر سے چلنے والا آرا پڑا تھا۔ وہ لوگ اس آرے سے ایک درخت تقریباً کاٹ چکے تھے۔ وہ درخت گرنے والا تھا۔ اسے صحیح سمت میں گرانے کے لیے چند لوگ رسیوں کی مدد سے ایک سمت میں کھینچ رہے تھے۔ ان افراد کے محض ہیولے نظر آ رہے تھے۔

جابر کا چہرہ سامنے آیا تو عزیر نے ہونٹ سکیڑے۔ جابر نے سگریٹ سلگایا تھا۔ ان لوگوں کے ہلتے ہونٹوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں لیکن

PAKSOCIETY.COM

ان کی آوازیں ریکارڈ نہیں ہو پائی تھیں۔

اس علاقے میں نمبر مافیا کا بڑا زور تھا۔ عزیر جانتا تھا کہ اس کام میں ایم پی اے اور ایم این اے لیول تک کے لوگ ملوث تھے۔ انور اس کام میں ان کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ نمبر مافیا میں شمولیت کے بعد انور نے چند برسوں میں قرب و جوار کے کئی جنگلوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ڈونگہ گراں کی پہاڑیوں کے اوپر وسیع پیمانے پر پھیلے جنگل میں اِکا دُکا درخت ہی بچے تھے۔ یہ جنگل ہی تھا جو لینڈ سلائڈنگ سے گاؤں کی حفاظت کرتا تھا۔ اس جنگل کے ختم ہوتے ہی گاؤں مکمل تباہ ہو گیا تھا اور ہزاروں لوگ اپنی جان سے گئے تھے۔

عزیر جنگلات کی کٹائی دیکھتے ہوئے جوان ہوا تھا۔ ان کے علاقے میں ہر فرد بڑے پیمانے پر جنگلات کی کٹائی سے خوفزدہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگلات کی کٹائی کے بعد کوئی گاؤں بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ ہر چند سال میں ایک آدھ بار لازماً اس علاقے میں ایسی بارش ہوتی تھی جو ہفتوں جاری رہتی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس بار ایسی بارش کے بعد کچھ بچنے کی امید کم ہی تھی لیکن انہوں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ لوگ اگر مل کے نمبر مافیا کے خلاف کھڑے ہو جاتے تو جنگلات کی کٹائی رک سکتی تھی لیکن اس اجتماعی مسئلے پر ان میں اجتماعیت قائم ہی نہ ہو سکی، نتیجے میں تباہی ان کا مقدر ٹھہری۔

لوگوں کی خاموشی دیکھ کے عزیر کا دل ہر وقت کڑھتا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ملکِ عزیز میں ہر جگہ ایسا ہی ہو رہا ہے، چند لوگوں پر مشتمل مفاد پرستوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ کہیں وہ منشیات فروشوں کے روپ میں قوم کو تباہ کرنے لگتا ہے تو کہیں دہشت گردوں کے روپ میں..... کہیں سیاسی پارٹیوں کی شکل میں قوم کا استحصال ہونے لگتا ہے تو کہیں قانون کے نام پر..... شعور سے عاری قوم خاموشی سے اپنے حقوق غصب ہونے کا، اپنی تباہی کا..... تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ اگر چند سر پھرے لوگ اس بے انصافی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے بھی ہیں تو ان کا ساتھ دینے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ لوگوں کے نزدیک ان کی ذاتی زندگی اور ان سے جڑے مسائل زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اجتماعی مسائل پر وہ ''اجتماعی خاموشی'' اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کچھ کہیں گے بھی تو محض بحث کرنے کی غرض سے ہی، کسی مسئلے کے حل کی طرف نہ وہ جاتے ہیں نہ ہی اس نہج پر ان کی تربیت کی گئی ہوتی ہے۔ نتیجے میں ایک محدود طبقہ ہمیشہ ان پر تباہی مسلط کر دیتا ہے۔ یہی کچھ اس علاقے کی عوام نے بھی کیا تھا۔ جس جان کے ڈر سے انہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی، وہ اس جان سے ہی چلے گئے تھے۔

ڈونگہ گراں مکمل تباہ ہونے والا پہلا گاؤں تھا، اس کی تباہی سے بھی نمبر مافیا کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دو تین ماہ بعد ہی انہوں نے پھر سے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ کام باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کرتے تھے۔ انہیں محکمۂ جنگلات اور محکمۂ پولیس دونوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ دونوں محکموں کے لوگوں کو گھر بیٹھے ان کا نذرانہ مل جاتا تھا، اس نذرانے کے خمار میں انہیں بھی اپنے مفاد کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

عزیر کے دل میں ان لوگوں کے لیے بے پناہ نفرت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اگر محکمۂ جنگلات میں کسی بڑی پوسٹ پر فائز ہو جاتا تو وہ اس کام کو روک سکتا ہے۔ محکمۂ جنگلات میں نوکریوں کا اشتہار آیا تو اس نے بھی اپلائی کر دیا۔ پبلک سروس کمیشن کی طرف سے امتحان پاس کر کے وہ سب ڈویژن فاریسٹ آفیسر بھرتی ہوا تھا۔ اس کی پہلی پوسٹنگ ہی اپنی سب ڈویژن میں ہوئی تھی۔

اس نے بڑے جذبے سے جاب جوائن کی تھی لیکن جاب جوائن کرنے کے بعد چند دن میں ہی اسے مشکلات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ اس کے اپنے محکمے کے لوگوں نے ہی اشاروں ہی اشاروں میں اسے دھمکانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں میں اس کے آفیسر بھی شامل تھے۔ وہ ان دھمکیوں کو خاطر میں نہ لایا، اس نے اپنے طور پر رات کو چھاپے مارنے شروع کیے تو اسے حاصل تو کچھ نہ ہوا الٹا اس کے افسر نے اسے بلا کے سرزنش کی۔ وہ جان گیا کہ ان کا سارا محکمہ ہی نمبر مافیا کے ساتھ ملا ہوا ہے اس لیے اس کے چھاپے ناکام گئے ہیں۔

اب وہ تنہا چھاپے مارنا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے اس کی باقاعدہ نگرانی شروع کر دی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کام میں تنہا ہے، اگر وہ جنگلات کی کٹائی روکنا چاہتا ہے تو اسے عوام کو ساتھ ملانا ہوگا۔ وہ خود سے عوام کو ساتھ نہیں ملا سکتا تھا۔ ایسے میں اسے نقاش ملا تھا جو اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا تھا لیکن پاداش میں اسے اپنے پورے گھرانے کی قربانی دینا پڑی تھی۔ اس نے پھر بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس تک ویڈیو پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس ویڈیو کی قیمت اس نے اپنی جان

دے کے ادا کی تھی۔ اب عزیر اس جان کا قرض بھی اپنے کندھوں پر محسوس کر رہا تھا۔

نقاش نے جتنی ویڈیو بنائی تھی وہ ان لوگوں کو پکڑنے کے لیے کافی تھی، لیکن پولیس کا سارا عملہ انہوں نے اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔ عزیر جانتا تھا کہ ایک اس ویڈیو کو بنیاد بنا کے اس نے ان لوگوں کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے کی کوشش کی تو تھانیدار ایف آئی آر تو کاٹے گا نہیں الٹا اسے جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس لیے اس نے اس مسئلے کا ایک اور حل سوچا تھا۔ سیدھا اور قانونی حل.....

یہاں جنگل کے قانون کا راج تھا۔ یہ قانون اسی شخص کا ساتھ دیتا تھا جس کے پاس طاقت ہوتی تھی۔ طاقتور لوگ اپنے دشمنوں سے مقابلے کے لیے قانون کا سہارا لیتے تھے۔ کوئی بھی شخص پیسہ پھینک کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کے اس کا رخ اپنے مخالفین کی طرف موڑ سکتا تھا۔ اس طرح قانون کے رکھوالے بھی فائدے میں رہتے تھے اور قانون سے کھیلنے والے بھی۔ رہا عام آدمی تو اس کے لیے تو قانون کے پاس آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ عزیر بچپن سے بااثر لوگوں کے ہاتھوں قانون کا یہ کھلواڑ ہوتے دیکھ رہا تھا۔

اس نے قانون کی اسی خاصیت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ پر ''واٹس ایپ ویب'' کھولی اور چند لوگوں کو وہ ویڈیو سینڈ کر دی۔ اس کام سے فارغ ہو کے اس نے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ابھی کال ریسیو ہوئی نہیں تھی کہ اس نے اپنے عقب میں دھپ کی آواز سنی۔ وہ ٹھٹک کے پیچھے مڑا۔

جابر ہاتھ میں پستول پکڑے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں لکڑی کی بنی کھڑکی کا پٹ جھول رہا تھا۔

''تو تم باز نہیں آئے'' ایس ڈی ایف او صاحب۔'' وہ لفظوں کو چبا چبا کے بولا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' عزیر اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''اس چھوکرے کو ہمارے پیچھے لگا کے سمجھ رہے ہو میں نے کیا کیا؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اس سے میموری کارڈ لے کے آئے اور پوچھ رہے ہو، میں نے کیا کیا؟ یہ دو جرم کافی ہیں یا اور بھی بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے؟'' عزیر کے چہرے کی رنگت متغیر ہوتے دیکھ کے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا ہوا میں چلایا گیا تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے۔

''مجھے کچھ نہیں سمجھ آ رہی تم کیا کہہ رہے ہو اور تمہیں جرأت کیسے ہوئی یوں میرے گھر میں گھسنے کی؟'' عزیر اپنی گھبراہٹ پر غصے کا نقاب چڑھاتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ میں نے خود تمہیں میموری کارڈ نقاش سے لیتے دیکھا تھا۔ تمہارے ماں باپ میرے آدمیوں کے نشانے پر ہیں۔ اگر ان کی زندگی چاہتے ہو تو میموری کارڈ میرے حوالے کر دو۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

اپنے والدین کی زندگی خطرے میں دیکھ کے عزیر کا دل ہول گیا۔ وہ اپنے لیپ ٹاپ کی سلاٹ میں ایک خراب میموری کارڈ ڈال کے رکھتا تھا۔ اس نے وہ کارڈ نکال کے نقاش والا کارڈ ڈالا تھا۔ اس نے وہی کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ لو کارڈ اور پلیز اپنے ساتھیوں کو لے کے اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

کارڈ دیکھ کے جابر کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''خفا کیوں ہوتے ہو..... ہم ابھی یہاں سے دفع ہو جاتے ہیں لیکن ہم ایسے ہی چلے گئے تو انور صاحب ہم سے بہت ناراض ہوں گے۔'' وہ اس کے ہاتھ سے کارڈ لیتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''کیا مطلب؟'' عزیر الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''وہ کہیں گے ناں کہ فاریسٹ آفیسر کو کوئی تحفہ دے کے کیوں نہیں آئے۔'' وہ پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیسا تحفہ؟'' عزیر کی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

''موت کا تحفہ.....'' جابر سفاکی سے کہتے ہوئے بولا۔ اگلے ہی لمحے اس کے پستول نے ایک شعلہ اگلا اور گولی عزیر کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کے گرا۔ اس کی بے نور نظریں چھت پر مرکوز ہو گئیں۔ ان نظروں میں حسرت تھی، نمبر مافیا کو ختم کرنے کی..... ان نظروں میں شکوہ تھا، خدا سے..... جس کی خدائی میں لوگ خدا بنے بیٹھے تھے۔ ان نظروں میں شکایت تھی، لوگوں سے..... جو ظلم کے خلاف اجتماعی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان نظروں میں درد تھا، بے یقینی تھی اگر کچھ نہیں تھا تو زندگی نہیں تھی۔

فائر کرتے ہی جابر نے لیپ ٹاپ اور عزیر کا سیل فون اٹھایا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اس کے ساتھی باہر ہی موجود تھے۔ وہ اس کے اندر جانے کے بعد سے اُدھر ہی کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ جنگل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگتے ہوئے ان کی

PakiBookStore

سماعتوں میں عزیر کی والدہ کی آہ و بکا پڑی تھی لیکن اس آہ و بکا میں چھپا درد ان کی سماعتوں سے ہوتا ہوا ان کے دل تک نہ پہنچا تھا۔

☆☆☆

جمشید ڈرائیو کر رہا تھا کہ اس کا سیل بجا۔ سیل کی اسکرین پر عزیر اسد کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے سیل کان کے ساتھ لگا کے ''ہیلو'' کہا لیکن دوسری طرف سے عزیر کے بجائے کسی اور کی مدھم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ چونک گیا۔ گاڑی اس نے کنارے پر لگائی اور سیل پر کال ریکارڈ کا آپشن آن کر دیا۔ کال ریکارڈ ہونے لگی۔ اس نے سیل کا اسپیکر بھی آن کر لیا۔

دوسری طرف ہونے والی گفتگو سنتے ہوئے اس کے چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ انور کا نام گفتگو میں آیا تو اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ فائر کی آواز سن کے اس کے لبوں سے ''اوہ'' برآمد ہوا..... دوسری طرف سے اب ''اٹھا پٹخ'' کی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کال کاٹنے ہی لگا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی۔

''کام ہو گیا۔ چلو بھاگو۔''

''انور صاحب کتنے عرصے سے اس فاریسٹ آفیسر کو ٹپکانے کا کہہ رہے تھے پر پتا نہیں ایم پی اے صاحب کو اس سے کیا ہمدردی تھی، وہ ہمیشہ منع کر دیتے۔''

''چلو اب تو ان کی خواہش پوری ہو گئی۔ اب ہم آزادی سے اپنا کام کر سکیں گے۔''

ایسا لگ رہا تھا جیسے بھاگتے ہوئے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ جمشید نے کچھ دیر سیل کان کے ساتھ لگائے رکھا لیکن اب سیل پر محض قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔

اس نے کال کاٹی اور ریکارڈنگ سیو کا بٹن دبا دیا۔ اس نے ریکارڈنگ نکالی اور سننے لگا۔ ریکارڈنگ کی کوالٹی سے مطمئن ہونے کے بعد وہ سیل بند کرنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر ایک ''واٹس ایپ نوٹیفیکیشن'' پر پڑی۔ واٹس ایپ عزیر کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ وہ اس ویڈیو کو دیکھنے لگا۔ ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ زیرِ لب بولا۔

''واہ عزیر مرتے مرتے تم میرا کام تو سیدھا کر گئے۔''

جمشید آنے والے الیکشن کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا تعلق مخالف پارٹی سے تھا۔ سابق ایم پی اے جب سے الیکشن لڑ رہا تھا وہ جیت رہا تھا۔ اس بار وہ اپنے داماد انور کو الیکشن لڑوانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ انور کی پوزیشن بھی انتہائی مضبوط تھی۔ جمشید کو اس بار بھی ہارا اپنا مقدر بنتے نظر آ رہی تھی لیکن اس ویڈیو نے اس کا دل خوش کر دیا تھا۔ اب وہ نہ صرف انور کو عزیر کے قتل کے مقدمے میں پھنسا سکتا تھا بلکہ اس پر جنگلات کی غیر قانونی کٹائی میں ملوث ہونے کا مقدمہ بھی کر سکتا تھا۔ اس کے پاس دولت تھی جس کے بل بوتے پر قانون کو اپنی مرضی سے چلانے کا اختیار رکھتا تھا۔ اس کے دشمن بھی با اختیار تھے اس لیے پہلے وہ بغیر ثبوتوں کے ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا مگر اب وہ ان ثبوتوں کی مدد سے.... قانون کو ان کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔

اس کی ان ساری کوششوں سے انور کو سزا ہوتی نہ ہوتی کم از کم وہ الیکشن نہیں جیت سکتا تھا۔ ایک بار وہ سیاسی طاقت حاصل کر لیتا اس کے بعد وہ اپنے طور پر بھی انور سے نمٹ سکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے سیل سے اپنے علاقے کی پولیس چوکی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے غنودہ سی ''ہیلو'' کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''میں جمشید عباسی بات کر رہا ہوں۔'' اس کی رعب دار آواز سن کے پولیس اہلکار کی غنودگی لمحہ بھر میں غائب ہو گئی۔ وہ چوکنے انداز میں بولا۔

''جی سر.....'' جمشید نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

''ایس ڈی ایف عزیر اسد کا قتل ہو گیا ہے۔ تم فوراً ان کے گھر پہنچو۔'' وہ حکمیہ انداز میں بولا۔

''اوہ..... او کے سر، ہم لوگ ابھی پہنچے۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اور بات سنو..... تم رپورٹ تیار کرنے کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرو۔ میں قاتل کو جانتا ہوں۔ میرے پاس اس کے خلاف ثبوت بھی موجود ہیں۔ تم ضروری کارروائی سے فارغ ہو جاؤ۔ کل میں باقاعدہ ایف آئی آر درج کرانے کے لیے چوکی آؤں گا۔''

''کون ہے قاتل؟'' پولیس اہلکار حیرانی سے بولا۔

''یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ پہلے تم اپنے طور پر کچھ تفتیش تو کرو۔'' یہ کہتے ہی اس نے کال کاٹ دی۔

اُس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو گوہرِ مقصود پا لینے والے کے چہرے پر ہوتی ہے۔

جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اسی طرح قدرت نے انور کو ''کانٹے'' کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔

www.PakiBooks.Site